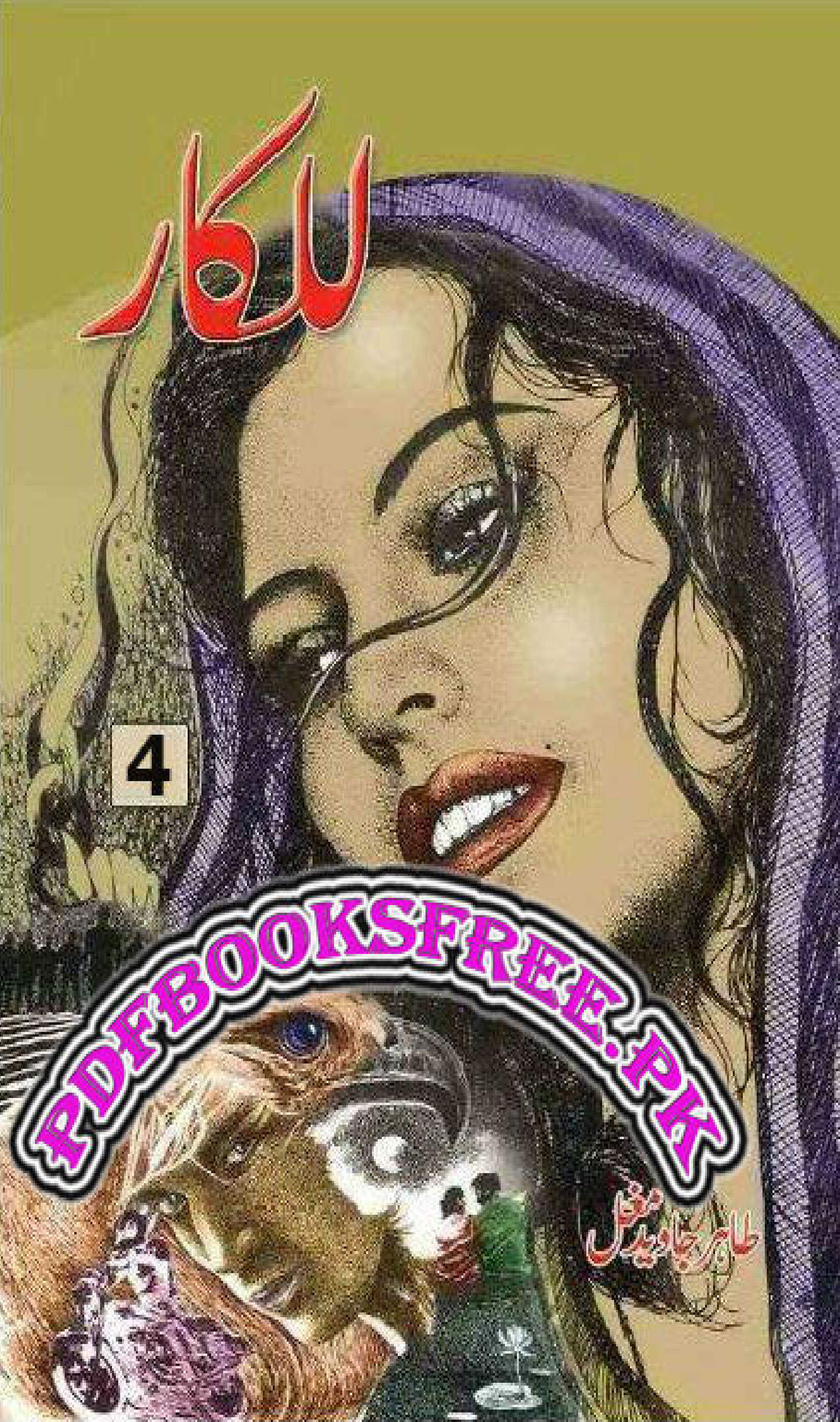


للکار
4
PDFBOOKSFREE.PK
ساجد جاوید مغل

راج بھون کی فصیل اور جھیل کے درمیان ریت کی ایک تنگ پٹی سی تھی۔ کہیں یہ پٹی دس پندرہ فٹ چوڑی تھی اور کہیں دو تین فٹ رہ جاتی تھی۔ کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں یہ پٹی موجود ہی نہیں تھی اور جھیل کا پانی فصیل نما دیوار کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ یہ رسّی ایک ایسی ہی جگہ پر جھول رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چمڑے کی ایک مضبوط بیلٹ ہے۔ اس کے بالائی سرے پر لکڑی کی ایک بڑی چرخی تھی اور نچلے سرے سے ربڑ کا ایک تھیلا سا بندھا ہوا تھا۔ کھلے منہ والے اس لچکیلے تھیلے کو عام طور پر ''بوکا'' کہا جاتا ہے اور اس سے کنوئیں کے اندر سے پانی کھینچا جاتا ہے۔

اب ساری صورتِ حال سمجھ میں آ رہی تھی۔ فصیل کے اوپر لگی ہوئی چرخی کے ذریعے جھیل میں سے پانی کھینچا جاتا تھا۔ یہ انتظام کرنے والوں نے شاید سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کوئی اس طرف سے برفاب جھیل کو پار کرے گا اور اس چرخی اور رسّی کو کمند کے طور پر استعمال کرنے کا پروگرام بنائے گا۔

رات کے اس پہر فصیل کا یہ حصہ بالکل تاریک اور بڑی حد تک خاموش نظر آتا تھا...... چرخی کے ارد گرد کسی طرح کی نقل و حرکت کے آثار نہیں تھے۔

''میں کیسے چڑھوں گا؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''تم چڑھو گے نہیں، چڑھائے جاؤ گے۔'' وہ ترت بولا۔

اس کے بعد اس نے اپنے کندھے سے رائفل اُتار کر ربڑ کے بوکے میں رکھ دی اور مجھے بھی ایسا کرنے کی ہدایت کی۔ پھر سرگوشی میں کہنے لگا۔ ''میں اوپر جا رہا ہوں۔ اوپر پہنچ جاؤں تو تم بوکے میں بیٹھ جانا۔ میں چرخی گھما کر تمہیں اوپر کھینچ لوں گا۔''

وہ اتنے اطمینان سے بات کر رہا تھا جیسے تیس پینتیس فٹ اونچی فصیل پر نہیں، کسی گھر کی

قدِ آدم باؤنڈری وال پر چڑھنے کا ارادہ کر رہا ہے...... اور وہ ایسا انداز اختیار کر بھی سکتا تھا۔ کودنا، پھلانگنا اور چڑھنا اُترنا اس کے پیشے کا حصہ تھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر اوپر جاتے جاتے تم زیادہ اوپر چلے گئے تو؟''

''تو تم میری ساری بیویوں سے شادی کر لینا...... اور میرا لاہور والا مکان بیچ کر میرے حلقے کے ایم این اے کو دے دینا۔ بے چارہ بڑا غریب سیٹھ ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی مہارت سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ فقط ایک منٹ میں وہ فصیل پر تھا۔

اس کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق میں ربڑ کے بوکے میں بیٹھ گیا۔ عمران نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ فصیل پر کھڑے ہو کر میں نے راج بھون کی وسعت میں جھانکا تو وہاں رنگ و نور کا سیلاب نظر آیا۔ کچھ رنگین ہوائیاں ہمارے سروں کے اوپر سے اُڑتی ہوئی گئیں اور جھیل کے پانی میں گم ہو گئیں۔

عمران ہانپ رہا تھا۔ ''یار! تمہاری باتوں میں تو اتنا وزن نہیں لیکن خود کافی وزنی ہو۔''

''اور تم دونوں طرف سے ہلکے ہو۔''

''تمہیں بھی زبان لگ گئی ہے۔ کوئی بات نہیں، اگلے آدھ پون گھنٹے میں تمہاری بولتی ضرور بند ہو جائے گی۔''

''بے فکر رہو۔ اگر ہو گی تو دونوں کی ہو گی۔

''لو...... لگ رہا ہے کہ کام شروع ہونے والا ہے۔'' عمران نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ دو پہرے دار چوڑی فصیل پر چلتے ہوئے سیدھا ہماری طرف آ رہے تھے۔ ہم دونوں نے چہرے ایک دوسرے کی طرف کر لئے اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ یہ پہرے دار ہماری طرف توجہ دیئے بغیر گزر جاتے۔

یقیناً گزر جاتے مگر یہاں ہم سے ایک غلطی ہوئی جس کا پتا ہمیں بعد میں چلا۔ ان پہرے داروں کی سرخ پگڑیوں میں ایک نیلی دھاری تھی جس کا مطلب تھا کہ یہ ہم سے سینئر ہیں۔ مروجہ اصول کے مطابق ہمیں ان کو نمستے کرنا چاہئے تھا۔ ہمارے خاموش رہنے کے سبب وہ ٹھٹک گئے۔ انہوں نے مڑ کر ہمیں دیکھا اور پھر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے ٹارچ کی روشنی ہم پر پھینکی۔ ''تمہاری ڈیوٹی کہاں ہے؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ بُری طرح چونکا۔ غالباً وہ یہاں موجود پہرے داروں کو صورتوں سے پہچانتا تھا میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے...... وہ نہیں

جانتا تھا کہ اس کی یہ حرکت اس کی موت پر مہرِ تصدیق لگا چکی ہے۔ عمران کی بھرپور لات اس کے سینے پر پڑی۔ پیچھے کی طرف لڑکھڑانے کے لئے اس کے پاس ڈیڑھ دو فٹ سے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ وہ پیچھے گیا اور پھر دیوار پر سے جھیل کی طرف پرواز کر گیا۔ دیوار یعنی فصیل کی موٹائی نیچے سے زیادہ تھی۔ وہاں ایک کنارہ سا بن گیا تھا۔ بدقسمت شخص پہلے اس کنارے سے ٹکرایا پھر جھیل کے برفاب میں چلا گیا۔ دوسرا شخص کافی قوی ہیکل تھا۔ اس نے مجھ پر اندھا دھند ہاتھ چلایا...... وزنی مکا میری ٹھوڑی پر لگا۔ گردن کو لگنے والے دھچکے کے سبب میرے نیم مندمل زخم میں ٹیسیں اُٹھیں اور دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ اس ہٹے کٹے شخص کا دوسرا وار میں نے جھک کر بچایا اور اس کے سر پر ایک زوردار جوابی مکا رسید کیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں نے اندھا دھند دو اور مکے اس کے کھوپڑے پر ہی رسید کئے۔ وہ پٹ سے گرا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ میرے زوردار مکوں کا یہ وہی نتیجہ نکلا تھا جو اس سے پہلے مکھیا عبدالرشید کی حویلی میں نکلا تھا۔ میں نے پورے طیش سے سلمان سلو کے سر پر دو تین ضربیں لگائی تھیں اور اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا تھا۔

اسی دوران میں ایک قریبی برجی کے پیچھے سے ایک نہایت جوشیلا پہرے دار نکل کر عمران پر جھپٹا۔ غالباً اس کے جوش و خروش میں کچھ حصہ شراب نوشی کا بھی تھا۔ وہ بھی یہ بات فراموش کر گیا کہ اگر اس کا وار خالی گیا تو انجام کیا ہو گا۔ عمران نے پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر خود کو اس کی اندھی زد سے بچایا۔ وہ رپٹ کر گرا۔ ایک سیکنڈ کے لئے فصیل کے کنارے پر نظر آیا۔ پھر ڈکراتا اور ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا جھیل کی طرف پرواز کر گیا۔

''بچہ ابھی سیکھ رہا تھا۔'' عمران نے گہرائی میں دیکھتے ہوئے تاسف سے کہا۔ پھر گھوم کر ٹارچ کی روشنی اس پہرے دار کے چہرے پر پھینکی جو ابھی تک دیوار کے اوپر ہی تھا۔

اس کا سامنا مجھ سے ہوا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ کر اس کی گھنی مونچھوں کو بھگو رہا تھا۔ ''زندہ ہے یا مر گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''سر کی ہڈی ٹوٹ کر مغز میں گھس جائے تو اکثر لوگ زندہ رہنا پسند نہیں کرتے۔''

عمران نے کہا اور مجھے ذرا حیرت سے دیکھ کر ٹارچ بجھا دی۔

یہ فصیل قریباً تین فٹ چوڑی تھی۔ کہیں کہیں باقاعدہ برجیاں تھیں اور وہاں اس کی چوڑائی چھ سے آٹھ فٹ تک تھی۔ ہم دونوں نے مُردہ پہرے دار کی لاش گھسیٹ کر پینتیس فٹ نیچے یخ بستہ جھیل میں پھینک دی اور محافظوں کے انداز میں اکڑ کر چلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ سیڑھیاں طے کیں اور ایک کھلے احاطے میں داخل ہو گئے۔ یہاں راج

بھون کے بیسیوں ملازم اور محافظ وغیرہ جمع تھے۔ کچھ ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ کچھ ساز بجا رہے تھے۔ یہاں وہاں مٹھائی بھی تقسیم ہو رہی تھی۔ عمران نے سرگوشی میں کہا۔

"ایک نئے آقا کے نئے ظلم سہنے کا کتنا چاؤ ہے ان لوگوں کو۔"

عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ظالم ابن ظالم اور مظلوم ابن مظلوم کی روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ ہم نے تھوڑی سی مٹھائی لی اور ہلا گلا کرتے لوگوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارا رُخ سنہری کلسوں والی اس بلند و بالا عمارت کی طرف تھا جو جنریٹرز کی روشنی سے پوری طرح جگمگا رہی تھی۔ سیکڑوں رنگ برنگے قمقمے تھے اور ابھی مزید لگائے جا رہے تھے۔ یہی عمارت اس اسٹیٹ کے طاقتور فرماں روا رائے وشوا ناتھ عرف حکم جی کی جائے رہائش تھی۔ عمران کی معلومات کے مطابق سفید چمڑی والے جارج کا عشرت کدہ بھی اسی عمارت کے ساتھ تھا۔

یہاں آ کر میں نے اور عمران نے نوٹ کیا کہ جن پہریداروں کی پگڑیوں میں دھاریاں تھیں، وہ سینئر تھے اور عام پہرے دار پاس سے گزرتے ہوئے انہیں باقاعدہ سر جھکا کر تعظیم پیش کرتے تھے۔ ہم نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔ اس کے علاوہ ہم کوشش کر رہے تھے کہ ہمارا آمنا سامنا باوردی افراد کے ساتھ کم سے کم ہو۔ فصیل کے عظیم الشان مین دروازے سے وہ خاص خاص مہمان اندر داخل ہو رہے تھے جنہیں اس پُر مسرت موقع پر اندر آنے کی اجازت ملی تھی۔ ان معزز مہمانوں کی شاندار گاڑیاں اور بگھیاں باہر ہی روک لی گئی تھیں۔ وہ پیدل اندر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ بیگمات بھی تھیں...... کچھ مقامی طوائفیں سنگِ مرمر کے ایک چبوترے پر رقص کر رہی تھیں۔ ان کا لباس، رقص سے بڑھ کر اور رقص، لباس سے بڑھ کر ہیجان خیز تھا۔ وہ گانا بھی گا رہی تھیں۔ یما یماں...... یما یماں......بس آج کی رات ہے زندگی۔ کل ہم کہاں تم کہاں...... کچھ اس طرح کا گیت تھا۔

گیت کی لہریں، موسیقی، پھڑکتے جسم اور آتش بازی...... یہ سب مل جل کر عجیب سماں باندھ رہے تھے اور اس صورتِ حال میں...... ہم دونوں ایک نہایت خطرناک ارادے کے ساتھ دھیرے دھیرے حکم جی کی رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"وہ دیکھو، ادھر ہجوم ہے۔" عمران نے ایک جانب اشارہ کیا۔

یہ جگہ حکم جی کی عالی شان رہائش گاہ کے عین سامنے تھی۔ ہم لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس ہجوم کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک جگہ رنگ برنگے فواروں کے درمیان کھلے احاطے میں پُر جوش لوگوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، ملازم پیشہ افراد

بھی اور محافظ بھی۔ کسی مقامی رسم کے مطابق یہ لوگ ایک دوسرے پر چینی پھینک رہے تھے اور چہروں پر رنگ مل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہولی کے بغیر ہی ہولی منائی جا رہی ہے۔

عمران نے آگے بڑھ کر ایک محافظ کے چہرے پر رنگ ملا تو جواباً اس نے بھی بہت سا رنگ عمران کو مل دیا۔ عمران نے گیلے رنگ کی مٹھی بھری اور میرا چہرہ بھی رنگ دیا۔ اس کوشش میں ہم دونوں کی مخصوص پگڑیاں گر گئی تھیں۔ ہم نے یہ پگڑیاں پھر سروں پر رکھیں۔ پہلے تو میں نے عمران کی اس حرکت کو صرف اس کی شوخی سمجھا تھا لیکن پھر اندازہ ہوا کہ اس "شوخی" کی آڑ میں ہم دونوں کافی حد تک اپنی شناخت چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اپنی رنگ برنگی پگڑیاں لہرا رہے تھے۔ ان میں راج بھون کے گارڈز اور سپاہی بھی شامل تھے۔ عمران نے بھی پگڑی اُتار کر لہرانی شروع کر دی۔ کسی طرف سے نعرہ بلند ہوا۔ "ہمارے حکم جی کی......" سیکڑوں لوگوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ "جے۔"

"ہمارے ولی عہد کی......"

سیکڑوں لوگوں نے کہا۔ "جے۔"

ہم بھی ان نعروں میں شریک ہو گئے اور قدم قدم آگے بھی بڑھتے رہے۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "لو...... آج حکم جی کو بھی دیکھ لو۔"

"کہاں؟"

"وہ دائیں طرف دیکھو، بالکونی میں۔"

اور پھر واقعی میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ مجھے پہلی بار نظر آیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں جو تصور قائم کر رکھا تھا، وہ اس سے زیادہ بارعب اور اونچا لمبا تھا۔ اس کے قد و قامت میں کچھ عمل دخل شاید اس چمک دار پگڑی کا بھی تھا جو اس نے بڑے شاہانہ ٹھاٹ سے باندھ رکھی تھی۔ وہ کافی دوری پر تھا۔ اس کے گلے کی نہایت قیمتی مالائیں اور انگشتریاں وغیرہ پھر بھی چمک دکھا رہی تھیں۔ بالکونی میں اس کے ساتھ شاہی خاندان کے اور بھی کئی مرد و زن موجود تھے۔ ان میں زرق برق لباسوں والی چار رانیاں بھی موجود تھیں۔ تاہم مہارانی رتنا دیوی یقیناً ان میں نہیں تھی کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق بچہ اسی کو تولد ہوا تھا۔

یکا یک مجھے لگا کہ میرے جسم کا سارا لہو میرے سر کو چڑھ رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ دل اتنی شدت سے دھڑکا کہ لگا، پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بالکونی میں معزز افراد کے درمیان میری نگاہ شیطانِ اعظم جارج گورا پر پڑی۔ اپنے

نہایت سرخ و سپید چہرے اور نمایاں قد کاٹھ کے سبب وہ علیحدہ پہچانا جا رہا تھا۔ ہاں، یہی تھا وہ شخص جس کے خون کی پیاس روز و شب میرے اندر بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ اسی نے میری سلطانہ کو روندا تھا، اسی نے اسے توڑ پھوڑ کر نا قابلِ شناخت بنایا تھا۔ اسے کوئی حق نہیں تھا مسکرانے کا، شاہی بالکونی میں کھڑے ہو کر جھکنے کا...... سانس لینے کا اور زندہ رہنے کا...... ہاں، کوئی حق نہیں تھا۔

عمران نے بھی جارج گورا کو بالکونی میں دیکھ لیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے نگاہ ملائی اور اس بے پناہ حرارت کو محسوس کیا جو گورا کی شکل دیکھنے کے بعد ہمارے رگ و پے میں دوڑی تھی لیکن ہمارے اور اس شیطان کے درمیان بہت فاصلہ تھا، بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ بالکونی خاصی بلندی پر تھی اور بالکونی کے آگے ایک وسیع رقبے کو بالکل خالی رکھا گیا تھا۔ اس رقبے کے گرد آہنی باڑوں اور محافظوں کی دُہری تہری قطاروں نے حد بندی کر رکھی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ بس ایک حد تک ہی آگے جا سکیں گے۔ زیادہ آگے گئے تو مشکوک قرار پائیں گے......

پھر بھی ہم کوشش کرنا چاہتے تھے، شاید کوئی راہ مل جاتی اور شاید ہم کسی ایسی جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے جہاں سے جارج گورا پر رائفل کا فائر کیا جا سکتا۔ حالانکہ کسی ایسی کوشش کی کامیابی کا امکان بہت کم اور پکڑے جانے کا اندیشہ بہت زیادہ تھا۔ تب میری نظر جارج گورا کے ساتھ کھڑے دو دوسرے افراد پر پڑی۔ ان میں سے ایک مرد تھا اور دوسری عورت۔ اس عورت کو بھی میں سیکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ یقیناً یہ ماریا تھی۔ اسے ہم نے اپنی شرائط منوانے کے لئے اغوا کیا تھا لیکن یہ ہمارے گروپ کے ایک غدار کو ''ایک رشوت'' پیش کر کے فرار ہو گئی تھی۔ ماریا کے ساتھ جو شخص کھڑا تھا، وہ بھی میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ سرجن اسٹیل تھا، ماریا کا شوہر نامدار...... اسی نے میرے جسم میں وہ منحوس چپ رکھی تھی جس نے ایک طویل عرصے تک مجھے پابندِ سلاسل کیا اور میں مسلسل کوششوں کے باوجود اس اسٹیٹ کی حدود سے نکل نہ سکا۔

ہم آگے کو کھسکتے رہے لیکن پھر ایک جگہ ہمیں رکنا پڑا۔ ہمیں لگا کہ اب اس سے آگے نہیں جا سکیں گے۔ یہاں طوائفیں اور راج بھون کی خدمت گار عورتیں بھی ہجوم میں گھسی ہوئی تھیں۔ بدمست مرد ان سے چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔ کہیں کہیں یہ چھیڑ خانیاں دست درازیوں میں بدل چکی تھیں، تاہم خوشی کے اس موقع پر یہ عورتیں کچھ زیادہ معترض نہیں تھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس صورتِ حال کو نظر انداز کر رہی تھیں۔

اس سے پہلے میں نے حکم جی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ صرف ایک مرتبہ بارونداجیکی کے پاس چند تصویریں دیکھی تھیں۔ یہ تصویریں دراصل جیکی کی محبوبہ شکنتلا کی تھیں۔ ان میں حکم جی بھی موجود تھا، تاہم جیکی نے اظہارِ نفرت کے طور پر حکم جی کے چہرے اور جسم کے دیگر حصوں پر سیاہی پھیر دی تھی...... آج حکم میرے سامنے تھا۔ بے شک وہ آج بھی کافی فاصلے پر تھا مگر میں کم از کم اسے دیکھ تو سکتا تھا۔ اسے حکمراں کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی راہنما کا درجہ بھی دیا جاتا تھا...... اور میں دیکھ رہا تھا کہ بالکونی میں اس کا انداز مذہبی راہنماؤں جیسا ہی ہے۔ ایک زرنگار چوغہ اس کے کندھوں پر تھا اور وہ گاہے بگاہے بڑے ''برگزیدہ'' انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے لگتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہم اس سے آگے نہیں جا سکیں گے۔'' میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

''اور ہمارے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''جھیل کے کنارے بے ہوش پڑے پہرے داروں کو کسی بھی وقت دیکھا جا سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''چڑی بے چاری کیا کرے...... ٹھنڈا پانی پی مرے۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

اچانک وہ کچھ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ بالکونی میں کھڑے شاہی افراد کی سخاوت اور دریا دلی نے جوش مارا۔ حکم جی نے وہی کچھ کیا جو قدیم زمانوں سے پُرشکوہ حکمران اپنی ''نیچ'' رعایا کو خوش کرنے کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ اس نے مٹھیاں بھر بھر کر کچھ چیزیں نیچے نچھاور کرنا شروع کر دیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، ان میں کرنسی نوٹوں کے علاوہ سونے چاندی کے سکے اور قیمتی پتھر وغیرہ بھی شامل تھے۔ حکم جی کے ساتھ ہی ان کی رانیاں اور دو چار دیگر افراد بھی اس شاہانہ سخاوت میں شریک ہوئے۔ جب بالکونی کے سامنے خالی احاطے میں قیمتی اشیاء کی غیر متوقع بارش ہوئی تو کوئی رُکاوٹ رُکاوٹ نہ رہی۔ لوگ ایک سیلاب کی طرح اُمڈے اور ان اشیاء پر جھپٹے۔ باڑیں اُکھڑ گئیں، محافظوں کا حصار تتر بتر ہو گیا......

یہ ایک نادر موقع تھا...... ''چلو۔'' عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ہم بھی اس انسانی ریلے کا حصہ بن گئے جو احاطے کی طرف لپک رہا تھا۔ اس اچانک بھگدڑ کے سبب کئی لوگ گر گئے تھے۔ دوسرے انہیں روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے......

میں نے دیکھا کہ باوردی محافظ بھی اپنے اہم فریضے کو لات مار کر قیمتی اشیاء پر جھپٹنا شروع ہو

گئے ہیں۔ یہ منظر دیدنی تھا۔ میں اور عمران باڑیں پھلانگتے ہوئے احاطے میں پہنچے...... کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ لوگ بھوکے جانوروں کی طرح قیمتی سِکوں پر جھپٹ رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے اور چلا رہے تھے۔

ہم نے بھی چند اشیاء اُٹھائیں اور جھک کر دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب ہم نے بھری ہوئی رائفلیں اپنے ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم بالکونی کے عین سامنے تھے۔ یہ سنگِ سرخ کی شاندار بالکونی زمین سے کم و بیش تیس فٹ بلند تھی۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس طرف سے اوپر جانے کا راستہ تھا ہی نہیں...... فقط ایک جانب ایک چھوٹی سی گلی نظر آ رہی تھی...... یہ گلی غالباً محل کے اندرونی حصوں کی طرف جانے کے لئے تھی۔ تاہم اس گلی کے سامنے حکم جی کے خصوصی محافظوں کا دستہ چوکس کھڑا تھا۔

''کیا کریں؟'' میں نے قریباً چلا کر عمران سے پوچھا۔

''یہیں سے فائر کرو۔'' اس نے ہانپتی آواز میں کہا۔

ہمیں بالکونی میں حکم، جارج گورا، سرجن اسٹیل اور ماریا وغیرہ کے بس بالائی دھڑ نظر آ رہے تھے۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی ہم نے رائفلیں سیدھی کیں۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی ٹریگر دباتا، لوٹ مار میں مصروف ایک ہٹا کٹا شخص توپ کے گولے کی طرح عمران سے ٹکرایا۔ عمران لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کی رائفل کا میگزین علیحدہ ہو کر دور جا گرا۔

میں نے ایک سیکنڈ کے نصف حصے میں یہ سب کچھ دیکھا اور سمجھ گیا کہ اب عمران فائر نہیں کر سکے گا۔ میں نے رائفل اندازے سے جارج گورا کی طرف سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ رائفل میڈیم برسٹ پر سیٹ تھی۔ خوفناک تڑتڑاہٹ سے فضا گونجی اور بالکونی کی ریلنگ کے آس پاس چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ میں نے فوراً ہی دوسرا برسٹ مارا۔ بالکونی میں نظر آنے والی چمکیلی پگڑیاں اور رنگین آنچل ایک دم ہی اوجھل ہو گئے۔ میں لوگوں سے ٹکراتا اور انہیں پھلانگتا ہوا واپس پلٹا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ دور ہٹ کر بالکونی پر مزید برسٹ ماروں لیکن پھر میری نظر ایک چہرے پر پڑی اور میرا جسم سنسنا گیا۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ مجھ سے قریباً بیس میٹر کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے فائر کرتے دیکھ لیا تھا۔

''پکڑو...... پکڑو......'' وہ میری طرف انگلی اُٹھا کر دھاڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی برق رفتاری سے میری طرف آیا۔

اب رکنا فضول تھا۔ میں اور عمران پلٹ کر دوڑے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس جگہ

یہ نہایت خطرناک شخص ہمیں نظر آئے گا۔ وہ نہ صرف نظر آیا تھا بلکہ اب پوری رفتار سے ہمارے پیچھے بھی آ رہا تھا۔ عمران نے ابھی تک رنجیت پانڈے کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس لئے اسے علم نہیں تھا کہ ہمارے پیچھے کون سی بلا لگ گئی ہے۔

ہم شاہی بالکونی کے سامنے جو کچھ زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے، وہ کر چکے تھے۔ اب ہمیں یہاں سے کسی طرح بھاگنے کی کوشش کرنا تھی۔ ہم باڑیں پھلانگ کر واپس بڑے ہجوم کے اندر گھس گئے۔ یہاں ابھی تک بیشتر لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ بالکونی کے سامنے کیا ہوا ہے...... فائرنگ کی تڑتڑ آتش بازی کی آوازوں میں گم ہو گئی تھی اور ہلچل تو ویسے بھی ہر طرف مچی ہوئی تھی۔ ہم ہجوم کو چیرتے ہوئے فصیل کے جنوبی دروازے کی طرف بڑھے مگر جب ادھر سے بھی گارڈز کو حرکت کر کے اپنی طرف آتے دیکھا تو رخ بدل لیا۔ سامنے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا، ہم اس میں گھس گئے۔ یہ راج بھون کا وسیع و عریض باورچی خانہ تھا۔ ایک قطار میں درجنوں دیگیں آگ پر دھری تھیں۔ ہم ان دیگوں کو پھلانگتے ہوئے ایک بڑے ہال کمرے میں گھس گئے۔ یہاں بہت سی عورتیں دو رویہ بیٹھی تھیں، ان کے سامنے قالینوں پر بڑے بڑے تھال تھے۔ وہ پکوانوں میں ڈالنے کے لئے خشک میوہ جات کاٹ رہی تھیں۔ ہم تند بگولوں کی طرح ان کے درمیان سے گزر گئے، وہ چلاتی اور ہڑبڑاتی رہ گئیں۔ ایک طویل برآمدے میں سفید وردیوں والے درجنوں خانساماؤں نے ہمیں حیرت اور خوف کے عالم میں دیکھا۔ عمران کا دھکا لگنے سے ایک لحیم شحیم باورچی اوندھے منہ ایک بڑے دیگچے میں گرا اور ہمیں صرف اس کی اوپر اُٹھی ہوئی ٹانگیں نظر آئیں۔

ہمارے عقب میں ہوائی فائرنگ ہو رہی تھی اور رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آندھی کی طرح اُڑا چلا آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پانڈے مجھے پہچان نہیں سکا ہوگا۔ میرے چہرے پر رنگ ملا ہوا تھا۔ اس نے مجھے صرف فائرنگ کرتے دیکھا تھا اور مجھے پکڑنے کے لئے جھپٹ پڑا تھا۔ اس حوالے سے اس کی تیز نگاہی کی داد دینا پڑتی تھی۔ اندرونی دروازے سے بیس تیس قدم پہلے تین چار گارڈز ہمارے راستے میں آئے مگر وہ شدید تذبذب میں تھے۔ جیسے سمجھ نہ پا رہے ہوں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ہمیں روکنا ہے یا کسی اور کو روکنا ہے۔ ایک گارڈ نے عمران کا راستہ روکا تو عمران نے اس کے چہرے پر رائفل کے دستے سے طوفانی ضرب لگائی۔ ایک دوسرے گارڈ کو میں نے دھکا دے کر دور پھینکا...... کچھ فاصلے پر ایک لوڈر حرکت کرتا ہوا فصیل کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں ترپال تنی ہوئی تھی۔ عمران مجھ سے آگے تھا، وہ دوڑتا ہوا لوڈر کے بائیں طرف والے دروازے سے اندر داخل ہو

گیا۔ ایک سیکنڈ بعد میں نے لوڈر کے ڈرائیور کو اچھل کر دوسرے دروازے سے باہر گرتے دیکھا۔ یقیناً عمران ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں بھی عمران کے ساتھ جا کر بیٹھ سکتا۔ میں نے جست لگائی اور چلتے ہوئے لوڈر کے عقب میں سوار ہو گیا۔ تاہم اس کوشش کے دوران میں میری رائفل گر گئی۔

عمران نے مجھے سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گیئر بدلا اور یکایک لوڈر کی رفتار بڑھا دی۔ مجھے درمیانی شیشے میں سے ونڈ اسکرین دکھائی دے رہی تھی۔ بیرونی دروازے پر بیریئر تھا اور مسلح گارڈز تھے۔ عمران ایک دھماکے سے بیریئر کو توڑتا ہوا نکل گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ نصف درجن گارڈز ہکا بکا رہ گئے۔ ان میں سے شاید ایک دو گارڈز نے گولی چلائی ہو گی لیکن تب تک ہم مین راستے پر آ چکے تھے۔ یہاں بھی بہت سی گھوڑا گاڑیاں اور چھکڑے وغیرہ موجود تھے۔ عمران ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

’’ٹھیک ہو؟‘‘ اس نے لوڈر کے کیبن میں سے ہانک لگائی۔

’’ہاں ٹھیک ہوں۔ پر رائفل گر گئی ہے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں...... اللہ اور دے گا۔‘‘

’’لگتا ہے کوئی پیچھے آ رہا ہے۔‘‘ میں نے اطلاع دی۔

’’کون ہے؟‘‘

’’یہ وہی ذلیل رنجیت پانڈے ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

وہ واقعی کسی بلا کی طرح ہمارے پیچھے تھا۔ وہ پوری رفتار سے ہمارے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھی کافی پیچھے رہ گئے تھے۔ شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ میری رائفل گر گئی ہے۔ اسے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ میں اس پر فائر کر سکتا ہوں۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لوڈر کی رفتار تیز ہونے سے پہلے وہ چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو جائے۔ لوڈر سے اس کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میں نے وردی کے نیچے سے اپنا لوڈڈ ریوالور نکال لیا۔ میں مکمل تاریکی میں تھا۔ آندھی کی طرح لوڈر کے پیچھے آتا ہوا رنجیت پانڈے میری حرکات و سکنات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ریوالور دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پانڈے کا نشانہ لے لیا لیکن پھر پتا نہیں کیوں...... میں نے اس پر گولی نہیں چلائی...... میں نے اسے جست کر کے لوڈر پر چڑھنے دیا۔

وہ کسی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ چنگھاڑتا ہوا میرے اوپر آ پڑا۔ تاریکی میں مجھے بس اس کی آنکھیں ہی چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔ غالباً اس کے چہرے پر بھی کسی نے تھوڑا سا

رنگ مل دیا تھا۔ ہم اوپر نیچے لوڈر کے دھاتی فرش پر گرے۔ گرتے گرتے پانڈے نے میری ٹھوڑی پر زوردار ٹکر رسید کی اور اپنی طبع کے مطابق ایک غلیظ گالی دی...... اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا سرکاری پستول نکال کر میری کنپٹی پر رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے راستے میں ہی اس کی کلائی پکڑ لی اور پوری طاقت سے مروڑ کر جوابی ٹکر اس کے تھوبڑے پر رسید کی۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو میں نے اسے ٹانگوں پر اچھال کر لوڈر کی سائیڈ سے دے مارا۔ جب وہ گھوما تو اس کی کلائی بدستور میری گرفت میں تھی۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح سنائی دی۔ پانڈے کی کراہ کرب ناک تھی۔ پستول پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہو گیا۔ اس نے تلملا کر میرے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔ دیوان کی طرح ایک بار پھر مجھے اس کی بے پناہ جسمانی قوت کا اندازہ ہوا۔ یہ ایک گھونسا کسی بھی شخص کو ہوش و حواس سے بیگانہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ میری برداشت نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے اس مہلک گھونسے کو برداشت کرتے ہوئے جوابی وار کیا...... اور یہ کوئی معمولی وار نہیں تھا۔ یہ پانڈے جیسے خطرناک غنڈے اور قاتل کے شایانِ شان تھا۔ یہ اس دس انچ لمبے پھل والے شکاری چاقو کا وار تھا جو میں نے دو تین سیکنڈ پہلے اپنی پنڈلی میں سے کھینچا تھا۔ یہ چاقو پورے کا پورا پانڈے کے پہلو میں گیا۔ وہ بڑے دردناک انداز میں چلایا۔ اس کی آنکھیں تکلیف اور حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے بے رحمی سے چاقو کو اوپر کی طرف کھینچتے ہوئے باہر نکالا۔ پانڈے کا پیٹ کئی انچ تک پھٹ گیا۔

آخری کوشش کے طور پر اس نے میرا چاقو والا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اب اس کے فولادی جسم کی طاقت نصف بھی نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دوسرا وار اس کی ناف سے ذرا اوپر پیٹ میں کیا۔ چاقو پھر اس کی انتڑیوں میں چلا گیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور اس نے بائیں ہاتھ سے میری آنکھیں نوچنے کی کوشش کی۔ وہ نزع کے عالم میں داخل ہو گیا تھا...... بی ایس ایف کا درندہ صفت افسر، دہشت و بربریت کا نشان، حکم جی کی مونچھ کا بال...... اس تیز رفتار لوڈر کی تیرگی میں آناً فاناً اپنے سارے منافع بخش عہدوں سے ’’مستعفی‘‘ ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب وہ موت کے رُوبرو تھا۔ میں نے پے در پے تین اور وار اس کے پیٹ اور سینے پر کئے...... اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا...... اچانک لوڈر کو ایک شدید ترین جھٹکا لگا۔ ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ لوڈر کی بائیں جانب والی دیوار نے ایک مقناطیس کی طرح مجھے اپنے ساتھ چپکا لیا ہے۔ لوڈر الٹ رہا تھا۔ تب ایک خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی اور سب کچھ تہ و بالا ہو گیا۔ میں نے پانڈے کے جسم کو اچھل کر چھت سے ٹکراتے دیکھا۔ خود میں بھی

اسی طرح چھت سے ٹکرایا......تب کئی لڑھکنیاں کھا کر کسی نرم چیز پر گرا۔ میرے چاروں طرف نیم تاریکی تھی اور گرد وغبار تھا۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ لوڈر کسی گھر کی دیوار توڑ کر کسی کمرے میں گھسا ہے۔ جونہی میں گرا تھا، میرے کانوں سے کسی کے چلانے کی سُریلی آواز بھی ٹکرائی تھی۔ یہ آواز میرے نیچے سے بلند ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ میں ایک قالین پر گرا تھا اور میرے نیچے ایک جواں سال لڑکی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو ذرا ہاتھ پاؤں چلا کر میرے نیچے سے نکل جاتی مگر وہ اتنی وحشت زدہ تھی کہ مسلسل چلانے کے سوا کچھ بھی کر نہیں پا رہی تھی۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اس وقت میں نے عمران کو بھی سڑک کے کنارے سے اُٹھتے دیکھا۔ لوڈر ایک طرف اُلٹا پڑا تھا۔ اس کے شیشے چکنا چُور ہو چکے تھے، ہیڈ لائٹس ابھی تک روشن تھیں۔ جونہی میں پیچھے ہٹا، لڑکی اُٹھ کر کسی نامعلوم سمت میں بھاگ گئی۔ تب میں نے ایک فربہ اندام ہندو عورت کو بھی ملبے سے نکل کر بھاگتے اور تاریکی میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ میں نے نیم تاریکی میں دائیں بائیں ہاتھ چلایا اور خوش قسمتی سے اپنا ریوالور ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔

یہ دراصل سڑک کے بالکل کنارے پر ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ لوڈر اس کی بیرونی دیوار توڑتا ہوا اندر گھس گیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ چائے خانہ ایک ہندو بیوہ اور اس کی بیٹی کا تھا اور وہ بند چائے خانے کے اندر ہی سو رہی تھیں۔

''وہ آرہے ہیں؟'' عمران نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

راج بھون سے ہمارے پیچھے لگنے والی گھوڑا گاڑیاں سرپٹ بھاگی چلی آرہی تھیں۔

ہمارے پاس صرف چند سیکنڈ کا وقت تھا۔ ہم ملبے میں سے نکلے اور جس طرف رخ تھا، اسی طرف دوڑ نکلے۔ ہمارے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ عمران بھی اپنی ناکارہ رائفل راج بھون میں ہی چھوڑ آیا تھا۔

''پکڑو......پکڑو۔'' کئی آوازیں ہمارے کانوں سے ٹکرائیں۔

ہم نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے نہر کا چوبی پل پار کیا اور ایک آبادی میں گھس گئے۔ ہمارے عقب میں فائرنگ بھی ہوئی لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ ایک بھری پُری آبادی تھی لیکن اس وقت گلیاں سو رہی تھیں اور ہر طرف سناٹا تھا۔ ہم ایک طویل خم دار گلی میں دوڑتے چلے گئے۔ ہمارے عقب میں بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں تھیں۔

''مارے گئے۔'' عمران کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

آگے گلی بند تھی۔ ہم واپس پلٹے۔ وہ بڑے نازک لمحے تھے۔ عمران کے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔ اس نے دو تین قریبی دروازوں کو اپنے کندھے سے زوردار ضربیں لگائیں۔ جس تیسرے دروازے کو اس نے کندھے سے ضرب لگائی، اس کے اندر کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ ہم پلک جھپکتے میں اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں تاریکی تھی۔ غور سے دیکھنے پر ایک بڑا گملا نظر آیا۔ عمران نے اور میں نے گملا گھسیٹ کر دروازے کے سامنے کر دیا۔ یوں چٹخنی نہ ہونے کے باوجود دروازہ بند ہو گیا۔

کوئی بڑی عمر کا شخص زور سے کھانسا۔ کسی قریبی کمرے سے اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے بھیا؟''

تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ اُبھری، وہ ڈیوڑھی کی طرف آرہا تھا۔ میں نے دائیں جانب والے ایک دروازے کو دھکیلا، وہ کھل گیا۔ ہم ایک نیم گرم کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں لالٹین کی بہت مدھم روشنی میں ایک جواں سال لڑکی ریشمی بستر پر نظر آئی۔ یقیناً چند سیکنڈ پہلے وہ سو رہی تھی۔ اب آوازیں سن کر جاگ گئی تھی مگر ابھی پوری طرح جاگی بھی نہیں تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے حیرت سے آنکھیں کھولیں۔ اس سے پہلے کہ وہ چلاتی اور کسی کو مدد کے لئے بلاتی، میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کے ہونٹ پوری سختی سے بند کر دیئے تھے۔ وہ میری گرفت میں بس تڑپ پھڑک کر رہ گئی۔ جب میں نے اس کی نازک گردن پر اپنے بازو کا دباؤ بڑھایا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اگر وہ زیادہ مزاحمت کرے گی تو اس کی کوئی ہڈی چیخ جائے گی۔ وہ ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس دوران میں عمران کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر چکا تھا۔ پھر اس نے لالٹین بھی بجھا دی۔

''کون ہے بھیا۔'' گھر کے مالک کی بھرائی ہوئی آواز پھر اُبھری۔

جواب میں خاموشی تھی۔ وہ شخص ڈیوڑھی تک آیا۔ چند سیکنڈ تک سن گن لیتا رہا۔ غالباً تاریک ڈیوڑھی میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ واپس چلا گیا۔ عمران نے خوفناک پھل والا شکاری چاقو نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اگر شور مچاؤ گی تو ایک سیکنڈ میں اس چاقو سے شہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔ اگر چپ رہو گی تو وعدہ کرتا ہوں تمہیں خراش تک نہیں آئے گی...... ہاتھ تک نہیں لگائیں گے تمہیں۔''

دھیرے دھیرے اب ہماری آنکھیں کمرے میں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو رہی تھیں۔ یہ درمیانے سائز کا کمرا تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا بغلی دروازہ بھی نظر آرہا تھا۔ یہ کوئی اسٹور نما جگہ تھی۔ ایک طرف طاق میں مورتیاں وغیرہ سجی ہوئی تھیں۔ ہم ایک ہندو گھر میں

داخل ہوئے تھے۔

لڑکی ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سمجھدار ہے۔ صورتِ حال کو سمجھ گئی ہے اور ہمارے ساتھ، کم از کم وقتی طور پر تعاون کرنے کو تیار ہے۔ عمران نے چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھی اور میں نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ گھگیائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہم کو کچھ ناہیں کہنا...... جو جی چاہتا ہے یہاں سے لے لو......اور چلے جاؤ...... بھگوان کے لئے......'' اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''چلے جاتے ہیں...... لیکن تھوڑی دیر بعد...... اس سے پہلے اگر تم نے کوئی حرکت کی تو تمہارا جیون تو جائے گا ہی...... باقیوں کے لئے بھی بہت بُرا ہوگا۔''

''بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں، کچھ ناہیں بولوں گی۔''

''آہستہ بولو۔'' عمران پھنکارا۔

''بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں، کچھ ناہیں بولوں گی۔'' اس نے اتنی باریک آواز میں اپنے الفاظ دہرائے کہ ایسے گھمبیر موقع پر بھی صورتِ حال میں مزاح کی جھلک محسوس ہوئی۔

عمران نے اسے بازو سے پکڑا اور کہا۔ ''چلو...... اس چھوٹے کمرے میں چلو۔''

وہ پہلے تو جھجکی لیکن جب عمران نے تحکم سے کہا تو وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی ہمارے ساتھ چھوٹے دروازے میں داخل ہوگئی۔ میرے اندازے کے عین مطابق یہ ایک بالکل چھوٹا سا اسٹور روم تھا۔ عمران نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر جلائی۔ یہ اسٹور کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ ہلکی پھلکی گھریلو ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ لڑکی نے ہمارے جسموں پر سرکاری وردی دیکھی اور اس کا زرد چہرہ کچھ اور زرد ہوگیا۔ اس کی حیرت کی وجہ یہ بات بھی تھی کہ ہمارے چہرے رنگ سے لتھڑے ہوئے تھے۔ لوڈر الٹنے سے ہمارے جسم پر خراشیں بھی آئی تھیں۔ ایسی ہی ایک بڑی خراش عمران کے بازو پر تھی۔ وہاں سے جرسی پھٹ گئی تھی اور خون رِس رہا تھا۔ میری وردی پر پانڈے کے خون کے دھبے تھے۔

''تمہارا نام؟'' عمران نے پوچھا۔

''و...... وجنتی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''اس گھر میں تمہارے علاوہ اور کون کون ہے؟''

''میرے ماتا پتا اور چھوٹا بھائی جگدیش۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

اسی دوران میں باہر گلی سے شور شرابا بلند ہونے لگا۔ دروازے کھٹکھٹائے جا رہے تھے اور گرجتی برستی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

اب عمران کے ہاتھ میں شکاری چاقو کی جگہ ریوالور نظر آ رہا تھا۔ ایسا یقیناً اس نے وجنتی نامی اس لڑکی پر دباؤ ڈالنے کے لئے کیا تھا۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''دیکھو، کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ وہ جب تک یہاں آس پاس ہیں، ہم تمہارے گھر میں رہیں گے، اس کمرے میں۔ تم اپنے گھر والوں کو بھی ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔ اگر تم نے ہمیں چھپا لیا تو ہم وچن دیتے ہیں کہ تمہیں کچھ بھی کہے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''مم...... میں کسی کو کچھ ناہیں بتاؤں گی۔'' وہ ایک بار پھر گھگیائی۔

''اور تم سارا وقت ہماری آنکھوں کے سامنے رہو گی۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلو گی۔'' عمران نے ریوالور کو ہاتھ میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''ناہیں نکلوں گی۔ وچن دیوت ہوں، ناہیں نکلوں گی۔'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

''ہم یہاں اس اسٹور روم میں رہیں گے۔ تم اس ریوالور کے نشانے پر رہو گی...... اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ تم چالاکی دکھا رہی ہو تو میں گولی چلا دوں گا۔ ہم دو خون ابھی تھوڑی دیر پہلے کر چکے ہیں، تیسرا اور چوتھا کرنے میں بھی ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' عمران کے آخری الفاظ نے لڑکی پر خاطر خواہ اثر کیا اور وہ بالکل زرد نظر آنے لگی۔

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے پھر قدموں کی چاپ اُبھری۔ وجنتی کا پتا اب پھر ڈیوڑھی کی طرف جا رہا تھا۔ شاید اس نے بھی گلی سے اُبھرنے والا شور سن لیا تھا۔ ڈیوڑھی کی طرف والے دروازے کی نچلی درز سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اب بوڑھے کے ہاتھ میں لالٹین ہے۔ کچھ دیر بعد بوڑھے کے بڑبڑانے کی آوازیں آئیں۔ یقیناً اس نے دیکھ لیا تھا کہ بیرونی دروازے کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی ہے اور دروازے کو بند کرنے کے لئے اس کے آگے گملا رکھا گیا ہے۔

عمران نے تیز سرگوشی میں لڑکی سے کہا۔ ''دروازے کے آگے گملا ہم نے رکھا ہے۔ اگر تمہارا پتا پوچھے تو اس سے کہنا کہ یہ تم نے رکھا ہے کیونکہ دروازے کی چٹخنی خراب ہوگئی ہے۔''

لڑکی زود فہم تھی۔ فوراً ہی عمران کی بات سمجھ گئی۔ اتنے میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ''جی پتا جی۔'' لڑکی وجنتی نے نیند میں ڈوبی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''دروازے پر گملا تم نے رکھا تھا؟''

''ہاں پتا جی......کواڑ ناہیں لگ رہے تھے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' بڑی عمر کے شخص کی آواز آئی۔

اسی دوران میں دروازے کے عین سامنے کچھ لوگوں کے بولنے کی بھاری آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً یہ راج بھون کے گارڈز تھے۔ وجنتی کے پتا نے دروازہ کھولا۔ ایک کرخت آواز نے پوچھا۔ ''تم لوگن خیریت سے ہو؟''

''جج......جی ہاں۔''

''دو خطرناک بندے یہاں کہیں آس پاس چھپے ہوئے ہیں۔ پوری طرح چوکس رہو۔ اگر کوئی شک ہو تو فوراً اطلاع کرو۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وجنتی کے پتا نے پریشان آواز میں کہا۔

بھاری آوازوں والے افراد آگے چلے گئے۔ وجنتی کے پتا نے دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد وجنتی کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ عمران نے وجنتی کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ وجنتی نے بڑے کمرے میں جا کر دروازہ کھولا۔ ہم چھوٹے سے اسٹور میں موجود رہے۔ وجنتی کا پتا لالٹین تھامے اندر آ گیا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا پچاس ساٹھ سالہ شخص تھا۔ اس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا اور گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ ہراساں لہجے میں بولا۔ ''محلے میں کوئی ڈکیت گھس آئے ہیں۔ سپاہی آئے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے ہیں، سب کو ہوشیار رہنا چاہئے۔''

اتنے میں باہر کے کسی کمرے سے کسی عورت کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ''کیا بات ہے جگدیش کے پتا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ ناہیں......سو جاؤ۔'' بوڑھے نے وہیں سے کہا۔

اپنے لب و لہجے سے یہ شخص ذرا سخت مزاج دکھائی دیتا تھا۔ اس نے وجنتی سے کہا۔ ''آ جاؤ......تم ہمارے کمرے میں آ جاؤ۔''

''نن......ناہیں پتا جی......کوئی بات ناہیں۔'' وجنتی بولی۔

''اچھا پھر دروازہ اندر سے بند کر لو۔'' اس کے پتا نے کہا۔

وجنتی نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ باہر ڈیوڑھی میں کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ وجنتی کا پتا ہتھوڑی کے ساتھ، اکھڑی ہوئی چٹخنی کو پھر سے اس کی جگہ پر جما رہا تھا۔ گلی میں گاہے بگاہے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجنے لگتی تھیں اور اہلکاروں کی بلند آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس علاقے کو گھیرے ہوئے ہیں۔

دس پندرہ منٹ بعد قدرے سکون ہو گیا۔ وجنتی کا پتا چٹخنی مرمت کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ گلی میں بھی نسبتاً خاموشی تھی، ہاں کچھ دوری سے مدھم آوازیں ضرور سنائی دیتی تھیں۔ غالباً یہ آوازیں جائے حادثہ سے آ رہی تھیں۔ یعنی جس جگہ لوڈر الٹا تھا۔

عمران کی ہدایت پر لڑکی وجنتی نے لالٹین پھر سے روشن کر دی تاہم اس کی لو اتنی دھیمی رکھی کہ کمرے میں ہلکی سی روشنی ہی پھیل سکی۔ عمران نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔ ''لوڈر پر کون چڑھا تھا؟''

''وہی پانڈے تھا اور کون؟''

''مار دیا؟''

''پتا نہیں۔ زخمی تو اچھا خاصا ہوا ہے۔''

''تم کچھ زیادہ ہی کھلتے جا رہے ہو۔'' عمران نے ناراضی سے کہا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ مصنوعی ناراضی ہے اور اندر سے وہ خوش ہے۔

''اور تم نے لوڈر کی قلابازی کیوں لگوائی؟'' میں نے پوچھا۔

''آگے دو بندے آ گئے تھے، انہیں بچانے کی کوشش کی۔'' عمران نے مختصر جواب دیا۔

وجنتی انگریزی نہیں جانتی تھی۔ وہ منہ کھولے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ بہرحال، وہ اب پہلے سے کچھ کم خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ بھی تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آ گئی۔

میں نے وجنتی سے پوچھا۔ ''تمہارا پتا کیا کام کرتا ہے؟''

''وہ لکڑی کا کام کرت ہیں۔''

''لکڑی کا کیا کام؟'' عمران نے ذرا تلخی سے وضاحت چاہی۔

''بندوقوں کے دستے وغیرہ بناوت ہیں۔ اس سے پہلے......'' وہ رک گئی۔

''اس سے پہلے......کیا؟''

''پہلے وہ راج بھون کی فوج میں تھے۔ دو سال پہلے ہی ان کی ملازمت پوری ہوئی ہے۔ ملازمت ختم ہونے پر راج بھون سے پیسا ملتا ہے، اسی سے پتا جی نے اپنا کاروبار شروع کیا ہے۔''

گھر کی ظاہری حالت اچھی تھی۔ عمران نے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ حکم جی رحم دل واقع ہوا ہے۔ ملازموں کو کافی پیسا دیتا ہے۔''

''آپ بھی تو فوجی ہو۔ کیا آپ کو پتا ناہیں؟'' وہ ہمیں ذہین نظروں سے سرتا پا دیکھ کر

بولی۔

عمران نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اگر ہم کہیں کہ ہم فوجی نہیں ہیں تو پھر؟''

''مم...... مجھے پہلے ہی لگ رہا ہے جی کہ...... آپ وہ ناہیں ہو جو نظر آوت ہو۔''

یہ بات تمہارے دماغ میں کیوں آئی؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس لئے کہ آپ کو راج بھون کے فوجی ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''ہم باغی فوجی بھی تو ہو سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''پر آپ کی بولی اور طرح کی ہے۔ آپ کے پاس جو پپ...... پستول ہیں، وہ بھی اور طرح کے ہیں۔''

''بچی سیانی ہے بھئی۔'' عمران نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

میں نے اسے پھر دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اگر تم ہمارے کہنے پر چلو گی تو ہم کسی کو بغیر کوئی نقصان پہنچائے یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم سے ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ خود کو پُرسکون رکھو۔''

''مم...... مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا لیکن اب کم لگ رہا ہے۔'' وہ صاف گوئی کے انداز میں بولی۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لئے کہ آپ حکم جی کے سپاہی ناہیں ہو۔''

''تو تم حکم کے سپاہیوں سے ڈرتی ہو؟''

''ہر کوئی ڈرتا ہے۔''

''لیکن مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی خاص معاملہ ہے۔'' عمران نے کھوجنے والے لہجے میں پوچھا۔

''نن...... ناہیں۔ ایسی تو کوئی بات ناہیں۔''

''اگر ہے تو بتادو۔ ہوسکتا ہے ہم تمہاری کوئی مدد کرسکیں۔''

وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم ایک آدھ دن کے لئے تمہارے اس اسٹور میں محفوظ ہیں؟''

''پتا جی اور جگدیش کی تو خیر ہے...... لیکن ماتا جی کسی کام سے اسٹور میں آ سکت ہیں۔''

''تو پھر؟''

''یا پھر میں دروازے کو تالا لگادوں گی اور کہوں گی کہ چابی گم ہوگئی ہے۔'' وہ روانی میں کہہ گئی۔

''کیا ہم تمہیں شکلوں سے اتنے ہی بے وقوف نظر آتے ہیں کہ تمہیں تالا لگانے دیں گے؟'' عمران نے کہا۔

وہ سٹپٹا گئی۔ ''نن...... ناہیں۔ میرا یہ مطلب ناہیں تھا۔ میں...... میں ماتا جی کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لوں گی۔''

اب سپیدۂ سحر نمودار ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''اگر تم تھوڑی دیر کے لئے سونا چاہی ہو تو بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ ہم یہاں اسٹور میں رہیں گے۔''

وہ تذبذب میں تھی۔ کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ تو گئی لیکن اس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کیں۔ عمران کی جادوئی شخصیت کی وجہ سے اس کا خوف کافی حد تک کم ہو گیا تھا مگر اب وہ اتنی بھی بے خوف نہیں ہوئی تھی کہ ہماری موجودگی میں آرام کرنے کے بارے میں سوچتی۔

ہم اسٹور میں موجود رہے۔ یہاں دیگر چیزوں کے ساتھ بندوقوں کے کئی مکمل اور نامکمل دستے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک دیوار پر ایک پرانی تصویر بھی لگی تھی جس میں وجنتی کا پتا فوجی وردی میں تھا اور باقاعدہ حکم جی کی قدم بوسی کر رہا تھا۔ حکم نے کسی مذہبی پیشوا کی طرح اس کے سر پر اپنے ہاتھ کا سایہ کیا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ستیش کے پتا آنجہانی رام پرشاد کی طرح یہ شخص بھی ایک کٹر مذہبی شخص ہے۔ ایک عیاش حکمران سے اس طرح کی عقیدت دقیانوسیت ہی کہلا سکتی تھی۔

میں اور عمران بیٹھے رہے، ہم دونوں کے ذہنوں میں راج بھون میں پیش آنے والے ہنگامہ خیز واقعات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے...... میں نے بالکونی کی طرف دو برسٹ چلائے تھے۔ تاہم ان برسٹوں کا رزلٹ مجھے معلوم نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد کھڑکیوں سے مدھم روشنی نظر آنے لگی۔ ایک پُر ہنگامہ شب کی صبح ہونے والی تھی۔ تاہم اس صبح میں بھی اَن گنت اندیشے تھے۔ وجنتی کا پتا جاگ گیا تھا...... اور صحن میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا...... پھر وہ بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے وجنتی سے پوچھا تو اس نے مدھم آواز میں بتایا کہ پتا جی اس وقت دودھ لینے جاوت ہیں۔ پھر وہ بولی۔ ''اگر ماتا جی یہاں آ گئیں اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ابھی تک یہاں کیوں بیٹھی ہوں اور باہر نکل کر منہ ہاتھ کیوں ناہیں دھوتی؟''

''لحاف اوڑھ کر لیٹی رہو۔ ان سے کہنا میری طبیعت خراب ہے۔''

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ ریوالور مسلسل عمران کے ہاتھ میں تھا اور وہ وجنتی کو باور کرا رہا تھا کہ کسی بھی ایسی ویسی حرکت کا نتیجہ خطرناک نکلے گا۔

وجنتی کے پتا نے گھر واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس نے زور زور سے وجنتی کے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ وجنتی نے لحاف سے نکل کر دروازہ کھولا۔ وجنتی کے پتا نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے بیٹا! رات کو راج بھون میں زبردست گولی چلی ہے۔ بڑے ڈاکٹر اسٹیل کے بھائی صاحب مارے گئے ہیں۔ ایک دو بندے زخمی بھی ہوئے ہیں۔ چھوٹا پانڈے بھی بہت زیادہ زخمی ہے۔ کہوت ہیں کہ وہ بچ ناہیں پائے گا۔“

”ہائے رام۔“ وجنتی نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

اسی دوران میں وجنتی کی فربہ اندام ماتا بھی اندر آ گئی۔ اس نے بھی اپنے پتی کی بات سن لی تھی اور اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ ”ہائے بھگوان! یہ کیا کلجگ ہوا ہے، کیا واقعی بڑے ڈاکٹر صاحب......؟“

”ہاں بھاگوان! وہ دو راکھشس تھے۔ پتا ناہیں کس طرح راج بھون میں گھس گئے۔ نہ صرف گھس گئے بلکہ اس جگہ تک بھی پہنچ گئے جہاں حکم جی رانیوں کے ساتھ کھڑے تھے اور بالک کے جنم کی خوشی میں دان کر رہے تھے۔ ان دونوں نے فوجی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس سرکاری رائفلیں بھی تھیں۔ انہی رائفلوں سے انہوں نے فائرنگ کی ہے۔“

”وشواس ناہیں ہو رہا......“ وجنتی کی ماں نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”وہاں تو اتنا کڑا پہرا ہووت ہے۔ چڑیا بھی پر ناہیں مارتی۔“

”کچھ لوگن کہتے ہیں کہ وہ دو یا تین بندے تھے اور راج بھون کے پچھواڑے جھیل کی طرف سے اندر گھسے ہیں۔ وہاں جھیل کے کنارے بھی ایک سپاہی کی ہتھیا ہوئی ہے اور ایک سخت گھائل ہوا ہے۔ راج بھون کی باہری دیوار کے اوپر سے بھی دو سینکوں کو نیچے گرا کر مارا گیا ہے...... باہر ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی ہے۔“

”یہ کون ہو سکت ہیں؟“ فربہ اندام عورت نے کہا۔

”یہ مختار راجپوت کی لونڈیا کے ساتھی بھی ہو سکت ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حمیدہ کے دیور کو پھانسی سے بچانے کے لئے کوئی کوشش کرنا چاہت ہوں۔“

وجنتی کی ماں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”ہائے رام! اب کیا ہووے گا؟ حالات دن بدن بگڑتے چلے جاوت ہیں۔ ہم جیسے لوگن تو کسی گنتی میں ناہیں آتے، اب تو راج بھون بھی

ان سے بچا ہوا ناہیں ہے۔“

”میں نے تو سنا ہے کہ وہ دونوں بدمعاش رات کو ہماری گلی تک بھی پہنچے ہیں......اور کیا پتا کہ اب تک یہاں کسی گھر میں ہی چھپے ہوئے ہوں۔“

وجنتی کی ماں رام رام کرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وجنتی کے پتا نے وجنتی سے کہا۔ ”آج بالکل گھر سے قدم باہر ناہیں نکالنا۔ تم کل کہہ رہی تھیں کہ بازار جانا ہے۔“

”ناہیں پتا جی...... ویسے بھی طبیعت ذرا خراب ہے۔ ٹھنڈ لگ رہی ہے۔“

”بس ٹھیک ہے۔ شانتی سے لیٹی رہو۔ آج سردی ہے بھی بہت۔“

سخت نقوش والا ادھیڑ عمر شخص باہر چلا گیا۔ ہم یہ سارا منظر اسٹور روم کی گہری تاریکی میں سے دیکھتے رہے تھے۔ عمران نے اسٹور کا دروازہ بند کر دیا تھا تاہم اس میں ایک دو انچ کی جھری رہنے دی تھی۔

کچھ دیر بعد وجنتی کی ماں پھر آئی اور بیٹی کا حال چال پوچھنے لگی۔ وہ لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ اس نے ماں سے کہہ دیا کہ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا اس لئے وہ ناشتا بھی نہیں کرے گی۔ اس کی ماں باتیں کرتی کرتی اسٹور روم کی طرف آئی۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ شاید اس سارے ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے لگا ہے لیکن پھر وہ دہلیز سے ہو کر واپس چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وجنتی کا چھوٹا بھائی جگدیش ناشتا کر کے اسکول چلا گیا اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہی وجنتی کا پتا بھی باہر نکل گیا۔ اب گھر میں وجنتی اور اس کی ادھیڑ عمر والدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ والدہ نے ایک بار کمرے میں جھانکا اور یہ دیکھ کر کہ بیٹی لحاف اوڑھے سو رہی ہے، سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی گئی۔ غالباً وہاں سے صفائی ستھرائی کرنا تھی۔ اس کے جانے کے بعد عمران کی ہدایت پر وجنتی نے اندر سے دروازے کو کنڈی لگا لی۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر دبا دبا ہراس نظر آ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ”تو آپ دونوں نے بڑے ڈاکٹر کے بھائی کو مارا ہے اور پانڈے صاحب کو بھی؟“

”اس کے علاوہ دو تین گارڈز کو بھی جہنم واصل کیا ہے۔ کیا تم نے اپنے پتا سے سنا نہیں؟“

”ہائے رام...... یہ تو بہت بڑا جرم ہے۔ راج بھون والے آپ لوگن کو زمین کی ساتویں تہ سے بھی نکال لیویں گے۔“ اس کے چہرے پر خوف کم اور پریشانی زیادہ تھی۔

”کیا تم ہمارے لئے پریشان ہو؟“ میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے صاف سیدھے انداز میں کہا۔

"کیوں؟ ہم نے تو تم پر ریوالور تانا ہوا ہے...... تمہیں یرغمال بنایا ہوا ہے؟"

"میں جانت ہوں۔ مجھ سے آپ کی کوئی دشمنی ناہیں۔ آپ حکم جی کے سپاہیوں سے بچنا چاہت ہیں اور واقعی آپ کو بچنا چاہیئے۔ یہ بہت کٹھور لوگ ہیں۔ بہت ہی پتھر دل......"

"اچھا، ابھی تمہارے پتا نے کسی کی پھانسی کا ذکر کیا ہے، وہ کون ہے؟" عمران نے سوال کیا۔

"ہے ایک بدقسمت۔"

"کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"اسے تو ناہیں لیکن اس کی بھابی کو جانت ہوں...... وہ...... وہ......" وجنتی کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ اس کی آواز میں گہرا درد اُتر آیا تھا۔

"لگتا ہے کہ تم ہم سے کچھ چھپا رہی ہو۔ تم بتاؤ، ہوسکتا ہے کہ ہم تمہاری مدد کرسکیں یا کوئی مفید مشورہ ہی دے سکیں۔" عمران نے اپنے مخصوص پُراثر لہجے میں کہا۔

ایک دم وجنتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب اس کے چہرے پر ہمارے حوالے سے خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ ہم حکم اور جارج وغیرہ کے دشمن ہیں۔ شاید اس ناتے سے وہ ہمیں اپنا ہمدرد سمجھنے لگی تھی۔

"بتاؤ وجنتی...... تم ہمیں بتا کر کسی طرح کا نقصان نہیں اُٹھاؤ گی، ہوسکتا ہے کہ کوئی فائدہ ہو جائے۔" عمران نے شفقت آمیز محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

وہ سسک کر بولی۔ "آپ لوگن کون ہیں؟ آپ نے ابھی تک مجھے اپنے بارے میں کچھ ناہیں بتایا۔"

"اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ شاید تم مزید الجھ جاؤ۔ بس اتنا جان لو کہ ہم انسان دوست ہیں اور حکم جیسے انسان دشمنوں کے ساتھ ٹکر لینے کے لئے کفن باندھ کر نکلے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ ہم تمہیں وچن دیتے ہیں کہ جو تم کہوگی، وہ صرف اور صرف ہم تک ہی رہے گا۔ ہم وچن پر جان دینے والے لوگ ہیں۔"

چند منٹ کی مزید کشمکش کے بعد وجنتی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "کل جس بندے کو راج بھون کے سامنے چوک میں سرِعام پھانسی دی جارہی ہے، اس کی بھابی حمیدہ میری گہری سہیلی ہے۔ وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی ہے لیکن ہم نے بچپن اور لڑکپن اکٹھے ہی گزارا ہے۔ آج کل

میری یہ سہیلی بڑی مشکل میں ہے...... بھگوان اس پر اپنی کرپا کرے۔"

"کیا ہوا ہے؟" عمران نے بات آگے بڑھانے کے لئے کہا۔

"حمیدہ خوبصورت ہے۔ ایک سال پہلے اس کا پتی فوت ہوگیا تھا۔ اب وہ راج بھون میں ہے...... اور جارج گورا صاحب کے پاس ہے۔ وہ اس سے بیاہ کرنا چاہت ہے...... زبردستی اسے پتنی بنانے پر تلا ہوا ہے۔"

"کیا علاقے کے لوگ اور خاص طور سے مسلمان اندھے بہرے ہیں...... کیا انہیں یہ زبردستی نظر نہیں آ رہی؟"

"آ تو سب کو رہی ہے جی...... پر اصل میں...... حمیدہ کے دیور سے بھی ایک دوش ہوا ہے۔ پتا ناہیں یہ دوش ہے بھی یا ناہیں لیکن بہت سے لوگن اسے دوش ہی کہتے ہیں۔ کچھ مہینے پہلے حمیدہ کے دیور نے اپنے کچھ مسلمان ساتھیوں کے ساتھ مل کر گورا صاحب کی بہن ماریا کو اغوا کرلیا تھا۔ وہ اسے نل پانی کی طرف لے جانا چاہت تھے۔ انہوں نے اسے ایک سرنگ میں رکھا تھا اور وہاں اس کی انگلی بھی کاٹ ڈالی تھی۔ بعض لوگ یہ الزام بھی لگاوت ہیں کہ...... ان لوگن نے ماریا کے ساتھ...... ماریا کے ساتھ...... بُرا سلوک کیا تھا۔ بعد میں ماریا کسی طرح جان بچا کر ان لوگن کی قید سے بھاگ نکلی تھی......"

عمران اور میں وجنتی کی باتیں سن کر سناٹے میں رہ گئے۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "جارج گورا صاحب نے اسی کا بدلہ لیتے ہوئے حمیدہ کو گھر سے اُٹھوایا ہے اور راج بھون میں رکھا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ اگر آنکھ کے بدلے آنکھ کے قانون پر عمل کیا جاوے تو پھر یہ قانون بھی بنایا جاسکتا ہے کہ اغوا و زیادتی کے بدلے اغوا اور زیادتی ہو لیکن وہ ایسا ناہیں کر رہے۔ انہوں نے حمیدہ کو اغوا ناہیں کیا، بس اپنے پاس اپنی حفاظت میں رکھا ہے۔ اگر حمیدہ کا کوئی پیارا اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہت ہے تو وہ اپنے بازو کے زور پر ایسا کرسکت ہے۔"

"بازو کے زور پر؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں جی...... آپ کو یہ بات کچھ عجیب سی لگے گی لیکن ہمارے اس راجواڑے میں ایسی اور بھی بہت سی عجیب باتیں ہیں۔ ہم بچپن سے بہت کچھ دیکھتے اور سنتے آئے ہیں۔"

"اچھا، ایک منٹ۔" میں نے اسے ٹوکا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ پھانسی کس کو دی جارہی ہے؟ میرا مطلب ہے اس کا نام؟"

"اس کا نام اسحاق ہے جی۔ وہ بڑا دیور ہے حمیدہ کا۔"

میرا دماغ سنسنا اُٹھا۔ اسحاق میرا، انور خاں اور چوہان کا ساتھی تھا۔ ہم نے مل کر بہت سی مصیبتیں اُٹھائی تھیں۔ نل پانی کی طرف سفر کرتے ہوئے بے شمار سختیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ میں جب سلطانہ کی مدد کے لئے چوری چھپے نل پانی سے نکلا تا تو اسحاق اس وقت انور اور چوہان وغیرہ کے ساتھ دیوان میں ہی تھا۔ وہ کب وہاں سے نکلا، کب یہاں پہنچا اور اب کن حالات میں تھا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی اور اب یہ وجنتی نامی لڑکی اسحاق کے حوالے سے ایک خوفناک بات بتا رہی تھی۔

عمران بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ''کیا یہ تمہارے ساتھیوں میں سے ہے؟'' اس نے انگریزی میں پوچھا۔

''ہاں، یہ وہی ہے جس نے ماریا کی انگلی کاٹی تھی۔'' میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا پھر وجنتی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''کیا اسحاق نام کے اس بندے کو پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے؟''

''ناہیں جی...... وہ خود آیا تھا...... مجبور ہو کر۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ گورا صاحب نے کیا اعلان کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ حمیدہ کا جو دعوے دار اسے چھڑانا چاہت ہے، وہ آئے اور اسے چھڑا کر لے جائے۔ بس اسے گورا صاحب کے ساتھ سامبر کرنا پڑے گا...... اور یہ پورے انصاف کے ساتھ ہو گا۔''

''یہ سامبر کیا ہے؟''

''یہ بھی سویمبر کی طرح ایک رسم ہے جی۔ سویمبر میں تو کسی ناری کا چاہنے والا ہی اس کے لئے لڑتا ہے لیکن سامبر میں ناری کا کوئی بھی ہمدرد اس کو کسی کے قبضے سے نکالنے کے لئے کوشش کر سکت ہے۔ اس کا پتا، بھائی یا بیٹا وغیرہ بھی......''

میں نے پوچھا۔ ''تو تمہارا مطلب ہے کہ یہ جو اسحاق نام کا بندہ یہاں پکڑا گیا ہے، وہ اپنی بھابی حمیدہ کو چھڑانے کے لئے یہاں آیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''اسے دھوکے سے پکڑ لیا گیا؟''

''ناہیں جی...... یہ جارج گورا صاحب ایسے معاملوں میں دھوکا ناہیں کرت ہے۔ وہ جو کہتا ہے، وہی ہووت ہے۔ سامبر کی اس رسم کے مطابق اگر کوئی بندہ کسی سے لڑنا چاہت ہے تو پھر ایک کا مقابلہ ایک سے ہووت ہے۔ باہر سے کوئی لڑنے والوں کی مدد ناہیں کر سکتا اور

گورا صاحب بھی ایسا ہی کرت ہے۔ اس کو اپنے اوپر بہت وشواس ہے جی۔ اب پتا ناہیں کہ اس کو بہادری یا جواں مردی کہنا چاہئے یا ناہیں، پر سچ یہی ہے کہ گورا صاحب ایسے کاموں کے لئے خود کو خطرے میں ڈالنے کے لئے ہر سمے تیار ہووت ہے۔ وہ اتنا بڑا آدمی ہو کر بھی اپنے ساتھ سامبر کرنے والے کسی بھی منش کو پورا پورا موقع دیوت ہے۔''

''تو اس نے اسحاق کے ساتھ لڑائی کی؟''

''جی ہاں، اس نے اعلان کروایا تھا کہ اگر اس مہینے کی دس تاریخ تک کوئی سامبر کے لئے آنا چاہت ہے تو آ جاوے۔ نو تاریخ کو حمیدہ کا دیور یہاں پہنچ گیا تھا۔ سنا ہے کہ گورا صاحب نے اس سے صاف کہا تھا کہ وہ اس کی بہن ماریا کے اغوا کا ذمے دار ہے لیکن اگر وہ سامبر جیت گیا تو وہ اسے کچھ ناہیں کہے گا بلکہ وہ اپنی بھاوج کو بھی یہاں سے لے جا سکے گا۔ دوسری صورت میں اس کو پوری پوری سزا ملے گی اور یہ سزا موت سے کم ناہیں ہووے گی۔ اسحاق کو یہ شرطیں ماننا پڑی تھیں......''

''تو وہ ہار گیا؟'' عمران نے پوچھا۔

وجنتی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک اُٹھے تھے۔

''کس قسم کا مقابلہ ہوا تھا؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''مجھے اس بارے میں کچھ جانکاری ناہیں۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ ہار گیا تھا۔ گورا صاحب سے جیتنا کوئی آسان کام ناہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ سخت جان ہے۔ پھر لڑنے والے پر لڑنے سے پہلے ہی اس کا بہت رعب پڑ جاتا ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس طرح کے بہت سے مقابلے کر چکا ہے اور کبھی ہارا ناہیں۔ وہ تلوار بازی بھی کر لیوت ہے، خالی ہاتھوں سے بھی لڑتا ہے۔ کبھی کسی کے سامنے چاقو یا پستول پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اسے اس سے پہلے اُٹھا کر دکھائے اور وار کرے......''

میری آنکھوں کے سامنے ماضی قریب کا وہ دردناک نقشہ گھوم گیا۔ جارج نے اس رات میرے سامنے بھی تو پستول پھینکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھندسی پھیلنے لگی۔ میں نے خود کو بمشکل سنبھالا اور وجنتی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یعنی اسحاق ہار گیا ہے اور اب اسے پھانسی دی جا رہی ہے؟''

وجنتی نے گردن جھکا کر ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو اس کی جھولی میں گرے۔ وہ سسک کر بولی۔ ''اس پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ کل پِتا جی بتا رہے تھے کہ اس کے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ اس طرح سے اس

سے گورا صاحب کی بہن ماریا کی انگلی کا بدلہ لیا گیا ہے۔کل یہاں چھٹی کا دن ہے۔کل راج بھون کے سامنے چوک میں اس کی ہتھیا کر دی جاوے گی۔''

''اور تمہاری سہیلی حمیدہ؟'' عمران نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

''وہ جارج گورا صاحب کے پاس ہی ہے۔''

''ابھی اس سے بیاہ نہیں کیا گیا؟''

''ناہیں...... گورا صاحب کہتے ہیں کہ وہ ابھی اس کے وارثوں کو ایک اور موقع دینا چاہت ہیں۔''

یہ سب کچھ دل دہلا دینے والا تھا۔خاص طور سے میرے رگ و پے میں آگ سی بہنے لگی تھی۔سارے زخم تازہ ہو گئے تھے۔

وجنتی اپنی سہیلی کے لئے مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔عمران نے اس سے کچھ مزید تفصیلات پوچھیں۔کہیں کہیں میں نے بھی سوالات کئے۔آخر میں عمران نے بڑی نرمی سے وجنتی کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اپنے مخصوص پُر اثر لہجے میں بولا۔''وجنتی! ہم اس پوزیشن میں تو نہیں کہ تم سے کوئی وعدہ کر سکیں لیکن اتنی تسلی ضرور دیتے ہیں کہ ہم ابھی یہاں زرگاں میں ہی ہیں۔اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکا، ضرور کریں گے۔''

''مم...... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔کہیں اس معاملے میں میرا نام آ گیا تو ہمارے پریوار کے لئے بڑی مصیبت ہو جاوے گی۔حکم جی کے کچھ لوگن کو میں پہلے ہی بہت بُری لگ رہی ہوں۔''

''وہ کس طرح؟''

''جس دن حکم جی کے سپاہی حمیدہ کو اس کے گھر سے لینے کے لئے آئے، میں بھی اس کے پاس ہی تھی۔وہ حمیدہ کو زبردستی لے جانے لگے تو میں نے اور اس کی ساس نے انہیں روکا۔میں سپاہیوں سے جھگڑ پڑی۔میں نے ایک کی وردی پھاڑ دی۔انہوں نے مجھے دھکے مارے اور دھمکیاں دیں۔اب اگر پھر کہیں میرا نام اس معاملے میں آ گیا تو وہ لوگن میرے پیچھے پڑ جاویں گے۔''

عمران نے پھر محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔''اس بارے میں بےفکر رہو۔ہم نے تم سے کہا ہے نا کہ ہم وچن توڑنے والے نہیں، جان دینے والے لوگ ہیں۔''

''میں بھی آپ کو وچن دیوت ہوں کہ اس گھر میں جو کچھ ہو سکا آپ کے لئے کروں گی۔''

میں نے عمران کی طرف اور عمران نے میری طرف دیکھا۔وجنتی کے لہجے میں سچائی تھی۔وہ بہت حد تک دلیر اور سمجھدار بھی تھی۔اس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''ٹھیک ہے وجنتی! اگر تم چاہو تو ضرورت پڑنے پر اس کمرے سے باہر جا سکتی ہو...... ہم امید کرتے ہیں کہ تم ہمارے وشواس پر پوری اُترو گی۔'' اس کے ساتھ ہی عمران نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی تو ہم جلدی سے تاریک اسٹور روم میں چلے گئے۔وجنتی کی فربہ اندام والدہ کمرے کی طرف آ رہی تھی۔اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وجنتی نے دروازے کی چٹخنی اُتار دی اور واپس آ کر بستر پر لیٹ گئی۔وجنتی کی والدہ نے اس کا احوال دریافت کیا پھر اس سے کہا کہ وہ منہ ہاتھ دھو لے اور تھوڑا سا کھا پی لے۔

اس مرتبہ وجنتی نے انکار نہیں کیا اور ماں کے ساتھ باہر چلی گئی۔

ہم نے وجنتی کو باہر بھیج کر بے شک رسک لیا تھا لیکن ہم جس راستے پر چلے تھے، اس پر خطرات، اندیشوں اور خدشوں سے واسطہ تو قدم قدم پر پڑتا تھا۔ہم اسٹور روم کے اندر ہی رہے۔ہم نے اپنے رنگین چہرے گیلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر اچھی طرح صاف کر لئے تھے۔عمران کے بازو پر گہری خراش آئی تھی۔اس نے وہیں اسٹور روم سے ایک پٹی لے کر بازو پر باندھ لی تھی۔درحقیقت کل شام سے اب تک ہم نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔بھاگ دوڑ بھی بہت ہوئی تھی، نہایت سرد پانی میں تیرنا پڑا تا...... اب بھوک اور نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔بھوک کا تھوڑا سا ذکر عمران نے وجنتی سے بھی کیا تھا۔اس بات کی امید تھی کہ شاید وہ کچھ کھانے کو لے آئے۔اسے واپس آنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔تاخیر سے پریشانی تو تھی لیکن نہ جانے کیوں یقین سا تھا کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔

کل رات کے واقعات ایک بار پھر ہماری نگاہوں میں گھومنے لگے۔کئی سال پہلے جب لاہور میں اس طرح کی ہنگامہ آرائیاں ہوئی تھیں تو میں نے خود کو عمران کے ساتھ ایک عضو معطل کی طرح محسوس کیا تھا...... لیکن اب ایسا نہیں تھا۔میں نے ہر جگہ عمران کے شانے سے شانہ ملائے رکھا تھا اور ایک دو موقعوں کے سوا کہیں بھی اس سے پیچھے نہیں رہا تھا۔

میں نے کہا۔''لاہور میں، مَیں نے تمہاری زبردست ڈرائیونگ دیکھی تھی۔کل مجھے توقع نہیں تھی کہ تم لوڈر کو الٹا دو گے۔''

وہ مسکرایا۔''اپنی ڈرائیوری کو بے داغ رکھنے کے لئے میں دو بے گناہوں کی جان لے لیتا تو تم نے ہی مجھے لعنت ملامت شروع کر دینی تھی...... ویسے اس موقع پر کام تم نے بھی کمال

کا کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں تو تمہیں پرہیزگار سمجھتا تھا، تم بڑی تیز نظر رکھتے ہو۔"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"لوڈرا لٹنے کے بعد گرے بھی تو ایک جوان لڑکی پر...... حالانکہ وہاں گرنے کے لئے کئی اور جگہیں بھی تھیں اور اگر کسی نرم نرم جگہ پر ہی گرنا تھا تو لڑکی کی ادھیڑ عمر والدہ بھی تو وہیں تھی۔ مجھے وہ محاورہ یاد آ رہا ہے کہ بنیا اگر گرتا ہے تو کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے۔"

"چلو اگر پھر ایسا موقع آیا تو تم اپنی من پسند جگہ پر گر لینا۔ میں بعد میں گر لوں گا۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"ہاں ہاں بھئی! آہستہ آہستہ زبان لگ رہی ہے تمہیں اور مجھے لگ رہا ہے کہ اندر سے تم کافی کھوچل بھی ہو۔ سلطانہ بھابی کے سامنے تو یونہی سائیں چپ شاہ بنے رہتے ہو۔ بہرحال، کچھ بھی ہے میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ سچی کھری بات کرنے سے باز نہیں رہوں گا۔ میں کنوارا ہوں اور تم شادی شدہ ہو۔ میری موجودگی میں تم نے ایک جوان لڑکی کے اوپر گر کر میرا استحقاق مجروح کیا ہے۔ کچھ مک مکا کر لو ورنہ میں اس معاملے کو اوپر تک لے جاؤں گا۔"

"کیا کرو گے؟"

"سب کچھ سلطانہ بھابی کو بتاؤں گا۔ فساد کرا دوں گا۔ چھ گنجے دانشور اسٹوڈیو میں بلاؤں گا۔ تین تمہاری طرف سے، تین سلطانہ بھابی کی طرف سے۔ انہیں اتنا لڑاؤں گا...... کہ باقی سارے قومی اور بین الاقوامی معاملات اس "اہم موضوع" کے سامنے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔"

"لیکن یہ سب تو تب ہو گا جب ہم یہاں سے زندہ نکل سکیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، یہ مسئلہ تو بہرحال ہے۔" اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔

اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہم الرٹ ہو گئے۔ عمران نے ریوالور پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اندر آنے والی جنتی ہی تھی۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ وہ کسی رومال وغیرہ میں کوئی چیز چھپا کر لائے گی لیکن وہ تو باقاعدہ ٹرے اُٹھائے چلی آ رہی تھی۔ اس میں پراٹھے اور انڈوں کا نمکین آملیٹ نظر آ رہا تھا۔

وہ اسٹور میں چلی آئی۔ "تمہاری ماں جی نے نہیں دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھا ہے بلکہ انہوں نے ہی بنا کر دیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ایک بات کہنا چاہت ہوں۔"

ہم دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے ماں جی کو سب بتا دیا ہے۔ آپ نے بالکل بھی فکر نا ہیں کرنا۔ میرے اور ماں کے بیچ کوئی بھی بات چھپی نا ہیں ہوتی۔ وہ وہی کریں گی جو میں کہوں گی۔"

"لو کر لو تماشا۔" عمران نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں جی؟" جنتی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں لیکن کہیں ماں جی کی وجہ سے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"اگر میں ماں جی کو نہ بتاتی، تب گڑبڑ ہونے کا ڈر تھا۔ اب ہم اس معاملے کو سنبھال لیویں گے۔" جنتی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھر میں صرف اپنے والد سے ڈرتی ہے اور اسے اب یہ خوف ہے کہ کہیں اس کے گھر میں ہونے والی خطرناک گڑبڑ کا پتا اس کے والد کو نہ لگ جائے۔ ہمیں یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ راج بھون سے ریٹائرمنٹ کے باوجود جنتی کے پتا کی ہمدردیاں راج بھون اور حکم جی سے ہیں اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جو راج بھون میں ہونے والے ہر کام میں کوئی نہ کوئی اچھائی تلاش کر ہی لیتے ہیں۔

جنتی نے کہا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں اپنی ماتا کو ان سے ملانے کے لئے یہاں لائے گی۔

کھانے کے دوران میں ہم بالکل خاموش رہے۔ جنتی کی آمد سے پہلے عمران نے کچھ ہلکی پھلکی باتیں کر کے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی تاہم میں جانتا تھا کہ میری طرح اس کا دماغ بھی مسلسل مصیبت زدہ اسحاق اور اس کی بھابی حمیدہ میں الجھا ہوا ہے۔

میں نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے عمران کہ اس کمینے جارج نے اسحاق کی بھاوج کو ایک چارے کے طور پر استعمال کیا ہے...... اور شاید وہ آئندہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے...... اس نے اس عورت کے خیرخواہوں کو مزید قسمت آزمانے کا موقع دیا ہے۔"

جنتی بولی۔ "میرا وچار ہے کہ آپ ٹھیک کہوت ہو۔ میں نے سنا ہے کہ اسحاق کے ایک اور دوست نے گورا صاحب کے سامنے آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا نام انور خاں ہے...... ہم سب جانت ہیں کہ وہ بہت دلیر شخص ہے۔ زرگاں کے مسلمان اسے بہت مانتے ہیں۔ کچھ ماہ پہلے جب مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ جیل کے بجائے گورا

صاحب کے گھر میں ہے تو علاقے کے مسلمان ایک دم بھڑک اُٹھے تھے۔ انہوں نے گورا صاحب کے گھر پر چڑھائی کر دی تھی۔ اس وقت انور خاں نے بہت ہمت دکھائی تھی۔ اب وہ کچھ عرصے سے نل پانی میں ہے۔ سنا ہے کہ وہ گورا صاحب کی سامبر رچنا میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کئی لوگن کا خیال ہے کہ شاید انور خاں وہ اکیلا شخص ہے جس کی گورا صاحب کے مقابلے میں جیتنے کی تھوڑی بہت امید کی جاسکت ہے۔"

یہ نئی اطلاع بھی سنسنی خیز تھی۔ وجنتی کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ جس سلطانہ کی بات کر رہی ہے، میں اس کا شوہر ہوں اور انور خاں میرا قریبی ساتھی ہے۔ میں انور خاں کے بارے میں عمران کو بہت کچھ بتا چکا تھا۔ وجنتی سے انور کا ذکر سن کر عمران کے چہرے پر بھی سنسنی نظر آنے لگی۔

ہماری غیر موجودگی میں یہ جارج گورا نے انوکھا کھیل کھیلا تھا۔ اس کی کمینگی اور عیاری کھل کر سامنے آرہی تھی۔ اس نے واقعی حمیدہ کو چارے کے طور پر استعمال کر کے اسحاق کی غیرت کو جگایا اور اسے یہاں بلانے میں کامیاب رہا تھا۔ اب وہ اسے موت کے گھاٹ اُتارنے والا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ انور خاں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا......

جو کچھ بھی تھا لیکن ایک بات تسلیم کرنی پڑتی تھی۔ سیکڑوں جنگجو افراد کا کمان دار ہونے کے باوجود جارج گورا بوقتِ ضرورت خود میدان میں اُترتا تھا اور اپنے مقابل کو نیچا دکھاتا تھا۔ اس نفسیاتی برتری کے بعد وہ اپنی من مانی کرنے کے لئے آزاد ہو جاتا تھا۔ جو رہی سہی کسر تھی، وہ حکم جی کی معاونت سے پوری ہو جاتی تھی۔

میرے سینے میں ایک عجیب سی آگ دہکنے لگی۔ مجھے لگا کہ ایک طویل عرصے سے میں جس "ٹاکرے" کا انتظار کر رہا تھا، اس کے لئے اسٹیج خود بخود تیار ہو رہا ہے۔ میرے پٹھے تن گئے۔ سینے کی دھڑکن میں ایک نامانوس اضافہ ہو گیا۔

وجنتی کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "کیا آپ دونوں میری سہیلی کے لئے کچھ کر سکت ہیں؟"

عمران نے کہا۔ "سہیلی سے پہلے تو اس کے دیور کی بات کرنی چاہئے جس کے بارے میں تم کہہ رہی ہو کہ اسے کل پھانسی یا سُولی دی جانے والی ہے......"

"اس کے لئے اب کیا ہو سکتا ہے؟" وہ بے حد مایوسی سے بولی۔ "اس کے لئے کچھ کرنے کا سمے اب گزر چکا ہے لیکن حمیدہ کے بچاؤ کے لئے تو ابھی کافی سمے ہے۔ شاید کسی

بڑی سفارش سے کوئی فائدہ ہو جائے...... یا پھر اسے راج بھون سے نکالنے کی ہی کوئی کوشش کی جاسکے۔" بات کرتے ہوئے وجنتی کے ہونٹ سوکھ رہے تھے۔

○......❖......○

وہ سرد رات ہم نے اسی تاریک اسٹور روم میں گزاری۔ وجنتی کی ماتا واقعی اس کے کہے کے مطابق چلتی تھی۔ شام کا کھانا ہمارے لئے وہی لے کر آئی تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اور ہاتھ جوڑ کر بس ایک ہی بات کہی اور وہ یہ کہ اگر یہاں سے نکلنے کے بعد خدانخواستہ ہم پکڑے جائیں تو اس گھر کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ وجنتی کی طرح ہم نے اس کی ماتا کو بھی یہ حلف دیا تھا۔ وجنتی کی ماتا سے ہمیں ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی......اس نے بتایا کہ پانڈے کی جان نہیں بچائی جاسکی اور آج سہ پہر شاہی اسپتال میں اس کا دیہانت ہو گیا ہے۔

اب رات کی اس تیرگی میں میرے ذہن میں بار بار وہ مناظر گھوم رہے تھے جب تیز رفتاری سے بھاگتی لوڈر میں، مَیں نے پانڈے کو جان لیوا طور پر گھائل کیا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں پانڈے جیسے موذی کو جہنم واصل کر چکا ہوں۔ اس نے دیوان میں بم بلاسٹ کر کے بڑی سفاکی سے بے گناہ لوگوں کے چیتھڑے اُڑائے تھے۔ آج ان لوگوں کو انصاف مل گیا تھا۔

رات کو گلی میں مسلسل گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی رہیں۔ گاہے بگاہے کچھ للکارے بھی سنائی دیتے رہے۔ پتا چلتا تھا کہ ہماری تلاش جاری ہے......صبح اپنے پتا اور چھوٹے بھائی کے گھر سے چلے جانے کے بعد وجنتی ہمارے لئے ناشتا لے کر آئی......اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ آج سہ پہر حمیدہ کے دیور اسحاق کو پھانسی دی جارہی ہے۔ وہ پھانسی کا لفظ استعمال کر رہی تھی لیکن ہمیں معلوم تھا کہ یہاں پھانسی کے بجائے سُولی چڑھایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بغاوت کے جرم میں جن افراد کو جیل کے اندر سزائے موت دی گئی، انہیں بھی سُولی پر لٹکایا گیا تھا۔ اس کی لرزہ خیز تفصیلات ہمیں دوسرے لوگوں سے پتا چلی تھیں۔ وجنتی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کل رات ڈاکٹر اسٹیل کے بھائی کا کریا کرم ہو گیا ہے اور ابھی تھوڑی دیر بعد پانڈے کی آخری رسوم بھی ادا کی جائیں گی۔ پورے زرگاں میں سوگ کی فضا ہے۔

جب ہم دہی کلچے اور چنے کا ناشتا کر رہے تھے، وجنتی نے پوچھا۔ "دوپہر کو آپ کیا کھائیں گے؟"

"جو مرضی بنالو۔" عمران نے کہا۔

"آپ...... ابھی...... یہاں رہیں گے نا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں...... اسی لئے تو کہا ہے جو مرضی بنالو۔" عمران نے جواب دیا۔

وہ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش، بے یقینی، اطمینان، سب کچھ گھل مل گیا تھا۔ "اپنی بہن کو بہت زیادہ تکلیف دی ہے ہم نے...... اب اور نہیں دیں گے...... اور جو کچھ کہا ہے، وہ بھی یاد رکھیں گے...... حمیدہ کے لئے جو کچھ ہو سکا ضرور کریں گے۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تم بھی کچھ کہو۔"

"سب کچھ تو تم خود کہہ دیتے ہو۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ بولی۔ "باہر آپ کے لئے گھمبیر خطرہ ہوگا یا پھر...... آپ آج کی رات اور رک جاویں......"

"نہیں، تمہارا بہت امتحان لے لیا ہے ہم نے...... تمہارا بہت بہت دھنیواد۔" عمران نے کہا۔

"اور تمہارا یہ احسان یاد بھی رکھیں گے۔" میں نے اضافہ کیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ عمران نے کہا۔ "بس ایک آخری چھوٹی سی تکلیف تمہیں دینی ہے۔ کسی طرح ہمارے لئے دو جوڑوں کا انتظام کر دو تا کہ ہم یہ منحوس وردیاں اُتار سکیں۔"

......اور اب یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ہم وجنتی کے گھر سے باہر آ چکے تھے۔ سردی عروج پر تھی۔ باہر آ کر ہمیں پتا چلا کہ گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور تیز ہوا بھی چل رہی ہے...... ہم مقامی لباس دھوتی کُرتے میں تھے۔ سروں پر رنگ دار پگڑیاں تھیں اور ہم نے گرم چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ ہمارا اسلحہ ان چادروں میں چھپا ہوا تھا۔ سردی کے سبب مقامی لوگ اکثر اپنی پگڑیوں کو منڈاسے کی صورت باندھ لیتے تھے، اس سے چہرہ بھی کافی حد تک چھپ جاتا تھا۔ آج تو پھر یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے اپنی پگڑیوں اور گرم چادروں کو اپنا آپ چھپانے کے لئے استعمال کیا اور تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے اس بہت بڑے ہجوم میں داخل ہو گئے جو راج بھون سے کچھ فاصلے پر ایک چوک میں جمع تھا اور بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں سے لوگ ٹولیوں کی شکل میں نکلتے تھے اور اس جم غفیر میں شامل ہو جاتے تھے۔ راج بھون کے ایک عظیم الشان دروازے کے باہر ایک پتھریلا چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر باوردی افراد چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کے تین عدد بہت بڑے بڑے

کراس بھی یہاں نصب تھے۔ یہ وہ سُولیاں تھیں جن پر حکم کے معتوبین کو لٹکایا جاتا تھا۔

ہم ہجوم میں گھستے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ یہ وہی انداز تھا جو ہم نے دو دن پہلے راج بھون میں اختیار کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج یہ سب کچھ راج بھون کی چار دیواری سے باہر ہو رہا تھا اور ہجوم میں امنگ ترنگ کی جگہ غم و غصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ لوگ ایک شخص کی اذیت ناک موت دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ غصیلے نعرے لگاتے ہوئے وہ مکے لہرا رہے تھے۔

چبوترے کے اوپر ہلچل میں اضافہ ہو گیا۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی ہم دیکھ سکتے تھے۔ کچھ افسران ٹائپ لوگ چبوترے پر دکھائی دیئے۔ ان کی پگڑیاں اونچی اور بھاری تھیں۔ تیز یخ بستہ ہوا میں ان پگڑیوں کے شملے لہرا رہے تھے...... چبوترے کے گرد بے شمار مسلح محافظ اور سپاہی موجود تھے۔ کچھ اونچی جگہوں پر بھی محافظوں کی پوزیشنیں تھیں۔ غالباً یہ اضافی حفاظتی انتظامات پرسوں رات پیش آنے والے واقعات کے بعد کئے گئے تھے۔ شاید وجنتی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب اس آخری وقت میں اسحاق کے لئے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی ہم کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ کیا کرنا چاہتے تھے؟ یہ خود ہمارے ذہنوں میں بھی واضح نہیں تھا۔

ایک طویل انتظار کے بعد بالآخر اس تماشے کا کلائمیکس شروع ہو گیا۔ دور چبوترے پر ہم نے ایک زرد رنگ چہرہ دیکھا۔ یہ شخص سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور اسے دو افراد نے سہارا دے رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں نے فلک شگاف نعرے لگائے اور ہجوم میں اضطراب کی بلند لہریں پیدا ہوئیں۔

"یہ ہے اسحاق؟" عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ہاں۔" درد و کرب کے سبب میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

وہ ہزاروں افراد میں گھرا ہوا تھا۔ یہاں کوئی اس کا دوست نہیں تھا، سب دشمن تھے اور اس کے خون کے پیاسے تھے۔ ہم ہجوم میں داخل ہو کے آگے بڑھتے رہے۔ آخر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے مسلح محافظوں کا دُہرا حصار شروع ہوتا تھا۔ اگر ہم اس جگہ تھوڑی سی ہلچل پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو آگے بڑھنے اور کچھ کر گزرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ کامیابی کا امکان بہت کم تھا لیکن ہم چھوٹے سے چھوٹے امکان کو بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ہم حتی الامکان حد تک آگے پہنچ گئے۔ کینوس کا وہ سفید بیگ ابھی تک عمران کے کندھے سے جھول رہا تھا جس میں فالتو ایمونیشن رکھا جاتا ہے لیکن اس وقت بیگ میں ایمونیشن نہیں تھا۔ ایک زہریلا سانپ تھا جسے ہم نے زرگاں کے راستے میں جنگل سے پکڑا تھا

اور اپنا ہم سفر بنا لیا تھا۔ میں اور عمران اس سانپ کو یہاں ہجوم میں چھوڑنے اور خوف و ہراس پیدا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ عمران نے گرم چادر کے اندر اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ وہ کینوس بیگ کھولنے جا رہا تھا لیکن اچانک ایسا ہوا کہ عمران کے اندر کوئی روشنی سی بجھ گئی۔ چادر کے اندر اس نے اپنے ہاتھ بھی روک لئے۔

"کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہ دیکھو۔" اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

محافظوں کی قطاروں کے درمیان تھوڑی سی جگہ خالی نظر آ رہی تھی۔ یہاں سے خاردار تاروں کے قریباً پانچ فٹ اونچے بڑے بڑے چھلے نظر آئے۔ چھلوں سے بنی ہوئی اس ناقابلِ عبور باڑ نے چبوترے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ "اوہ گاڈ!" میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"ہم یہ کسی صورت پار نہیں کر سکیں گے۔" عمران کی آواز میں مایوسی تھی۔

بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہم نے اس ڈھلتی سہ پہر میں اس چبوترے کے سامنے...... ان سیکڑوں لوگوں کے درمیان...... بڑی وضاحت سے محسوس کیا۔

ایک دم ہمیں لگا کہ ہم ہار گئے ہیں۔ کم از کم آج کا دن کسی طرح بھی ہمارے حق میں نہیں ہے۔ وقت بہت کم تھا اور ہم کسی بھی طرح ان لاتعداد محافظوں اور اس مخصوص خاردار باڑ سے گزر کر اسحاق تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اب ہماری حیثیت بھی تماشائیوں سے زیادہ نہیں رہی تھی اور تماشا تقریباً شروع ہو چکا تھا۔ یہاں قریباً چودہ پندرہ ہزار کا مجمع تھا اور ہر نگاہ حکم اور جارج کے گناہ گار پر جمی تھی۔ وہ غالباً کسی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور خود کو جلادوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اتنی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا، اس کا ایک ہاتھ سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ یقیناً یہ وہی ہاتھ تھا جس کی انگلیاں پرسوں کاٹ دی گئی تھیں۔ اسحاق کے چہرے پر بھی مار پیٹ کے گہرے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اسے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ دو تین افراد نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ لکڑی کے ایک کراس کو آٹھ دس افراد نے مل کر چبوترے پر لٹایا پھر اس کراس پر اسحاق کو لٹا دیا گیا۔ ایک پہلوان نما جلاد کے ہاتھ میں ایک بڑا ہتھوڑا نظر آیا۔ تب وہ کارروائی شروع ہوئی جو میرے سینے میں دل کو ٹکڑوں میں بدل گئی۔ یہ سب کچھ دیکھنے اور سہنے کے لئے لوہے کا دل درکار تھا۔

اسحاق کی ہتھیلیوں اور ٹانگوں پر ٹخنوں کے قریب لمبی آہنی کیلیں ٹھونکی جانے لگیں ہم کافی دوری پر ہونے کے باوجود اس کی کرب ناک آوازیں سن سکتے تھے۔

اس وقت میں نے سوچا کہ اگر ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے تو وہاں آئے ہی نہ ہوتے اور یقیناً عمران بھی ایسا سوچ رہا تھا۔ ہم ہزاروں پُر جوش تماشائیوں کے درمیان ساکت کھڑے تھے۔ پھر درجن بھر افراد نے مل کر لکڑی کے کراس کو کھڑا کر دیا۔ اسحاق اس صلیب پر ٹنگا ہوا تھا۔ چلا چلا کر وہ شاید نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں سے بہتے ہوئے خون کی سرخی ہم اتنی دور سے بھی دیکھ سکتے تھے۔

وہ ہمارے گروپ کا سب سے جوشیلا رکن تھا۔ تھوڑا سا غصیلا بھی تھا لیکن اس کا غصہ بے وجہ نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس کے غصے کی جڑیں اس کے ماضی سے پیوست تھیں۔ اس کی جوان بہن پر مقامی عورتوں کے بدنام رسیا (جارج) نے رال ٹپکائی تھی...... جارج کے ہاتھوں سے محفوظ رہنے کے لئے اس لڑکی نے زہر کھایا تھا۔ اس کے پھیپھڑے بند ہو گئے تھے اور وہ سانس کو ترستے ترستے راہیِ عدم ہو گئی تھی۔ اب اس کے خاندان کی ایک اور عورت ایسی ہی صورتِ حال کا شکار ہوئی تھی اور وہ اسے بچانے کی کوشش کرتے کرتے اس سُولی تک آ پہنچا تھا۔

پہلوان نما جلاد آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی ہتھوڑا نظر آیا جس سے اس نے اسحاق کے جسم میں میخیں ٹھونکی تھیں۔ اس مرتبہ جلاد نے اس ہتھوڑے کو ایک اور طرح کی سفاکی کے لئے استعمال کیا۔ ہتھوڑے کی زوردار ضرب اسحاق کی پنڈلی پر لگائی گئی۔ یقیناً پنڈلی کی ہڈی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہو گی۔ یہاں کوئی لاؤڈ اسپیکر نہیں لگا ہوا تھا، پھر بھی اسحاق کے چلانے کی دردناک آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ایسا ہی سلوک اسحاق کی دوسری پنڈلی سے کیا گیا۔ پھر بازوؤں کی باری آئی۔ ہر بار جب ضرب لگتی تھی اور مرتا ہوا اسحاق چلاتا تھا تو جواب میں جوشیلے نعرے بلند ہوتے تھے۔ کبھی کبھی انسان کتنا سنگ دل ہو جاتا ہے...... ہجوم کی نفسیات اس سنگ دلی کو انتہا تک پہنچا دیتی ہے۔

ہمارے لئے اب وہاں مزید کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے دم توڑتے اسحاق کو دیکھا...... اور دل ہی دل میں کہا۔ "اے دوست! ہم نے وہ سب دیکھا جو ان دشمنوں کے درمیان تجھ پر بیتا۔ ہاں، ہم نے سب دیکھا...... اور سب ہمارے دل پر نقش ہوا اور ہم وعدہ کرتے ہیں تجھ سے کہ ہم تیری تکلیف اور بے بسی کو بھولیں گے نہیں۔ تیرے خون کا حساب لیں گے...... اور اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش بھی کریں گے جس کی خاطر تُو نے اس اجنبی جگہ پر...... بے مہر لوگوں کے درمیان...... بے بسی کے عالم میں تڑپ تڑپ کر جان دی

ہے......"

اب ایک دوسرا جلاد آگے بڑھ رہا تھا، اسے اسحاق کے کولہوں کی ہڈیاں توڑنا تھیں لیکن کھیل تو شاید اس سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ سُولی پر ٹنگا ہوا اسحاق تقریباً بے جان نظر آ رہا تھا۔ عمران نے میرا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ "چلو آؤ تابش......" اس کی آواز میں انتہا درجے کا دکھ تھا۔

ہم ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے واپس چل دیئے۔ جب ہم ایک ایک قدم کھسکتے ہوئے نسبتاً کشادہ جگہ پر پہنچے، مشتعل ہجوم نے فلک شگاف نعرے لگا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا...... پتا چلا کہ مصلوب کے سینے میں خنجر گاڑ کر اس کا قصہ تمام کر دیا گیا ہے۔

ہم نکلتے چلے گئے۔ ہمارے سینوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ چوک سے باہر نکل کر ہم چھوٹی گلیوں میں داخل ہو گئے۔ سرد ہوا کی کاٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ اچانک ہم ٹھٹک گئے۔ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آ رہا تھا۔ آنے جانے والوں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ایک سخت گیر افسر ایک راہ گیر پر گرج برس رہا تھا۔ اس نے اسے کوٹ اُتار کر تلاشی دینے کا حکم دیا پھر کسی بات پر مشتعل ہو کر اسے تھپڑ دے مارا۔ میں اس افسر کو دیکھ کر سکتہ زدہ رہ گیا...... نگاہ پر بھروسا نہیں ہوا۔ کیا مُردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں؟ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔

O......❖......O

ہمارے اور رنجیت کے درمیان کم و بیش پچاس میٹر کا فاصلہ تھا۔ رنجیت کا دھیان ہماری طرف نہیں تھا۔ میں نے عمران کا بازو دبایا۔ ہم رک گئے اور پھر جلدی سے ایک بغلی گلی میں مڑ گئے۔

میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟" عمران نے چلتے چلتے پوچھا۔

"تم نے اس افسر کو دیکھا جو ناکے پر تلاشی لے رہا تھا؟"

"ہاں...... وہی بینگن کی رنگت والا......"

"وہ رنجیت پانڈے ہے۔"

"کون سا پانڈے؟"

"رنجیت پانڈے...... جسے پرسوں میں نے چاقو مارے تھے...... اور جس کے بارے میں وجنتی نے بھی بتایا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔"

"تو یہ کوئی اور ہوگا۔ اس کا ہم شکل...... اس کا پارٹ ٹو۔" عمران نے ہلکے پھلکے انداز

میں کہا۔

"نہیں یار! وہ سو فیصد وہی ہے۔ میں نے اسے دھیان سے دیکھا ہے۔ اس کی آواز سنی ہے۔ یہ وہی بدبخت ہے۔" میری آواز کانپ رہی تھی۔

"تو پھر جسے تم نے اس روز لوڈر میں مارا، وہ کوئی اور ہوگا۔ وہاں تو بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔"

میری آنکھوں کے سامنے لوڈر کے تہلکہ خیز مناظر گھومنے لگے۔ وہ دوڑ کر لوڈر پر چڑھ آیا تھا اور آتے ساتھ ہی مجھ پر جھپٹ پڑا تھا۔ وہاں اندھیرا تھا...... اور شاید اس کے چہرے پر کچھ رنگ بھی ملا ہوا تھا۔ میں سناٹے میں رہ گیا...... تو کیا میں اب تک اس غلط فہمی کا شکار رہا ہوں کہ میں نے رنجیت پانڈے کو مار دیا ہے؟

ذہن میں بہت سے سوال اُبھر رہے تھے لیکن ابھی ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ ابھی ہمیں کسی سے ملنا تھا...... بلکہ مجھے کسی سے ملنا تھا اور اس ملاقات کا پروگرام ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ ہمارا رخ زرگاں کے عظیم الشان پگوڈا کی طرف تھا۔ میری معلومات کے مطابق میڈم صفورا اسی پگوڈا میں تھی اور مجھے گروسو بھاش سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ اب اسے پگوڈا میں کچھ آزادیاں حاصل ہو گئی ہیں اور وہ پگوڈا میں آنے والے سفید فام لوگوں سے راہ و رسم بھی بڑھا رہی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میڈم صفورا جارج گورا تک پہنچنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔ اس نے خود بھی تو کہا تھا کہ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور یہاں راجواڑے میں ہمارا فائدہ نقصان ایک ہے لیکن میڈم صفورا سے ملنے میں ایک گھمبیر مسئلہ بھی تھا اور وہ یہ کہ عمران میرے ساتھ تھا۔ پچھلی ملاقات میں صفورا نے عمران کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ مجھے ابھی تک یاد تھے۔ وہ عمران کو مسلسل شیطان اور قاتل جیسے القابات سے نوازتی رہی تھی۔ اس نے کہا تھا...... اس کی بہن نادیہ کا قاتل ہے اور وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

بے شک عمران کے حوالے سے اس کا رویہ بڑا سخت تھا لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی پچھلے تین چار برس میں میڈم صفورا کے غم و غصے میں خاطر خواہ کمی بھی واقع ہوئی تھی۔ حالات کے شکنجے میں جکڑے جانے کے بعد اس کے دل میں نرمی پیدا ہوئی تھی اور اس کے مزاج کے چڑھے ہوئے دریا کو ہموار انداز میں بہنا آ گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں اچھے طریقے سے اس کے ساتھ بات کرتا اور اسے یہ سمجھاتا کہ موجودہ حالات میں عمران ہمارا کس قدر مددگار ثابت ہو سکتا ہے تو وہ اس کے بارے میں بھی نرم رویہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتی۔ ہمارا پروگرام

یہی تھا کہ میں اکیلا پگوڈا میں جاؤں اور عمران باہر کہیں مناسب جگہ پر میرا انتظار کرے گا۔

شام کے سائے لمبے ہو کر جھٹ پٹے میں اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ ہوا تیز تھی اور یخ بستہ ٹھنڈ، شام کے شانہ بہ شانہ زرگاں کے گلی کوچوں میں اُتر رہی تھی۔ ہم نے مقامی انداز میں اپنے چہرے پگڑیوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ اسحاق کی موت کا بے پناہ غم اور پانڈے کی دید کی زبردست حیرت سینے میں چھپائے ہم ندی کی طرف بڑھتے رہے۔ یہ مٹیالے پانی والی وہی ندی تھی جو راج بھون کی دیواروں کو چھوتے ہوئے گزرتی تھی۔ اس کے کنارے تفریحی باغ بنے ہوئے تھے۔ اچھے موسم میں یہاں شام کے وقت یقیناً اہلِ زرگاں کی بھیڑ ہوتی ہوگی لیکن اس نہایت سرد شام میں بس اِکا دُکا لوگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جانب ایک قہوہ خانہ نظر آ رہا تھا۔ یہ نیم گرم جگہ بیٹھنے اور انتظار کرنے کے لئے مناسب تھی۔ عمران قہوہ خانے میں چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہیں اندازاً کتنا وقت لے گا؟“

”یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جلدی بھی آ سکتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں رات گئے تک انتظار کرنا پڑے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں قہوہ خانے میں یا اس کے آس پاس ہی ملوں گا۔“

عمران سے رخصت ہو کر میں پگوڈا کی طرف بڑھ گیا۔ وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک باغ کے درختوں کے عقب سے پگوڈا کی مخروطی چھت کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں تنگ گلیوں سے گزر کر آگے بڑھتا رہا۔ راج بھون کے سامنے خونی تماشا دیکھ کر واپس آنے والوں کی ٹولیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر لوٹ رہے تھے۔

جلد ہی میں پگوڈا کی وسیع و عریض سیڑھیوں کے سامنے تھا۔ اس سرد شام میں یہاں بھی کم کم لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ گردوپیش کو دیکھ کر میری نگاہوں میں کئی بھولے بسرے مناظر تازہ ہو گئے۔ مجھے اور سلطانہ کو جب نل پانی سے پکڑ کر زرگاں لایا گیا تو میں سب سے پہلے اسی بودھ مندر میں آیا تھا۔ یہاں میری حیثیت ایک خدمت گار قیدی کی سی تھی۔ ایک بار مجھے انہی سیڑھیوں پر الٹا لٹا کر بید بھی مارے گئے تھے۔ اب بھی ان سیڑھیوں پر ایک درمیانی عمر کا شخص اوندھا پڑا سسک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اسے بیدزنی کی سزا دی گئی ہے۔ ایک طرف دو تین کوڑھی افراد پھٹے پرانے کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ گیروا کپڑوں والے بھکشو اندر باہر آ جا رہے تھے۔ عام لوگ بھی سیڑھیاں اُترتے چڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جوتے اُتارے اور اسی طرح پگڑی لپیٹے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے وہ کوٹھڑی نظر آئی جو میرا مسکن

تھی اور پھر ہمیش یاد آیا۔ وہ جواں سال بھکشو جو ہمارا ہم سفر بنا تھا اور نل پانی کے راستے میں ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا تھا۔

صفورا کو یہاں کورتی کہا جاتا تھا۔ میں نے پگوڈا کے وسیع و عریض احاطے میں اس امید پر نگاہ دوڑائی کہ شاید کہیں کورتی یعنی صفورا گھومتی پھرتی دکھائی دے جائے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نہایت ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلتا، مٹھ کی طرف بڑھا۔ صفورا کی رہائش اسی مٹھ (مدرسے) کی طرف تھی۔ نوجوان بھکشوؤں کی ایک ٹولی تھالیوں میں پھول سجائے پگوڈا کے اندرونی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ اندر سے ڈھول بجنے کی مدھم آواز باہر آ رہی تھی۔ مٹھ کے عین سامنے برآمدے میں مجھے ایک بوڑھا شخص بیٹھا نظر آیا۔ اس نے کمبل لپیٹ رکھا تھا اور ماحول کی لَے پر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ میں نے اس شخص کو یہاں پہلے بھی دیکھا تھا۔ یہ نابینا تھا۔ میں سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔

میں نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ ”بابا جی! میں کورتی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

بوڑھے نے اپنا بے نور آنکھوں والا چہرہ میری طرف پھیرا اور قدرے حیرت سے بولا۔ ”کون ہو تم؟“

”میرا نام دلجیت ہے جی۔ فتح پور سے آیا ہوں۔ پچھلی بار جب میں آیا تھا تو کورتی نے مجھ سے انگلیوں کی خارش کی دوا منگوائی تھی......“

”لیکن وہ تو یہاں سے چلی گئی ہے......“ بوڑھا روانی سے بولا۔

”کہاں؟“ میں نے بھی ترت پوچھا۔

”لال بھون میں......“

”لال بھون میں؟“

”ہاں، وہ گوری چمڑی والے لے گئے ہیں اسے۔ وہاں بڑی موجیں ہیں اس کی۔ پر وہ بدھا کی گناہ گار ہے۔ وقتی طور پر سکھ شانتی حاصل بھی کر لیوے گی تو انجام بُرا ہی ہونا ہے......“

شاید میں کچھ دیر مزید اس بوڑھے کے پاس بیٹھتا اور اسے کریدنے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں دور سے دو منڈے ہوئے سروں والے بھکشو بوڑھے کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ میں اپنی بات مختصر کر کے بوڑھے کے پاس سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

لال بھون کا نام میں نے پہلے نہیں سنا تھا۔ تاہم بوڑھے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی مشہور عمارت رہی ہوگی۔ میں اس کا کھوج لگا سکتا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ پگوڈا کے وسیع و عریض احاطے سے باہر نکل کر میں نے

جس پہلے راہ گیر سے لال بھون کے بارے میں پوچھا، اس نے انگلی سے اشارہ کر کے کچھ فاصلے پر ایک سرخی مائل عمارت کی نشان دہی کر دی۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہو گا۔ اب شہر کی روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ گھوڑا گاڑیوں اور چھکڑوں پر بھی لیمپ روشن ہو گئے تھے۔ گلیوں کی رہی سہی رونق بھی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں لال بھون کے سامنے کھڑا تھا۔ پرانی طرزِ تعمیر کی یہ کافی وسیع عمارت تھی۔ یہاں بھی جنریٹرز کی موجودگی کا پتا چلتا تھا۔ گیٹ کے پاس برقی قمقمے روشن تھے اور اندر ہی کچھ کھڑکیوں میں برقی روشنی نظر آ رہی تھی۔

میں ہر خطرے سے بے نیاز لال بھون کی سرخی مائل عمارت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میری گرم چادر کے نیچے بھرا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور اور شکاری چاقو موجود تھا۔ جونہی میں گیٹ کے سامنے پہنچا، ایک باوردی پاسبان سامنے آیا۔ اس کی رنگین پگڑی کا شملہ دو فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ سخت سردی کے سبب اس کے نتھنوں سے بھاپ خارج ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے مجھے سر تا پا گھور کر پوچھا۔

''مجھے کورتی صاحبہ سے ملنا ہے۔ فتح پور سے آیا ہوں۔ وہ مجھے جانت ہیں۔''

''کون کورتی؟'' نہایت کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

ایک دم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میڈم صفورا کے لئے کورتی کا لقب پگوڈا میں استعمال کیا جاتا تھا اور یہ کوئی اچھا لقب نہیں تھا۔ اس کا مطلب شاید گناہ گار عورت تھی۔ اب صفورا پگوڈا میں نہیں تھی۔ اس پر کچھ غیر مقامی لوگوں کی نظرِ کرم ہوئی تھی اور وہ اب اس عالی شان عمارت تھی۔

میں نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پاسبان سے کہا۔ ''میں اس خاتون صاحبہ سے ملنا چاہت ہوں جو پاکستانی ہیں اور اس سے پہلے پگوڈا میں سیوا کرت تھیں......''

''تم میڈم صفورا جی کی بات کرت ہو؟'' پاسبان نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''لیکن تم ہو کون اور کہاں سے آئے ہو؟ اور سب سے پہلے یہ چادر اُتار کر ایک طرف رکھو۔'' پاسبان کا انداز سخت ہوتا جا رہا تھا۔

اسی دوران میں دو اور محافظ نما شخص بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ مسلح تھے۔ میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میڈم مجھے بڑی اچھی طرح جانت ہیں۔ آپ بس ان تک میرا پیغام پہنچا دیں۔ ان کے آنے سے پہلے میں آپ کو کچھ ناہیں بتاؤں گا اور اگر آپ لوگن زبردستی پوچھنے کی کوشش کریں گے تو میڈم بہت ناراض ہوں گی۔''

''ان کی راضی اور ناراضی کی پروانہ کرو تم...... یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم یہ چادر اور پگڑی اتار دو......چلو شاباش، جلدی کرو۔''

''تم اپنے ساتھ ساتھ میڈم جی کا بھی نقصان کر رہے ہو۔'' میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

ہمارے درمیان تکرار شروع ہو گئی لیکن اس سے پہلے کہ یہ تکرار زیادہ سنگین شکل اختیار کرتی اور مجھے زبردستی عمارت میں گھسنا پڑتا، ایک شان دار گھوڑا گاڑی گیٹ کی طرف آتی دکھائی دی۔ دو گھوڑوں والی اس چمکیلی گاڑی کو دیکھتے ہی محافظ تن کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سلام کے انداز میں اپنے ہاتھ اپنے ماتھوں سے لگا دیئے۔ تاہم ایک موچھیل محافظ نے مجھے بازو سے تھامے رکھا۔

گھوڑا گاڑی کی کھڑکی کا پردہ سرکا۔ مجھے میڈم صفورا کی شکل نظر آئی...... آخری بار میں نے اسے بڑی خستہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور جسم پر چیتھڑے تھے لیکن آج وہ اپنے مخصوص بوائے کٹ اسٹائل میں نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا۔ تقریباً وہی روپ تھا جو ہم لاوہر کی لال کوٹھیوں میں دیکھا کرتے تھے۔ ایک اسمارٹ جواں سال اور دبنگ عورت۔

صفورا نے محافظوں کے چہروں پر ہیجان کے آثار دیکھ لئے تھے۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔

''یہ بندہ زبردستی اندر گھسنا چاہت ہے جی۔ تلاشی بھی ناہیں دے رہا۔''

''پگڑی ہٹاؤ۔'' میڈم صفورا کرخت لہجے میں بولی۔

''آپ مجھے اچھی طرح جانت ہیں میڈم...... لیکن میں ان کے سامنے پگڑی ہٹانا ناہیں چاہتا۔''

میری آواز سن کر صفورا ذرا چونکی مگر اس کا ذہن ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا...... میں نے اسے اشارہ دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نادیہ کی موت کا بہت افسوس ہے میڈم۔ میں اسی بارے میں بات کرنا چاہت ہوں۔''

ایک لمحے میں صفورا نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلا...... اس نے موچھیل محافظ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''چھوڑ دو انہیں۔''

محافظ ایک دم بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میڈم صفورا نے مجھے گاڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔ میں شان دار گاڑی کی نیم گرم فضا میں آ گیا۔ گاڑی طویل ڈرائیو وے کو طے کر کے

عمارت کے پورچ میں رکی۔ جلد ہی میں میڈم صفورا کے ساتھ لال بھون کے اندر تھا۔

یہ عمارت باہر سے تو درمیانی حالت کی نظر آتی تھی لیکن اس کا ''اندر'' دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بلند چھتیں، محرابی دروازے، دبیز قالین، خوبصورت غالیچے اور بڑے بڑے فانوس...... باوردی ملازم اور ملازمائیں ننگے پاؤں، بے آواز چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی حصے سے موسیقی کی آواز اُبھر رہی تھی اور شوخ لڑکیوں کے سریلے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے...... در و دیوار سے رنگ و بُو کے غیر مرئی سوتے پھوٹ رہے تھے۔ ایک فوارے اور شاندار حوض کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم ایک شاندار کمرے میں داخل ہو گئے۔

میڈم صفورا نے انگریزوں کی طرح پتلون قمیص اور جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کے پاؤں میں جوگر ٹائپ جوتے تھے۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ میں نے پگڑی اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔ ''اوہ تابش! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں تمہیں پھر اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ اِٹ اِز رئیلی ونڈرفل۔'' اس نے مجھے چھوتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی یقین نہیں آ رہا۔ پچھلی بار ہماری دونوں ملاقاتیں بڑے بُرے حالات میں ہوئی تھیں۔ ہم دونوں کی گردنوں میں آہنی کڑے تھے۔ آپ کا سر منڈا ہوا تھا اور باقی کا حلیہ بھی قابلِ رحم تھا لیکن اب...... اب تو آپ وہی لاہور والی میڈم صفورا نظر آ رہی ہیں......''

''خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے لیکن جو کچھ بھی تبدیلی آئی ہے، اس کے لئے کافی محنت کرنا پڑی ہے مجھے۔ تفصیل بتاؤں گی تو تم حیران رہ جاؤ گے لیکن...... یہ سب باتیں تو بعد کی ہیں۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آ پہنچے؟ مجھے تو تمہارے بارے میں بُری بُری خبریں مل رہی تھیں۔''

''خبریں تو اب بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہیں میڈم...... آپ کو پتا چل ہی گیا ہوگا کہ جارج گورا نے سلطانہ کے ساتھ اپنے گھر میں کیا کیا تھا؟''

''ہاں تابش! وہ واقعہ تو واقعی افسوس ناک تھا۔ وہ اسے جیل سے نکال کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس ساری بات کا پتا تو اس وقت چلا جب اس کے گھر پر حملہ ہوا...... اور جارج کے محافظوں نے لوگوں پر اندھا دھند گولیاں چلائیں۔''

''اس واقعے کے بعد بھی واقعات کا ایک سلسلہ میڈم...... جارج نے اپنے پاپوں کا گھڑا بھر لیا ہے، اب اس گھڑے کو ہر صورت پھوٹنا ہی پھوٹنا ہے۔''

میڈم صفورا گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ''میں نے سنا تھا کہ تم میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب تم وہ پہلے والے تابش نہیں رہے

ہو۔ مجھے یقین نہیں ہوتا تھا لیکن اب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔''

''بس میڈم! ایسی تبدیلیاں یونہی تو نہیں آتیں۔ ان کے پیچھے حالات کا لمبا جبر ہوتا ہے...... اگر موقع ملا تو میں آپ کو یہ طویل کہانی ضرور سناؤں گا۔''

میڈم کی عقابی نگاہیں جیسے میرے اندر تک دیکھ رہی تھیں۔ اس نے میری گرم چادر کے نیچے اسلحے کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا اور شاید اس آگ کو بھی دیکھ لیا تھا جو میرے سینے میں بھڑک رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ''تو تم جارج گورا کے لئے یہاں آئے ہو؟''

''کچھ ایسا ہی سمجھ لیں میڈم۔''

''اکیلے ہو یا کوئی اور بھی ساتھ ہے؟''

''ایک ساتھی بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''یہیں زرگاں میں۔ ایک قہوہ خانے میں چھوڑ کر آیا ہوں اسے۔''

میڈم نے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور قیمتی لائٹر سے سلگا کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''تابش! بہت خطرناک اور مشکل کام کا ارادہ لے کر پہنچے ہو یہاں...... بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔''

''آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔''

''میں کیا ڈراؤں گی...... سچ پوچھو تو میں خود ڈری ہوئی ہوں۔ یہ بہت سفاک لوگ ہیں اور آج کل ایک دم ہائی الرٹ بھی ہیں۔ جارج گورا تک پہنچنا تو بہت دور کی بات ہے تابش! آج کل اس کے کسی ادنیٰ افسر تک رسائی بھی مشکل ہے۔''

میں نے عجیب اعتماد سے کہا۔ ''میڈم! آپ نے خود کہا ہے کہ یہ وہ تابش نہیں ہے جسے آپ جانتی تھیں اور میڈم...... یہ نیا تابش آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ نہ صرف جارج گورا تک پہنچے گا بلکہ اس کے دس بیس ٹکڑے بھی کرے گا اور صرف یہی نہیں میڈم...... ہم اس منحوس جگہ سے نکلیں گے...... اپنی آزاد دنیا میں واپس پہنچیں گے۔ اپنے پاکستان، اپنے لاہور، اپنے جانے پہچانے گلی کوچوں میں۔ بہت جلد میڈم۔''

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر بند کر لیا۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولی۔ ''وہ دوسرا بندہ کون ہے جو تمہارے ساتھ آیا ہے؟''

''میں آپ کو اس کے بارے میں بھی بتاتا ہوں لیکن پلیز پہلے تھوڑا سا اپنے بارے میں

بتا دیجئے۔ میرا کنفیوژن دور ہوگا۔ آپ پگوڈا کی مصیبت سے نکل کر اس شاندار لال بھون میں کیسے پہنچیں؟''

''تمہیں معلوم کیسے ہوا کہ میں یہاں ہوں؟'' میڈم نے جواب سوال کیا۔

''میں پہلے پگوڈا میں ہی گیا تھا۔ وہیں سے پتا چلا۔ میں سیدھا یہاں آ گیا۔''

''یہ حماقت تمہیں مہنگی پڑ جاتی تو پھر؟''

''کیا مطلب میڈم؟''

''گارڈز سے تمہاری تکرار ہو رہی تھی۔ وہ تمہاری پگڑی اُتروا دیتے تو عین ممکن تھا کہ تمہیں پہچان لیتے اور پھر تم نے چادر کے نیچے اسلحہ بھی لگایا ہوا ہے۔''

''میڈم! اردو کا وہ محاورہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا، جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ سچ پوچھیں تو میں کشتیاں جلا کر یہاں آیا ہوں۔ جارج نام کے اس پھوڑے کو جڑوں سے کاٹوں گا یا پھر خود ختم ہو جاؤں گا۔''

میرے پُرتپش لب و لہجے نے میڈم صفورا کو ایک بار پھر چونکایا۔ وہ دھیان سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میرے اور صفورا کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی، پھر صفورا نے مجھے بتایا کہ وہ پگوڈا سے یہاں کیسے پہنچی۔ وہ بولی۔ ''میرے خیال میں میرے یہاں پہنچنے میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ میں انگلش میں روانی سے بول لیتی ہوں۔ پگوڈا میں جارج گورا کے ساتھی سرجن اسٹیل نے ایک بار مجھ سے تھوڑی سی بات چیت کی اور پھر ہمارے درمیان اکثر بات ہونے لگی۔ اسٹیل نے ہی جارج سے میری سفارش کی اور کہا کہ میں کافی سزا کاٹ چکی ہوں، اب میرے ساتھ کچھ رعایت کی جائے۔ یہ اس سفارش کا ہی نتیجہ تھا کہ مجھے پگوڈا سے نکال کر یہاں پہنچا دیا گیا...... تم ٹھیک کہتے ہو، یہ واقعی پازیٹو چینج ہے۔ یہاں مجھے ہر طرح کا سکون آرام حاصل ہے۔ میری حیثیت حکم جی کی معمولی ملازمہ کی سی ہے۔ پھر بھی جاب اچھا اور انٹرسٹنگ ہے۔''

''کیسا جاب؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''یہ آوازیں سن رہے ہو تم؟''

میں نے کان دھرے۔ لال بھون کے کسی دور افتادہ حصے سے لڑکیوں کے گانے کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ شاید کورس کی شکل میں کوئی طربیہ نغمہ گا رہی تھیں یا گانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''یہ گانے کی آوازیں ہیں۔''

''ہاں، یہاں مجھے کچھ لڑکیوں کی نگہبانی سونپی گئی ہے اور یہ کوئی عام لڑکیاں نہیں ہیں۔ ان چالیس لڑکیوں کو پورے راجواڑے میں سے چنا گیا ہے۔ ان کی عمریں اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ مسلمان ہیں، باقی ساری ہندو ہیں۔ میرا کام یہاں ان لڑکیوں کو بنانا سنوارنا اور ادب و آداب سکھانا ہے۔ میری مدد کے لئے کچھ اور لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔ ہندی ڈانس کی تربیت دینے والی گیتا مکھی، ایک ماسٹر ہندو گائیک، ایک جڑی بوٹیوں کا ماہر وید اور اس طرح کے دوسرے لوگ۔''

''ان لڑکیوں کا کیا کیا جائے گا؟''

''میرے خیال میں تم نے بھی ساتویں کے جشن کا سنا ہوگا۔ یہ اس راجواڑے کا سب سے بڑا فیسٹیول ہوتا ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میڈم صفورا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس فیسٹیول میں راج بھون کے لئے جو سات پریاں چنی جاتی ہیں، وہ انہی لڑکیوں میں سے چنی جائیں گی۔ ان میں سے زیادہ تر سادہ اور گم صم ٹائپ کی ہیں۔ انہیں بنانا سنوارنا اور راج بھون کے ادب و آداب سکھانا سب کچھ یہیں لال بھون میں ہوتا ہے۔''

میں نے ساتویں کے جشن اور سات رنگوں کی پریوں کے بارے میں پہلے بھی کافی کچھ سنا تھا۔ یہ سب کچھ بہت داستانی لگتا تھا مگر یہاں اس اسٹیٹ میں یہ ایک ٹھوس حقیقت کی صورت میں موجود تھا۔ یہ قدیم رسم پورے اہتمام کے ساتھ یہاں جاری ساری تھی...... بلکہ خود سلطانہ پر بھی ایک بڑا الزام یہ تھا کہ اس نے خود کو پری بننے کے اعزاز سے جان بوجھ کر محروم کیا...... اور پریوں کے چناؤ سے پہلے ہی آناً فاناً شادی کر لی۔

میری اور میڈم صفورا کی گفتگو جاری تھی کہ اچانک دروازے پر عجلت آمیز دستک ہوئی۔

''کون؟'' میڈم نے بارعب آواز میں پوچھا۔

''میڈم! میں ہوں ثمرین۔'' روتی ہوئی سی آواز اُبھری۔

''او گاڈ۔'' میڈم نے سٹپٹائے لہجے میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''میں ایک منٹ میں آئی۔''

اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ مجھے روتی سسکتی لڑکی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ میڈم ساتھ والے لاؤنج میں ایک خوبرو لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک مختصر سا چمکیلا لباس تھا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھیں میڈم! یہ کپڑے پہننے کو کہہ رہی ہے مجھے گیتا دیدی۔ یہ مجھ سے نا ہیں ہوگا۔''

یہ لباس کپڑے کے دو نہایت مختصر ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ لڑکی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔

میڈم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے جھڑک کر بولی۔ ''اچھا، ہر بات پر رونا دھونا نہ شروع کر دیا کرو۔ پہلے مجھے بتایا تو کرو کہ پرابلم کیا ہے۔ چلو آؤ میرے ساتھ......'' وہ خوش شکل لڑکی کے ساتھ ایک راہداری میں اوجھل ہو گئی۔

اسی دوران میں دو اور خوبصورت لڑکیاں لٹک مٹک کر چلتی ہوئی کھڑکی کے سامنے سے گزریں۔ انہوں نے بہ عین وہی مختصر لباس پہن رکھا تھا جو ابھی ثمرین نامی لڑکی نے میڈم کو دکھایا تھا۔

میں کھڑکی بند کر کے واپس اپنی جگہ آ بیٹھا اور میڈم کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی واپسی میں چار پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

''کون تھی یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ یہ تمہاری ایک دور کی رشتے دار تھی تو پھر؟'' میں چونک کر میڈم کو دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا دی۔ ''یونہی مذاق کر رہی تھی۔''

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ پوچھتا، وہ سگریٹ کا ایک چھوٹا کش لے کر بولی۔ ''جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر وہ واقعی صحیح ہے تو پھر......تم بڑے سنگین وقت پر اور بڑے سنگین ارادوں سے یہاں آئے ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم سے کیا کہوں۔''

''آپ کچھ بھی نہ کہیں۔ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ جو کچھ آپ کہنا چاہ رہی ہیں، وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ اس حوالے سے ہم بعد میں تفصیل سے بات بھی کر سکتے ہیں۔''

وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر ایک اور کش لے کر بولی۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو تابش؟''

میں نے کہا۔ ''میڈم! چاہتا تو بہت کچھ ہوں اور جو چاہوں گا وہ ہم سب کے بھلے میں ہوگا لیکن فی الوقت تو ہمیں بس دو تین روز کا ٹھکانا دے دیجئے۔''

''او کے......مل گیا۔''

''میں اپنے ساتھی کو بلا سکتا ہوں؟''

''بلا لو۔ کون ہے وہ؟''

میں نے نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''میڈم! اب تک آپ نے جو سوال

پوچھے ہیں، ان میں یہ سوال سب سے ٹیڑھا ہے......لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کی فہم و فراست اور محبت اس سوال کو اور اس کے جواب کو اتنا ٹیڑھا نہیں رہنے دے گی۔''

''کھل کر بات کرو تابش!''

کھڑکیوں سے باہر ایک سرد رات نے پنجے گاڑ لئے تھے......یہ پوری عمارت قالینوں غالیچوں کی وجہ سے گرم تھی پھر بھی کمرے میں ہلکی خنکی محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں نے مناسب الفاظ کا چناؤ کیا اور پھر میڈم صفورا کو دھیرے دھیرے عمران کے بارے میں سب بتا دیا۔ میڈم کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ سب سے پہلے تو اسے اسی بات کا یقین نہیں آیا کہ عمران تا حال زندہ ہے۔ دوسری بڑی حیرت یہ تھی کہ وہ یہاں اس اسٹیٹ میں، اس شہر میں موجود ہے اور اس گھر سے ایک ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک قہوہ خانے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔

ایک طویل سکتے کی سی کیفیت سے نکلنے کے بعد میڈم صفورا بولی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سراج اور شیرے وغیرہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے سینے پر گولیاں لگی تھیں اور وہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔''

''بے شک میڈم! یہ سب کچھ ہوا تھا لیکن وہ پھر بھی بچا رہا۔ اس کے جسم پر بس ایک دو گولیاں ہی لگ سکیں اور اس کے نشان اس کے جسم پر موجود ہیں۔''

میں نے میڈم صفورا کو امریکن بلٹ پروف جیکٹ کے بارے میں بتایا اور وہ باقی باتیں بھی بتائیں جو عمران نے میرے گوش گزار کی تھیں۔ میں نے دیکھا، صفورا کی پیشانی پر پسینا ہے۔ اس کی آنکھوں کے اندر گہرائی میں وہ سارے پرانے کرب جاگ گئے تھے جن کا تعلق لاہور والے واقعات سے اور پھر چھوٹی میڈم نادیہ کی موت سے تھا۔

میں نے لجاجت سے کہا۔ ''میڈم! وقت کے ساتھ بہت کچھ تبدیل ہوا ہے۔ میں تبدیل ہوا ہوں، آپ ہوئی ہیں......ہمارے حالات، ہمارا گرد و پیش سب کچھ بدل گیا ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا، اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ میڈم! بے شک وہ صدمہ شدید تھا جو آپ کو پہنچا۔ اس جیسے کم شدت کے اور بھی کئی صدمے ہیں جن کا تعلق ان دنوں سے ہے۔ کتنا اچھا ہو میڈم......اگر ہم ان صدموں کو بھلا کر اپنی موجودہ مصیبت سے نکلنے کے لئے کوئی مشترکہ کوشش کر سکیں۔''

میڈم خاموش رہی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ لگتا تھا، وہ بڑی مشکل سے اپنے آتشیں آنسوؤں کو روکے ہوئے ہے۔ میں نے

کہا۔ ”میڈم! میں بڑے مان سے آپ کے پاس آیا ہوں اور وہ مان یہ ہے کہ جس طرح آپ نے مجھے معاف کیا ہے، اسی طرح عمران کو بھی کر دیں گی...... بے شک جرم بہت بڑا ہے لیکن مجھے آپ کے ظرف کا آسرا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ آپ کا ظرف آپ کے غم و غصے سے کہیں زیادہ ہے...... پلیز میڈم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، ہم آپ کی دی ہوئی معافی کا حق ادا کر دیں گے۔ ہم آپ کے ایک اشارے پر اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ لیں گے۔ اللہ نے چاہا تو اس راجواڑے کی اونچی دیواریں اب زیادہ دیر ہمارا راستہ نہیں روک سکیں گی......“

میں جو کچھ کہہ رہا تھا، دل کی گہرائی سے کہہ رہا تھا اور کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے...... میں نرم و گداز لہجے میں بولتا رہا اور میڈم خاموشی سے سنتی رہی...... کبھی اس کے چہرے پر گہرا کرب جھلکتا، کبھی وہ ایک طویل آہ بھر کر رہ جاتی...... میری گفتگو کے دوران میں اس نے ایک دو سخت جملے بھی کہے تاہم میں نے ان جملوں کا توڑ کیا...... اور عمران کے حوالے سے میڈم صفورا کا غم و غصہ دور کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کوشش کا نتیجہ مثبت نکلا۔ بالآخر میڈم نے عمران کو یہاں لانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ تاہم اس نے کہا۔ ”وہ فی الحال میرے سامنے نہیں آئے۔ میں ایک دو دن میں خود ہی اس سے ملاقات کروں گی۔ اس دوران میں مجھے خود کو سنبھالنے میں مدد ملے گی۔“

”آپ جیسا کہتی ہیں، ویسا ہی ہوگا میڈم! جو کچھ ہوا اس کا افسوس اور دکھ اسے بھی بے چین رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب تک آپ سے معافی نہیں مانگے گا اور آپ اسے معاف نہیں کریں گی، وہ ذہنی سکون سے دور رہے گا۔“ میں نے اپنی طرف سے بات بناتے ہوئے کہا۔

میڈم نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں کے نم کناروں کو صاف کیا اور اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں پھیر کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اُٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ”میں اپنے منیجر مدن کو بھیجتی ہوں، وہ تمہیں میری گاڑی میں لے جائے گا۔“

کچھ دیر بعد ایک ہٹا کٹا خرانٹ سا شخص آن موجود ہوا۔ اس کی عمر تیس سال سے اوپر رہی ہوگی۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام مدن ہے۔ میں نے مقامی طرز کی پگڑی پھر سر اور چہرے پر لپیٹ لی۔ بہرحال، مدن نے مجھے سلطانہ کے شوہر مہروز کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ ہم باہر نکل کر اسی شاندار گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھے جس میں صفورا یہاں پہنچی تھی۔ یہ بالکل بند گھوڑا گاڑی تھی۔ یخ بستہ ہوا اور سردی کے اثرات سے کافی حد تک محفوظ۔ ہم اس گھوڑا

گاڑی پر دھند آلود ندی کے کنارے کنارے چلتے مطلوبہ جگہ پر پہنچے۔ میں گھوڑا گاڑی کے اندر ہی رہا اور منیجر مدن قہوہ خانے کے اندر سے عمران کو لے آیا۔ ہم نے واپسی کا سفر مکمل خاموشی سے طے کیا...... منیجر مدن نے بات چیت کرنے کی کوشش کی تاہم میں نے مختصر جواب دے کر اسے خاموش کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم لال بھون کے ایک نہایت آرام دہ بیڈ روم میں موجود تھے۔ یہاں آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ شیشے کی الماری میں شراب کی بوتلیں چنی ہوئی تھیں اور خوبصورت تپائی پر بسکٹ، پیسٹری، کاجو اور اس طرح کے دیگر لوازمات موجود تھے۔

ہم نے اپنی چادریں اور پگڑیاں وغیرہ اُتار دیں اور ایزی موڈ میں ہو گئے۔ توقع کے مطابق میڈم صفورا دوبارہ نظر نہیں آئی، تاہم کھانا پُرتکلف تھا۔ بعد میں سبز چائے سے تواضع کی گئی۔ کھانے کے دوران میں ہم دھیمے لہجے میں بات کرتے رہے اور میں نے عمران کو اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس عمارت میں ہونے والی سرگرمیوں کی روداد نے عمران کو بھی حیران کیا۔ وہ بولا۔ ”جگر! یہ تو میرے فساد پلس کے لئے بڑی زبردست اسٹوری ہے۔ اس کا عنوان ہو سکتا ہے...... چالیس لڑکیاں چالیس کہانیاں بلکہ اکتالیس کہانیاں۔ میڈم صفورا خود بھی تو ایک کہانی ہے۔ اب اندازہ لگاؤ، اکتالیس کہانیوں کو فی کہانی پچاس منٹ کے دورانیے میں بنایا جائے اور ہر دورانیے میں پچاس بریک ہوں تو یہ بن گئے تقریباً دو ہزار بریک۔ ہر بریک میں آج کل شریف سے شریف چینل بھی چودہ پندرہ اشتہار تو چلا ہی دیتا ہے۔ تو یہ ہو گئے تقریباً تیس ہزار اشتہار...... اور مجھے تو لگتا ہے کہ اتنی زبردست لڑکیوں...... میرا مطلب ہے اسٹوریوں کے لئے یہ تیس ہزار اشتہار بھی کم رہیں گے۔“

”یہاں سے زندہ بچ کر نکلو گے تو اشتہار چلاؤ گے نا۔“ میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”جگر! مجھے ایسی باتوں سے مت ڈرایا کرو۔ ہمارا تو کام ہی ہے پلٹ کر جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا۔“

”جو کچھ تم لوگ ”جھپٹ“ کر پلٹتے ہو اس کا بھی سب کو پتا ہے۔“

”خبردار، ہم پر رشوت کا الزام نہ لگانا۔ ورنہ بریکنگ نیوز میں جگہ پا جاؤ گے۔ ہم شاہین صفت لوگ ہیں۔“

”لیکن ہم نے تو دیکھا ہے کہ جہاں واقعی خطرہ ہو، وہاں پولیس والوں کی طرح تم لوگ بھی پلٹ کر پلٹتے اور پلٹتے ہی پلٹتے چلے جاتے ہو۔“

''میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ شاہین صفت لوگوں سے یوں طنزیہ لہجے میں بات نہیں کرتے اور یہ وہ اقبال والا شاہین نہیں ہے۔''

''یہ کون سا ہے؟''

''یہ لاہور کا مشہور رس فروش ہے۔ گنے کا رس بیچتا ہے۔ اس نے ایسا ڈبل ایکشن بیلنا بنوایا ہے جو خشک سے خشک گنے سے بھی دو چار گلاس رس نکال کر دکھا دیتا ہے...... بلکہ اس کا تو کہنا ہے کہ کسی بھی پلاسٹک یا لکڑی وغیرہ کے ٹکڑے پر ''گنا'' لکھ دیا جائے تو وہ اس میں سے بھی رس نکال کر دکھا دے گا۔''

''اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے اپنا بستر درست کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی جس طرح شاہین رس فروش، سوکھے سڑے گنے سے بھی رس نکال لیتا ہے، ہم بھی نہایت پُرسکون حالات اور لوگوں کے اندر سے تہلکہ خیز خبریں نکال سکتے ہیں......'' اس نے ایک بار بولنا شروع کیا تو بولتا چلا گیا۔

اسحاق کی دردناک موت نے میرا دل بوجھل کر رکھا تھا اور یقیناً ایسا ہی بوجھ عمران کے دل و دماغ پر بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری اور اپنی توجہ اس گھمبیر دکھ سے ہٹانے کے لئے یہ اوٹ پٹانگ گفتگو کر رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ بیچ وہ کچھ سنجیدہ باتیں بھی کر جاتا تھا۔ ان باتوں کا تعلق اس لال بھون اور یہاں کی کرتا دھرتا میڈم صفوار کے حوالے سے عمران کے ذہن میں ابھی خدشات موجود تھے۔ یہ خدشات اسی وقت دور ہو سکتے تھے جب عمران اور صفورا میں آمنے سامنے بات ہوتی اور وہ دونوں ماضی کو بھلا کر آگے کی طرف دیکھنے کا فیصلہ کرتے۔

میں عمران کے خدشات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ خدشات بدترین صورت میں صحیح ثابت ہونے والے ہیں اور بہت جلد۔

ہم کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد سو گئے۔ میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے اردگرد ہر چیز دھندلائی ہوئی سی نظر آئی۔ سر پر جیسے منوں بوجھ تھا۔ کئی سیکنڈ مجھے یہ سمجھنے میں ہی گزر گئے کہ میں کہاں اور کس حالت میں ہوں۔

ایک پھنکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''حرامزادے...... تم کیا سمجھتے تھے...... میری میزبانی انجوائے کرو گے۔ میری چھت تلے بیٹھ کر میری روٹیاں توڑو گے...... میں اتنی جلدی بھول جاؤں گی اپنی بہن کے قاتل کو...... اتنی جلدی معاف کر دوں گی......''

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ سر بُری طرح چکرا رہا تھا اور تب میں نے محسوس کیا کہ میرے

ہاتھ اور پاؤں بڑی سختی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔

میں نے اپنے سامنے صفورا کو دیکھا۔ وہ تن کر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر...... پر رکھے عمران سے مخاطب تھی۔ غنودگی کے سبب میں یہ سارا منظر بہ مشکل دیکھ پا رہا تھا۔

میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ عمران کے ہاتھ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور اس کے پاؤں کے گرد نائیلون کی سرخ رسّی کی مضبوط بندش ہے۔ میرے جاگنے سے پہلے شاید اسے مارا بھی گیا تھا۔ وہ بستر کے بجائے قالین پر نظر آ رہا تھا اور اس کے ہونٹ خون آلود تھے۔

میرا ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ متلی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل میڈم صفورا کو پکارا۔ ''میڈم! یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ نے تو وعدہ کیا تھا......''

''خاموش۔'' ایک بھاری مردانہ آواز نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میری پسلیوں پر ایک بے رحم ٹھوکر لگی۔ میں کراہ کر رہ گیا۔

ٹھوکر زوردار تھی تاہم اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ میرے دماغ پر چھائی ہوئی گہری دھند چھٹنا شروع ہو گئی۔ میں نے کوشش کی اور بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ عمران قالین پر تھا اور اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی ازلی اطمینان تھا جو بدترین حالات میں بھی اس کے چہرے سے جدا نہیں ہوتا تھا۔

میڈم صفورا نے عمران کے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور زوردار جھٹکے دے کر بولی۔ ''یو باسٹرڈ! تم نے تین چار سال کو کافی عرصہ سمجھا...... شاید تمہیں پتا نہیں، تیس چالیس سال بھی گزر جاتے تو مجھے تمہاری شکل بھولنا تھی اور نہ تمہارا جرم...... تم نے میری بہن کو مارا ہے۔ اس کے بدلے تمہیں اپنی جان دینا پڑے گی...... اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا...... تم تمنا کرو گے کہ کاش تم اسی رات ڈیک نالے پر مر گئے ہوتے۔'' صفورا کے لہجے میں آگ تھی اور جنون تھا۔ وہ اس عورت سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی جسے چند ماہ پہلے میں نے پگوڈا میں فرش کی صفائی کرتے دیکھا تھا...... اور اس عورت سے بھی جس سے کل شام میں نے اسی عمارت میں ڈیڑھ دو گھنٹے بات چیت کی تھی۔ میں نے اپنے ڈولتے ذہن کو سنبھالا اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ''میڈم! آپ جلد بازی کر رہی ہیں۔ آپ جانتی نہیں کہ ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

''شٹ اَپ!'' میڈم گرجی۔ ''تم اپنی عقل دانش اپنے پاس ہی رکھو۔ اگر تم میں عقل ہوتی تو تم اسے یہاں لے کر ہی نہ آتے۔ تم کیا سمجھتے تھے، میں اتنی ہی کمزور اور بھلکڑ ہوں۔''

میں نے محسوس کیا کہ واقعی مجھ سے اندازے کی بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ حالات کی بے رحم چکی میں پسنے کے بعد میڈم کی کیمسٹری میں غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں لیکن میں بھول گیا تھا کہ عورت کو داناؤں نے ہمیشہ ایک پہیلی قرار دیا ہے اور میڈم صفورا جیسی عورت تو ویسے بھی ''بھید بھری'' ہوتی ہے۔

ہمیں یقیناً کھانے میں بے ہوشی کی زود اثر دوا دی گئی تھی۔ مجھے کھانے کے بعد کی کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم کھانا کھاتے کھاتے ہی سو گئے تھے اور پھر یہ نیند گہری بے ہوشی میں بدل گئی تھی۔ یقیناً یہ گہری بے ہوشی ہی تھی کہ عمران جیسا شخص بھی کچھ نہیں کر پایا تھا اور اب میری ہی طرح بندھا ہوا پڑا تھا۔ میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی اور میری حیرانی میں اضافہ ہو گیا۔ اب صبح کے چار بجنے والے تھے۔ یعنی ہم تقریباً چھ گھنٹے بعد ہوش میں آئے تھے۔ عمران غالباً مجھ سے پہلے ہوش میں آ گیا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ جب میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے تو عمران کے ساتھ میڈم صفورا کا غصیلا مکالمہ جاری تھا۔

میڈم صفورا نے عمران کے پہلو میں جوگر بوٹ کی زوردار ٹھوکر رسید کی اور پھنکاری۔ ''بتا، کیا قصور تھا میری بہن کا؟ بس یہی نا کہ وہ تجھ سے دوستی کر بیٹھی تھی۔ اتنے سے جرم کی اتنی سخت سزا دے دی تُو نے اسے......''

''میڈم! وہ آپ کی بہن تھی۔ آپ کو اس کا کوئی قصور نظر نہیں آئے گا لیکن اگر کوئی انصاف سے اس کے قصور لکھنے بیٹھے تو شاید ایک کتاب بن جائے۔ اس پوری کتاب کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور اس کا صرف ایک جرم ہی دیکھا جائے تو وہ بھی اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا تھا۔ بے گناہ سلیم کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا میڈم...... لیکن ہم ان باتوں میں پڑیں گے تو یہ بحث کبھی ختم نہیں ہو سکے گی۔'' عمران بولا۔

''گھبراؤ مت۔ میں تمہیں بحث کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں چھوڑوں گی۔'' میڈم پھنکاری۔ ''تمہیں صرف اپنی جان کی دہائی دینے کے سوا کوئی خیال ہی نہیں آئے گا۔''

ایک دم عمران اپنے مخصوص ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا اور بولا۔ ''میڈم! شاید آپ کو کسی نے بتا دیا ہے کہ آپ غصے میں زیادہ خوبصورت نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہر دو منٹ بعد گرجنے برسنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔''

''میرا اندازہ ہے کہ تم بھی روتے چلاتے اور مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے کافی اچھے لگتے ہو گے۔ میں اس کی تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ خوفناک انداز میں بولی۔

''یہ دیکھیں...... جوں جوں آپ کا غصہ بڑھ رہا ہے، آپ کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو آپ اگلے دو چار منٹ میں ضرور قلوپطرہ بن جائیں گی۔''

''اگلے دو چار منٹ میں اور بھی بہت کچھ ہو گا۔ ہم دیکھیں گے کہ ایک مسخرہ اپنی چوکڑی بھول کر کس طرح روتا چلاتا ہے اور زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔'' میڈم نے کہا۔

''آپ مستقبل کی بات اتنے یقین سے کیوں کرتی ہیں میڈم۔ گلوکار مکیش صاحب کہہ گئے ہیں...... آگے بھی جانے نہ تُو، پیچھے بھی جانے نہ تُو، جو کچھ ہے بس یہی ایک پل ہے۔''

میڈم صفورا بغیر کچھ کہے، لکڑی کی الماری کی طرف گھومی۔ اس نے الماری کھولی اور اندر سے ایک سرنج اور انجکشن نکال لیا۔ میڈم کے چہرے پر انتہا درجے کی بے رحمی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وہی میڈم تھی جسے ہم نے ایک عرصے پہلے لال کوٹھیوں میں دیکھا تھا...... اس کے رعب داب سے اردگرد کی ہر شے سہمی ہوئی سی رہتی تھی۔ اس کے طور اطوار میں کسی شعلہ مزاج ملکہ کی جھلکیاں تھیں۔

''یہ کس چیز کا انجکشن ہے میڈم؟'' عمران نے معصومیت سے پوچھا۔

''یہ بولتی بند کرنے کے لئے ہے۔'' اس نے ترت جواب دیا۔

''تو پھر یہ آپ خود کو کیوں نہیں لگا لیتیں؟ مجھے تو ڈر ہے کہ آپ اسی طرح بولتی رہیں اور آپ کا غصہ شریف بڑھتا رہا تو آپ قلوپطرہ سے بھی دو چار ہاتھ آگے نکل جائیں گی۔ اتنا زیادہ حسن ہم سے برداشت نہیں ہو گا۔ خاص طور سے مجھ سے تو بالکل بھی نہیں۔ یہ نہ ہو کہ میں یہ رسیاں توڑ کر دھڑام سے آپ کے اوپر آ گروں اور یہیں اس قالین پر عشق کی انتہا ہو جائے۔''

میڈم نے اس مرتبہ جواب میں کچھ نہیں کہا۔ غالباً وہ عمران کی خوش گفتاری کا عملی جواب دینا چاہتی تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے انجکشن کے وائل کو شیک کیا اور پھر اسے اوپر اُٹھا کر سرنج میں بھرنا شروع کر دیا۔ یہ ہلکے سبز رنگ کا انجکشن تھا۔ اچانک مجھے جارج گورا کی جیل کے قیدی عبدالرحیم کی بات یاد آ گئی۔ اس نے جارج کی جیل میں ستم گری کے ہتھکنڈوں کا ذکر کرتے ہوئے خاص قسم کے انجکشن کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ منحوس انجکشن جارج کے بہنوئی سرجن اسٹیل کا ایجاد کردہ ہے۔ یہ معتوب قیدی کو لگایا جاتا ہے

اور وہ کم از کم بارہ گھنٹے کے لئے زندگی اور موت کے درمیان لٹک جاتا ہے۔ پورے جسم پر سرخ نشان نمودار ہو جاتے ہیں اور اتنا شدید درد ہوتا ہے کہ قیدی بلک بلک کر موت کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔ سخت سے سخت جان قیدی بھی اس طرح کے زیادہ سے زیادہ تین انجکشن برداشت کر پاتا ہے اور چھتیس گھنٹے بعد موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

میرے جسم کے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ آہنی دروازے والے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں عمران بھی اس مہلک ترین انجکشن کا شکار ہونے والا ہے۔ مجھے اس انجکشن کا نام یاد نہیں آ رہا تھا تاہم عبدالرحیم نے اس کا رنگ سبزی مائل بتایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ انجکشن کی سزا کو سُولی کے بعد دوسری بدترین سزا سمجھا جاتا ہے۔ عمران کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا لیکن اتنی بات تو یقیناً وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ میڈم صفورا اس سرنج کے ذریعے کوئی مہلک دوا داخل کرنے والی ہے جو اسے شدید ترین تکلیف میں مبتلا کر دے گی یا پھر ہو سکتا ہے کہ موت سے ہی ہم کنار کر دے۔

سرنج بھرنے کے بعد میڈم صفورا نے دراز قد گارڈ کو اشارہ کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میری پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی تھی۔ دراز قد گارڈ آگے بڑھا اور عمران کو الٹا کرنے کے لئے نیچے جھکا۔ اسے معلوم نہیں تا کہ وہ کتنا خطرناک کام کرنے جا رہا ہے...... اور ہم میں سے بھی کسی کو معلوم نہیں تھا...... اچانک میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ عمران نے اپنی بندھی ہوئی ٹانگیں پورے زور سے گارڈ کے سینے پر ماریں...... وہ اچھلتا ہوا اس میز سے ٹکرایا جس پر ہمارا ذاتی سامان پڑا تھا۔ میز ٹوٹ گئی اور گارڈ کراہتا ہوا فرش بوس ہوا۔

تب ایک اور حیران کن منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ عمران کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی نائلون کی رسّی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ وہ کم از کم تین جگہ سے ٹوٹی تھی، اس کے بل ایک دم کھلتے چلے گئے۔ عمران اچھل کر کھڑا ہوا۔ میڈم تانبے کے ایک وزنی گل دان کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ عمران نے جھک کر بہ آسانی یہ وار بچایا۔ اپنی پشت پر ٹانگ کی شدید ضرب کھا کر میڈم لڑکھڑاتی ہوئی آتش دان کے قریب گری۔ اس دوران میں دراز قد گارڈ سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ ہولسٹر کی صرف بڑھا رہا تھا جب عمران نے اس پر وار کیا۔ یہ ایک بے مثال وار تھا۔ مجھے اب فائٹنگ آرٹ کی کافی سمجھ بوجھ آ چکی تھی۔ میں عمران کے اس وار کی ٹائمنگ، ایکوریسی اور طاقت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ عمران نے پوری طاقت سے اپنی ٹانگ گھما کر گارڈ کے چہرے پر رسید کی تھی۔ میں نے جبڑا ٹوٹنے کی آواز بالکل صاف سنی۔ گارڈ کا سر بڑی شدت کے ساتھ آہنی دروازے سے ٹکرایا اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح قالین پر لڑھک گیا۔

میڈم جھپٹتی ہوئی اس ساؤنڈ پروف کمرے کے شمالی گوشے کی طرف گئی۔ یہ ایک طرح سے اس طویل کمرے کا دوسرا پورشن تھا، اسے نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میڈم کے یوں اس حصے کی طرف جھپٹنے کی وجہ چند لمحے بعد سمجھ میں آئی۔ جس وقت گارڈ چوٹ کھا کر گرا، پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ گرتے وقت پستول ہاتھ سے پھسلا اور نشست گاہ کی طرف چلا گیا تھا۔

جونہی عمران نے محسوس کیا کہ میڈم پستول پر جھپٹی ہے، عمران نے بھی جست لگائی اور ٹوٹی ہوئی میز کے قریب گرا۔ یہاں ہماری ذاتی اشیاء بکھری ہوئی تھیں اور ان میں عمران کا ریوالور بھی شامل تھا۔ عمران اپنے ریوالور تک پہنچ گیا...... لیکن اس سے پہلے میڈم پستول تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے عمران پر دو فائر کئے۔ عمران پھرتی سے لیٹ گیا۔ یہاں اس کی بے مثال "لک" نے بھی کام کیا۔ دونوں گولیاں عقب میں آہنی دروازے پر لگیں۔ عمران کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس نے کسی پیراک کی طرح جست لگائی اور ہوا میں اُڑتا ہوا وزنی چوبی الماری کے پیچھے گرا۔ یہ وہی الماری تھی جس میں سے کچھ دیر پہلے میڈم نے انجکشن نکالا تھا۔ اس کے بعد میں نے جو منظر دیکھا، وہ عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتا۔ عمران کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں کو اس نے زور لگا کر اس طرح موڑ لیا کہ وہ الماری کے عقب سے میڈم پر فائر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میڈم نشست گاہ میں تھی اور وہاں کی نیم تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غالباً وہ بھی کسی چیز کے پیچھے پوزیشن لے چکی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر کم از کم تین تین فائر کئے۔ دھاکوں سے یہ کمرا گونج اُٹھا۔ میں بغیر کسی آڑ کے بستر پر پڑا تھا۔ کوئی آوارہ گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ میرے محفوظ رہنے سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی اور وہ یہ کہ میڈم کے سارے غیظ و غضب کا رخ عمران کی طرف تھا اور وہ مجھے بخشنے پر آمادہ تھی۔

وہ فائر کرنے کے ساتھ ساتھ چنگھاڑ بھی رہی تھی۔ "حرامزادے...... کتے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تجھے بڑی بری موت دوں گی۔"

میں نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو اس طرح مردانہ وار للکارتے اور باقاعدہ گولی چلاتے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ پستول استعمال کرنے میں مہارت بھی رکھتی تھی۔

دفعتاً عمران کے ریوالور سے "ٹرچ" کی آواز نکلی۔ وہ خالی ہو چکا تھا۔ یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ یقیناً یہ آواز میڈم کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ اس کا پلڑا بھاری ہو چکا تھا۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میرا ریوالور بھی کمرے میں موجود تھا مگر وہ خاصے فاصلے پر

تھا۔عمران الماری کے عقب سے نکل کراس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو یقیناً میڈم صفورا کی گولی کا شکار ہو جاتا لیکن پھر وہ کچھ ہوا جس کا ہم میں سے کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ایک بالکل ڈرامائی واقعہ تھا۔گارڈ سمیت اس کمرے میں ہم کل چار ذی روح موجود تھے لیکن ہم ایک کو بھولے ہوئے تھے۔

اچانک میں نے میڈم کی کرب ناک آواز سنی۔ بالکل یہی لگا جیسے کسی نے اچانک اس پر خنجر چلا دیا ہو۔وہ نہ صرف چلائی بلکہ لڑکھڑا کر کسی چیز پر گری۔ ''او گاڈ......او گاڈ'' وہ دہشت سے پکارتی جارہی تھی۔

عمران چند سیکنڈ تک الماری کے عقب میں رہا۔شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میڈم کوئی چال تو نہیں چل رہی۔تاہم میڈم کا لہجہ گواہی دینے لگا کہ وہ تکلیف اور دہشت کے سخت گھیرے میں ہے۔عمران الماری کے عقب سے نکل کر میڈم کی طرف بڑھا...... میں نے بھی بہ مشکل خود کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور تب میری نگاہ سانپ پر پڑی۔ وہی گول داغوں والا مہلک ترین جان دار جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ڈسا پانی طلب نہیں کرتا۔ ہم نے اسے زرگاں کے راستے میں ایک دلدلی علاقے سے پکڑا تھا اور یہ اب تک ایک کینوس کے تھیلے میں ہمارے ساتھ تھا۔ کمرے میں ہونے والی دھینگا مشتی کے دوران میں ہماری ساری اشیاء یہاں وہاں بکھر گئی تھی۔ یقیناً ان میں یہ کینوس کا تھیلا بھی شامل تھا۔خبر نہیں کہ یہ کب تھیلے میں سے نکلا اور کب کسی کونے کھدرے میں رینگ گیا۔اب وہ میری طرف آ رہا تھا۔اس کی ''آمد'' کا نظارہ ایک دل خراش تجربہ تھا۔عمران نے میڈم کا گرا ہوا پستول اُٹھایا اور تاک کر فائر کیا۔ پہلے فائر میں ہی سانپ کی کھوپڑی صاف اُڑ گئی۔خون کے چھینٹے صوفے کے سفید غلاف کو رنگین کر گئے۔

میڈم نے اپنی پنڈلی دونوں ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی اور تکلیف کی شدت سے صوفے پر دُہری ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً سخت جان تھی۔اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید بے ہوش ہو چکی ہوتی۔عمران اور میں پشت جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔عمران نے پھرتی سے میرے ہاتھ کھول دیئے، میں نے عمران کے کھولے۔عمران میڈم کی طرف لپکا۔وہ زبردست برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی تاہم تکلیف اس کے چہرے پر اور پورے جسم سے ظاہر تھی۔اس کے صاف شفاف رنگ میں ہلکی سی نیلاہٹ کی آمیزش ہوتی جارہی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔وہ کراہی۔
''مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔''

اس کی ٹوٹی ہوئی آواز سن کر یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہی عورت کچھ دیر پہلے

یرنی کی طرح گرج رہی تھی۔

سانپ نے اپنے دانت میڈم صفورا کے ٹخنے میں ذرا اوپر گاڑے تھے۔ نیلی جراب ے نیچے سے خون رِس رہا تھا۔اپنا ''جوگر'' وہ پہلے ہی اُتار چکی تھی۔عمران نے اس کی جراب ہی کھینچ دی۔ ''اس کا مفلر دینا مجھے۔'' عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر بے ہوش گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے بے سدھ پڑے شخص کے گلے سے مفلر کھینچ کر عمران کو دیا۔عمران نے یہ مفلر س کر زخم سے ذرا اوپر باندھ دیا۔

سریع الاثر زہر کے اثرات کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا مگر آج پہلی بار آنکھوں ے اس کا مشاہدہ کیا۔زخم کے اردگرد صفورا کی جلد تیزی سے نیلی پڑتی جارہی تھی......

''چابی کہاں ہے؟'' عمران نے خشک لہجے میں صفورا سے پوچھا۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بے ہوش گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ گارڈ کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ شاید وہ دم توڑ چکا ہے۔صرف سانس لی مدھم حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بقید حیات ہے۔

میں اپنے پاؤں کھول چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر گارڈ کی جیبیں ٹٹولیں اور کمرے کی چابی برآمد کر لی۔ یہ ڈھائی تین انچ لمبی اسٹیل کی خاص چابی تھی۔ میں نے اور عمران نے آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کیا پھر میں دروازہ کھولنے کے لئے بڑھا اور تب میں ٹھٹک کر رہ گیا۔جس ہضمی قفل کے سوراخ میں، مَیں نے چابی گھمانی تھی، وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں تھا۔اندھا دھند فائرنگ کے دوران میں گولیاں اس اسٹیل کے دروازے سے ٹکرائی تھیں اور قفل کا سوراخ ناکارہ ہو گیا تھا۔

''چابی اندر نہیں جارہی۔'' میں نے عمران کو اطلاع دی۔

''چابی اندر نہیں جائے گی تو اس کی جان باہر آ جائے گی۔'' عمران نے کہا۔

اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تکلیف، صفورا کی برداشت سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ زخم کے اردگرد کی جلد کا رنگ بدل رہا تھا۔عمران نے میرے ساتھ مل کر دروازے کھولنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش یکسر ناکام ہوئی۔ ہم نے دروازے کو زور زور سے پیٹنا اور صفورا کے ملازمین کو پکارنا شروع کیا۔ جلد ہی اس آہنی دروازے سے باہر لوگ جمع ہو گئے۔ وہ باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم اندر سے لگے رہے مگر یہ دروازہ ''مستقبل قریب'' میں کھلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ کمرے میں سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ایک دروازہ تھا۔ کھڑکی،

روشن دان، بغلی دروازہ، کوئی شے نہیں تھی۔ کمرے کے اندر اور باہر ایک دم ہی تہلکہ سا گیا۔ دونوں طرف سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جارہی تھی...... وہ ٹس سے مس نہیں ہو تھا۔ عمران نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''شاید اسی موقع کے لئے کہا جاتا ہے...... لو آپ ا دام میں صیاد آ گیا۔''

وہ پلٹ کر میڈم صفورا کی طرف بڑھا اور اس کے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر میں ۔ ایک عجیب منظر دیکھا۔ میرا یہ یار واقعی انوکھا تھا۔ سب سے منفرد، سب سے جدا۔ وہ یونہی دلوں میں جگہ نہیں بناتا تھا، یونہی تو وہ رگِ جاں میں سما کر دھڑکنوں کا حصہ نہیں بن جاتا تھا۔ اگر وقت پڑنے پر فولاد تھا تو وقت پڑنے پر ریشم کی طرح نرم اور چاندنی کی طرح گداز بھ تھا۔ میں عمران کی بات کر رہا ہوں...... جو میری توانائیوں کا سرچشمہ تھا اور میرے لئے زندگ کا دوسرا نام بن چکا تھا۔ اس نے میڈم صفورا کی پنڈلی کو دونوں ہاتھوں سے دبایا اور پھر ا کے نہایت خطرناک زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ اپنے ہونٹوں کی پوری طاقت سے زخم مواد چوس چوس کر ایک گلاس میں تھوکنے لگا۔

''عمران یہ کیا کر رہے ہو؟'' میں بے تاب ہو کر بولا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور اپنا کام جاری رکھا۔ گلاس میں خون جمع ہو رہا تھا اور اسی خون سے عمران کے خوب صورت ہونٹ بھی لتھڑے ہوئے تھے۔ بظاہر صرف خون تھا لیکن اس میں یقیناً سانپ کا سریع الاثر زہر بھی شامل تھا۔ جب زخم سے نکلنے والا مواد کم ہو گیا تو عمران نے شکاری چاقو کی مدد سے زخم کے گرد دو اور گہرے کٹ لگائے او وہاں سے بھی sucking شروع کی۔ میڈم پر اب غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

کمرے میں رکھے ایک انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ باہر سے میڈم صفورا کے منیجر مدن کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اندر کیا ہو گیا ہے...... دروازہ کیوں نہیں کھل رہا؟''

''میڈم شدید زخمی ہو گئی ہیں۔ انہیں فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی طرح دروازہ کھولو۔ نہیں کھلتا تو توڑ دو۔'' میں نے کہا۔

صرف چند سیکنڈ بعد آہنی دروازے پر باہر سے وزنی ہتھوڑے کی زوردار ضربیں لگائ جانے لگیں۔ یہ ضربیں ہضمی قفل کی جگہ پر لگائی جارہی تھیں۔ ضربوں سے پیدا ہونے والا شو قیامت خیز تھا۔ مُردے بھی قبروں میں جاگ سکتے تھے اور گارڈ مرا نہیں، صرف بے ہوش ہو تھا۔ وہ کسمسانے اور کراہنے لگا۔ میں اس کی طرف سے چوکس ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مقامی طرز کی رنگین پگڑی میں، میں نے اپنا منہ پھر لپیٹ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لال بھون

ے عام ملازمین میری صورت دیکھیں۔ اسی دوران میں آہنی دروازہ ایک دھاکے سے کھل گیا۔ صفورا کے درجنوں ملازمین بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ کسمساتا ہوا زخمی گارڈ...... سانپ کی لاش...... عمران کا خون آلود منہ...... سارے مناظر انہیں مزید ششدر کر رہے تھے۔

عمران گرجا۔ ''جلدی کرو۔ میڈم کو اسپتال لے جانا ہے۔''

کئی افراد میڈم پر جھک گئے اور اسے ہاتھوں پر اُٹھا لیا۔

O......❖......O

میڈم کو اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہیں لال بھون میں ڈاکٹر اسٹیل ا ایک تجربہ کار معاون پہنچ گیا۔ اس نے میڈم کو ایک دو انجکشن دیئے، ڈرپ لگائی اور میڈم کی طبیعت بحال ہونا شروع ہو گئی۔ درحقیقت عمران کے بروقت اور دلیرانہ اقدام نے میڈم کو شدید خطرے سے دوچار ہونے سے بچا لیا تھا۔

لیکن عمران کو بھی اس کا کچھ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ رات کو عمران کا منہ سوج گیا اور یہ سوجن باہر ہی نہیں، منہ کے اندر بھی تھی۔ اسے زبان ہلانے میں بھی دشواری ہونے لگی...... علی الصباح میں نے میڈم کے منیجر مدن کو بتایا۔ اس کو بھی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ عمران نے ہنگامی طبی امداد کے طور پر میڈم کے زخم پر منہ رکھا تھا اور اس کا زہر نکالا تھا...... عمران کے اس دلیرانہ ایثار نے ڈاکٹر کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ ان میں مدن بھی شامل تھا...... وہ خود ہی ڈاکٹر کے پاس گیا اور عمران کی کیفیت بتا کر دوا لے آیا۔ ڈاکٹر نے تسلی دی کہ اگر مریض کے منہ کے اندر کوئی تازہ زخم نہیں تو پریشانی کی بات نہیں...... ایک دو دن میں اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ میں نے ٹارچ کی مدد سے اچھی طرح عمران کے منہ کا اندرونی معائنہ کیا۔ کوئی زخم نظر نہیں آیا۔ رات کو عمران کو تھوڑا سا بخار بھی ہو گیا لیکن مجموعی طور پر اس کی حالت زیادہ خراب نہیں ہوئی۔ دوسری طرف میڈم کی حالت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔

اگلی صبح میں میڈم کی خبر گیری کے لئے اس پورشن کی طرف گیا جہاں میڈم کی رہائش تھی۔ میڈم تک پہنچنے میں منیجر مدن نے میری مدد کی۔ ہم ایک ایسی راہداری میں سے گئے تھے جہاں کسی ملازم یا گارڈ سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے ایک گرم ٹوپی اور مفلر سے اپنا دو تہائی چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ایک بلند و بالا دروازے سے گزر کر ہم ایک شاندار بیڈ روم میں پہنچے۔ یہاں ایرانی قالین بچھے تھے اور کھڑکیوں پر دبیز پردے جھول

رہے تھے...... میڈم سفید اُجلے بستر پر لیٹی تھی۔ اسے ابھی تک ڈرپ لگی تھی۔ پاؤں پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی۔ آنکھیں بھی بالکل بے تاثر تھیں۔ اگر میرا خیال تھا کہ میڈم کے انداز میں نرمی یا احسان مندی نظر آئے گی تو مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اس نے مختصر جواب دیئے۔ میں کئی منٹ اس کے پاس رکا۔ اس دوران میں، مَیں منتظر رہا کہ شاید وہ عمران کے بارے میں کچھ پوچھے...... مگر ایسا نہیں ہوا...... بالآخر میں اس سے اجازت لے کر واپس ہو گیا۔ منیجر مدن بھی میرے ساتھ تھا۔ جب ہم کمرے کے دروازے پر پہنچے تو میڈم صفورا نے مجھے آواز دی۔ ''تابش!''

''جی میڈم!'' میں نے پلٹ کر کہا۔

''تمہارے دوست کا حال اب کیسا ہے؟''

''جی...... میڈم! کل شام تک تو ٹھیک نہیں تھا، اب تھوڑا سا بہتر ہے۔''

''مدن لال!'' میڈم نے منیجر کو مخاطب کیا۔

''جی میڈم!'' اس نے ادب سے جھک کر کہا۔

''ناشتے کے بعد ڈاکٹر کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ وہ اس کے دوست کو اچھی طرح دیکھے اور میڈیسن تجویز کرے۔''

میڈم کے لہجے میں مثبت تبدیلی محسوس کر کے مجھے عجیب سے اطمینان اور خوشی کا احساس ہوا۔ عمران دل جیتنے کا ہنر جانتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی یہ صلاحیت جادو جیسی لگتی تھی۔ شاید یہاں بھی اس جادوگری نے کام دکھایا تھا۔

...... یہ چار روز بعد کی بات ہے۔ میں، عمران اور میڈم صفورا ایک بند کمرے میں بیٹھے تھے اور صورتِ حال پر کھل کر بات کر رہے تھے۔ میڈم صفورا اور عمران کے تعلقات میں حیرت انگیز تبدیلی رُونما ہو چکی تھی۔ اس تبدیلی کا محور و منبع پانچ چھ روز پہلے کا وہی ڈرامائی واقعہ تھا جس نے میڈم اور عمران دونوں کو جان کے لالے ڈال دیئے تھے...... میڈم صفورا نے ہمیں یہ بات بتا کر حیران کیا کہ پانچ چھ روز پہلے جب لال بھون کے مین گیٹ پر میرے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی تو وہ چوراہے میں اسحاق کی سُولی کا منظر دیکھ کر واپس آ رہی تھی۔ میں نے بھی اسے بتایا کہ اسحاق ہمارے ساتھیوں میں سے تھا اور اس کی دردناک موت نے ہمیں شدید صدمہ پہنچایا ہے۔ میڈم نے بھی اسحاق کی موت کے حوالے سے وہی روداد سنائی جو اس سے پہلے ہم ریٹائرڈ فوجی کی بیٹی وجنتی سے سن چکے تھے۔ اپنی بہن ماریا کے اغوا کا بدلہ لینے کے لئے جارج گورا نے اسحاق کی بھاوج کو اُٹھوایا تھا اور اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ اس نے کہا تھا

کہ کوئی اس عورت کو چھڑوانا چاہے تو اس کے لئے میدان کھلا ہے۔ وہ آئے اور اس سے دو دو ہاتھ کر کے عورت کو چھڑوا لے۔ دوسری صورت میں اس عورت پر اس کا پورا حق ہوگا اور وہ اپنی سوچ کے مطابق اس کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔

یہ تقریباً ویسا ہی ہتھکنڈا تھا جو پولیس والے یا دوسرے بااثر لوگ اپنے مفرور مجرموں کو پکڑنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان کے اہلِ خانہ کو دھر لیتے ہیں...... اور اپنے اہلِ خانہ کو بچانے کے لئے مجرم یا ملزم کو سامنے آنا پڑتا ہے۔ میڈم نے بتایا کہ اسحاق، جارج گورا سے دوبدو مقابلے کے لئے آیا تھا اور یہ مقابلہ اسے کرنا پڑا۔ حالانکہ اس میں اسحاق کی کامیابی کا امکان دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ سب تو جنگل کے قانون جیسا لگتا ہے۔ جس میں زور ہو، وہ اپنی مرضی کا فیصلہ ٹھونسنے کے لئے آزاد ہو جائے۔''

''بس کچھ ایسا ہی ہے۔'' میڈم نے کہا۔ ''اس رسم کو یہاں سامبر کہا جاتا ہے اور یہ پتا نہیں کب سے چلی آ رہی ہے۔''

''کب ہوئی تھی یہ زور آزمائی؟'' عمران نے پوچھا۔

''پچھلے بدھ کو اور اس حقیقت سے انکار نہیں کہ سامبر کے اصول کے مطابق حمیدہ کے دیور اسحاق کو پورا پورا موقع دیا گیا تھا۔ دونوں میں تلوار بازی ہوئی تھی۔ یہاں چھوٹے سائز کی قریباً دو فٹ لمبی تلوار استعمال ہوتی ہے جسے کٹار یا کٹاری کہا جاتا ہے۔ جارج ایسے مقابلوں میں بہت مہارت حاصل کر چکا ہے اور کسی کو اپنے ''باؤنس'' میں اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔ اس نے لڑائی شروع ہونے کے ڈیڑھ دو منٹ بعد ہی اسحاق کی کٹار گرا دی تھی اور اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔ مگر پھر اس نے اسحاق کو ایک اور موقع دیا۔ اس مرتبہ بھی وہ دو منٹ سے زیادہ اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ اس کی ران پر زخم لگا اور وہ گر گیا۔ جارج نے کٹار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ اس مقابلے میں پہلے ہی جارج نے واضح کر دیا تھا کہ اگر سامبر میں اس کے مقابلے میں آنے والا مقابلہ ہار گیا تو اسے ماریا کے اغوا کی پوری پوری سزا ملے گی اور یہ سزا حمیدہ کے دیور کو دی گئی۔ مقابلے کے فوراً بعد جارج نے اس کے ہاتھ کی انگلیاں کٹار سے کاٹ ڈالی تھیں۔ بعد میں اسے سُولی چڑھا دیا گیا۔''

عمران نے پوچھا۔ ''اب اس لڑکی حمیدہ کے حوالے سے صورتِ حال کیا ہے؟''

میڈم صفورا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''انور خاں یہاں زرگاں کا ایک دلیر مسلمان ہے۔ سنا ہے کہ حمیدہ کو چھڑانے کے لئے اس نے جارج کے سامنے آنے کا

"اناؤنس" کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین روز کے اندر زرگاں میں ایک اور خونی واقعہ ہو جائے۔"

"کیا انور خاں یہاں زرگاں میں آئے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ اسے یہیں آنا پڑے گا۔"

"کیا اس مقابلے سے پہلے ہی ہم کسی طرح اس "لڑاکے مرغے" کا سر قلم نہیں کر سکتے؟" عمران نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

"سوچا تو بہت کچھ جا سکتا ہے لیکن تھیوری اور پریکٹیکل میں بہت فرق ہوتا ہے۔" میڈم نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔

"کیا آپ کی رسائی جارج تک نہیں ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"مجھے یہاں آئے تقریباً تین ماہ ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں صرف ایک بار جارج سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی یہاں نہیں راج بھون میں۔ آج کل یہ سارے لوگ اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بہت چوکس ہیں۔ خاص طور سے حکم جی، جارج اور سرجن اسٹیل، ماریا وغیرہ...... ایک ہفتے پہلے بھی ایک خونی واقعہ ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے راج بھون کے اندر گھس کر کارروائی کی ہے۔ سای سیکیورٹی کو درہم برہم کر کے وہ راج بھون کے اندر پہنچے، گارڈز سے رائفلیں چھینیں اور اندھا دھند فائرنگ کی۔ سرجن اسٹیل کے بھائی کے علاوہ کئی گارڈز بھی مارے گئے۔ اس کے علاوہ......"

ایک دم میڈم صفورا بات کرتے کرتے چپ ہوگئی۔ اس نے جیسے چونک کر ہم دونوں کو دیکھا۔ پھر ٹھٹکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم دونوں بھی زرگاں دو تاریخ کو ہی پہنچے تھے نا؟" عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اور یہ واقعہ بھی اسی دن ہوا۔ کہیں...... میرا مطلب ہے...... کہیں......" وہ کھوجی نظروں سے ہماری طرف دیکھتی جا رہی تھی۔

عمران نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف نگاہ دوڑائی۔

میڈم بولی۔ "کہیں تم دونوں کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو؟"

عمران نے میڈم کی اجازت سے اس کے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ لیا اور بولا۔ "میڈم! ہم چھپا رہے تھے لیکن اب چھپانا نہیں چاہتے۔ ہمیں قدرت نے ایک ہی راستے پر لا کھڑا کیا ہے اور اب ہمیں ایک ہی رخ پر جانا ہے......"

اس کے بعد میں نے اور عمران نے اپنی کہانی کا وہ حصہ بھی میڈم کے گوش گزار کر دیا جو

اب تک اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ جان کر ششدر ہوئی کہ یہ ہم ہی تھے جنہوں نے اس رات راج بھون میں تہلکہ مچایا تھا...... اور پھر صاف بچ کر نکل گئے تھے۔ میڈم کے ساتھ اس گفتگو میں ہم پر ایک اور انکشاف بھی ہوا اور وہ یہ کہ اس رات میں نے سرپٹ بھاگتی...... گاڑی کے اندر جس شخص کو جہنم واصل کیا، وہ رنجیت پانڈے نہیں اس کا چچازاد گرومیت پانڈے تھا۔ دونوں کی شکل اور قد کاٹھ کافی حد تک ملتے جلتے تھے۔ ان کو قریب سے نہ جاننے والے اکثر دھوکا کھا جاتے تھے۔ مجھے وجنتی کے پتا کا وہ فقرہ بھی یاد آیا جو اس نے پانڈے کی موت کی اطلاع دیتے ہوئے بولا تھا۔ اس نے "چھوٹے پانڈے" کا لفظ استعمال کیا تھا۔

ہمارے اور میڈم کے درمیان ہونے والی یہ طویل گفتگو کئی لحاظ سے کارآمد رہی۔ کئی طرح سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ اسی گفتگو میں میڈم کے ایک سوال کے جواب میں عمران نے یہ بھی بتایا کہ جب بے ہوشی کی حالت میں میڈم نے اس کے اور میرے ہاتھ پاؤں بندھوا دیئے تھے تو وہ اچانک اپنے پاؤں کی رسّی توڑنے میں کامیاب کیسے ہو گیا تھا۔ عمران نے بتایا کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس رسّی کو ایک میز کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ساتھ رگڑتا رہا تھا اور اسے کمزور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ ایڈووکیٹ...... ابرار صدیقی کی بھی بقایا سزا معاف ہونے کی امید ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ بھی چار پانچ روز میں ایک قریبی پگوڈے سے یہاں لال بھون میں پہنچ جائے۔ یہاں لال بھون کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کئی انکشافات ہوئے۔ میں، عمران اور میڈم سر جوڑ کر بیٹھے اور پہلی بار مشترکہ طور پر سوچا کہ ہم اس راجواڑے کی تاریکی سے نکل کر کس طرح آزاد فضاؤں میں پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اہم ترین مقصد بھی زیر بحث آیا جس کے لئے ہم یہاں پہنچے تھے اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھی تھی...... یعنی جارج گورے کی موت......

یہ دوسرے روز کی بات ہے، عمران لان کی طرف چہل قدمی کے لئے گیا تھا۔ میں کمرے میں تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے میں نے ایک دن کے لئے بھی ورزش نہیں چھوڑی تھی۔ جہاں اور جس وقت موقع ملتا، میں دن میں کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹا اپنی جسمانی فٹنس کو ضرور دیتا تھا۔ اب بھی میں کمرے کے اندر ہی اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ مارشل آرٹ اور باکسنگ ذخیرہ میں ایک لفظ "شیڈو فائٹ" استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کھلاڑی کا بغیر کسی حریف کے خیالی لڑائی لڑنا اور اس طرح خود کو چست رکھنا۔ کچھ دیر تک شیڈو فائٹ کرنے کے بعد میں ڈپس لگانے میں مصروف ہو گیا۔ یہ کوئی دس بیس یا سو پچاس ڈپس نہیں تھے بلکہ میں گنتی کرتا ہی نہیں تھا۔ ایک بار شروع ہوتا تھا تو پھر جب تک بازو بے دم نہیں ہو جاتے تھے، لگا

رہتا تھا۔ جیکی یہی کہا کرتا تھا۔ جہاں ہمت جواب دے جاتی ہے، وہیں سے غیر معمولی ''امپرووومنٹ'' کا آغاز ہوتا ہے۔

اس دن میں اپنے جسم پر شاید کچھ زیادہ ہی سختی کر گیا۔ ورزش ختم کی تو پیٹ کے بالائی حصے میں اینٹھن شروع ہوگئی۔ میں قالین پر لیٹ گیا اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھڑکیوں سے باہر لان کا منظر نظر آ رہا تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی مگر سرما کی دھوپ میں ابھی تک کوئی دم خم نہیں آیا تھا۔ میں نے دیکھا دور ایک روش پر عمران اکڑوں بیٹھا ہوا میڈم صفور کے چھوٹے رَشین کتے کو پچکار رہا تھا۔ میڈم بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ کتے کو غالباً کوئی چوٹ آئی تھی۔ عمران اس کی چوٹ پر دوا لگانے میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ میڈم سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ اس نے جب کسی کو رام کرنا ہوتا تھا تو اس کی خوش گفتاری عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ میڈم سنجیدہ نظر آتی تھی۔ وہ بس عمران کی کسی کسی بات کا ہی جواب دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میڈم کا ملازم کتے کو گود میں اُٹھا کر میڈم کے پیچھے پیچھے درختوں میں اوجھل ہو گیا، عمران واپس کمرے کی طرف آ گیا۔ وہ کمرے میں پہنچا اور میرے تاثرات دیکھ کر چونک گیا...... ''جگر! کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''کچھ نہیں...... پیٹ میں ذرا درد ہو رہا ہے۔''

''ذرا نہیں ہو رہا۔ تم تو پیلے پڑے ہوئے ہو لیکن یہ ہوا کیوں...... مجھے تو لگتا ہے، تم نے اندھا دھند ورزش فرمائی ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح بہت جلد درست نتیجے پر پہنچ گیا۔

میں خاموش رہا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''کبھی کبھی تم جنون کی حد تک چلے جاتے ہو۔ خود اپنے آپ پر ظلم کرنے لگتے ہو۔ نقصان اُٹھاؤ گے۔''

پھر وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور میرے پیٹ کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ ''کہاں ہے درد؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے خود پتا نہیں چل رہا۔'' میں زبردستی مسکرایا۔

''میں میڈم سے بات کرتا ہوں۔''

میں نے اسے روک دیا۔ ''خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔ اب میں پہلے سے بہتر ہوں۔''

تھوڑی سی کوشش کر کے میں نے اسے قائل کر لیا کہ درد ناقابلِ برداشت نہیں اور اب

کم ہوتا جا رہا ہے۔

حقیقت میں ایسا نہیں تھا...... درد شدید تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، اب اپنی کسی بھی تکلیف کے لئے مجھے دوا کا سہارا لینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں تکلیف کو دوا کے بغیر برداشت کرتا تھا اور اکثر یہ بُرا وقت گزر ہی جاتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ آدھ پون گھنٹے تک درد نے زور مارا پھر دھیرے دھیرے کم ہو کر ختم ہو گیا۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی اور میڈم اندر آ گئی۔ وہ نسبتاً اچھے موڈ میں تھی۔ سانپ کے ڈسنے کے اثرات اب اس پر نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ ہمارے کمرے کے آہنی دروازے کی مرمت ہو چکی تھی اور بے ہوش ہو جانے والا دراز قد گارڈ بھی اب روبہ صحت تھا۔ میڈم نے سگریٹ سلگایا اور ہمیں بھی پیشکش کی۔ عمران نے یہ پیشکش شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ میڈم بولی۔ ''آج کل یہاں زرگاں میں ایک اور بات گردش کر رہی ہے۔ لوح یا تختی والی بات۔ تم نے کچھ سنا ہے اس بارے میں؟''

''نہیں میڈم۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ تو تمہیں پتا ہی ہے نا کہ حکم جی کے خاص قیدی اگر جیل وغیرہ میں نہ بھی ہوں تو اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں سکتے۔ انہیں پکڑ لیا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے حکم جی کی روحانی طاقت کا کرشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اب کچھ لوگ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ جس میجک کے ذریعے ان قیدیوں کو اسیر کیا جاتا ہے، وہ کسی لوح یا تختی پر لکھا جاتا ہے اور پھر یہ چھوٹی سی لوح قیدی کے جسم میں ڈال دی جاتی ہے۔ یہ اس لوح کی شکتی ہے کہ وہ قیدی جہاں بھی جاتا ہے، حکم جی کی نظروں میں رہتا ہے......''

عمران زیرِ لب مسکرایا اور بولا۔ ''اس بارے میں آپ کا کیا آئیڈیا ہے میڈم؟''

میڈم سگریٹ کا طویل کش لے کر بولی۔ ''اسٹیٹ کے عام لوگ تو اسی میجک اور لوح والی بات کو درست سمجھتے ہیں لیکن چند پڑھے لکھے ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو میجک یا لوح اور نقش وغیرہ کہا جاتا ہے، وہ شاید کوئی جدید ڈیوائس ہے...... کوئی الیکٹرانک چپ وغیرہ......''

کچھ دیر کمرے میں گھمبیر خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ نے مجھ سے ابھی تک یہ اہم سوال نہیں پوچھا کہ میں زرگاں سے فرار ہونے کے بعد حکم کے ہرکاروں کی نگاہ سے کئی ہفتے تک کیسے بچا رہا اور کیسے پھر چوری چھپے یہاں زرگاں پہنچ گیا؟''

''بے شک یہ سوال میرے ذہن میں آ تا رہا ہے۔'' میڈم نے کہا۔

''آپ نے جو تختی والی بات کہی ہے میڈم...... وہ بالکل درست ہے اور میں اب تک اسی لئے بچا رہا ہوں کہ میں اپنے اندر اس تختی کی موجودگی سے باخبر ہو گیا تھا۔''

''باخبر ہو گیا تھا؟''

''جی میڈم! اور مجھے پتا چل گیا تھا کہ مجھے اس کا توڑ کیسے کرنا ہے۔''

میڈم نے پہلے میری طرف پھر عمران کی طرف اور تب دوبارہ میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم اس کی وضاحت کرنا پسند کرو گے؟'' اس نے کہا۔ تختی والی بات اسے ششدر کر رہی تھی۔

ہمیں میڈم کا اعتماد اور بھروسا درکار تھا اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب ہمارے درمیان کم سے کم پردہ باقی رہے۔ میں نے میڈم کو چپ کے حوالے سے تقریباً سبھی کچھ بتا دیا...... اور یہ بھی بتا دیا کہ بالآخر یہ چپ کیسے اور کیونکر میرے جسم سے نکل سکی ہے۔ میڈم یہ ساری روداد بہت حیرت کے عالم میں سنتی رہی، بیچ بیچ میں کہیں کہیں اس نے سوالات بھی کئے۔ میں نے میڈم کو اس نہایت خطرناک آپریشن کا نشان دکھایا اور دیگر تفصیلات بتائیں۔

اس کے بعد میڈم ہی کے کہنے پر میں نے میڈم کے سر کے پچھلے حصے کا معائنہ بھی کیا۔ میرے ذہن میں اس بات کا ساٹھ ستر فیصد امکان موجود تھا کہ میڈم صفورا اور...... ابرار صدیقی کے جسم میں بھی چپ رکھی ہوگی مگر کم از کم میڈم کے جسم میں چپ کی موجودگی کا سراغ نہیں ملا۔ ہماری یہ سنسنی خیز گفتگو جاری تھی کہ کسی عورت کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ وہ شاید کسی کو ڈانٹ رہی تھی اور مار بھی رہی تھی۔ پھر جس کو مارا جا رہا تھا، اس کے چلانے کی آواز بھی اُبھری۔ یہ اسی دن والی ثمرین نامی لڑکی کی آواز تھی۔

''اوہ گاڈ! یہ پھر تماشا لگ گیا ہے۔'' میڈم نے بیزار لہجے میں کہا۔ ہم سے معذرت کر کے وہ باہر چلی گئی۔

اسے باہر کا معاملہ سنبھالنے اور واپس آنے میں قریباً دس منٹ لگ گئے۔

''اس لڑکی کا کیا مسئلہ ہے میڈم؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں جو لڑکیاں تربیت کے لئے اور پالش وغیرہ ہونے کے لئے آتی ہیں، ان میں سے کچھ تو ایسی ہوتی ہیں جن کی اپنی مرضی بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ وہ راج بھون کی رنگینیوں اور وہاں کے آرام و آسائش میں جانے کا شوق دل میں رکھتی ہیں لیکن کچھ کو یہ سب کچھ مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے اور وہ دل ہی دل میں یہ خواہش رکھتی ہیں کہ وہ ''فیری سلیکشن'' سے بچ جائیں تو اچھا ہے۔ اب ان میں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو چپ رہتی ہیں اور دوسری وہ جو تھوڑی بہت مزاحمت کرتی ہیں۔ یہ ثمرین نامی لڑکی بھی مزاحمت

کرنے والیوں میں ہے۔ یہ اکثر کسی بات پر اڑ جاتی ہے اور پھر مار پیٹ کا شکار ہوتی ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ تمہاری بیوی سلطانہ کے گھرانے سے بھی اس کا تھوڑا بہت تعلق ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میڈم چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولی۔ ''یہ سلطانہ کی رشتے دار ہے۔ اس کی شادی سلطانہ کے بھائی نبیل سے ہونے والی تھی لیکن پھر نبیل کمر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے مفلوج ہو کر بستر پر پڑ گیا۔ پہلے امید تھی کہ شاید وہ علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ پھر وہ لوگ ویسے ہی زرگاں چھوڑ کر نل پانی چلے گئے...... اب یہ لڑکی نظر میں آ گئی ہے۔''

''نظر میں آ گئی...... کیا مطلب؟'' عمران نے پوچھا۔

''ساتویں کا جشن شروع ہونے سے قریباً چھ مہینے پہلے راج بھون کے خاص اہلکاروں کی ٹیم جن میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں، دوشیزاؤں کی تلاش میں نکلتی ہے۔ جو لڑکیاں سلیکٹ ہوتی ہیں ان کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ''نظر'' میں آئی ہیں۔ اس ''تلاش'' میں وہ سیکڑوں عورتیں بھی مدد کرتی ہیں جو مقامی آبادی میں موجود ہوتی ہیں اور ان کے رابطے راج بھون سے ہوتے ہیں۔''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ اس ثمرین نامی لڑکی کی شادی سلطانہ کے بھائی سے ہونے والی تھی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''بالکل ایسا ہی تھا اور ان لڑکیوں میں آٹھ دس اور بھی ایسی ہیں جو بالکل ناخوش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت کو کوستی ہوں جب وہ کسی وجہ سے نظر میں آئیں۔''

میرے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ میں نے میڈم سے اس بارے میں دو چار سوال مزید پوچھے۔ میڈم نے بتایا کہ اس ثمرین نامی لڑکی نے اسے خود یہ ساری تفصیل بتائی ہے۔ وہ اس لڑکے کی یاد اب بھی دل میں بسائے ہوئے ہے۔

مجھے وہ ساری باتیں یاد آئیں جو تاؤ اُفضل نے مجھے سلطانہ اور اس کے بھائی کے بارے میں بتائی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ سلطانہ اپنے بھائی کا علاج کرانے کی شدید خواہش رکھتی تھی۔ اس نے محنت مزدوری کر کے پندرہ ہزار روپے کی رقم جمع کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ رقم نبیل کے کام آتی، میں خود بیمار پڑ گیا تھا۔ میرا بخار اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا اور ایک ہچکی ہر وقت میرا سینہ دہلاتی رہتی تھی۔ سلطانہ نے اپنی جمع پونجی بشمول اپنے زیورات، بے دریغ

میرے علاج پر خرچ کر دی تھی۔ پتا نہیں کہ خاموشی اور رازداری کے ساتھ اس لڑکی نے کتنے احسان لادے ہوئے تھے میرے سر پر۔ میں جدھر رخ کرتا تھا، مجھے اس کے بے مثال ایثار کے نشان نظر آتے تھے۔ اس ایثار کی وجہ سے وہ خود مشکلوں کا شکار ہوئی تھی اور اس کے قریبی بھی۔

جواں سال نبیل کا بیمار اور مایوس چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ مجھے لگا کہ میں اس کی بربادیوں میں اہم حصے دار ہوں۔ میری وجہ سے وہ اپنی صحت سے دور ہوا اور شاید اپنی محبت سے بھی۔

”کن خیالوں میں کھو گئے ہو؟“ میڈم کی آواز نے مجھے چونکایا۔

”میں اس لڑکی سے مل سکتا ہوں؟“

”مل کر کیا کرو گے؟“

”میں اس سے تھوڑی سی بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو کر لینا، اس میں کون سی رکاوٹ ہے۔ ابھی وہ ذرا رو دھو رہی ہے۔ گیتا مکھی سے آج پھر اس کی لڑائی ہوئی ہے۔ ایک لڑکی نے اپنے سر کے بال سامنے سے کٹوانے تھے۔ اس نے ثمرین سے کہا۔ بال تھوڑے سے زیادہ کٹ گئے۔ بناؤ سنگھار والی ٹیچر نے گیتا کو بتایا۔ گیتا نے ثمرین کو ڈانٹا ڈپٹا ہے۔ جس کے بال کٹے ہیں اس کی تو اچھی درگت بنی ہے۔ چھڑی سے مار پڑی ہے اسے۔ یہاں ایسے معاملوں کی بڑی سختی ہے۔ انتخاب کے لئے نظر میں آنے والی لڑکیوں کو لگے بندھے اصولوں کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ خلاف ورزی پر جان تک کے لالے پڑ سکتے ہیں۔“

اس بارے میں ہماری معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے میڈم نے بتایا۔ ”حکم جی کو یہاں اوتار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تربیت پانے والی لڑکیوں کو بتایا جاتا ہے کہ اوتار اور اس کے خاص مصاحبوں کی خوشی کا خیال رکھ کے وہ ہر جنم میں اعلیٰ رتبہ پا سکتی ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگر کسی وقت ان کی قسمت جاگے اور حکم جی یا ان کا کوئی مصاحب ان کی طرف خاص انداز کی ”پیش قدمی“ کرے تو انہیں کس طرح خوش آمدید کہنا ہے اور ان کو ریجھانے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کرنے ہیں، گیتا مکھی اس تربیت کی ماہر ہے اور گیتا مکھی سے اکثر ثمرین کی چپقلش ہو جاتی ہے۔“ یہ ساری باتیں تن بدن میں آگ لگا دینے والی تھیں۔ حکم جی اور اس کے حواریوں کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، وہ بالکل سچ ثابت ہو رہا تھا۔

ان باتوں سے تصدیق ہوئی تھی کہ جیکی کی حسین محبوبہ شکنتلا والی کہانی بھی بالکل سچ

تھی۔ شکنتلا کی ”پریم کہانی“ کی وجہ سے حکم جی اسے اپنی پتنی تو نہ بنا سکا لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے اس نے شکنتلا کو فیری یا پری کا درجہ دے دیا۔ اس کے لئے سبز رنگ کا چناؤ کیا گیا اور وہ راج بھون کی سبز پری کے طور پر حکم جی کے گھڑے کی مچھلی بن گئی۔ ایسی نہ جانے کتنی شکنتلائیں اور ثمرینیں حکم جی اور جارج گورا وغیرہ کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں اور ابھی چڑھنے والی تھیں۔

میڈم کے جانے کے بعد بھی وہ اور عمران ثمرین کے بارے میں بات کرتے رہے۔ عمران کو بھی اس لڑکی سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ”اس کا معاملہ بھی تمہاری ثروت جیسا ہی لگتا ہے...... وہ کیا کہتے ہیں، ٹوٹی کہاں کمند۔ مجھے ایک وظیفہ یاد آ رہا ہے جو ایسی لڑکیوں کو مصیبت سے بچانے کے لئے پڑھتا جاتا ہے۔ اگر وہ پورا یاد آ گیا تو شاید ہم اس کو بچا لیں۔“ وہ ایسی ہی گول مول باتیں کرتا تھا۔

اس رات میں سونے کے لئے لیٹا تو دیر تک باروندا جیکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا، اپنے کٹے پھٹے جسم کے ساتھ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آگ اور ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ مجھے بھولنا نہیں۔ مجھے یاد رکھنا اور میری بے بسی کو بھی اور اپنا حوصلہ بلند رکھنا۔ میں نے تمہیں کمزور نہیں رہنے دیا ہے۔ اپنی ساری آگ تمہیں سونپ دی ہے اور اپنے دشمن کے بارے میں بھی بتا دیا ہے......

پھر میرا دھیان سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ میں اسے مندر کے تہ خانوں میں چھوڑ آیا تھا اور کہہ آیا تھا کہ میں وہ کام پورا کر کے آؤں گا جس کے لئے وہ اپنا سر ہتھیلی پر لے کر پھرتی رہی ہے۔ میرا نشانہ جارج گورا تھا اور میں جلد از جلد اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں جوں جوں جارج گورا کے بارے میں زیادہ جان رہا تھا اور اس کی خصلت کو زیادہ پہچان رہا تھا، میرے دل میں اس کے لئے نفرت اور انتقام کا بہاؤ تیز تر ہو رہا تھا۔ وہ گورا چمڑی والا یہاں کے لوگوں کو شاید انسان ہی نہیں سمجھتا تھا۔ زرگاں اس کے لئے شکار گاہ تھی۔ یہاں کے مرد و زن اس کے لئے پُر گوشت چوپایوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ خاص طور سے مقامی خواتین اس کا من پسند شکار تھیں اور وہ اس حوالے سے کسی طرح کی شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ برملا کہتا تھا...... مجھے مقامی عورتیں بھاتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرے دل میں انہیں حاصل کرنے کی خواہش جاگتی ہے۔ میں اس حوالے سے کمزور ہوں۔ ہوا اور پانی کے بغیر تو میں شاید زندہ رہ جاؤں لیکن خوش شکل نمکین عورتوں کے بغیر نہیں۔

یہ عورت باز شخص میری سلطانہ کو داغ دار کر چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر بدنامی کا ٹیکا لگا چکا تھا۔ وہ راجپوت خاندان کی طرح دار بیٹی تھی۔ جارج نے اس کا پندار توڑا تھا، اس کی آن بان خاک میں ملائی تھی...... اور وہ ابھی تک زندہ تھا، راج بھون کی بلند دیواروں کے اندر سانس لے رہا تھا، زندگی کی ساری لذتوں سے بہرہ مند ہو رہا تھا...... اور حمیدہ جیسے نئے شکار پھانس رہا تھا۔

میرے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلے الاؤ بن گئے۔ میں بے قرار ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا...... مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک دوسرے بستر پر عمران سو رہا تھا۔ اسے کیا پتا تھا، میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ میں ہر مصلحت اور اندیشے کو بالائے طاق رکھ دینے کے مرحلے میں آ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں ایک واشگاف فیصلے تک پہنچ گیا...... میں نے دیوار پر لٹکے ہوئے ہولسٹر میں سے بھرا ہوا ریوالور نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھا اور جیکٹ پہن لی...... ایک سرخ دھندسی میری آنکھوں کے سامنے چھاتی چلی جا رہی تھی۔ میں عمران کو سوتا چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

رات کے قریباً دس بج چکے تھے۔ نیم گرم کمرے سے باہر سردی تھی اور میں جانتا تھا کہ لال بھون سے نکلتے ہی میرا سامنا کڑاکے کی ٹھنڈ سے ہوگا لیکن سردی، گرمی، بھوک پیاس، چوٹ اور بے آرامی کی دی ہوئی تکلیفیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ یہ تکلیفیں میرے بے تکلف دوستوں جیسی ہو گئی تھیں۔ مجھے ان کے ساتھ مل بیٹھنا اور ان کی ''کمپنی'' میں خوش رہنا آ گیا تھا۔ جیسے نہایت تیز مرچ مسالے کی وجہ سے آنسو آ جاتے ہیں لیکن انسان مزہ بھی محسوس کرتا ہے...... کچھ ایسا ہی مزہ مجھے دکھ جھیل کر آتا تھا۔

میں دو راہداریوں میں سے گزر کر ایک بڑے لاؤنج میں پہنچا۔ ایک قریبی ہال نما کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ٹی وی اور اس جیسی دوسری الیکٹرانکس اشیاء یہاں خال خال ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔ ٹی وی پر وی سی آر کے ذریعے لڑکیاں کوئی رومانی فلم دیکھ رہی تھیں...... یا شاید انہیں ''تربیت'' کے طور پر دکھائی جا رہی تھی۔ گاہے بگاہے نوخیز لڑکیوں کی کھلکھلاتی ہنسی بند دروازے کے عقب سے اُبھرتی تھی۔ میں برآمدے میں چلا آیا۔ کڑک سردی نے استقبال کیا۔ وسیع لان میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف الاؤ روشن تھا مگر وہاں کوئی پہرے دار نظر نہیں آیا۔ غور کیا تو پہرے دار صاحبان ایک کھڑکی سے چپٹے نظر آئے۔ وہ تاریکی میں کھڑے تھے اور ادھ کھلی کھڑکی میں سے ٹیلی وژن دیکھ رہے تھے۔ یہاں یہ چیز یقیناً ''عجوبہ تفریح'' کے زمرے میں آتی تھی۔

میں پہرے داروں کی نظر بچاتا ہوا باغیچے کی طرف چلا گیا۔ دن کی روشنی میں، مَیں اس جگہ کا معائنہ کر چکا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ لال بھون سے چوری چھپے نکلنے کے لئے یہ راستہ بہترین ہے۔ سامنے سے ایک گارڈ ٹارچ ہلاتا آ رہا تھا۔ میں جلدی سے ایک مور پنکھ کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہاں سے ایک روش پر چلتا ہوا میں دس فٹ اونچی بیرونی دیوار تک پہنچ گیا یہاں کچنار، مہندی اور جامن وغیرہ کے پیڑ تھے۔ میں ایک درخت پر چڑھ کر دیوار پر آیا اور پھر خاموشی سے دوسری طرف کود گیا۔

لال بھون کی عمارت پانچ چھ کینال میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں عمارت کا چکر کاٹ کر روشن سڑک پر آ گیا۔ یہاں اکا دکا گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، سڑک کشادہ ہوتی گئی اور رونق میں بھی قدرے اضافہ ہو گیا۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیدھا راج بھون کی طرف جا رہا تھا۔ راج بھون کے بلند و بالا محرابی دروازے کی روشنیاں کافی دور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ آج میں نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ اس سے پہلے میں اور عمران پگڑیوں میں چہرہ چھپا کر زرگاں میں پھرتے رہے تھے، آج پگڑی نہیں تھی اور پتا نہیں کیوں میں چہرہ چھپانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا، یہاں میرا کوئی شناسا مجھے پہچان سکتا ہے۔ میں جارج کا مفرور قیدی تھا اور اب تو اور کئی الزام بھی میرے سر آ چکے تھے جن میں تیواری لال اور ڈیوڈ کے قتل کے علاوہ ماریا کے اغوا کو بھی شامل کیا جا سکتا تھا۔

ان اندیشوں کو دیوانی ٹھوکر سے اُڑاتا ہوا میں سیدھا راج بھون کے بلند و بالا دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے اور رگوں میں لہو کی جگہ آگ دوڑ رہی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق، ابھی میں راج بھون کے عظیم الشان دروازے سے پچاس ساٹھ قدم دور ہی تھا کہ مسلح گارڈز نے مجھے روک لیا۔

''کیا بات ہے...... کہاں جا رہے ہو؟'' ایک افسر نما شخص نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''میں جارج گورا سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میرا لہجہ سپاٹ اور مستحکم تھا۔

کئی گارڈز میرے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ اچانک مجھے پہچان لیا گیا۔ ایک شخص نے حیرت بھری آواز میں کہا۔ ''...... یہ تو وہی ہے...... مختار کی بیٹی کا شوہر۔''

سب سناٹے میں رہ گئے۔ میرے چہرے پر ٹارچوں کی روشنی پھینکی گئی۔ ایک دم دو گارڈز نے رائفلوں کی رخ میری طرف کر دیا۔ ''تم مہروز ہو؟'' انچارج گارڈ کی چونکی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"ہاں......اور جارج کو بتاؤ۔ میں اس سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔"

"ملاتے ہیں......ملاتے ہیں......ابھی تم ادھر آؤ۔"

انچارج نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ ایک دوسرے گارڈ نے تیزی سے میری تلاشی لی اور ریوالور میری قمیص کے نیچے سے نکال لیا۔

وہ مجھے مین گیٹ کے پاس ہی واقع ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف کھینچنے لگے۔

"چھوڑ دو۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "تم نے میری تلاشی لے لی ہے، اب مجھے جارج کے پاس جانے دو۔ میں اس سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"تمیز سے بولو اور کیا بات کرنے آئے ہو تم؟"

"میں اس کے اعلان کے جواب میں آیا ہوں۔ اس نے سامبر کا چیلنج دے رکھا ہے۔ میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔" بہت سے لوگ اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے اور میں یہی چاہتا تھا۔

میں نے چیلنج کی بات کی تو گارڈز میں ایک دم سنسنی سی دوڑ گئی۔ ان کا سخت رویہ بھی قدرے نرم پڑ گیا۔ میں نے اپنی بات دُہرائی۔ "جارج کو بتا دو کہ میں سامبر میں اس کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔"

"کوئی نشہ وغیرہ تو نا ہیں کر رکھا۔ میرا مطلب ہے جو کہہ رہے ہو، ہوش حواس میں کہہ رہے ہو نا؟" انچارج گارڈ کے لہجے میں ہلکا سا طنز داخل ہو گیا۔

"ہاں، ہوش حواس میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی ہوش حواس کے ساتھ سنو۔ مجھے جارج سے ملواؤ۔"

مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ایک بار پھر مزید احتیاط سے میری تلاشی لی گئی۔ اردگرد ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ انچارج گارڈ نے مجھ سے کچھ مزید سوالات پوچھے جن کے میں نے طے شدہ جواب دیئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں یہاں اکیلا پہنچا ہوں اور آج ہی آیا ہوں۔

قریباً پندرہ منٹ بعد میں نے ایک منحوس صورت کو اپنے روبرو پایا۔ یہ جارج کا بہنوئی اور ماریا کا شوہر سرجن اسٹیل تھا۔ وہ خاصا دراز قد تھا۔ نشے کے سبب اس کی آنکھیں قدرے سوجی ہوئی تھیں۔ چند دن پہلے میری رائفل کی گولی اس کے بھائی کو لگی تھی اور وہ جہنم واصل ہو گیا تھا۔ اس موت کا غم بھی اس کے چہرے پر تلاش کیا جا سکتا تھا۔

اس نے مجھے سرتاپا دیکھا اور اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں حقارت آمیز تجسس نظر آنے لگا۔ وہ بناوٹی لہجے میں بولا۔ "خوش آمدید۔ تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوا۔ بہت اچھا

بات......کہ تم کو ڈھونڈنے میں ہام کو زیادہ "اسٹرگل" نا ہیں کرنا پڑا۔"

میں نے بے خوف ہو کر کہا۔ "مجھے بھی خوشی ہے کہ مجھے پالتو کتوں سے نہیں لڑنا پڑا۔ میں سیدھا ان کے مالک سے دو دو ہاتھ کر سکتا ہوں۔"

"تم اپنی بکواس بند کرو۔" انچارج پھنکارا اور اس نے میرے سر پر چوٹ لگانے کے لئے رائفل کا دستہ فضا میں بلند کیا۔

"نہیں۔" سرجن اسٹیل نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔ "اس نے چیلنج قبول کیا۔ اب یہ ہام کی حفاظت میں ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوئیں گا، اب رُول کے مطابق ہوئیں گا۔"

انچارج پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد دو تین اور اہم افراد وہاں آن موجود ہوئے، یہ مقامی فوج کے افسران ہی لگتے تھے۔ میں نے خدا بخش کو بھی دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جو چند ماہ پہلے موہن کمار وغیرہ کے ساتھ نل پانی پہنچا تھا تا کہ مجھے اور سلطانہ کو چھوٹے سرکار کی پناہ سے نکال کر واپس زرگاں لا سکے۔ مجھے پہچاننے کے بعد ہر چہرے پر سنسنی کے آثار نظر آ رہے تھے......مجھ سے بار بار پوچھا گیا کہ کیا میرے ساتھ کوئی اور بھی یہاں زرگاں پہنچا ہے؟ میں نے ہر بار اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔ دراصل ان لوگوں کو انور خاں کے بارے میں شک تھا......سرجن اسٹیل نے مجھ سے کہا۔ "اہم کو معلوم ہوا تھا کہ وہ بھگوڑا انور خاں بھی یہاں آنا مانگتا۔ وہ بھی چیلنج قبول کرتا۔"

"وہ بھگوڑا نہیں سرجن...... وہ باغی ہے اور ابھی اس جیسے اور کئی باغی تم لوگوں کو ناکوں چنے چبوائیں گے اور جہاں تک اس کے آنے کی بات ہے تو اس کی جگہ میں آ گیا ہوں۔"

ہمارے درمیان کچھ دیر تک گفتگو جاری رہی۔ سرجن اسٹیل کی طرف سے خدا بخش کوئی پیغام لے کر جارج گورا کی طرف گیا۔ اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ جارج گورا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر تک سرجن اسٹیل اور فوجی افسران سے کھسر پھسر کی۔ اس کے بعد خدا بخش نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "سامبر سے پہلے کے دو چار دن تم کہاں رہنا چاہت ہو؟"

"میں تمہارے اس راج بھون کے سوا کہیں بھی رہنے کو تیار ہوں۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"یہاں اور کون سی جگہ ہے؟"

میں نے چند سیکنڈ تک سوچنے کی اداکاری کی پھر کہا۔ "تم لوگ مجھے پگوڈا میں ٹھہرا سکتے

ہو۔"

"پگوڈا میں کیوں؟" سرجن اسٹیل نے دریافت کیا۔

"وہاں میری پرانی ساتھی کورتی (میڈم صفورا) موجود ہے۔"

"تو تم کورتی کے پاس رہنا مانگتا۔" اسٹیل نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ میں نے بھی اسی طرح سر کو حرکت دی۔

"لیکن کورتی تو کہیں اور ہے۔" خدا بخش نے کہا۔

"وہ جہاں بھی ہے، میں اس کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔"

"او کے۔ اس کا ارینج منٹ ہو جائیں گا۔" اسٹیل بولا۔

گفتگو کے دوران میں وہ برابر مجھے تفتیشی نظروں سے گھور رہا تھا۔ کسی وقت اس کے تاثرات عجیب سے ہو جاتے تھے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے میرے سر کے اندر منحوس چپ پلانٹ کی تھی۔ وہ چپ جو میرے جسم کا حصہ بن گئی تھی اور جسے اپنی مرضی سے جدا کرنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ غالباً اسٹیل کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے۔ ان میں سے ایک اہم سوال یہ رہا ہوگا کہ مجھے زرگاں سے باہر ہر طرف دور دور تلاش کیا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ سگنل وصول کرنے والے کئی انٹینا یہاں وہاں چکرا رہے ہوں۔ میں اس ساری تلاش کو ناکام کر کے یہاں راج بھون کے عین سامنے آ نمودار ہوا تھا۔ یہ کیونکر ہو سکا تھا؟ کیا یہ ایک اتفاق تھا؟ یا پھر اس کی چپ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا؟ یا پھر کوئی اور مسئلہ ہو گیا تھا؟

میں سمجھ گیا کہ بہت جلد مجھے اس چپ کے حوالے سے بھی اسٹیل وغیرہ کو جواب دینا پڑے گا۔

کچھ دیر تک مجھ سے پوچھ تاچھ جاری رہی...... پھر کڑے پہرے میں مجھے میڈم صفورا کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ میں گھوڑا گاڑی میں تھا۔ تین مسلح گارڈ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک گھوڑا گاڑی آگے اور ایک پیچھے تھی۔ ان میں بھی چوکس محافظ موجود تھے۔ ہر نگاہ میرے لئے تجسس، حیرت اور طنز کا ملا جلا تاثر تھا۔ جو کوئی دیکھ رہا تھا، مجھے تولنے والی نظروں سے ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میرے اندر کیا ہے جس کے بل بوتے میں جارج گورا جیسے شخص کو للکارنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اپنے انجام کی پروا کئے بغیر موت کے جبڑوں میں سر دے رہا ہوں۔ یہ گارڈز وغیرہ اپنے افسران کی وجہ سے چپ تھے ورنہ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ پر حقارت اور طنز کے تیر چلانا شروع کر دیتے۔

پھر بھی ایک گارڈ سے برداشت نہیں ہو سکا، وہ ایک طرف تھوک کر بولا۔ "بھگوان کا

شکر کرو، تمہیں بڑوں کی طرف سے رکھشا مل گئی ہے، ناہیں تو اس گاڑی کے اندر تمہاری ایک بوٹی بھی نہ ملتی۔"

"تم بھی شکر کرو کہ میں یہاں کتوں بلوں سے نہیں، ان کے مالک سے لڑنے کے لئے آیا ہوں۔"

گارڈ نے مشتعل ہو کر میرا گریبان پکڑنا چاہا لیکن دوسرے نے اسے روک دیا۔ "چھوڑ دو یار! یہ اپنی موت آپ مرنے والا ہے۔"

"اور یہ کوئی آسان موت ناہیں ہووے گی، اس کے ساتھی کی طرح اس کی بھی ایک ایک ہڈی ٹوٹے گی پہلے۔ جتنا بڑا اپرادھ ہے اس سے بڑی سزا ہووے گی۔"

"کس اپرادھ کی بات کرتے ہو تم؟ میں نے کسی کی ماں بہن کے ساتھ کیا کر دیا ہے؟"

"تم نے کیا ہے...... اور یہ ساری دنیا جانت ہے۔ تم ان لوگن میں شامل ہو جنہوں نے سرجن صاحب کی دھرم پتنی کو اغوا کیا اور ان کی آبرو خراب کی۔" گارڈ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ "اور تم نے ان کو گولی مار کر زخمی بھی کیا۔" وہ اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ماریا کی بات کر رہا ہے۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ "مجھے تم جیسے کرائے کے ٹٹوؤں کے سامنے صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی سن لو کہ سرجن کی پتنی اور جارج کی بہن ماریا کو سلطانہ کے بدلے میں اُٹھایا گیا تھا...... اور وہ بدبخت اُٹھائے جانے کے قابل تھی لیکن یہاں دوسری بات بھی یاد رکھو۔ اسے اُٹھانے والے مسلمان تھے۔ انہوں نے تمہاری عورت کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو تم نے ان کی عورت کے ساتھ کیا۔"

گارڈ پھنکارا۔ "کوئی ناری بھی کسی مرد پر ایسا جھوٹا الزام ناہیں لگا سکتی...... کیا تم انکار کرت ہو کہ شریمتی ماریا کی عزت خراب ہوئی؟"

"نہیں، میں انکار نہیں کرتا۔ شریمتی جی کی عزت خراب ہوئی لیکن کسی نے نہیں، اس نے خود کی۔ اس نے اندھیری رات میں ایک پارسی کو اپنا جسم رشوت کے طور پر پیش کیا اور اس کی مدد سے بھاگ نکلی......"

"یہ بکواس ہے۔" گارڈ گرجا۔ "اس طرح کی باتیں تم مُسلوں نے ہی پھیلائی ہیں۔ اپنے گندے اپرادھ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے تم لوگن نے۔ ناری کی عزت......"

"کون ناری؟ کیسی عزت؟" میں نے بھڑک کر اس کی بات کاٹی۔ "یہ گوری چمڑی والے جنہیں تم نے اپنا آقا بنایا ہوا ہے، عزت آبرو، پوترتا اور شرم حیا جیسے لفظوں کا مطلب ہی

نہیں جانتے۔ ان کے دیس میں جا کر دیکھو، یہ ماریا جیسی میمیں ایک برگر اور ایک کوک کے لئے کسی کے ساتھ بھی جانے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں...... اور یہاں برگر کوک کا نہیں، جان کا معاملہ تھا۔''

گارڈ نے دانت پیسے۔ ''بھگوان کی سوگند...... اگر مجھے بڑوں کا ڈر نہ ہوتا تو میں اسی جگہ تمہاری کھوپڑیا میں سوراخ کر دیتا۔''

''اچھا، تم دونوں چپ ہو جاؤ۔'' دوسرے گارڈ نے ذرا تحکم سے کہا۔ وہ قدرے سینئر دکھائی دیتا تھا۔

اسی دوران میں اس قافلے کی گاڑیاں لال بھون کے سامنے پہنچ گئیں۔ کئی دیگر اہم عمارتوں کی طرح یہ عمارت بھی جنریٹر کی برقی رو سے روشن تھی۔ گاڑیاں مین دروازے کے سامنے رک گئیں اور وردی میں ملبوس دو افسر نما افراد لال بھون کے اندر چلے گئے۔ یقینی بات تھی کہ وہ میڈم صفورا کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے گئے تھے۔ مجھے میڈم کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی پر اعتماد تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی گفتگو سے ان افسران کو کسی طرح کا شک نہیں ہونے دے گی۔ میں ابھی صرف چند گھنٹے پہلے یہاں سے گیا اور اب ایک نئی حیثیت سے واپس آیا تھا۔

دونوں افسران پندرہ بیس منٹ بعد واپس آئے اور مجھے نیم گرم گھوڑا گاڑی سے اُتار کر لال بھون کے اندر لے گئے۔ گیٹ پر موجود گارڈز اور دیگر ملازمین نے اس سے پہلے میری صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں میڈم صفورا کا وہی مہمان ہوں جو چند روز پہلے یہاں پہنچا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اب ان لوگوں میں سے کچھ نے مجھے سلطانہ کے شوہر کی حیثیت سے پہچان لیا ہو، بہرحال وہ سب خاموش تھے۔

لال بھون کی عالی شان راہداریوں سے گزر کر میں جلد ہی میڈم صفورا کے سامنے تھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ نیند سے جاگی ہے۔ میری توقع کے عین مطابق میڈم صفورا مجھ سے اسی انداز میں ملی جس میں اسے ملنا چاہئے تھا۔ اس نے قدرے حیرت ظاہر کی کہ میں اس وقت اس حال میں یہاں زرگاں میں موجود ہوں۔ اس نے اپنی اس حیرت میں ہلکی سی ''ناگواری'' بھی شامل کر لی تھی۔

ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی پھر فوجی افسر نے میڈم صفورا کو بتایا۔ ''جو کچھ بھی ہے میڈم، یہ شخص فی الحال سر جارج کے مہمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ سر جن صاحب کا حکم ہے کہ اسے یہاں لال بھون میں رہنے کی آ گیا دی جاوے اور ہر طرح کی سہولت بھی مہیا کی

جاوے۔ اس کے بارے میں مزید احکامات سر جارج بعد میں دیویں گے۔''

میڈم نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر یہ سر کا آرڈر ہے تو یہ یہاں رہ سکتا ہے لیکن اس کی حفاظت......''

''اس کے لئے آپ کوئی چنتا نہ کریں۔ ٹھیک اسی وقت سے یہ عمارت ہمارے ''سکیورٹی گھیرے'' میں رہے گی۔ عمارت کے اندر بھی سر جارج کی اسپیشل فورس کے لوگن موجود رہیں گے۔''

میڈم صفورا کو علیحدگی میں کچھ ہدایات دینے کے بعد فوجی افسران واپس چلے گئے......

جونہی تنہائی میسر آئی، ایک دروازے کے عقب سے عمران بھی نمودار ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''اوئے گھامڑ، یہ کیا گڑ بڑ گوٹالا کیا ہے تُو نے؟'' اس نے مجھے گدی سے دبوچ لیا اور زور سے آگے پیچھے ہلایا۔

''سب کچھ بتاتا ہوں۔ بتانے کے لئے ہی تو یہاں آیا ہوں۔'' میں نے اس سے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے کہا۔

''غضب خدا کا اتنا بڑا دھوکا۔ نہ کوئی صلاح نہ مشورہ۔ مجھے سوتا چھوڑ کر نکل گئے اور جا پہنچے راج بھون کے سامنے...... یار! سچی بات ہے، مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ تم اتنے بے وفا اور کمینے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اتنا بڑا قدم اُٹھانے سے پہلے تم نے مجھ سے یا میڈم سے بات تک نہیں کی۔ نہیں نہیں...... ضرور میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا......'' وہ اداکاری کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ واقعی بہت حیران بھی تھا۔

''تم نے جو کچھ سنا ہے، وہ صحیح ہے ڈیئر۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یعنی تم جارج گورا کا چیلنج قبول کر آئے ہو...... اور اسے للکار آئے ہو کہ اس سے دوبدو لڑائی کرو گے؟''

''ایسا ہی ہے۔''

وہ میڈم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میڈم! اس نے ضرور کوئی زہریلی چیز کھا لی ہے۔ یہ زہر اس کے دماغ کو چڑھ گیا ہے یا پھر اس نے نشہ کیا ہے۔ اس کا ڈوپ ٹیسٹ کراؤ میڈم...... یہاں ڈوپ ٹیسٹ ہو سکتا ہے نا...... چل بھئی چل...... اُٹھ......''

اسی دوران میں کمرے کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ گیتا نے میڈم کو پکارا۔ غالباً کوئی ایمرجنسی کام تھا۔ میڈم 'ابھی آئی' کہہ کر باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی عمران ایک دم

سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے گہری فکرمندی جھانکنے لگی ہے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تابی! یہ کوئی اچھا کام نہیں کیا تُو نے...... کم از کم مشورہ ہی کر لیتا۔ اس کی مطلب ہے کہ تُو مجھے اپنا نہیں سمجھتا۔''

''اپنا سمجھتا ہوں لیکن مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔ مشورہ کرتا تو تم مجھے کبھی نہ جانے دیتے۔ اس کام میں سے سیکڑوں خطرے نکال کر مجھے بتا دیتے اور بعد میں ہو سکتا تھا کہ یہ سارے خود مول لے لیتے۔''

''تو کیا ساری مصیبتوں، پریشانیوں اور سارے خطروں کا ٹھیکا تُو نے لے لیا ہے؟''

''یہ ساری مصیبتیں اور پریشانیاں پیدا بھی تو میری ہی کی ہوئی ہیں۔ تمہارا جارج اور حکم وغیرہ سے کیا واسطہ ہے۔ یہ ساری دشمنیاں میری ہی پالی ہوئی ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن میں نے آج تک تم سے لیا ہی کیا ہے۔ ہر قدم پر تمہارا سہارا مانگتا رہا ہوں اور تم کسی بھی چیز کی پروا کئے بغیر یہ سہارا مجھے دیتے رہے ہو لیکن اب نہیں...... اب پلیز مجھے اپنے طور پر کچھ کرنے دو۔ مجھے میرے ہونے کا احساس ہونے......''

''لیکن تابی......''

''نہیں عمران! اب اس بارے میں کچھ نہ بولو۔ ویسے بھی جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اب اگر کر سکتے ہو تو ایک کام کرو...... کسی بھی ذریعے سے انور خاں تک اطلاع پہنچا دو۔''

''کیسی اطلاع؟''

''یہی کہ اب وہ زرگاں نہ آئے۔ وہ جس کام کا ارادہ رکھتا تھا، وہ اب میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اب اسے جان مصیبت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

عمران ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اسی دوران میں میڈم بھی واپس آ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش اور برہمی تھی۔ وہ بولی۔ ''تابش! یہ بہت جذباتی فیصلہ کیا ہے تم نے۔ یہ قدم اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم نے آناً فاناً خود کو ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال لیا ہے۔''

''مصیبت میں تو ہم سب ہیں ہی۔''

''لیکن تمہیں کیا ضرورت تھی جارج کے ''مرضی کے محاذ'' پر لڑنے کی؟ تم اس کام کے لئے کوئی اور راستہ بھی ڈھونڈ سکتے تھے۔ ہم تینوں مل کر سوچتے تو کوئی حل نکل آتا۔''

''اب تو جو ہونا تھا ہو چکا میڈم۔'' میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

وہ بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ''بے وقوفی ہوئی ہے تم سے۔ کم از کم مشورہ ہی کر لیتے تم...... جارج نے ایک پھندا لگایا ہوا ہے اور تم نے اس کے پھندے میں آنے کے لئے شاندار پھرتی دکھائی ہے۔ اب واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے تمہارے پاس۔''

''میں واپس آنا چاہتا بھی نہیں ہوں میڈم...... اور آپ اتنا زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے اب زمانے کا بہت گرم سرد دیکھ لیا ہے۔ مرنے مارنے کی ہمت آ چکی ہے مجھ میں۔ میں جارج گورا کے لئے تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گا۔ آپ یقین رکھیں، اس شخص کو اس کی توقع سے کہیں زیادہ مزاحمت ملنے والی ہے۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

میرے لہجے کی حرارت اور توانائی کو محسوس کر کے میڈم کے چہرے کے تناؤ میں ایک بے ساختہ کمی واقع ہوئی۔ وہ ایک نشست پر بیٹھ گئی اور مجھے تولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ پچھلے چند ماہ میں تم بہت زیادہ بدلے ہو۔ تمہارے بارے میں اُڑتی اُڑتی خبریں بھی ہم تک پہنچتی رہی ہیں۔ ان میں رنجیت پانڈے والی خبر بھی شامل تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے تن تنہا پانڈے سے مارا ماری کی تھی اور وہ اس مارا ماری میں زخمی بھی ہوا تھا...... واٹ سو ایور...... میں سمجھتی ہوں کہ یہ جارج بالکل اور طرح کا بندہ ہے۔ میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہو کہ اس کا ٹمپرامنٹ ایک پروفیشنل فائٹر جیسا ہو چکا ہے۔ پچھلے تین چار سالوں میں اس نے اس طرح کی لڑائیوں کا خاطر خواہ تجربہ حاصل کیا ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ وہ ہر طرح کی فائٹنگ میں ایک نہایت طاق اور سخت جان حریف ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ وہ یہاں اسٹیٹ میں آباد ہونے سے پہلے انگلینڈ میں کیا کرتا تھا؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''برمنگھم میں مارشل آرٹس کا ایک بہت بڑا کلب ہے۔ یہ کلب 1925ء میں جارج کے دادا نے شروع کیا تھا۔ دادا کے بعد جارج کا باپ اور پھر خود جارج اس کلب کا کرتا دھرتا رہا۔ فائٹنگ آرٹ میں اس شخص کی دلچسپی خاندانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مجرمانہ ذہن کا مالک بھی ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے دو دھاری تلوار کہہ سکتے ہیں۔ اس تلوار کو زہر کی پان لگانے کے لئے حکم جی کی دوستی اور مکمل پشت پناہی بھی موجود ہے۔ ہم اس برصغیر کے لوگ فطری طور پر محکوم طبیعت کے مالک ہیں۔ جو چیز باہر سے اور خاص طور سے مغرب سے آتی ہے، وہ ہمیں بہت جلد متاثر کرتی ہے اور اگر اس چیز میں واقعی کوئی بات بھی ہو تو پھر تو سونے پر سہاگا ہے۔ جارج باہر سے آیا ہے اور اس میں ٹیلنٹ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی لوگ پوجنے کی حد تک اس سے متاثر ہیں لیکن توہم پرست تو اسے شکتی کا دیوتا تک کہہ ڈالتے ہیں۔

حکم جی کی طرف سے اس کو ''سر'' کا خطاب ملا ہوا ہے۔''

''اور دوسری طرف ان سر جی نے راجواڑے کو اپنی شکار گاہ بنایا ہوا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ طاقت اپنے قانون خود بنالیتی ہے۔ جس کے پاس اختیار ہوتا ہے اس کے لئے ہزار ہا آسانیاں مہیا ہو جاتی ہیں اور اگر اختیار گورے کے پاس ہو تو پھر کیا ہی بات ہے۔ گورا ہم جیسے لوگوں پر اپنا اختیار استعمال کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ لوگ یونہی تو دو سو سال یہاں حکومت نہیں کر گئے۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''میڈم! میں اپنی جلد بازی پر شرمندہ ہوں لیکن ایک بار پھر کہوں گا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ میرے دو کام کر دیں۔''

''کیسے کام؟''

''زیادہ مشکل کام نہیں۔ آپ بہ آسانی کر سکتی ہیں میڈم۔''

''کچھ کہو گے تو پتا چلے گا۔''

''کسی طرح نل پانی میں انور خاں تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ یہاں آنے کا پروگرام فوراً ختم کر دے کیونکہ میں نے جارج کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔''

''میڈم صفورا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... اور دوسرا کام۔''

''مجھے اس عمارت میں ایک علیحدہ پورشن دیں جہاں میں دو چار دن میں اپنی فٹنس کو بہتر کر سکوں۔''

''علیحدہ پورشن کی کیا ضرورت ہے، یہاں ایک چھوٹا سا ''جم'' موجود ہے۔ تم چاہو تو صبح گیارہ بارہ بجے تک اسے آزادی سے استعمال کر سکتے ہو لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ تو پتا چلے کہ سامبر رچنا والے کیا کہتے ہیں۔''

''سامبر رچنا والے کون؟'' میں نے پوچھا۔

''پنڈت مہاراج اور ان کے چیلے۔ اس سامبر کی رسم میں دو حریفوں کے آمنے سامنے آنے کا حتمی فیصلہ یہ لوگ ہی کرتے ہیں۔ باقاعدہ کنڈلیاں وغیرہ نکالی جاتی ہیں اور مناسب وقت بھی طے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں حریف کس طریقے سے ایک دوسرے کا سامنا کریں گے۔ یعنی لڑائی خالی ہاتھ ہوگی یا کوئی ہتھیار استعمال کیا جائے گا...... اور اگر ہتھیار استعمال کیا جائے گا تو کون سا ہوگا اور اس ہتھیار سے بچاؤ کے لئے

کیا انتظام ہوگا۔ اصولی طور پر سامبر کی لڑائی صرف حریف کو زیر کرنے کے لئے ہوتی ہے لیکن کچھ موقعوں پر ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ شدید زخمی ہوئے ہیں یا پھر ان کی جان ہی چلی گئی ہے۔''

ہم تینوں کے درمیان رات آخری پہر تک گفتگو جاری رہی۔ اس گفتگو کے آخر میں میڈم نے وعدہ کیا کہ وہ صبح سب سے پہلا کام یہی کرے گی کہ کسی طرح انور خاں تک میرا پیغام پہنچائے گی۔ اس لال بھون میں ایک بندہ ایسا تھا جس پر میڈم اندھا اعتماد کر سکتی تھی۔ اس کی حیثیت یہاں میڈم کے خاص الخاص کارندے جیسے ہوگئی تھی۔

میڈم کے جانے کے بعد میں اور عمران سو گئے۔ باروندا جیکی نے میری تربیت کے دوران میں جو ہدایات مجھے دی تھیں، ان میں یہ بھی شامل تھا کہ میں نرم بستر پر سونے سے گریز کروں اور کئی دوسری ہدایتوں کی طرح میں اس ہدایت پر بھی عمل کرتا تھا بلکہ مجھے ایسا کرنا اچھا لگتا تھا۔ یہاں بھی میں قالین پر چادر بچھا کر سوتا تھا۔ عمران نے کئی بار چاہا کہ میں اس کی طرح بستر استعمال کروں لیکن میں ٹال گیا...... ہم دوپہر سے کچھ ہی دیر پہلے بیدار ہوئے۔ کئی دن کے ابر آلود موسم کے بعد یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ بھون کے وسیع سبزہ زار میں نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں میڈم نے ہی بیدار کیا تھا۔ وہ خاصی جلدی میں نظر آتی تھی۔ اس نے اطلاع دی۔ ''جارج صاحب آرہے ہیں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے تیار ہو جاؤ...... اور تم بھی کسی کمرے میں چلے جاؤ۔ جب تک جارج صاحب یہاں ہیں، باہر نہیں آنا۔'' میڈم نے آخری الفاظ عمران سے مخاطب ہو کر کہے۔

عمران سے بات کرتے ہوئے وہ اس سے نگاہ نہیں ملاتی تھی۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ زہریلے سانپ والے ڈرامائی واقعے کے بعد وہ عمران کو معاف کر چکی ہے یا کم از کم اتنا تو ہو چکا ہے کہ وہ اسے برداشت کر رہی ہے لیکن اس کی دلی کیفیت کے بارے میں ابھی حتمی رائے قائم کرنا مشکل تھا۔

''آپ کا کیا اندازہ ہے، جارج کے آنے کا مقصد کیا ہوگا؟'' عمران نے پوچھا۔

''میرے خیال میں اس کے ساتھ پنڈت مہاراج ہوں گے جو کنڈلی وغیرہ نکالیں گے...... اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ سامبر کے بارے میں ڈسکشن ہو۔'' میڈم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور میڈم کا فراہم کردہ لباس پہنا۔ یہ پینٹ شرٹ اور سویٹر پر مشتمل تھا۔ شیو کئی دن سے بڑھی ہوئی تھی۔ مجھے شیو کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا۔ آدھ

پون گھنٹے میں، مَیں بالکل فریش ہو گیا اور حقیقتاً میں اندر سے بھی بہت فریش تھا۔ راج بھون کے سامنے جا کر جارج گورا کو للکارنے کے بعد میرے اندر کا غبار نکل گیا تھا۔ میرے رگ و پے میں دوڑنے والی بے پناہ بے قراری ایک طرح کے ٹھہراؤ میں بدل گئی تھی۔ اب مجھے یہ سوچ کر لطف محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے بدترین دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کروں گا اور اس کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آؤں گا۔

جارج گورا کی آمد کی وجہ سے لال بھون میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ملازمین بھاگے پھر رہے تھے۔ گارڈز بھی چوکس اور ہوشیار نظر آتے تھے۔ قریباً ایک بجے کے قریب جارج گورا اپنے دو درجن اسپیشل گارڈز کے ساتھ لال بھون کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ اس کے یہ اسپیشل گارڈز پگڑیوں کے بغیر تھے۔ ان میں مجھے چند سفید فام افراد بھی نظر آئے اور یقیناً یہی لوگ سیکیورٹی کے انچارج بھی تھے۔ ان میں سے کچھ افراد نے پہلے سے موجود گارڈز کے ساتھ بیرونی حصے میں پوزیشن سنبھال لی۔ باقی جارج گورا کے ساتھ عمارت کے اندر چلے آئے۔ گارڈز کے وزنی بوٹوں سے برآمدوں کے فرش لرز اُٹھے۔ ایک دہشت کی سی فضا پیدا ہو گئی۔ اسپیشل فورس کے دو گارڈز، جارج سے پہلے ہی اندر آ گئے۔ انہوں نے مجھے سر تا پا دیکھا۔ یہ دونوں سفید فام تھے۔ مجھے 'گڈ نون' کہنے کے بعد انہوں نے اچھی طرح میری تلاشی لی اور پھر مجھے ایک ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لے گئے۔ یہاں بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دو تین منٹ بعد جارج گورا اپنے تین مسلح گارڈز کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میڈم صفورا اور منیجر مدن وغیرہ بھی اس کے عقب میں موجود تھے۔

جارج کو میں نے چند دن پہلے راج بھون کی شاہی بالکونی میں دیکھا تھا لیکن اس وقت ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد آج میں اسے اپنے رُوبرو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں نہایت خطرناک چمک تھی۔ یہ آنکھیں کسی انسان سے زیادہ درندے کی آنکھیں لگتی تھیں۔ غیر متوقع طور پر اس نے مجھ سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ''زرگاں میں خوش آمدید۔''

اس نے اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میرے ہاتھ پر قائم کر رکھی تھی۔ شاید اس طرح وہ میری جسمانی طاقت اور اعصابی مضبوطی کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

وہ مجھ سے فقط دو فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس نے اختیار اور جسمانی طاقت کے نشے میں سلطانہ کو روندا تھا۔ جی چاہا کہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اس پر جا پڑوں اور تب تک خود کو اس سے جدا نہ کروں جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتا لیکن عملی طور پر ایسا ممکن نہیں

تھا۔ تین گارڈز موجود تھے، وہ مجھے چھلنی کر کے رکھ دیتے۔ مجھے ابھی صبر کرنا تھا۔

جارج نے کہا۔ ''ہام کا خیال ہے کہ تم انگلش سمجھ سکتا ہے۔''

''ہاں، میں سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

''او کے...... ویسے تو تم سے پوچھنے کی بہت سی باتیں ہیں لیکن فی الوقت ہم صرف اس اعلان کے حوالے سے بات کریں گے جو تم نے کل راج بھون کے سامنے کیا ہے۔'' جارج کا لہجہ خشک تھا۔

''میں بھی صرف اسی حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے شستہ انگریزی میں جواب دیا۔

''تمہیں شرائط کا پتا ہے؟''

''مجھے تمہاری ہر شرط بغیر سنے منظور ہے۔ میں صرف تم سے لڑنا اور تمہیں ہرانا چاہتا ہوں۔''

''بہت خوب...... بہت خوب۔'' میرے لہجے کی آگ کو محسوس کر کے اس نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''یسوع بُری نظر سے بچائے، مورال بہت اونچا ہے تمہارا۔''

''شکریہ۔''

''پھر بھی میں تمہیں شرائط بتا دینا چاہتا ہوں۔ تم ایک مفرور مجرم ہو...... تم پر جو سنگین الزامات ہیں، ان کی کم سے کم سزا موت ہے لیکن تم نے دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ چوہے کی طرح پکڑے جانے کے بجائے خود یہاں پہنچ گئے ہو۔ اب تم پر ریاست کا قانون نہیں بلکہ کھیل کے اصول لاگو ہوں گے۔ تم میرے ساتھ ون ٹو ون زور آزمائی کرو گے۔ اگر تم جیت گئے تو تمہارے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ تم یہاں سے جا سکو گے بلکہ اپنے دوست کی بھاوج کو بھی لے جا سکو گے...... لیکن اگر تم ون ٹو ون باؤٹ میں ہار گئے تو پھر تمہارا انجام وہی ہو گا جو تمہارے دوست اسحاق کا ہوا۔ تمہیں بغیر کسی ٹرائل کے سزائے موت دی جائے گی۔ راج بھون کے سامنے سُولی چڑھا دیا جائے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے بلاتوقف کہا۔

''او کے...... لیکن اس سے پہلے پنڈت مہاراج کو تمہاری کنڈلی وغیرہ نکالنی ہو گی اور مقامی رواج کے مطابق شبھ گھڑی کا چناؤ کرنا ہو گا۔ اس کے بعد ہم یہ طے کریں گے کہ ہماری لڑائی کس طرح کی ہو گی اور اس کے رولز اور ریگولیشن کیا ہوں گے۔''

''اس حوالے سے میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں لیکن چلو...... تم کنڈلیاں وغیرہ نکلوا

لو۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کنڈلیاں وغیرہ نکلوا لیتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے بھی کچھ کرنا ہے۔ یہ کنڈلیوں والا کام آج نہیں کل ہو سکے گا۔ آج میں کسی اور چیز کی تصدیق کے لئے یہاں آیا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

جارج نے ایک گارڈ کو اشارہ کیا، وہ باہر چلا گیا۔ جارج نے میڈم صفورا اور مدن وغیرہ کو بھی باہر بھیج دیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" اس نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے حکم دیا۔ میں قالین پر بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگالی۔

وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں بھی اس پر جمی تھیں۔ اس کی عمر پینتیس چالیس کے قریب تھی تاہم وہ اپنی عمر سے کم نظر آتا تھا۔ وہ ایک نہایت مضبوط اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ خاص طور سے اس کی گردن اور شانے غیر معمولی طور پر مضبوط نظر آتے تھے۔ قد کاٹھ کے لحاظ سے وہ مجھ سے کہیں بہتر تھا اور جسم کے پھیلاؤ میں تو کافی فرق تھا۔ اس نے مجھے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا تھا اور اب پتا نہیں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اسی دوران میں باہر جانے والا گارڈ دوبارہ واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر نما شخص بھی تھا۔ اس کے ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ اس نے ایک سرنج پکڑی ہوئی تھی۔ غالباً وہ مجھے کچھ انجیکٹ کرنا چاہ رہا تھا۔

"گھبرانے کی بات نہیں۔" جارج نے کہا۔ "تمہاری صحت اور سلامتی کا سب سے بڑا ضامن اب میں خود ہوں۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے، سامبر کے دن تک تمہیں کچھ نہیں ہو گا......"

"یہ انجکشن کس لئے ہے؟"

"سمجھو، تمہاری جسمانی صحت کو چیک کرنے کے لئے ہے۔ اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔"

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ آخر وہ چپ والا معاملہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے انٹینا میری پوزیشن کو لوکیٹ نہیں کر رہے تھے اور وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ ایسا کیوں ہے۔ غالباً مجھے کوئی نشہ آور دوا دی جا رہی تھی۔ کمرے میں جارج کے علاوہ صرف تین افراد تھے اور یقیناً یہ جارج کے اعتماد کے لوگ تھے......

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "جارج! میں سمجھ گیا ہوں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اگر تم اپنا

وقت بچانا چاہتے ہو تو میں براہِ راست تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔"

"تم کیا بات کر رہے ہو؟" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں چپ کی بات کر رہا ہوں۔"

میرے الفاظ نے جارج جیسے مضبوط شخص کو ہلا دیا۔ اس کے تینوں ساتھی بھی بُری طرح چونک گئے۔ جارج نے ایک گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا اور بولا۔ "کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرنا پسند کرو گے......؟"

"بالکل پسند کروں گا۔ میں اس چپ کی بات کر رہا ہوں جسے یہاں لوح یا تختی کہا جاتا ہے۔ یہ تختی میرے اندر بھی موجود تھی۔ شاید مجھے اس کا پتا کبھی نہ چلتا...... یا اگر چلتا بھی تو میں اس کی حقیقت کبھی معلوم نہ کر پاتا لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ صورتِ حال ایک دم بدل گئی۔"

میں نے ذرا توقف کیا اور اپنی گردن کے عقب میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لوگ دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ یہاں کیا ہوا ہے۔"

ڈاکٹر اور جارج ایک ساتھ آگے بڑھے۔ ڈاکٹر نے میری گدی کا معائنہ کیا۔ یہاں آپریشن کا نشان تھا اور ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ "یہ کیا ہے؟" سفید فام ڈاکٹر نے پوچھا۔

"مجھے یہاں چوٹ لگی تھی اور زخم ہو گیا تھا۔ پھر زخم میں انفیکشن ہو گیا۔ میرا پورا جسم درد کے شدید شکنجے میں جکڑ گیا اور کسی وقت یوں لگنے لگا کہ مجھے اوپر کے دھڑ کا فالج ہو رہا ہے۔ طبیعت بہت بگڑ گئی تو پتا چلا کہ یہ سب اس "چپ" کی وجہ سے ہے۔ میرے ساتھی ڈاکٹر چوہان نے جیسے تیسے اس چپ کو نکال دیا......"

جارج اور ڈاکٹر حیران سے سن رہے تھے۔

میری بتائی ہوئی تفصیل جارج وغیرہ کے لئے حیران کن تھی اور یقیناً اس سے زیادہ یہ بات حیران کن تھی کہ میں نے چپ اپنے جسم سے علیحدہ کر ڈالی اور اس کے باوجود جان لیوا صورتِ حال سے بچا رہا۔

ڈاکٹر کے علاوہ جارج نے بھی میری جلد کو دبا دبا کر اس بات کی تصدیق کی کہ چپ میرے جسم میں موجود نہیں ہے۔

آخر جارج ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا واقعی اس بھگوڑے ڈاکٹر چوہان نے یہ کام کیا ہے؟"

"میں وہی بتا رہا ہوں جو میرے ساتھ ہوا ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

جارج اور سفید فارم ڈاکٹر کچھ دیر تک الجھی ہوئی نظروں سے ایک دوجے کو دیکھتے رہے پھر جارج نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''اگر واقعی سب کچھ ویسا ہی ہوا ہے جیسا تم بتا رہے ہو تو پھر تم ایک خوش قسمت شخص ہو۔ جب ڈاکٹر چوہان سے ملاقات ہو گی تو میں اسے اس آپریشن پر ''شاباش'' ضرور دوں گا۔'' اس نے شاباش کا لفظ معنی خیز انداز میں کہا تھا اور اس لفظ میں ایک سفاک دھمکی کی ساری سنگینی بھر دی تھی۔

سفید فارم ڈاکٹر نے امریکن لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''اب وہ چپ کہاں ہے؟''

''مجھے اس بارے میں ٹھیک سے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے ڈاکٹر چوہان نے کہیں پھینک دیا تھا۔''

''پھینک دیا تھا تو بھی اس کے سگنل تو ملنے چاہئیں۔'' جارج نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''اتنی عقل تو ڈاکٹر چوہان میں بھی تھی۔ اس نے چپ نکالتے ہی اسے ضائع کر دیا تھا۔ ضائع کرنے کے بعد ہی اس نے اسے کہیں پھینکا ہو گا۔''

''تم اتنی بے یقینی سے بات کیوں کر رہے ہو؟ کیا چوہان نے تمہیں اس بارے میں اصل صورتِ حال نہیں بتائی؟''

''یہ ایک اتفاق ہے کہ آپریشن کے بعد چوہان سے میری تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔'' میں نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔

کچھ دیر تک اس بارے میں بات چیت جاری رہی۔ تب جارج یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ وہ کل پھر آئے گا...... اور اس سے پہلے پنڈت مہاراج یہاں پہنچیں گے اور کنڈلی وغیرہ نکالیں گے۔ چپ کے حوالے سے جارج کی اُلجھنیں ابھی پوری طرح دور نہیں ہوئی تھیں۔

جب جارج اپنے مسلح گارڈز کے ہمراہ کمرے سے نکل رہا تھا، ایک بار پھر میرا جی چاہا کہ ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ کر اس پر جھپٹ پڑوں۔ اس کو سانس لینے کے لئے...... اور مسکرانے کے لئے اور زمین پر دندنانے کے لئے چند منٹ بھی زندہ نہ چھوڑوں...... مار دوں یا مر جاؤں۔ اس عیاش، عورت باز کو دیکھ کر میرے اندر ایک ایسی ناقابلِ برداشت نفرت جاگتی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لئے ممکن نہ ہو۔

لال بھون سے نکلتے ہوئے جارج اور اس کے ساتھی دو چار منٹ کے لئے اس بڑے

ہال کمرے میں ٹھہرے جہاں لڑکیاں کتھک ناچ کی تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ جارج کے پہنچتے ہی موسیقی رک گئی اور لڑکیاں ایک قطار میں کھڑی ہو گئیں۔ میڈم صفورا مؤدب انداز میں گرانڈیل جارج کے پہلو میں موجود تھی۔ وہ لڑکیوں کی صحت اور تعلیم و تربیت کے بارے میں جارج کو معلومات فراہم کر رہی تھی۔ وہ کافی فاصلے پر تھے، ان کی باتیں میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد جارج، مسلح گارڈز کے جلو میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

تنہائی میسر آتے ہی عمران اور میڈم صفورا پھر میرے پاس موجود تھے۔ میڈم صفورا کے چہرے پر بہت تجسس نظر آ رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اسے کمرے سے نکالنے کے بعد جارج گورا نے مجھ سے کیا بات چیت کی ہے اور جارج کے ساتھ ڈاکٹر کی آمد کا مقصد کیا تھا۔

میں نے میڈم اور عمران کو وہ ساری گفتگو بتائی جو چپ کے حوالے سے میرے اور جارج کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ واقعی اہم گفتگو تھی۔ میں نے جارج کو بتایا تھا کہ چوہان نے چپ میرے جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد توڑ پھوڑ کر ضائع کر دی تھی لیکن وہ چپ صحیح سالم حالت میں اب بھی مندر کے زیریں تہ خانے میں موجود تھی۔ عمران کا خیال تھا کہ ہم اس چپ کو کسی موقع پر اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں۔

...... اگلے روز علی الصباح ہی پنڈت مہاراج اپنے پورے پروٹوکول کے ساتھ لال بھون میں آ دھمکا۔ یہ ایک پچاس پچپن سالہ شخص تھا۔ اس کے گلے میں بہت سی مالائیں تھیں۔ وہ سفید دھوتی قمیص میں تھا۔ ایک نہایت اعلیٰ درجے کی کشمیری شال اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کی وضع قطع دیکھ کر سورگ باشی گرو سوباش کی یاد آتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ پنڈت مہاراج کے بال بہت لمبے تھے اور اس کی شخصیت مجموعی طور پر بہت بارعب نظر آ رہی تھی۔

پنڈت نے مجھے سرتاپا گھورا اور منہ میں کچھ اشلوک وغیرہ پڑھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے نفرت آمیز شناسائی کی جھلک صاف محسوس کی۔ اس نے اپنے بھرائے ہوئے لہجے میں مجھ سے چند سوال کئے۔ میرے اندازے کے مطابق ان سوالوں کا مقصد صرف یہ جاننا تھا کہ میں ماضی میں واقعی یادداشت کے مسئلے کا شکار رہا ہوں یا پھر یہ کوئی ڈراما قسم کی چیز تھی۔

معلوم نہیں کہ وہ میرے جوابات سے کس حد تک مطمئن ہوا، بہرحال اس نے اپنا اصل کام شروع کرتے ہوئے مجھ سے چند سوالات کئے۔ میری تاریخ پیدائش، مقام اور والدین کے نام دریافت کئے۔ اس کے بعد وہ اپنے ایک چیلے کے ساتھ لمبے چوڑے حساب کتاب

میں مصروف ہو گیا۔ چیلے کے پاس کچھ پرانے کاغذات اور پوتھیاں وغیرہ بھی تھیں۔ وہ نہ جانے ان پوتھیوں کی ورق گردانی سے کیا کیا ڈھونڈتا رہا اور پنڈت مہاراج کو بتاتا رہا، جسے پنڈت صاحب تحریر فرماتے رہے۔ آخر وہ دونوں اُٹھ کر چلے گئے۔

اس کے کوئی پندرہ بیس منٹ بعد بھون میں کل والی سنسنی آمیز ہلچل محسوس ہوئی۔ گارڈز کی بھاگ دوڑ دکھائی دی۔ ملازمین الرٹ ہو گئے۔ تب زرگاں میں شکتی کا دیوتا، یعنی حکم جی کے بعد اہم ترین شخص سر جاج گورا اپنے دو درجن گارڈز کے جلو میں دکھائی دیا۔ اس کی آمد سے پہلے میری اور کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی گئی، تب وہ دندناتا ہوا اندر آ گیا۔

آج جارج گورا نے کوٹ کے بجائے بند گلے کی ایک پتلی سی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ اس ہائی نیک جرسی کے نیچے غالباً قمیص وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اس ڈریس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ مجھے اپنے شان دار کسرتی جسم کی جھلک دکھا کر مرعوب کرنا چاہتا تھا یا پھر اس نے میری نقل کی تھی۔ آج کی طرح ایک دن پہلے بھی بہت سردی تھی۔ میں نے تب بھی بس ایک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شاید اس نے مجھے بتایا تھا کہ اگر میں صرف ایک ٹی شرٹ میں موسم کی سختی جھیل سکتا ہوں تو وہ بھی ایسا کر سکتا ہے۔

آج پھر اس نے بھرپور توانائی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے بازو کو باقاعدہ جھنجوڑا۔ کسی تمہید کے بغیر ہی وہ اصل موضوع پر آ گیا اور بولا۔ ”پنڈت مہاراج کی طرف سے کلیئرنس مل گئی ہے۔ سامبر کی رسم بدھ کو سہ پہر کے وقت ہو گی۔ بدھ کو سہ پہر کے وقت۔“ اس نے دُہرایا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کس طرح لڑنا پسند کرو گے؟“

”میں کسی بھی طرح لڑنے کے لئے تیار ہوں لیکن جیسا کہ میں نے کل کہا تھا، اس لڑائی کے حوالے سے میں ایک تجویز دینا چاہتا ہوں۔“

”کہو۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ تم یہ تجویز مان لو گے......“

”کیا تم پہیلیاں بجھوانا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کہ یہ لڑائی مرنے یا مار دینے پر ختم ہو۔“

اس نے ذرا چونک کر مجھے دیکھا پھر اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بہت خوب...... بہت خوب۔ دلیری دکھا رہے ہو اور چالاکی بھی۔“

”چالاکی سے کیا مطلب؟“

”لڑائی کسی بھی طرح کی ہو، ہارنے کی صورت میں تمہیں تو مرنا ہی ہے اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تم سُولی چڑھنے کے بجائے گولی یا چاقو وغیرہ کے زخم سے مرو۔“

”تمہاری دلیری اور بے خوفی کے بارے میں تمہارے چمچے بہت شور مچاتے ہیں لیکن اب مجھے لگ رہا ہے کہ وہ سب ”شور“ ہی ہے۔ جو دلیل تم پیش کر رہے ہو اس میں کوئی خاص وزن نہیں ہے۔“

”مجھے اکسانے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آ گیا ہے۔ اب اسے ماننا یا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔“

جارج کی نیلگوں آنکھوں میں ایک بار پھر نفرت اور رقابت کی برق لہرائی۔ وہ اندر سے اُبل رہا تھا۔ یہ جان کر مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ وہ مجھے قرار واقعی اہمیت دے رہا ہے۔ میرے خیال میں اس اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے ان لوگوں کو کچھ ثابت کر کے دکھایا تھا۔ پہلے جارج کی حراست سے فرار ہونا اور پھر پانڈے جیسے گھمنڈی کو یادگار مزاحمت دینا معمولی واقعات نہیں تھے۔

جارج ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا تھا۔ بڑے اسٹائل سے کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”اس بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ کس طرح لڑنا پسند کرو گے؟ تم ویسٹرن انداز میں ڈیول کھیل سکتے ہو، تلوار بازی کر سکتے ہو، کشتی، چاقو زنی، باکسنگ...... جو تمہارا دل چاہے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ ہم بغیر کسی ہتھیار کے خالی ہاتھ لڑیں اور تب تک لڑتے رہیں جب تک کوئی ایک حتمی طور پر جیت نہ جائے۔“

”تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے جیسے یہ لڑائی شاید بہت دیر تک چلے گی لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ خاصی غیر دلچسپ لڑائی ہو گی۔ ایک دو منٹ میں ہی تمہارا جنازہ تیار ہو جائے گا۔“

”کچھ ایسے ہی خیالات تمہارے بارے میں میرے بھی ہیں۔“ میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”بہت خوب...... بہت خوب۔“ اس نے ایک بار پھر اوپر نیچے سر ہلایا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”ایک طرف تم کہہ رہے ہو کہ تم ”مرو یا مارو“ کی لڑائی لڑنا چاہتے ہو۔ دوسری طرف خالی ہاتھ لڑنے کی بات کر رہے ہو۔ خالی ہاتھوں سے بندہ مارنے میں کافی دقت پیش آیا کرتی

ہے اور میری کھال بھی تھوڑی سی موٹی ہے۔"

"تو اپنا کوئی من پسند ہتھیار رکھ لو۔ چاقو یا کٹاری یا کچھ اور......"

"ٹھیک ہے۔ اس بارے میں تمہیں کل بتا دیا جائے گا۔" جارج نے مبہم انداز میں کہا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے طرزِ تخاطب نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کے اندر طیش کا دریا ابل رہا تھا۔ وہ اس ابال کو ضبط کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ مجھے جان امان دے چکا تھا ورنہ شاید اسی جگہ وہ خوں ریز لڑائی شروع ہو جاتی جس کی منصوبہ بندی کی رہی تھی۔

اس کے طیش اور اس کی آتش پائی نے مجھے لطف دیا۔

عمران ابھی سو رہا تھا۔ میں اس ہال کمرے کی طرف چلا گیا جہاں جسمانی ورزش کا سازو سامان موجود تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اس جگہ کو "جم" کہا جا سکتا تھا۔ ایک دیواروں پر انڈین فلمی اداکاراؤں ہیما مالینی، زینت امان اور سری دیوی وغیرہ کی تصویریں لگی تھیں۔ ان تصویروں میں ان خواتین کی جسمانی "فٹنس" نمایاں نظر آتی تھی۔ سہ پہر کے بعد ٹرینر گیتا دیدی لڑکیوں کو لے کر یہاں آتی تھی اور ڈیڑھ دو گھنٹے گزارتی تھی۔ فی الوقت یہ "جم" خالی پڑا تھا۔ ایک گوشے میں جاگنگ مشین موجود تھی اور سینڈ بیگ بھی جھول رہا تھا۔ میں جاگنگ مشین پر ایکسرسائز میں مصروف ہو گیا۔ قریباً آدھے گھنٹے تک میں نے اندھا دھند ورزش کی اور پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پھر میں سینڈ بیگ پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ جب میں یہ کام شروع کرتا تھا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ ارد گرد کا احساس تو دور کی بات ہے مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ باروندا جیکی کی تربیت نے مجھے کسی اور ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ میں نے سینڈ بیگ کو اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ وہ جگہ جگہ سے خوں رنگ ہو گیا۔ یہ میرا اپنا ہی خون تھا جو میرے ہاتھوں کی جلد سے اور ناخنوں سے رستا تھا۔ یہ ورزش نہیں تھی، مشق بھی نہیں تھی...... یہ ایک جنون تھا، ایک آگ تھی جو سینڈ بیگ کے رُوبرو ہوتے ہی میرے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ غیظ و غضب کے عالم میں کچھ ہو جاتا تھا مجھے۔ آج کل اسحاق کی دردناک موت کی یاد نے میرے رگ و پے میں کچھ اور بھی چنگاریاں بھر دی تھیں۔ جب میں دیوانہ وار اپنے کام میں لگا ہوا تھا، عمران کی آمد نے مجھے چونکایا۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں باکسنگ کے ہلکے گلوز نظر آ رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر دلکش انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "لگتا ہے کہ مارشل آرٹ کی کسی دھواں دار فلم کا اثر ہو گیا ہے تم پر۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ باتھ

ال رکھتے ہوئے بولا۔ "بے زبان کو مارنا اچھی بات نہیں ہے۔ کوئی ایسا ہو جو تھوڑا بہت جواب بھی دے سکے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے دستانوں کی ایک جوڑی میری طرف بھی پھینک دی۔

میں نے دو گلاس پانی پیا اور دستانے پہن لئے۔ وہ چہکا۔ "بس میری ناک پر نہ مارنا ... یہ میں نے جگہ جگہ گھسیڑنی ہوتی ہے اور ہو سکے تو پڑپڑی (کنپٹی) کو بھی چھوڑ دینا ... سنا ہے شریف لوگ یہاں لگنے والی چوٹ سے اکثر فوت ہو جاتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تم زبان درازی کرنے لگے ہو لیکن خیر، اس کی سزا میں تمہیں "رِنگ" میں دوں گا۔ لو ...ے ہو جاؤ۔"

ہم دونوں لکڑی کے ہموار فرش پر باکسنگ میں مصروف ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اور عمران اس طرح آمنے سامنے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ عمران ایک زبردست "لڑاکا" ہے۔ میں لاہور میں ہڑپہ میں اور پھر جہلم وغیرہ میں اس کی غیر معمولی پھرتی اور توانائی کے مظاہرے دیکھ چکا تھا۔ وہ سنگین ترین صورتِ حال میں بھی بڑے سکون سے لڑتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ لڑ نہیں رہا، سرکس میں کوئی خطرناک آئٹم دکھا رہا ہے۔ میں نفسیاتی طور پر ہمیشہ اس سے مرعوب رہا تھا...... لیکن اب یہ مرعوبیت میری اندرونی تبدیلیوں کے دھارے میں کافی حد تک ...ب گئی تھی۔

ہم پہلے وارم اپ ہوتے رہے پھر ایک دوسرے پر ہلکے ہلکے حملے کرنے لگے۔ یکا یک عمران نے اپنے دائیں بازو کو بجلی کی سی تیزی سے حرکت دی۔ بے حد کوشش کے باوجود میں خود کو اس کے طوفانی مکے سے نہ بچا سکا۔ آنکھوں میں تارے سے ناچ اور میں لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

وہ مسکرایا۔ "جارج سے لڑنا چاہتے ہو تو اس کے لئے زندہ رہنا ضروری ہے اور مجھے تمہاری خیریت مشکوک نظر آ رہی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ ایک قریبی الماری کی طرف گیا اور وہاں سے دو "فیس گارڈز" لے آیا...... ہم دونوں نے یہ گارڈز پہن لئے اور ایک بار پھر باکسنگ اسٹائل میں آ گئے۔ اب میں کافی احتیاط کر رہا تھا۔ تکنیک میں عمران مجھ سے کہیں بہتر تھا۔ میں نے اسے دو تین مکے رسید کئے لیکن جواب میں مجھے اس کے پانچ چھ سہنے پڑے۔ باکسنگ کے ساتھ ساتھ وہ فقرے بازی بھی کر رہا تھا۔ ہم بُری طرح ہانپنے لگے۔ اسی دوران میں وہ پھر ایک چکما دے گیا۔ بایاں ہاتھ

استعمال کرتے کرتے اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا اسٹاک مکا استعمال کیا۔ اس بار میں قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور گر گیا۔

وہ خود ہی گنتی گننے لگا۔ ''ایک...... دو...... تین...... چار۔'' اس کے آٹھ تک پہنچتے پہنچتے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کھڑے ہوتے ہی وہ چیتے کی طرح جھپٹا۔ ایک بار پھر تابڑ توڑ وار کئے۔ میں دوبارہ چت ہو گیا۔ ذہن پر دھند سی چھانے لگی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک آگ بھی بھڑک اُٹھی۔ میری قوتِ برداشت کام آئی اور میں عمران کے گنتی شروع کرتے ہی پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب ہم دونوں نے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ میرے ہونٹوں سے خون رِسنے لگا۔ عمران کے رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔ مجھے لگا کہ شاید عمران اپنی کارکردگی دکھا کر اپنی اندرونی خفگی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو بائی پاس کیا تھا اور بڑی خاموشی سے راج بھون جا کر جارج کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ شاید وہ اس طرح یہ بتانا چاہتا تھا کہ جارج کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لئے وہ مجھ سے بہتر ہے۔

اس کی یہ بات غلط ثابت کرنے کے لئے میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اگلے راؤنڈ میں اسے چند سخت مکے رسید کئے مگر تب اچانک پھر اس کی بہتر تکنیک کام کر گئی۔ عمران نے راؤنڈ پنچ کے انداز کا ایک مکا میری ٹھوڑی پر رسید کیا اور اس مرتبہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب میں گرا اور کب لکڑی کے فرش نے میری پشت کو چھوا۔ دماغ لٹو کی طرح گھوم گیا تھا۔

عمران نے پھر گنتی شروع کی...... چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ...... میں پھر کھڑا ہو گیا۔ دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ ایک بار پھر ہم ایک دوسرے پر جھپٹے...... اگلے قریباً پانچ منٹ میں واقعی بہت سخت لڑائی ہوئی۔ میں نے عمران کو زیادہ چوٹیں لگائیں اور یہ سخت بھی تھیں مگر عمران کی چوٹوں میں صفائی اور ایکوریسی تھی۔ ان پانچ منٹ میں، مَیں قریباً تین بار فرش بوس ہوا اور دوبارہ اپنا توازن قائم کر کے اُٹھا۔

''بس بھئی بس۔'' عمران پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''اب سلطانہ بھابی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔''

اس نے فیس گارڈ اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون رِسنے لگا تھا۔ چہرے پر ایک دو نیل بھی تھے۔ میں نے بھی فیس گارڈ اُتار دیا۔ ایک طرف سے میڈم صفورا نمودار ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اوٹ میں کھڑی ہو کر یہ ساری لڑائی دیکھتی رہی ہے۔

عمران نے پسینا پونچھتے ہوئے میڈم کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''کیا خیال ہے میڈم! میں ٹھیک کہہ رہا تھا نا؟''

''لگتا تو ایسے ہی ہے۔'' میڈم نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا رمزیہ باتیں کر رہے ہو آپ دونوں؟'' میں نے دستانے اُتارتے ہوئے عمران سے پوچھا۔

''سچ سچ بتا دوں یا گول مول بات کر دوں؟'' وہ مسکرایا۔

''سچ سچ ہی بتا دو کیونکہ یہ نیکی تم کم کم ہی کرتے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ پانی پیتے ہوئے بولا۔ ''میں میڈم کو چھوٹا سا ثبوت دینا چاہتا تھا۔''

''کس بات کا ثبوت؟''

''میں میڈم کو بتانا چاہتا تھا کہ تم کچھوکوے بن چکے ہو۔ کچھوکوما سمجھتے ہو نا تم؟ جسے انگلش میں کچھوا کہتے ہیں۔''

''انگلش میں نہیں، اردو میں کہتے ہیں۔'' میں نے تصحیح کی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب اس بات کا بھی ثبوت مل رہا ہے کہ تمہارے مکے میں کافی جان ہے۔ میری یادداشت کی چولیں ہل گئی ہیں اور انگریزی اردو آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہے...... ہاں تو میں بات کر رہا تھا کچھوکوے کی...... میں میڈم کو بتانا چاہتا تھا کہ تم اپنے لائف اسٹائل کی وجہ سے اس جانور کی طرح ڈھیٹ اور سخت جان ہوتے جا رہے ہو اور یہ ثابت ہو گیا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

میڈم مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں بتاتی ہوں...... دراصل بات یہ ہے کہ میری رائے میں اگر جارج گورا سے دو دو ہاتھ کرنے ہی ہیں تو پھر تمہارے بجائے عمران کو آگے ہونا چاہئے تھا کیونکہ میرا خیال یہ تھا اور کسی حد تک اب بھی ہے کہ لڑائی بھڑائی کے فن میں عمران تم سے آگے ہے۔ دوسری طرف عمران کا کہنا یہ تھا کہ تم ایک اور حوالے سے اس سے کہیں آگے ہو اور یہ ایسا حوالہ ہے جو فائٹنگ آرٹ میں سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی قوتِ برداشت اور درد سہنے کی صلاحیت...... اور میرے خیال میں یہ بات پچھلے بیس پچیس منٹ میں کافی حد تک ثابت ہوئی ہے۔ میں واقعی تمہاری برداشت کی صلاحیت سے ''امپریس'' ہوئی ہوں۔ اتنی چوٹیں کھا کر گرنا اور پھر پاؤں پر کھڑے ہو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ یس، اِٹ از ونڈرفل۔''

"تو یہ میرا سر پرائز ٹیسٹ ہو رہا تھا۔" میں نے عمران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلو ایسا ہی سمجھ لو برخوردار...... اوہ...... سوری...... میں نے تمہیں برخوردار کہہ دیا۔ دماغ گھوم گیا ہے۔ تمہارے مکے میں کافی طاقت ہے یار۔" اس نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔

میں اس کی مسخری پر یکسر خاموش رہا۔ چند سیکنڈ تک کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔

وہ اس گھمبیر خاموشی کو توڑنے کے لئے مسکرایا۔ "لگتا ہے کہ تم پھوکو ما کہنے کی وجہ سے ناراض ہو گئے ہو لیکن تمہاری سخت جانی کی وجہ سے میں نے تمہیں پھوکو ما کہا ہے۔ تیزی اور پھرتی میں تم خود کو کسی اور جانور سے تشبیہ دے سکتے ہو...... مثلاً باہر والا۔"

وہ سؤر کی بات کر رہا تھا۔ اس کی بکواس پر میرا پارا پھر اوپر چلا گیا لیکن میڈم کی موجودگی کی وجہ سے میں بولا کچھ نہیں۔

میڈم بولی۔ "یہ باہر والا کیا ہوتا ہے بھئی؟"

"یہ...... یہ چیتے کی طرح کا ایک جانور ہوتا ہے جی۔" عمران نے بات بنائی۔

"بھئی اس لحاظ سے تو تم دونوں ہی باہر والے ہو۔ میں تمہاری فائٹ سے متاثر ہوئی ہوں۔"

عمران بولا۔ "آپ بھی تو کم 'باہر والی' نہیں ہیں۔ میں نے کچھ موقعوں پر آپ کو بڑی تیزی سے فیصلہ کرتے اور حرکت میں آتے دیکھا ہے۔"

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ اب دونوں اپنا حلیہ درست کرو۔ شام کو کچھ لوگ تابش کو دیکھنے آ رہے ہیں۔"

"لیکن یہ تو شادی شدہ ہے۔"

وہ عمران کے فقرے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "یہ خبر پورے زرگاں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے کہ سلطانہ راجپوت کا شوہر زرگاں واپس پہنچ گیا ہے اور وہ جارج گورا سے لڑنا چاہتا ہے۔ ہر طرف اس بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک دلچسپ مقابلہ ہوگا۔"

"اس خیال کی وجہ؟" عمران نے پوچھا۔

"رنجیت پانڈے۔" میڈم نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ "رنجیت پانڈے زرگاں کا سب سے کرخت اور دبنگ افسر ہے۔ اس رنجیت پانڈے کے ساتھ نل پانی کے دیوان میں تابش کی ٹکر ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تابش نے نہ صرف پانڈے کا

ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ اسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس کامیابی کا کریڈٹ ملنے کے بعد تابش کو یہاں کافی شہرت حاصل ہوئی ہے...... زرگاں میں اکثر لوگ اس کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ لوگوں کے لئے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو ڈیڑھ دو سال پہلے تک ایک عضو معطل کی طرح اپنی بیوی کے آسرے پر جی رہا تھا، اب پانڈے جیسے بندے سے ٹکر لینے کے قابل ہو گیا ہے...... اب جو نئی صورت سامنے آئی ہے، اس نے مزید ہلچل مچائی ہے۔ راج بھون کے دروازے کے سامنے جا کر جارج کو للکارنا اور اس کا چیلنج قبول کرنا، ہر جگہ زیر بحث ہے۔ شام کو جو لوگ آ رہے ہیں، یہ زرگاں کے عمائدین میں سے ہیں۔"

"یہ کیا کریں گے" میں نے پوچھا۔

"تمہارے ناخن دیکھیں گے کہ کہیں تم لڑائی کے دوران میں جارج کو کھرونڈے سے مارنا نہ شروع کر دو۔" عمران نے کہا۔

میڈم اس کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "کچھ نہیں، بس یہ لوگ تم سے ملیں گے اور تمہیں یقین دلائیں گے کہ چیلنج قبول کرنے کے بعد تمہاری حیثیت ملزم یا مجرم کی نہیں رہی ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، وہ سامبر کے قدیم اصولوں کے مطابق ہوگا اور تمہیں مقابلے کے دن تک ہر طرح کی سہولت حاصل رہے گی، وغیرہ وغیرہ۔"

"میڈم! میرے کام کا کیا بنا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... تمہارا کام ہو گیا ہے...... میں نے پرسوں شام ہی تمہارا پیغام نل پانی روانہ کر دیا تھا۔ اب تک انور خاں کو یہ اطلاع پہنچ چکی ہو گی کہ اسے فی الحال زرگاں آنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے وہ تمہارے اور جارج کے مقابلے کا نتیجہ دیکھ لے۔"

"اس بات کی تصدیق کب تک ہو سکے گی کہ اطلاع پہنچ گئی ہے؟"

"کل شام تک لیکن تم بالکل مطمئن رہو۔ یہ کام ہو چکا ہے۔"

میڈم کے جانے کے بعد میں نے عمران کو گھورا۔ اس نے فوراً ہاتھ جوڑ دیئے۔ "جگر! اگر کہیں زیادہ چوٹ لگی ہے تو معاف کر دینا۔"

"چوٹیں تو تمہیں بھی کم نہیں لگیں۔ تمہارا تھوبڑا سوجتا جا رہا ہے...... اور میرے خیال میں میرا بھی یہی حال ہے۔"

"یعنی بقول شاعر، دونوں طرف ہے سوج برابر چڑھی ہوئی۔" وہ چہکا۔ ہم ہنسے اور بغل گیر ہو گئے۔

رات کو بڑی بڑی پگڑیوں اور فربہ جسموں والے کچھ مقامی لوگ مجھ سے ملنے آئے۔

ان کا رویہ بس لئے دیے جیسا رہا۔ تاہم ان کی نگاہوں میں میرے حوالے سے دلچسپی اور گوناگوں تجسس تھا۔ میں ان کے لئے جیسے کوئی عجوبہ قسم کی شے تھا۔ وہ میری ''کایا کلپ'' کے بارے میں جاننے کے خواہش مند تھے لیکن کھل کر کوئی سوال بھی نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے سلطانہ اور اس کے اہلِ خانہ کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا، حالانکہ یہ سوال بھی ان کے ذہنوں میں ہلچل مچا رہا تھا۔

رات کو میں اور عمران ایک ہی کمرے میں لیٹے تھے۔ میں اپنے معمول کے مطابق سخت فرش پر دراز تھا (قالین پر) جبکہ عمران بستر پر لحاف اوڑھے لیٹا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے اس طرح سونے کی عادت ہو گئی تھی۔ میں حیران تھا کہ اب مجھے سردی بے چین نہیں کرتی تھی۔ دوپہر والی مارا ماری کے سبب عمران کی ناک کافی سوج گئی تھی مگر وہ ایسی باتوں کی پروا کب کرتا تھا۔ اس نے اپنے خوبصورت بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''یار! کبھی کبھی تو میں بارونداجیکی سے واقعی بہت متاثر ہوتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس کی اور میری ملاقات نہ ہو سکی، ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی اس کی شاگردی اختیار کر لیتا۔''

''پھر کوئی ڈراما رچا رہے ہو؟''

''نہیں جگر! میں سنجیدہ ہوں۔ جیکی نے تم جیسے پھوسٹر بندے کی کیمسٹری چند مہینوں میں تبدیل کر کے رکھ دی ہے۔ درد کے حوالے سے جو فلسفہ اس نے تمہیں دیا ہے، میں اس سے پورا متفق تو نہیں لیکن اس کے نتائج کو جھٹلانا بھی بہت مشکل ہے۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر تم سے اظہارِ یکجہتی کے طور پر آج مابدولت بھی فرش پر استراحت فرمائیں گے۔'' اس نے چھلانگ لگائی اور میرے پہلو میں آ کر قالین پر لیٹ گیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اظہارِ یکجہتی کرنا ہے تو پورا کرو۔ لحاف کیوں لپیٹ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم نے وہ شعر نہیں سنا۔ آپ سے پہلے تم ہوئے، پھر تُو کا عنوان ہو گئے۔ ہر کام آہستہ آہستہ ہوتا ہے بھائی۔ اتنا اظہارِ یکجہتی بھی نہ کراؤ کہ کل سویرے اکڑا ہوا پایا جاؤں اور لوگ اظہارِ افسوس کے لئے تمہارے پاس آنے لگیں۔ تم سے پوچھا جائے کہ کیا ہوا؟ تو بولو، بس جی اظہارِ یکجہتی ہو گیا...... اچھی بھلی رضائی پڑی تھی مگر رضائی کی جگہ اس نے ''یکجہتی'' اوڑھ لی...... اور صبح تک اپنے مرحوم بزرگوں سے اظہارِ یکجہتی کر گیا۔''

اگلے دن صبح میں اور عمران پُر تکلف ناشتے سے فارغ ہونے کے کچھ دیر بعد جم میں

چلے گئے۔ میں ورزشوں میں مصروف ہو گیا اور عمران اس قدیم کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا جو منیجر مدن نے اسے دی تھی۔ یہ کتاب اس راجواڑے یعنی بھانڈیل اسٹیٹ کی قدیم رسموں کے بارے میں تھی اور اس میں سویمر اور سامبر وغیرہ کا ذکر بھی تھا۔ اس کتاب میں اس مورتی کا تذکرہ بھی کیا گیا تھا جسے چرانے کی پاداش میں ہم یہاں پہنچے تھے اور سنگین مسائل کا شکار تھے۔ لوگ ایک مدت سے بدھا کی اس مورتی کو آراکوئے کے نام سے پکارتے رہے تھے، یعنی وہ شے جو اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے والوں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ ابھی تک تو یہ مورتی آراکوئے ہی ثابت ہوئی تھی۔

لال بھون کے وسیع سبزہ زار پر ابھی یخ بستہ اوس کے قطرے موجود تھے۔ طویل قطاروں میں کیاریوں کے اندر سرما کے پھول جیسے زردی مائل دھوپ سے حظ اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جم کے قریب دو باوردی گارڈز موجود تھے اور صرف جم ہی نہیں، پورے لال بھون کو اسپیشل فورس کے کمانڈوز نے گھیرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہم جدھر جاتے ہیں، درجنوں نگاہیں ہمارا پیچھا کرتی ہیں۔

میری ورزش اور مشق جاری تھی۔ پھر میں نے عمران کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ ابھی ہم دونوں کو مصروف ہوئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ گیتا کی آواز سنائی دی اور پھر کئی لڑکیوں کی جلترنگ جیسی آوازیں اُبھریں۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ قریباً ڈھائی درجن نہایت خوبرو لڑکیاں ہمارے سامنے کھڑی تھیں۔ یہ سب کی سب وہی تھیں جنہیں ساتویں کے جشن میں ''سات پریوں'' کے انتخاب میں حصہ لینا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر ایسی تھیں جنہوں نے اب خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ ان میں چمک دمک آ گئی تھی۔ ان کے عارض دہکتے تھے اور زُلفیں لہراتی تھیں۔ وہ بات بات پر کھلکھلاتی تھیں، ایک دوسرے سے چہلیں کرتی تھیں اور آنکھوں آنکھوں میں بھید بھری باتیں کہتی رہتی تھیں۔

''کیا بات ہے گیتا دیوی؟'' میں نے ان کی ٹرینر سے پوچھا۔

''یہ سب تم سے ملنا چاہت ہیں۔''

''کس لئے؟''

''بھئی جس لئے لوگ مشہور لوگوں سے ملنا چاہت ہیں۔ انہیں قریب سے دیکھنا چاہت ہیں۔''

''میں ایسا مشہور تو نہیں ہوں۔''

"یہ تو تمہارا خیال ہے نا...... ذرا یہاں سے باہر نکل کر تو دیکھو۔ ہر طرف تمہارے چرچے ہیں۔" گیتا بولی۔

"کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے۔"

"کئی وجہیں ہیں...... اور ان میں سے ایک وجہ تمہارا یہ رہن سہن ہے۔" وہ مسکرائی اور سخت سردی میں میرے بالکل ناکافی کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

اب لڑکیوں نے مجھے گھیرا ڈال لیا تھا۔ ان کے جسموں سے خوشبوؤں کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ آپس میں شوخ سرگوشیاں بھی کر رہی تھیں۔ ان میں وہ لڑکی بھی نظر آئی جس کا نام میڈم نے ثمرین بتایا تھا اور جس کے بارے میں کہا تھا کہ اس کی شادی سلطانہ کے بھائی سے ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ وہ آج بھی خوش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک لڑکی نے ہمت کر کے کہا۔ "سنا ہے کہ نل پانی میں آپ کی لڑائی پانڈے صاحب سے ہوئی تھی؟"

"بالکل ہوئی تھی...... لیکن اس شخص کے نام کے ساتھ "صاحب" لگا کر اس لفظ کی توہین نہ کرو۔"

چند لڑکیوں کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ نظر آئی۔ ان میں ثمرین بھی شامل تھی۔

"سنا ہے، آپ کو درد ناہیں ہوتا؟" ایک دوسری لڑکی نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"کون کہتا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"یہاں کے ملازمین کہوت ہیں۔ ان میں سے کچھ نے آپ کو یہاں "جم" میں ورزش کرتے دیکھا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ آپ کے شریر سے خون بھی رِسنے لگے تو آپ کو پتا ناہیں چلتا۔"

ایک لڑکی نے لقمہ دیا۔ "اور آپ بے موسم کے کپڑے پہن کر گھومتے ہیں، فاقے کرتے ہیں، فرش پر سوتے ہیں اور عام پانی سے اشنان بھی کر لیوت ہیں۔"

ثمرین نے کہا۔ "لیکن جہاں تک ہم کو جانکاری ہے، آپ پہلے تو ایسے ناہیں تھے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کی یادداشت کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔"

"اپنے سوال کا جواب تم نے خود ہی دے دیا ہے۔" عمران نے مدبرانہ انداز میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"خیر سے آپ کون ہیں؟" زرق برق کپڑوں والی ایک لڑکی نے تنک عمران سے

پوچھا۔

"میں میڈم کا ملازم ہوں لیکن آج کل یہاں جم میں آ رہا ہوں، ٹریننگ میں تابش کا ساتھ دینے کے لئے بلکہ...... بلکہ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ مجھے اس کا استاد بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟" ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

"استاد تو یہ واقعی ہے...... بلکہ بہت استاد ہے اور آپ بھی اس سے ذرا دور ہٹ کر کھڑی ہوں۔ یہ لڑکیوں کو بہت جلد شاگردی میں لے لیتا ہے۔"

"دیکھو مسٹر تابش...... اِٹ اِز ٹو مچ۔ میں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بھی اتنی زیادہ لڑکیوں کے سامنے۔"

اس نے مجھے مکا دکھایا پھر لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اے خوش جمال...... پری پیکران! میں آپ کو ایک بہت اونچی بات بتاتا ہوں۔ جس طرح بد سے بدنام زیادہ بُرا ہوتا ہے، اسی طرح اچھے سے مشہور زیادہ عزت دار ہو جاتا ہے۔ یہ تابش صاحب بس مشہور ہو گیا ہے، ورنہ یہ کوئی ایسا رستم سہراب بھی نہیں ہے۔"

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔ ایک بولی۔ "ہم تو اتنا جانت ہیں جی کہ جو شخص پانڈے صاحب جیسے شخص سے ٹکر لے سکتا ہے...... وہ جارج گورا صاحب کے لئے بھی ضرور مشکل پیدا کرے گا۔"

"تو آپ سب یہ چاہتی ہیں کہ جارج صاحب کے لئے مشکلیں پیدا ہوں؟"

لڑکیاں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ان کی ٹرینر گیتا جلدی سے بولی۔ "ناہیں، ایسی بات تو ناہیں۔ جارج صاحب کی حیثیت ہمارے مالک کی سی ہے۔ ہم ایک غیر کے مقابلے میں ان کی ہار کا کیوں سوچیں گے؟ ہم چاہت ہیں کہ بھگوان ہمیشہ کی طرح ان کو کامیاب کرے......" اس کے ساتھ ہی اس نے سوالیہ نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

کئی لڑکیوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بہرحال، ان کے تاثرات ان کے اندرونی جذبات کی چغلی کھا رہے تھے۔ ان میں سے شاید ہی دو چار ہوں جو دلی طور پر گیتا کی بات سے اتفاق کر رہی ہوں اور مجھے تو لگ رہا تھا کہ شاید گیتا بھی وہ نہیں کہہ رہی جو اس کے دل میں ہے۔ وہ تیس پینتیس سال کی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اب سے پانچ دس سال پہلے تک وہ خاصی حسین رہی ہوگی۔ اس کے جسم میں بھی کشش تھی۔ عین ممکن تھا کہ ماضی قریب میں وہ بھی جارج کی عیش پرستی کا شکار رہی ہو۔

میڈم صفورا نے بتایا تھا کہ وہ بہت باتونی ہے۔ اس ملاقات میں اس کا ثبوت بھی ملا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں جتنی باتیں ساری لڑکیوں نے کیں، اس سے دگنی صرف گیتا مکھی نے کیں۔ عمران بھی ٹھیک ٹھاک چرب زبان تھا۔ وہ گیتا کا خوب ساتھ دے رہا تھا۔ گیتا زرگاں کے بڑے بڑے لوگوں سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتا رہی تھی اور یہ بتا رہی تھی کہ وہ رقص کی کون کون سی اکیڈمی میں ٹیچر کی حیثیت سے وزٹ کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان دونوں کی گفتگو کا رخ جارج گورا کی طرف مڑ گیا۔ گیتا ایک نمک خوار کی حیثیت سے اس کی تعریفیں کرنے لگی اور بتانے لگی کہ اپنی کچھ چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود وہ زبردست قسم کا سوشل ورکر ہے اور کھل کر خیر خیرات کرتا ہے۔ عمران اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

میں گیتا کے سامنے بات کرتے ہوئے خاص احتیاط کر رہا تھا۔ مجھے میڈم کی یہ بات یاد تھی کہ گیتا پیٹ کی ہلکی ہے اور اس کے سامنے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا ہے۔

میرا خیال تھا کہ عمران کو بھی میڈم کی یہ نصیحت یاد ہوگی لیکن پھر جوشِ گفتار میں وہ کہیں کا کہیں نکل گیا۔ گیتا کی ایک بات پر وہ شد و مد سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل...... گیتا دیوی...... تم صحیح کہہ رہی ہو۔ بہت بڑا دل ہے جارج صاحب کا۔ وہ ایسے ہی بڑے نہیں بنے۔ اب ترسوں کی بات ہی لو، جب وہ یہاں آئے تھے۔ سامبر کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ طے ہو رہا تھا کہ مقابلہ کس طرح کا ہوگا۔ حضرت تابش صاحب نے جوش میں آ کر فرما دیا کہ یہ ''مرو یا مارو'' کی فائٹ ہونی چاہیے۔ یعنی fight till death۔ اب اگر کوئی کم ظرف ہوتا تو وہیں آگ بگولا ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہیں پر مارا ماری شروع ہو جاتی لیکن جارج صاحب نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ کہا کہ سوچ کر بتائیں گے۔ اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ خدانخواستہ وہ ڈر گئے۔ یہ بڑے دل گردے کی بات ہے کہ ایک بااختیار بندہ کسی بے اختیار بندے کی غلط بات حوصلے سے سنے۔ کیوں گیتا دیوی! غلط تو نہیں کہا؟''

''سولہ آنے ٹھیک ہے۔'' گیتا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''مجھے تو واقعی حیرانی ہو رہی ہے کہ اس طرح کی بات ہوئی ہے...... میں تو یہ کہوں گی کہ......''

''میں سمجھ گیا ہوں، آپ جو کہنا چاہ رہی ہیں۔'' عمران نے تیزی سے گیتا کی بات کاٹی۔ ''اگر جارج صاحب نے سوچنے کا وقت لیا ہے تو اس واسطے نہیں کہ وہ گھبرا گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سامبر کے بارے میں جو کچھ طے ہوا ہے، وہ اسی طرح رہے اور کوئی نئی شروعات نہ ہو...... یہی بات ہے نا گیتا دیوی؟''

گیتا نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر عمران کی رفتار زیادہ تیز تھی۔

''میں خود بھی فائٹنگ آرٹ کی تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جارج صاحب مہا فائٹر ہیں۔ ہم تابش صاحب سے صرف ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں یا پھر یہ دعا کر سکتے ہیں کہ ان کے لئے جارج صاحب کے دل میں کچھ رحم پیدا ہو جائے اور وہ سامبر کی شرطوں میں کچھ ردوبدل کر دیں۔''

''یہ بہت مشکل ہے۔'' گیتا نے دبے لہجے میں کہا اور پھر ایک جھرجھری سی لی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی قینچی زبان کو پھر حرکت دیتی عمران دوبارہ پہل کر گیا۔

''میں سمجھ گیا گیتا دیوی کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ میری آنکھوں میں بھی وہی دو تاریخ والا منظر ہے......کیا نام تھا اس بدقسمت کا؟''

''اسحاق۔'' گیتا نے کہا۔

''ہاں......اسحاق...... میں نے اس کا آخری وقت دیکھا تھا، اللہ ہر کسی کو ایسے وقت سے بچائے۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور ایک بار پھر بولتا چلا گیا۔ گیتا کا چہرہ دیدنی تھا۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی لیکن عمران کہیں سانس لیتا تو وہ منہ کھولتی۔ سیر کو سوا سیر ٹکر گیا تھا۔ گیتا کچھ دیر تک پیچ و تاب کھاتی رہی۔ اسی دوران میں اندر سے اسے میڈم کا بلاوا آ گیا اور وہ اپنی شاگرد لڑکیوں کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی عمران مسکرانے لگا۔ ''جگر! لگتا ہے گیتا دیوی کا پیٹ آج ضرور پھول جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لئے خاموش رہنا عذاب سے کم نہیں ہوتا۔''

میں غصے میں کھول رہا تھا۔ جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ تُو نے کیا ڈراما کیا ہے بھئی۔ میڈم نے سمجھایا بھی تھا کہ گیتا کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی۔ تُو نے سارا کچا چٹھا کھول دیا۔ یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ میں نے جارج کو ''مرو یا مارو'' والی تجویز دی ہے؟''

''یار! اس میں برائی ہی کیا ہے؟ لیکن اگر تم ناراض ہوتے ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہوں۔'' وہ اُٹھ کر چل دیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''الفاظ واپس لینے۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''دیکھو، تم دوسروں کو بے وقوف سمجھنے کی عادت چھوڑ دو۔ مجھے بتاؤ تم نے گیتا کے سامنے یہ سب کچھ کیوں کہا ہے؟''

"اچھا......تم بتاؤ، تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے کیوں کہا ہے؟" اس نے جوابی سوال جڑ دیا۔

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم یہ بات پھیلانا چاہ رہے ہو۔"

"کیوں؟"

"شاید تم سب کو بتانا چاہتے ہو کہ میں نے دلیری دکھائی ہے اور جارج کو 'مرو یا مارو' کا چیلنج دیا ہے۔"

"ونڈرفل، یار! تمہارے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا ہے۔ تم واقعی جینئس ہو۔ میرے اندر سے ایسی عقل مندی ڈھونڈ نکالی جو میرے میں تھی ہی نہیں۔ ویسے یہ بات ہے تو بڑی زبردست۔ ہر کس ناکس کو پتا چل جائے گا کہ تم نے اس لڑائی میں جارج کو 'مارو یا مارو' والا چیلنج دیا ہے۔ اب اس کے لئے اس چیلنج کو قبول نہ کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ بہت خوب یار...... بہت خوب۔"

میں اسے گھورتا رہا۔ کبھی اس پر طیش آتا، کبھی اس کی چالاکی کی تعریف کرنے کو دل چاہتا۔ وہ ایسا ہی گورکھ دھندا تھا۔ کبھی سیدھا سادہ، کبھی جلیبی کی طرح گول۔ یقینی بات تھی کہ اس نے گیتا سے جو کہا، پلاننگ کے ساتھ کہا تھا۔

اس پلاننگ کا نتیجہ صرف پندرہ بیس گھنٹے میں سامنے آ گیا۔ اگلے روز صبح ناشتے پر میڈم اپنے کتے سمیت آ دھمکی۔ اس نے بتایا۔ "زرگاں میں کھلبلی ہے۔ یہ بات پھیل گئی ہے کہ سلطانہ راجپوت کے 'پاکستانی پتی' نے جارج گورا کو سامبر کے لئے تجویز دی ہے کہ یہ لڑائی کسی ایک فریق کی موت تک جاری رہے۔"

"یہ بات پھیلی کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔ اس کا پتا تو جارج کے علاوہ بس ہم دو تین لوگوں کو تھا۔ بہر حال جو بھی ہے...... اب یوں لگ رہا ہے کہ اس حوالے سے جارج کا فیصلہ چند گھنٹوں میں ہی سامنے آ جائے گا۔"

جارج کا فیصلہ تو سامنے نہیں آیا تاہم رات نو دس بجے کے لگ بھگ میڈم صفورا ہمارے بیڈ روم میں آئی۔ میں اور عمران اس وقت مونگ پھلی کھانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ہماری گفتگو کا موضوع ہزاروں لوگوں کے سامنے اسحاق کی دردناک موت ہی تھی۔ وہ منظر کوشش کے باوجود ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ اس کی بے بسی، اس کا

کرب، اَن گنت مشتعل لوگوں کے درمیان وہ یکسر تنہا اور زخم زخم تھا۔

میڈم کے آتے ہی ہم خاموش ہو گئے۔ وہ بولی۔ "تم لوگ راج بھون میں ہلچل مچا کر یہاں آرام سے بیٹھے ہوئے ہو۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی پنڈت مہاراج یہاں آئے ہوئے تھے۔ کسی خاص الخاص موقع کے سوا وہ کم ہی خود چل کر کسی کے پاس آتے ہیں۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ ان پر جج منٹ کی بھاری ذمے داری آن پڑی ہے۔ وہ خود کو پھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اگر درست فیصلہ دیتے ہیں تو ظلم جی سمیت جارج کے خیرخواہ ناراض ہوتے ہیں اور غلط فیصلہ دے نہیں سکتے کیونکہ سب کچھ پرانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ جو لوگ دھرم کو سمجھتے ہیں، وہ اس فیصلے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔"

"کیا آپ سامبر کی لڑائی کی بات کر رہی ہیں؟"

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ "یہ بات پوری طرح پھیل گئی ہے کہ سلطانہ کے شوہر نے سر جارج کو 'مرو یا مارو' کا چیلنج دیا ہے۔ اب سامبر کے پرانے اصولوں کے مطابق جارج کو تابش کی یہ للکار قبول کر لینی چاہئے...... اور یہی دلیرانہ فیصلہ بھی کہلائے گا مگر کچھ لوگ ایسا نہیں چاہتے۔ ان کا پوائنٹ آف ویو یہ ہے کہ یہ دو 'ہم رتبہ' افراد کا مقابلہ نہیں ہے۔ ایک عام شخص ہے، دوسرا ریاست کا ایک اہم ترین فرد ہے۔ اس پر بہت سی ذمے داریاں ہیں، بے شمار لوگوں کی بہتر زندگی اس کی سلامتی سے وابستہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسی سوچ رکھنے والے زیادہ تر لوگ وہی ہیں جن کا تعلق حکمراں طبقے اور ہائی جینٹری سے ہے۔"

"اب پنڈت مہاراج کیا کہتا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"میں نے بتایا ہے نا کہ وہ پھنس گیا ہے۔ اب اس مسئلے کو حل کرنے کی ساری ذمے داری اس پر ڈال دی گئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کو لاء کی تشریح کرنی ہے اور یہ فیصلہ دینا ہے کہ جارج، تابش کا مطالبہ پورا کرنے کا پابند ہے یا نہیں۔ اب شاید وہ اس اہم 'جج منٹ' سے فرار حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔"

"درمیانی راستہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، وہ مجھ سے یہی بات کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ اگر تم خود ہی اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہو جاؤ تو فیصلے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ یعنی تم کہہ دو کہ تم

جارج سے "مرو یا مارو" کی فائٹ نہیں چاہتے ہو۔"

"اس کے بدلے میں مجھے کیا حاصل ہو گا؟ مجھے تو ہارنے کی صورت میں سُولی پر چڑھنا ہے۔"

"میں نے بھی پنڈت مہاراج سے یہی بات کہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہو سکتا ہے، وہ اس سلسلے میں حکم جی سے تھوڑی بہت رعایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔"

"یعنی مجھے وہ چار گھنٹے کے لئے سُولی پر لٹکانے کے بجائے عمر بھر کے لئے لٹکا دیا جائے۔ زرگاں کی جیل میں ڈال دیا جائے...... نہیں میڈم...... مجھے یہ کڑی سزا منظور نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ جو بھی ہونا ہے، بس ان دو چار دنوں میں ہو جائے۔" میرا لہجہ حتمی اور فیصلہ کن تھا۔

میڈم نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر وہ عمران کو دیکھ کر بولی۔ "تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟"

چند لمحوں کے لئے میری اور عمران کی نگاہیں ٹکرائیں۔ ایک بجلی سی گوندی۔ یہ وہی بجلی تھی جو ہمیں ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ جو ہمیں یاد دلاتی تھی کہ ہم موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرا فیصلہ وہی ہو گا میڈم جو تابش کا ہو گا۔"

"تابش تُو فیصلہ دے چکا ہے۔"

"تو میں بھی دے رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے میڈم! میں رعایت کے نام پر جارج کی جیل میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک جانے کے بجائے آناً فاناً موت کو گلے لگانا اس کے لئے بہتر رہے گا۔"

"میڈم کی آنکھوں میں ایک تعجب سا نظر آنے لگا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر اور دھواں فضا میں چھوڑ کر بولی۔ "بہر حال...... تم لوگ کل تک اس بارے میں مزید سوچ لو۔"

"سوچ لیا میڈم۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میرا جواب ایک دن بعد بھی یہی ہو گا اور ایک ماہ یا ایک سال بعد بھی یہی۔ آپ پنڈت کو بتا دیں کہ میں اپنے پورے ہوش و حواس سے اپنے مطالبے پر قائم ہوں۔"

میڈم چلی گئی۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا اور عمران نے میری طرف۔ میں یونہی تو اس پر ناز نہیں کرتا تھا۔ وہ میری رگِ جاں سے قریب تر تھا۔ باروندا جیکی نے مجھے جسمانی طور پر مضبوط بنایا تھا لیکن عمران نے اس سے بڑا کام کیا تھا۔ اس نے مجھے روحانی اور ذہنی استقامت دی تھی۔ مجھے اندر سے بدلا تھا۔ اب بھی وہ اس نازک موقع پر مجھے ایک ایسی توانائی دے رہا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لئے ممکن نہ ہو۔ وہ میرا دل بن کر میرے دل میں دھڑک رہا تھا۔ وہ میرے بازو بن گیا تھا، میرا حوصلہ بن گیا تھا۔

میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ "تھینک یو عمران۔" میں نے دل کی گہرائی سے کہا۔

"وہ چند لمحے چپ رہا پھر ایک دم پٹڑی سے اُتر گیا۔ "تھینک یو کس بات کا؟ یہ تو میرا پیشہ ہے یار۔ لوگوں کو ذرا بھڑکا کر ایک دوسرے سے لڑانا اور پھر کھٹا کھٹ بریکنگ نیوز بناتے جانا۔ اب دیکھنا، فساد پلس پر کیسی کیسی لیڈ چلے گی...... اور اس کے بعد تبصرے، تجزیے اور ٹڑفیے چلیں گے۔ ٹڑفیے سمجھتے ہو نا تم؟ ایسے ٹاک شوز جن میں گنجے دانشور اچھل اچھل کر ٹڑف ٹڑف کر لڑتے ہیں۔ اب ذرا تم سوچو، ایک تو دانشور ہو اوپر سے گنجا...... وہ کیا قیامت نہ اٹھائے گا۔ بس مزہ آ جائے گا۔ یار! آٹھ دس کروڑ تو ہم یہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی بنا لیں گے۔"

"یہ پنڈت مہاراج کی منافقت پر غور کیا ہے تم نے؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"یار! غور کرنے کے لئے ناظرین جو ہوتے ہیں۔ ہمارا کام تو بس پسوڑی ڈالنا ہے اور وہ ہم ان شاء اللہ ڈالیں گے۔"

میں نے اس کی طنزیہ گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی منافقت ہے جو ہر مذہب کے کٹر لوگوں میں نظر آتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے علم کا سارا زور مذہب کو موم کی ناک بنانے پر صرف کر دیتے ہیں۔ اپنے گرو سورگ باشی سوبھاش کی کارستانیاں تو تمہیں یاد ہیں ناں؟ اس کے دوغلے پن کی ایک چھوٹی سی مثال وہ گرم ٹھنڈے پانی والا معاملہ تھا۔ اپنی سہولت کے لئے اس نے ادھ بجھے انگاروں کو آگ کی تعریف سے خارج کر دیا تھا۔ اب دیکھو، یہی کچھ یہاں یہ لمبی زُلفوں والا پنڈت مہاراج کر رہا ہے۔ ایک مشکل فیصلے سے بچنے کے لئے "بیک ڈور" کارروائیاں کر رہا ہے۔"

ہماری گفتگو کافی دیر جاری رہی پھر ہم سونے کے لئے لیٹ گئے۔ اب میری طرح عمران بھی سخت قالین پر ہی سوتا تھا، ہاں وہ لحاف ضرور اوڑھتا تھا۔

ہم لال بھون کی اونچی دیواروں میں بند تھے۔ چاروں طرف کڑا پہرا تھا۔ پھر بھی زرگاں کی صورتِ حال کی کچھ کچھ جھلکیاں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان جھلکیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ زرگاں کی فضاؤں میں ارتعاش اور ہلچل ہے۔ یہ ہلچل دو طرح کی تھی۔ ایک تو یہی

جارج اور میری لڑائی والا معاملہ تھا۔ اس لڑائی کو یوں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ اس سے پہلے میں تل پانی میں رنجیت جیسے شخص کو ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ دوسری ہلچل ساتویں کے سالانہ جشن کی تھی۔ یہ جشن بھی چند روز میں پہنچا چاہتا تھا۔ اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہماری معلومات کے مطابق زرگاں کے گلی کوچوں کو سجایا سنوارا جا رہا تھا۔ مختلف کھیل تماشوں کا انتظام ہو رہا تھا۔

ایسے ہی کچھ کھیل تماشوں کی تیاری لال بھون کے اندر بھی ہو رہی تھی۔ میں حسب معمول دوپہر سے ذرا پہلے جم میں ورزش اور مشق کے لئے چلا گیا۔ عمران کچھ دیر میرے ساتھ رہا پھر وہ گیتا مکھی کے ساتھ ایک پھول دار روش پر ٹہلتا کسی طرف نکل گیا۔ میں اکیلا ہی لگا رہا۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹنے لگا اور رگ پٹھے اپنی برداشت کی آخری حد کو چھونے لگے۔ میں اپنی دیوانہ وار کوشش سے ہر روز اس حد کو تھوڑا سا وسیع کر دیتا تھا۔ دورانِ مشق میں جم کے دروازے کھڑکیاں بند کر لیتا تھا کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ لال بھون کے گارڈز اور ملازمین کھڑکیوں اور دروازوں کی جھریوں سے مجھے دیکھنا پسند کرتے تھے۔

عمران کو اوجھل ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ورزش ختم کر کے میں نے پسینا پونچھا۔ کچھ دیر تک سانسیں درست کیں اور پھر عمران کی تلاش میں نکلا۔ وہ یہاں بھی بڑی تیزی سے اپنی جگہ بنانے لگا تھا۔ کبھی کسی سے گپ شپ کرتا نظر آتا تھا، کبھی کسی کا کوئی مسئلہ حل کرنے میں لگا ہوتا تھا۔ لال بھون میں سب کو یہی معلوم تھا کہ وہ میڈم کا خصوصی ملازم ہے۔ اسے مارشل آرٹ کی کچھ سمجھ بوجھ ہے اور میڈم کا ارادہ اسے اپنے ذاتی محافظوں میں شامل کرنے کا ہے۔

میں عمران کو ڈھونڈتا ہوا اندرونی حصے میں پہنچا تو وہ مجھے ایک بڑے ہال کمرے میں ملا۔ یہاں بڑی رونق تھی۔ خوبرو لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی بازی گری اور شعبدہ بازی کی ریہرسل کر رہی تھی۔ لڑکے لڑکیوں کی عمریں پندرہ بیس سال کے درمیان رہی ہوں گی۔ میں آج انہیں پہلی بار یہاں دیکھ رہا تھا۔

ایک طرف جمناسٹک کے انتظامات تھے۔ ایک طرف تنے ہوئے رسّے پر چلا جا رہا تھا۔ پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی چالیس عدد لڑکیاں بھی اس ریہرسل کو انجوائے کر رہی تھیں۔ ایک جانب منیجر مدن بھی بیٹھا تھا۔ مدن کے قریب عمران ایک نوخیز لڑکی کے ساتھ تند و تیز گفتگو میں مصروف تھا۔ لڑکی نے سرخ رنگ کا نیم عریاں لباس پہن رکھا تھا۔

میں نے قریب کھڑی گیتا سے پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے؟''

وہ بولی۔ ''یہ لال کپڑوں والی لڑکی بہت زبردست بازی گر ہے۔ اسے یہاں لٹل مس انڈیا کہا جاوت ہے۔ تمہارا دوست خواہ مخواہ اس کے ساتھ میچ ڈال کر بیٹھ گیا ہے۔''

''کیسا میچ؟''

''یہ لڑکی لوہے کے اس چکر کے اوپر کھڑی ہو کر اسے اپنے پاؤں سے چلاوت ہے اور ساتھ ساتھ کرتب دکھاوت ہے۔ تمہارا دوست کہتا ہے کہ وہ بھی ایسا کر لیوے گا۔'' گیتا نے تھوڑی دور پڑے ایک آہنی چکر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کڑا نما چکر زمین سے قریباً آٹھ فٹ اونچا تھا۔ اسے ایک چھ سات انچ چوڑی آہنی پٹی کو گول کر کے بنایا گیا تھا۔ اس پر چڑھنے کے لئے لکڑی کا ایک اسٹول بھی پڑا تھا۔

بظاہر اس چکر کے اوپر چڑھ کر اسے پاؤں سے گول گول دھکیلنا اور ساتھ ساتھ کوئی کرتب دکھانا کافی مشکل کام لگتا تھا لیکن عمران جیسے شخص کے لئے ہرگز مشکل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں کوئی جانتا نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ماہر فنکار ہے اور اس سے کئی گنا زیادہ مشکل کام کر سکتا ہے۔

معاملہ کافی گرما گرم تھا۔ لٹل مس انڈیا کے حمایتی اس کے حق میں چلا رہے تھے اور عمران کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ اپنا دعویٰ ثابت کر کے دکھائے۔ سترہ اٹھارہ سالہ نوخیز لڑکی بھی لال بھبوکا ہو رہی تھی۔ وہ زور سے بولی۔ ''اچھا تم باقی چھوڑو، پہلے والا آئٹم ہی کر کے دکھادو۔''

''او کے۔'' عمران نے سینہ تان کر کہا۔ ''میں کروں گا۔''

''لو، میں تمہارے لئے ایک بار پھر دُہرا دیتی ہوں۔'' لڑکی تند لہجے میں بولی۔

گیتا مکھی نے ایک چھوٹے اسٹول پر کھڑے ہو کر اناؤنسمنٹ کے انداز میں کہا۔ ''لو بھئی، لڑکے لڑکیو! لٹل مس انڈیا بمقابلہ بگ مسٹر پاکستان۔''

''ہو ہا'' کا شور بلند ہوا...... سرخ کپڑوں والی نوخیز لڑکی پھرتی سے اسٹول پر چڑھی اور لوہے کے چکر پر کھڑی ہو کر توازن درست کرنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلا دیئے تھے۔ ایک دوسری لڑکی نے اس کی دونوں ہتھیلیوں پر دو لمبی تلواریں رکھی ہیں۔ یہ بالکل سیدھی تلواریں تھیں۔ لڑکی نے رومن اسٹائل تلواریں اپنی دونوں ہتھیلیوں پر عمودی رخ سے کھڑی کیں اور انہیں بیلنس کر لیا پھر وہ اپنے پاؤں کے ساتھ، چھ سات انچ چوڑے آہنی چکر کو گول گول دھکیلنے لگی۔ اس نے تماشائیوں کے درمیان دو راؤنڈ مکمل کئے۔

تلواروں کو ہتھیلیوں پر بیلنس رکھنے کے ساتھ ساتھ چکر کو دھکیلنا واقعی مشکل کام لگتا تھا۔

لڑکی نے دو راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد تلواریں پھینکیں اور خوبصورت انداز میں قلابازی لگا کر فرش پر آ گئی۔ تالیوں سے ہال گونج گیا۔

اب عمران کی باری تھی۔ اس نے پہلے فرش پر کھڑے ہو کر تلواروں کو اپنی ہتھیلیوں پر کھڑا کیا۔ پھر پورے کرتب کے لئے اسٹول پر چڑھ کر چکر پر کھڑا ہو گیا۔ کرتب مشکل تھا لیکن عمران جیسے شخص کے لئے نہیں۔ اس نے تلواروں کو ہتھیلیوں پر کھڑا کر کے بیلنس کیا پھر آہستہ آہستہ آٹھ فٹ اونچے چکر کو اپنے پاؤں سے دھکیلنے لگا۔ دو چار لوگ عمران کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے مگر اکثریت لعل مس انڈیا کی حمایتی تھی۔ یہ لوگ عمران کو ''ہوٹ'' کر رہے تھے اور ڈرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

عمران نے ایک راؤنڈ مکمل کیا پھر دوسرا شروع کیا اور تب وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ کم از کم مجھے تو ہرگز نہیں تھی۔ عمران لڑکھڑایا، سنبھلنے کی کوشش کی۔ ایک تلوار گر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن دوبارہ حاصل کرتا آہنی چکر اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گیا...... وہ آٹھ فٹ کی بلندی سے اُڑتا ہوا نیچے آیا۔ ایک دم شور بلند ہوا، اس میں قہقہے بھی شامل تھے۔ عمران نیچے بیٹھے تماشائیوں پر گرا تھا۔ یہ وہی پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی دوشیزائیں تھیں۔ جو ایک دو لڑکیاں اس کے نیچے آئیں، وہ بُری طرح چلائیں۔ عمران کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہوا۔ اس کے نیچے آنے والی لڑکیوں میں ایک زخمی ہوئی تھی۔ عمران نے جو تلوار پکڑ رکھی تھی، اس کی نوک لڑکی کی گردن کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ لڑکی کا خون رِسنے لگا تھا اور وہ تکلیف سے دُہری ہو گئی تھی۔ میں دیکھ کر بُری طرح ٹھٹکا۔ یہ ثمرین تھی۔ میں تیزی سے اس کی طرف گیا۔ زخم گہرا نہیں تھا لیکن پانچ چھ انچ لمبا اور قریباً دو انگل چوڑا تھا۔ وہ گردن سے شروع ہو کر اس کے کان کی لو تک چلا گیا تھا۔

''ویری ساری...... ویری ساری۔'' عمران بار بار کہہ رہا تھا۔

''اوہ گاڈ۔'' گیتا زخم دیکھ کر بڑبڑائی۔

اس نے اپنی ساڑھی کے پلو سے ثمرین کا خون روکا اور اسے لے کر ہال سے نکل گئی۔ سرخ کپڑوں والی لڑکی کے حمایتی، فاتحانہ نعرے لگا رہے تھے۔ عمران پہلے تو کھسیانا نظر آیا...... پھر اس نے کھلے دل سے ہار مان لی اور تند و تیز فقروں کی طرف سے کان لپیٹ کر وہاں سے نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم آگے پیچھے کمرے میں آئے۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' میں نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''وہی جو تم نے دیکھا ہے۔''

''مسخری مت کرو عمران...... مجھے بتاؤ ایسا کیوں کیا ہے؟''

''یار! کیا خوبرو لڑکیوں کے اوپر گرنا تمہارا ہی حق ہے۔ آخر ہم بھی سینے میں دل رکھتے ہیں۔ جب گر ہی گئے تو سوچا کہ چلو کسی اچھی جگہ پر گریں......''

''تم بکواس کر رہے ہو...... تم...... تم...... جان بوجھ کر گرے ہو۔ جان بوجھ کر ہارے ہو۔ کیا ضرورت تھی اس طرح اپنی بے عزتی کرانے کی...... اور پھر اس لڑکی کو جو چوٹ لگی ہے، اس کا ذمے دار کون ہے؟''

''ذمے دار کوئی نہیں...... ایسا حادثہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے یار۔ جہاں تک بے عزتی کی بات ہے، ہم پہلے ایسے کون سے نواب عزت بیگ ہیں۔''

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو...... ہپناٹزم کرنے کا ارادہ ہے کیا؟'' وہ بولا۔

میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''تم بہت اونچی شے ہو عمران...... تم نے...... جان بوجھ کر ثمرین کو زخم لگایا ہے نا؟''

''توبہ توبہ۔'' وہ گال پیٹنے لگا۔ ''اتنا بڑا الزام اور وہ بھی جمعۃ المبارک کے دن۔''

''یہ الزام نہیں...... حقیقت ہے...... میں سمجھ گیا ہوں...... سب سمجھ گیا ہوں۔ تم نے کہا تھا ثمرین بچ سکتی ہے...... اور تم نے اس کو بچایا ہے...... تم نے اسے داغ دار کیا ہے...... کیونکہ تم جانتے ہو کہ بے داغ اور بے عیب لڑکی ہی فیری سلیکشن میں حصہ لے سکتی ہے۔''

اس نے دیدے گھمائے۔ ''زبردست...... ونڈرفل۔ یار! تم واقعی سپر جینئس ہو۔ بندے کے اندر ایسی عقل مندیاں ڈھونڈ لیتے ہو جو اس نے کی ہی نہیں ہوتیں۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بھئی واہ...... یہ مجھ سے کیا بے ساختہ کارنامہ سرزد ہو گیا ہے۔ بھئی واہ۔''

مجھے پتا تھا، وہ بدستور بکواس کر رہا ہے۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''تم کو سمجھنا بڑا مشکل ہے عمران...... پتا نہیں کیا شے ہو تم؟''

''میں کوئی شے نہیں۔ بس یہ تمہارا حسن نظر ہے شہزادے۔ مجھے ایسی فلموں کا ہیرو بنا دیتے ہو جن کا میں نے صرف نام سنا ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، فلم پاکیزہ میں دلیپ کمار کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

میں خاموش رہا۔ وہ میری طرف سے خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا۔ تم

کہنا چاہ رہے ہو کہ فلم پاکیزہ میں تو دلیپ کمار تھا ہی نہیں...... بھئی یہی ہوا تھا نا۔ اسے فلم میں لیا ہی نہیں گیا اور اس کی جگہ راج کمار کو لے لیا گیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ فلم آن میں بھی ہوا تھا......'' وہ ایک بار پھر اوٹ پٹانگ بولتا چلا گیا۔

......وہ رات خاصی تاریک تھی۔ میں اور عمران پہلو بہ پہلو قالین پر لیٹے تھے۔ وہ دو دن سے زبردستی مجھے بھی لحاف اوڑھا رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے لیکن دونوں کے ذہنوں میں یقیناً ایک ہی طرح کے خیالات گھوم رہے تھے۔ وہ مقابلہ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے زرگار میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ صیاد خود اپنے دام میں آ گیا ہے۔ اب بات خود جارج کے ہاتھ سے بھی نکلی ہوئی لگتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس مقابلے کی نوعیت اور دیگر شرائط کے بارے میں جو فیصلہ بھی ہونا ہے، وہ پنڈتوں، پنچوں اور دیگر عمائدین نے کرنا ہے اور آخری رائے پنڈت مہاراج کی ہونی ہے۔

○......❖......○

رات کا پتا نہیں وہ کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی، فقط ایک کھڑکی میں سے تھوڑی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ مجھے عمران نے ہی ہلا کر جگایا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تھا تو اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکنا اور چوکس نظر آتا تھا۔ اس نے دونوں لحافوں کو قالین پر اسی طرح پڑا رہنے دیا جیسے ان کے نیچے کوئی لیٹا ہو۔ پھر وہ قالین پر اوندھے منہ رینگتا ہوا غسل خانے کے دروازے کی طرف گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میری ساری حسیات آناً فاناً بیدار ہو گئی تھیں اور میں سمجھ گیا تھا کہ ہم کسی شدید خطرے میں ہیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم تاریک سرد غسل خانے کے اندر تھے۔ عمران نے دروازے میں تھوڑی سی جھری رہنے دی اور باہر دیکھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے کمرے کی کھڑکی کے پاس کسی سائے کی حرکت محسوس ہوئی......

ہم غسل خانے کی تاریکی میں دم سادھے کھڑے رہے اور صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہے۔ سایہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ہم رات کو دروازہ مقفل کر کے سوتے تھے۔ یہ آہنی دروازہ تھا اور اس دروازے سے ملتا جلتا تھا جو چند روز پہلے فائرنگ کی وجہ سے خراب ہوا تھا اور اسے کھولنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اب ہمارا کمرا تبدیل ہو چکا تھا۔

چند سیکنڈ مزید گزرے، پھر دروازے کے ہضمی قفل میں چابی گھومنے کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔ شک تو ہمیں پہلے ہی ہو رہا تھا، اب یقین ہونے لگا کہ یوں چوری چھپے ہمارے کمرے میں داخل ہونے والا اس عمارت میں موجود افراد میں سے ہی کوئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہمارے محافظوں میں سے کوئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ بے آواز کھل گیا اور ایک دراز قد شخص دبے پاؤں اندر آیا۔ اس

نے وارداتیوں کی طرح اپنا چہرہ ایک کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی جس کا بیرل معمول سے زیادہ لمبا نظر آ رہا تھا۔غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اندر آنے والے شخص کے جسم پر محافظوں والا مخصوص لباس ہے۔وہ چند سیکنڈ تک تاریکی میں کھڑا دونوں لحافوں کو گھورتا رہا پھر اس نے رائفل سیدھی کی اور بڑی تیزی سے دونوں لحافوں پر پانچ چھ فائر کئے۔فائرنگ کی آواز سے انکشاف ہوا کہ رائفل پر سائیلنسر چڑھا ہوا ہے۔

فائرنگ کے فوراً بعد وہ مڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔یہی وقت تھا جب عمران نے اپنی جگہ سے تیز رفتار حرکت کی اور غسل خانے سے نکل کر اُڑتا ہوا سا حملہ آور پر جا پڑا۔حملہ آور اس کے نیچے اوندھے منہ گرا اور گرتے ہوئے آہنی دروازے سے ٹکرایا۔اس کے لئے یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ جیسے تیورا کر رہ گیا۔میں عمران کی مدد کے لئے آگے بڑھا تاہم اس وقت دروازے پر ایک اور پرچھائیں نظر آئی۔یہ بھی ایک محافظ تھا۔اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔اس نے بلاتردد مجھ پر فائر کیا۔دھماکے کے ساتھ شعلہ چمکا اور گولی میرے آس پاس سے گزر گئی۔میں نے حملہ آور کو دوسرے فائر کا موقع نہیں دیا اور اس پر جا گرا۔میں نے سب سے پہلے اس کا پستول والا ہاتھ دبوچا۔پھر دائیں ہاتھ کا مکا اس کے چہرے پر رسید کیا۔یہ بڑی شدید ضرب تھی۔مدِمقابل کے دو تین دانت ضرور اپنی جگہ چھوڑ گئے ہوں گے۔وہ کراہا اور اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔اس دوران میں وزنی بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور سات آٹھ گارڈز موقع پر پہنچ گئے۔مجھے ایک دو لمحے کے لئے شدید خطرہ محسوس ہوا۔کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ گارڈز ہماری مدد کریں گے یا اپنے چٹی بھائیوں کی۔

"خبردار......خبردار" کئی آوازیں گونجیں۔

دو محافظوں نے میرے نیچے دبے ہوئے شخص کے سر سے رائفلیں لگا دیں۔چند محافظوں نے عمران کا ہاتھ ہٹایا اور دوسرے حملہ آور کو دبوچ لیا۔لال بھون میں ہر طرف کھلبلی مچ گئی تھی۔بتیاں روشن ہو رہی تھیں اور بھاگتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔دونوں حملہ آوروں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔سیاہ رنگ کے ڈھاٹے ان کے چہروں سے علیحدہ کئے گئے، ہم نے پہچان لیا۔یہ ہمارے محافظوں میں سے ہی تھے۔ہم دن میں کئی بار انہیں اپنے آس پاس دیکھتے تھے۔جس شخص کو میرا مکا لگا تھا، اس کے دہن کا کباڑا ہو گیا تھا۔دونوں ہونٹ پھٹ گئے تھے اور دو تین دانت اپنی مقررہ جگہ سے غیر حاضر تھے۔

ہم پر گولی چلانے والا دراز قد محافظ پہلے تو سکتہ زدہ رہا پھر میری طرف رخ کر کے طیش میں چلانے لگا۔"تم کو جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔مار دیں گے تم کو۔تم بچ جات......تم

گندی نالی کے کیڑے۔تم کو یہ جرأت ناہیں کرنے دیں گے، ناہیں کرنے دیں گے۔"

یقیناً یہ سامبر کی لڑائی کا ذکر کر رہا تھا اور اپنی اس تکلیف کا اظہار کر رہا تھا جو راج بھون کے بلند و بالا دروازے کے سامنے میری "للکار" نے اسے پہنچائی تھی۔محافظوں نے دونوں حملہ آوروں کی مشکیں کس دیں۔اسی دوران میں منیجر مدن اور میڈم صفورا وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئے۔میڈم سلیپنگ گاؤن میں تھی اور اس کے چہرے پر سخت ہلچل تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟ واٹ از گوئنگ آن ہیئر؟" وہ گرجی۔

پھر چند ہی سیکنڈ میں ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں آ گئی۔وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ اگر محافظوں میں سے دو محافظ قاتل کا روپ دھار سکتے ہیں تو دو چار اور بھی ہو سکتے ہیں۔لہٰذا ضروری تھا کہ مجھے فوراً موقع سے ہٹا لیا جاتا۔اس نے ہمیں اپنے ساتھ لیا اور اپنے خصوصی پورشن میں لے آئی۔یہ لگژری پورشن الیکٹرک ہیٹرز سے گرم تھا۔"جب تک میں نہ کہوں، تم دونوں یہاں سے باہر نہیں نکلنا۔" وہ بولی۔

"آپ بے فکر رہیں۔" عمران نے اسے تسلی دی۔

وہ جلدی سے باہر چلی گئی۔

"یہ سب کیا ہے یار؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"اسے اردو میں شب خون اور انگریزی میں نائٹ اٹیک کہتے ہیں۔فرانسیسی میں بھی اس کے لئے ایک بھلا سا لفظ ہے، اس وقت یاد نہیں آ رہا۔"

"لیکن اس قاتلانہ حملے کا مقصد کیا تھا؟"

"اصل مقصد تو میڈم ہی ڈھونڈ کر لائے گی۔ہم تو بس اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ یہ لوگ تمہیں جارج گورا کے مدِمقابل دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"تمہیں پتا کیسے چلا کہ کوئی ہمارے کمرے کی طرف آ رہا ہے؟"

"یار! میں نیوز چینل کا چڑیلا ہوں۔ایک تو چڑیلا دوسرا نیم چڑھا۔ہماری ناک بہت تیز ہوتی ہے بلکہ ہم تو مجسم ناک ہوتے ہیں۔ان واقعات کی بُو بھی سونگھ لیتے ہیں جن کی بُو ہی نہیں ہوتی، یعنی جو وقوع پذیر ہی نہیں ہوتے لیکن جس تازہ واقعے کی تم بات کر رہے ہو، اس کا شک مجھے کل شام سے ہی تھا۔دراصل بڑے پنڈت کا یہاں آنا اور میڈم سے مل کر تمہیں مقابلے سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ہر صورت تمہیں سامبر سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"تم نے سامبر کی صورت ہی ایسی بنا دی ہے۔ اسے مرو یا مارو کی لڑائی کا ناک نقشہ دے دیا ہے اور یہ بات ہر جگہ پھیل بھی چکی ہے۔"

"اسے پھیلانے والے بھی تم ہی ہو۔ تم نے جان بوجھ کر گیتا کے سامنے بات کی۔ تم بڑے زبردست قسم کے کھوچل ہو عمران۔ میں اب آہستہ آہستہ تمہیں سمجھنا شروع ہو گیا ہوں۔"

"ایسے ہی موقع کے لئے محمد رفیع صاحب بڑے فلسفے کی بہت گہری بات کہہ گئے ہیں۔ تم نے بھی سنا ہوگا، میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے۔"

"یہ کیا بے تکی بات ہے؟"

"اور پھر بھی تم کہہ رہے ہو کہ آہستہ آہستہ مجھے سمجھنا شروع ہو گئے ہو؟ اس شعر میں چاند کے ٹکڑے سے مطلب انسان کے بیکار خیالات ہیں اور "کھڑکی" دماغ کا استخارہ ہے۔"

"یہ استخارہ نہیں استعارہ ہوتا ہے...... اور اب تم چپ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔"

میں اُٹھ کر کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم ایک خطرناک حملے سے بال بال بچے ہیں۔ یہ سب کھلی آنکھوں کے خواب جیسا لگ رہا تھا۔

میڈم کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے بتایا۔ "پکڑے جانے والے حملہ آوروں کے نام امرت اور شنکر ہیں۔ ان کے چار اور ساتھی بھی حراست میں لے لئے گئے ہیں۔ یہ سارے یہاں کے گارڈز ہیں۔"

"یہ سب کرایا کس نے ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"ابھی پورے یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر لگتا یہی ہے کہ اس کے پیچھے حکم جی کے کسی قریبی ساتھی کا ہاتھ ہوگا۔" آخری الفاظ کہتے کہتے میڈم نے اپنی آواز بہت دھیمی کر لی۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ لوگ ظاہر تو نہیں کر رہے ہے لیکن اندر خانے ان کی مرضی یہی ہے کہ تمہارے اور جارج کے درمیان مرو یا مارو والی فائٹ نہ ہو۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کا اتنا قریبی دوست کسی ایسی لڑائی کا شکار ہو جائے...... لیکن میں پھر کہتی ہوں، ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ ان دو گارڈز کا انفرادی فعل ہی ہو۔ بہرحال یہ بات تو کنفرم ہے کہ تمہیں

یہاں بہت زیادہ سیکیورٹی کی ضرورت ہے...... اور میں اس سیکیورٹی کا ارجنٹ انتظام کر رہی ہوں۔"

ہم دونوں پر ہونے والے اس قاتلانہ حملے کی خبر بھی بہت جلد زرگاں میں پھیل گئی......

اگلے روز دوپہر کے وقت میں اور عمران "جم" جانے کے لئے کمرے سے نکلے تو بڑی بڑی مونچھوں والے ایک سینئر گارڈ نے ہمیں روک لیا۔ "ناہیں سر!" اس نے ادب سے کہا۔ "اوپر سے آرڈر رہے۔ آپ ابھی کمرے سے ناہیں نکل سکتے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ میڈم کہاں ہیں؟" میں نے تنک کر پوچھا۔

"میڈم ابھی بھون سے باہر ہیں۔ وہ تھوڑی دیر میں آوت ہیں تو ان سے بات کر لیجئے گا۔" گارڈ بولا۔

"تم زیادہ تھانے دار بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں اپنی ذمے داری پر جا رہا ہوں۔"

"میں شما چاہت ہوں سرکار۔ یہ میری نوکری کا سوال ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، آپ کی رکھشا کے لئے کر رہے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میری اور سینئر گارڈ کی گفتگو تکرار کی شکل اختیار کرتی، گیتا مکھی وہاں آ گئی۔ وہ بہت چست لباس پہنتی تھی اور اس کے جسم میں ماہر رقاصاؤں جیسا لوچ تھا۔ اس نے مداخلت کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ اندر آنے کے لئے کہا۔ میں اور عمران، گیتا کے ساتھ واپس کمرے میں آ گئے۔ گیتا عمران سے خفا خفا نظر آتی تھی۔ اس خفگی کی وجہ وہی ثمرین والا واقعہ تھا۔ اس دن وہاں بالکل "مقابلے" والا ماحول بن گیا تھا۔ مس انڈیا اور مسٹر پاکستان کے نعرے گونجے تھے۔ عمران کرتب دکھاتے ہوئے بلندی سے ثمرین پر گرا تھا اور اسے زخمی کر دیا تھا۔ یہ بات اب تقریباً طے تھی کہ گیتا مکھی اپنی ایک قیمتی شاگرد سے محروم ہو چکی تھی۔

کمرے میں آ کر گیتا نے مجھے مخاطب کیا اور اپنے مخصوص بازاری انداز میں بولی۔

"اس بے چارے سے آپ کیوں مغز ماری کرت ہو۔ وہ آرڈر سے مجبور ہے۔ ابھی میڈم جی آ جاوت ہیں، جو کہنا ہے ان سے کہہ لینا۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ دونوں کا جیون بچ گیا۔ ویسے ابھی بھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں۔ کل رات میڈم جی نے یہاں کے تقریباً سارے گارڈز تبدیل کر دیئے ہیں۔ سات آٹھ بندوں کو پکڑا بھی گیا ہے۔"

"شہر کی کیا پوزیشن ہے؟" میں نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

"آج تو میرا من بھی چاہ رہا ہے کہ لڑکیوں کی طرح آپ جناب سے آٹوگراف مانگوں اور سوال جواب کروں۔ رات والے واقعے کے بعد آپ کی شہرت میں ایک دم اضافہ

ہوا ہے۔ ہر جگہ آپ ہی کا چرچا ہے۔ زیادہ تر لوگن کا یہی وچار ہے کہ راج بھون میں حکم جی کے کچھ ساتھی ناہیں چاہت ہیں کہ آپ جارج گورا سے دوبدو مقابلہ کریں۔ وہ یہ مقابلہ رکوانے کے لئے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری طرف راج بھون سے سختی کے ساتھ اس بات سے انکار کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ دو تین لوگن کا ذاتی جرم ہے اور اس کا بوجھ دوسروں کے سر نہیں ڈالنا چاہئے۔ راج بھون کی طرف سے لوگن سے اور خاص طور سے مسلمان شہریوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ پُرسکون رہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہووے گا، قانون قاعدے کے مطابق ہووے گا۔''

''مسلمانوں سے خاص اپیل کرنے کی ضرورت کیوں پڑی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گیتا بولی۔'' سچی بات یہ ہے کہ جب سے جارج صاحب اور سلطانہ والا واقعہ ہوا ہے، مسلمان آبادی جارج صاحب کے خلاف ہے۔ اب انہیں پتا چلا ہے کہ سلطانہ کا پتی جارج صاحب سے دوبدو لڑائی کے لئے یہاں پہنچا ہے تو ان کا جوش تازہ ہو گیا ہے اور پرانے زخم بھی ہرے ہو گئے ہیں۔ ان لوگن نے اس مقابلے کے ساتھ اپنی بہت سی آشائیں جوڑ لی ہیں۔ اگر تم یہاں زرگاں میں راتوں رات مشہور ہوئے ہو تو اس کا ایک کارن یہ بھی ہے۔ ان لوگن کو پورا وشواس ہے کہ صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ تمہارا جارج کے محافظوں کو ادھیڑ کر یہاں سے بھاگنا، پھر نل پانی میں پانڈے کو نیچا دکھانا، پھر یہاں آنا اور جارج صاحب کو للکارنا...... اور آخر میں انہیں ''مرویا مارو'' کا چیلنج دینا یہ ساری باتیں ان لوگن کے لئے بڑے اچنبھے کی ہیں۔ ان کا یہ وچار پکا ہو رہا ہے کہ تمہارے کارن کوئی انہونی ہو گی۔''

''جارج گورا صاحب کیا فرماتے ہیں؟'' عمران نے گیتا سے استفسار کیا۔

وہ عمران کو ناگواری سے دیکھ کر بولی۔ ''گورا صاحب بہت غصے میں ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی ساکھ خراب ہو رہی ہے۔ لوگن ان کو شکتی دیوتا کے نام سے یاد کرت ہیں مگر اب اس طرح کی سوچ پھیل رہی ہے کہ شاید جارج صاحب خود بھی سامبر لڑنا ناہیں چاہتے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آج کا دن بہت اہم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شام سے پہلے جارج صاحب تمہارے چیلنج کے بارے میں کوئی واضح اعلان کر دیں۔''

''میرا چیلنج؟''

''ہاں، یہی مرویا مارو والی بات۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیویں اور اس شبھ گھڑی کا اعلان بھی کر دیویں جو پنڈتوں نے نکالی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ جارج صاحب ایسے خطروں سے ڈرنے والے ناہیں۔ تم وشواس رکھو کہ اگر تمہارا مقابلہ ہوا تو ایک دلیر آدمی سے

ہووے گا۔''

''دلیر نہیں گھمنڈی۔'' میں نے کہا۔

''تم کچھ بھی کہہ لو لیکن یہ بات اپنی جگہ ٹھوس حقیقت ہے کہ یہاں جارج صاحب کے بے شمار پرستار بھی ہیں۔ اچھائیاں برائیاں تو ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ جارج صاحب کی ایک بڑی اچھائی یہ ہے کہ وہ بڑے دل کے مالک ہیں۔ ان کے پاس دھن ہے اور وہ دھن کو خرچ کرنا بھی جانت ہیں۔ زرگاں کے بے شمار لوگن کو ان کی خیر خیرات سے فائدہ پہنچتا ہے۔''

''تمہاری عقل کا ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے گیتا مکھی۔ تم جیسے ہندوستانی ہی ہیں جنہوں نے ہر دور میں باہر سے آنے والے زور آوروں کے سامنے سر جھکانے کی ریت نبھاتی ہے۔ جس کو تم خیر خیرات کہہ رہی ہو، یہ زناکاریوں اور عیش پرستیوں کا عوضانہ ہے اور یہ عوضانہ بھی تمہارے ہی خون پسینے کی کمائی سے دیا جاتا ہے۔ ان گوری چمڑی والوں کے لئے یہاں کے لوگ بھک منگوں اور بے غیرتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ جو کچھ ان بھک منگوں اور بے غیرتوں کو دے رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ وصول کرتا ہے اور اس کام میں تمہارا حکم جی اس کا مددگار ہے۔''

میرے ان سخت ریمارکس پر گیتا مکھی نے ناراضی کا اظہار کیا لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس ناراضی کی تہ میں کہیں میری دبی دبی تائید بھی موجود ہے۔

گیتا مکھی ایک چلتی پھرتی جہاندیدہ عورت تھی۔ اس نے جارج گورا کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ درست ثابت ہوا۔ شام سے پہلے ہی سرجن اسٹیل اپنے سالے جارج کی نمائندگی کرتے ہوئے لال بھون میں پہنچ گیا۔ وہ ہم سے انگلش میں بات کرتا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا۔'' جارج صاحب نے پنڈتوں سے مشورے کے بعد تمہارا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ''مرویا مارو'' کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ بہرحال اس کے لئے چند چھوٹی چھوٹی شرطیں بھی ہیں۔''

''مجھے یہ شرطیں بغیر سنے منظور ہیں۔ مجھے بتاؤ مقابلہ کب ہے؟'' میں نے اسٹیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''پنڈت مہاراج نے دو شبھ گھڑیاں نکالی تھیں۔ ایک شبھ گھڑی عین ساتویں کے جشن کے روز آ رہی ہے۔ دوسری جشن کے تین دن بعد۔ مشورے سے فیصلہ ہوا ہے کہ تمہارے اور جارج صاحب کے درمیان سامبر کی رسم جشن کے بعد ہو گی۔ جشن کے تیسرے روز سورج ڈوبنے سے کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے۔''

"یہ کس طرح کی لڑائی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"اس میں کوئی آتشیں ہتھیار استعمال نہیں ہوگا کیونکہ تمہاری خواہش کے مطابق یہ دست بدست لڑائی ہے۔ موقع پر تین یا چار تیز دھار آلے رکھے جائیں گے۔ جارج صاحب تمہیں پیشکش کریں گے کہ تم ان میں سے کوئی سا ایک آلہ اُٹھا کر ان سے لڑ سکتے ہو۔ تم جو آلہ چنو گے، جارج صاحب بھی اس جیسا آلہ استعمال کرنے کے حقدار ہوں گے۔" پھر سرجن اسٹیل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ان آلاتِ ضرب میں کٹاری، چاقو اور چھوٹے دستے کی کلہاڑی جسے مقامی زبان میں دستی کہا جاتا ہے، شامل ہوں گے۔

اسٹیل نے کچھ دیگر شرائط بھی بتائیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مرو یا مارو کی لڑائی کے باوجود جارج گورا کے پاس مجھے سزائے موت دینے یعنی سُولی پر ٹانگنے کا آپشن موجود رہے گا۔ اپنے جیتنے کی صورت میں جارج گورا مجھے موقع پر ختم کرنے کے بجائے سُولی پر چڑھانے کا شوق پورا کر سکے گا۔

دیگر شرائط کی طرح میں نے یہ شرط بھی فوراً منظور کر لی...... میں کشتیاں جلا چکا تھا، اب مجھے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا تھا۔ مجھے صرف جیتنا تھا اور جیتنا تھا...... اور جب مجھے صرف جیتنا تھا تو پھر سزائے موت کا تذکرہ میرے نصاب سے باہر تھا۔ میں وجدانی جوش کے ایک ایسے دھارے میں بہا جا رہا تھا جس کے رخ اور بہاؤ کا خود مجھے بھی ٹھیک سے علم نہیں تھا۔ یہ ایک جنون تھا، دیوانہ پن تھا۔ یہ وہی ضد تھی جو شیشے کو پتھر سے ٹکراتی ہے اور پھر پتھر کو توڑنے کا عزم بھی رکھتی ہے۔

میں نے اسٹیل کی ساری باتوں کے جواب میں بس ایک ہی بات کہی۔ "میری صرف ایک ہی شرط ہے مسٹر اسٹیل! اور یہ وہ شرط ہے جو جارج شروع میں ہی مان چکا ہے۔ میرے جیتنے کی صورت میں اسحاق کی بھاوج کو آزاد کر کے میرے حوالے کر دیا جائے گا اور مجھے نل پانی تک پہنچنے کا محفوظ راستہ دیا جائے گا۔"

"یہ بالکل طے ہے اور اس کی ضمانت اس تحریر میں بھی دی گئی ہے جو تمہارے اور جارج صاحب کے مقابلے کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ اس پر حکم جی، پنڈت مہاراج اور دیگر اہم لوگوں کی گواہی موجود ہوگی۔ مقابلے کے وقت اس تحریر پر تمہارے اور جارج صاحب کے دستخط بھی لئے جائیں گے۔"

ہماری اس گفتگو کے دوران میں میڈم صفورا بھی موقع پر موجود رہی تھی۔ اسٹیل اور جارج کی موجودگی میں وہ بالکل مؤدب کھڑی رہتی تھی اور صرف اس وقت بولتی تھی جب اس

سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا۔

رات کو میں سونے کے لئے لیٹا تو سلطانہ بڑی شدت سے یاد آنے لگی۔ اس کے گداز ہونٹ، اس کے گھنے بال اور سب سے بڑھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہر وقت عجز و انکساری نظر آتی تھی اور میرے لئے غیر مشروط محبت و اطاعت ٹپکتی رہتی تھی۔ میں اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ جارج گورا سے بدلہ لے کر آؤں گا یا پھر کبھی نہیں آؤں گا اور اس نے مجھے اشک بار آنکھوں سے رخصت کیا تھا اور کہا تھا...... "میں تمہاری کامیابی کی دعا کروں گی مہروج! اور یہ دعا بھی کروں گی کہ میری عمر تمہیں لگ جائے۔"

اب وہ یہاں سے طویل فاصلے پر اس مندر کے سہ منزلہ تہ خانے میں تاؤ افضل، ہوشیار لکھ اور آفتاب خاں وغیرہ کے ساتھ موجود تھی۔ مجھے معلوم تھا، وہ ہر گھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ ہر آہٹ پر چونکتی ہے، ہر چاپ پر سراپا نگاہ بن جاتی ہے لیکن مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میں سرخرو ہو سکوں گا یا نہیں...... اور اگر سرخرو ہو گیا تو اس کے پاس جا سکوں گا یا نہیں...... اور اگر چلا گیا تو کیا وہ مجھے اس مندر میں بخیر و عافیت مل پائے گی یا وہاں حالات بدل چکے ہوں گے؟ ان گنت سوالات تھے اور جواب کوئی نہیں تھا۔

مجھے نوری یاد آئی۔ درحقیقت اس نے سلطانہ کو پھر سے میرے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور اگر غور کیا جاتا تو یہ کردار بھی اصل میں عمران نے ہی ادا کیا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے نوری کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ وہ ہر گھڑی میرے اردگرد نظر آتی تھی اور اسی وجہ سے سلطانہ کے اندر سوئی ہوئی عورت دھیرے دھیرے بیدار ہوئی تھی۔ بچے کی محبت نے اس عورت کو بیدار کرنے میں مزید مدد کی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا، ایک بار کم از کم ایک بار، سلطانہ کی آنکھوں کا سپنا ضرور پورا کر دوں۔ اس کی گود میں بالو ہو، اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کر شرمائے اور جب میں اسے چھوؤں تو اس پر وہ اذیت ناک کپکپی طاری نہ ہو جو اس کے جسم کا خون نچوڑ لیتی تھی۔

اس پر کیوں طاری ہوتی تھی وہ کپکپی؟ اس سوال کا جواب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کپکپی کا مآخذ جارج گورا تھا اور مجھے اسے مارنا تھا۔ اس کی خون آلود لاش کو اپنے پاؤں تلے روندنا تھا...... اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر سلطانہ کو بتانا تھا کہ میں نے اس کی آن بان اور عزت کے ہتھیارے کے ساتھ کیا کیا ہے۔

ایک بار پھر میرے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ رگ پٹھوں میں ایک بے نام حرارت لہریں لینے لگی۔ میں ہمیشہ کی طرح بے چین ہو اُٹھا۔ قالین سے اُٹھ کر کمرے میں

ٹہلنے لگا۔ پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ آج سردی معمول سے بڑھ کر تھی۔ کبھی کبھی گرج چمک کا احساس بھی ہوتا تھا۔ میں راہداری میں پہنچا تو سینئر گارڈ جگ موہن نے مجھے روکا۔

''آپ کہاں جاوت ہیں سر؟''

''تم میری آیا مت بنو۔'' میں پھنکارا۔ ''مجھے اس چار دیواری میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے۔''

''لیکن سر...... رات کو اس سمے؟''

''میرے لئے رات دن برابر ہیں۔ تم پیچھے ہٹو۔ مجھے جم میں جانا ہے۔''

''جم میں؟ سر! یہ تو کوئی ٹائم ناہیں ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

یہی وقت تھا جب مجھے اپنے عقب میں عمران کی آواز سنائی دی۔ میرا یہ اندیشہ درست نکلا تھا کہ وہ سو نہیں رہا، بس یونہی آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔ وہ گارڈ جگ موہن سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو بھئی، آگ لگنے کا کوئی ٹائم نہیں ہوتا۔ بالکل جیسے زلزلہ کسی بھی وقت آ سکتا ہے اور آندھی کبھی بھی چلنا شروع ہو جاتی ہے۔ تم ٹائم شائم کے چکر میں نہ پڑو۔ بڑے صاحب کو جانے دو جم میں۔''

''پیچھے ہٹو۔'' میں نے گارڈ کو ایک طرف دھکیلا۔

''لیکن جناب! جم تو اس ٹائم بند ہے۔ تالے لگے ہوئے ہیں۔''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

عمران بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم نے دو دن پہلے پریکٹس کا ایک متبادل انتظام کر لیا تھا۔ پائیں باغ میں درختوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ ہمارے کام آ سکتی تھی۔ یہاں ہم نے ایک سینڈ بیگ لٹکوا دیا تھا اور کینوس کا ایک بہت بڑا گدا بھی ڈلوا دیا تھا۔ اس گدے میں چاول کی چھال یعنی پرالی بھری ہوئی تھی۔

راہداری سے نکل کر ہم احاطے میں پہنچے اور پھر پائیں باغ میں داخل ہو گئے۔ کڑاکے کی سردی میں اس مصروفیت کا کوئی جواز تو نہیں بنتا تھا لیکن میں اپنے اندرونی اضطراب کا کیا کرتا جو مجھے کسی کروٹ چین لینے نہیں دے رہا تھا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ اگر میرے اندر کی آگ کو کوئی ایندھن نہ ملا تو میں خود ہی اس میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔

میں نے کہا۔ ''یار عمران! مجھے تو اس ذلیل جارج کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔ تم پر کیا آفت آئی ہے؟ تم تو جا کر سو جاؤ۔''

''یہ تو وہی فلمی سچویشن ہے جگر! ستارو...... تم تو سو جاؤ پریشاں رات ساری ہے، اا

سب رات پریشان ہے، تم پریشان ہو تو پھر میں کیسے آرام کر سکتا ہوں۔ لہٰذا جہاں گدھا وہیں ...تی۔''

ہم دونوں باغ کے اس تنہا کنج میں چلے آئے۔ ہلکی دھند نے قرب و جوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوا تھمی ہوئی تھی مگر تاریک آسمان پر گاہے بگاہے بجلی چمک جاتی تھی۔ ہماری حرکت کے ساتھ ہی گارڈز نے بھی حرکت کی تھی۔ وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن یقینی بات تھی کہ وہ پائیں باغ کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ میں اور عمران پہلے شیڈو فائٹ کرتے رہے پھر سینڈ بیگ کے ساتھ مشغول ہو گئے۔ سینڈ بیگ کو قدرے نرم رکھنے کے لئے اس میں عموماً ریت کے ساتھ لکڑی کا باریک برادہ بھی بھرا جاتا ہے مگر اس بیگ میں صرف ریت ہی ریت تھی۔ یہ بہت ہارڈ تھا اور خالی ہاتھ اس پر مسلسل مکا بازی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہم لگے رہے۔ پھر عمران وقفہ لینے کے لئے بیٹھ گیا مگر میں بدستور مصروف رہا۔ دھم دھم کی آوازوں سے باغ کا وہ تنہا گوشہ گونجتا رہا۔ وہی جنون، وہی دیوانہ پن، وہی خواہش کہ جسم کو اتنی تکلیف پہنچے کہ وہ چیخ جائے۔ سانسوں کی کٹار اتنی تیز ہو جائے کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں اور برداشت کی وہ حد آئے کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جائے۔ میں وقفہ نہ لوں بلکہ تیورا کر گر جاؤں۔ جیکی نے کہا تھا، پہلے اپنے آپ سے جنگ جیتنا پڑتی ہے اور جب یہ ہو جائے تو پھر کچھ بھی ناممکن نہیں رہتا۔ جو لوگ مجھے اس طرح اندھا دھند مشق کرتے دیکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ میں بیمار پڑ جاؤں گا یا پھر کوئی ایسی چوٹ لگوا لوں گا کہ مجھے مارشل آرٹ وغیرہ سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑ جائے گی۔ ایسی باتوں میں یقیناً وزن تھا مگر میں جس راستے پر چل پڑا تھا، اس سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ یہ ایک الگ راستہ تھا، یہ ایک جدا طرز تھی۔ اس میں وہ کرنا تھا جو نہیں کرنا تھا۔ اس میں سب سے پہلا حریف اپنا ہی نفس تھا۔ اس میں بہت تکلیف تھی لیکن اس تکلیف کو برداشت کرنے کے لئے ایک اسمِ اعظم بھی تھا اور وہ اسمِ اعظم یہ یقین تھا کہ اس تکلیف کا صلہ ملے گا...... اس تکلیف کا صلہ ملے گا۔

ایک بار بادل زور سے گرجا اور پھر بارش ہونے لگی۔ میرے دہکتے ہوئے جسم پر یخ بستہ بوچھاڑ پڑی۔ ''بس کرو یار! باقی صبح سہی۔'' عمران نے رائے دی۔

''تم نے جانا ہے تو جاؤ۔'' میں نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

عمران نے تکرار نہیں کی۔ وہ میرا رمز شناس تھا۔ سمجھ گیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ اس نے پہلو سے کانٹا بدلا۔ ''اچھا ایسے تو ایسے ہی سہی۔'' وہ اُٹھا اور مجھ پر پل پڑا۔

ہم پرالی سے بھرے ہوئے گدے کے اوپر گرے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی

اندھا دھند کوشش کرنے لگے۔ بارش نے زور پکڑا۔ ہمیں سیکیورٹی گارڈز کے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ وہ سایہ ڈھونڈنے کے لئے دائیں بائیں ہو رہے تھے۔ یہ بڑی مزے دار صورتِ حال تھی۔ جب سارا شہر گرم کپڑوں میں آتش دانوں اور انگیٹھیوں کے سامنے بھی سردی محسوس کر رہا تھا، ہم یخ بستہ بارش میں اپنا الگ ہی تماشا لگائے ہوئے تھے۔

میری اور عمران کی زور آزمائی میں پھر وہی فرق سامنے تھا۔ وہ مہارت اور تکنیک میں مجھ سے آگے تھا لیکن میں اپنی غیر معمولی برداشت اور اسٹیمنا کے سبب اس کو ٹف ٹائم دے رہا تھا۔ زوردار بارش میں ہماری یہ اندھا دھند کشتی دس پندرہ منٹ جاری رہی۔ ہماری قمیصیں تار تار ہو گئیں۔ اسی دوران میں اولے پڑنے لگے۔ فائبر کے قریبی شیڈ پر اولوں کے گرنے کی آواز بڑی زوردار تھی۔

عمران نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہم دونوں میں سے ایک ضرور شیطان ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے زور لگا کر اس کا ”آرم لاک“ توڑا اور اس کے اوپر آ گیا۔

”ہمیں کنکریاں ماری جا رہی ہیں۔“ وہ بولا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ”اور وہ دیکھو، اب حاجن بھی نظر آ رہی ہے۔“

میں نے عمران کو نیچے دبائے دبائے گھوم کر دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر میڈم صفورا اپنی بڑے سائز کی کالی چھتری لئے کھڑی تھی۔ اس نے سفید گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ پکاری۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ اپنے ہوش میں تو ہو؟“

میں نے جو ایک سیکنڈ میڈم کو دیکھنے میں صرف کیا تھا؟ اس میں عمران نے اپنا کام دکھا دیا۔ اس نے جوڈو کی ایک فرشی تکنیک استعمال کرتے ہوئے ایک بار پھر مجھے اپنے بازو کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس بار بازو کے بجائے میری گردن گرفت میں آئی۔ اب وہ میرے نیچے ہونے کے باوجود مجھے بے بس کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ جب میں اس کی یہ غیر معمولی پھرتی اور مہارت دیکھتا تھا تو مجھے میڈم کی اس بات میں وزن محسوس ہونے لگتا تھا کہ میرے بجائے جارج کا مقابلہ عمران کو کرنا چاہئے تھا۔

میں اپنی گردن کو عمران کے بازو سے نکالنے کی تدبیر سوچ رہا تھا جب دفعتاً ژالہ باری تیز ہو گئی۔ ژالوں کا سائز بھی شاید بڑھ گیا تھا۔ اب کھلی جگہ پر ہونا خود کو زخمی کرنے کے مترادف تھا۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور بھاگتے ہوئے فائبر کے شیڈ کے نیچے آ گئے۔ ہمارے جسم کی خراشوں سے خون رِس رہا تھا اور سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ میڈم بھی چھتری سمیت شیڈ میں پہنچ گئی۔ کئی مسلح گارڈز بھی ہمارے اردگرد آن موجود ہوئے۔ وہ بھیگے

ہوئے تھے اور سردی میں نیلے پڑ رہے تھے۔ یقیناً دل ہی دل میں وہ ہمیں بددعاؤں سے نواز رہے ہوں گے۔

”یہ کیا حماقت ہے بھئی؟“ میڈم نے غصے سے کہا۔ ”تم لوگ مجھے مشکل میں ڈال دو گے۔ تمہاری سیکیورٹی اور صحت میری ذمے داری ہے اور تم لٹھ لے کر ان دونوں چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ یہ کوئی بات ہے۔“

وہ غصے سے کانپ رہی تھی اور غالباً اس کپکپاہٹ میں کچھ عمل دخل سردی کا بھی تھا۔

”سوری۔“ میں نے مختصراً کہا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

عمران اور میڈم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے پھر قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی میرے پیچھے آ رہے ہیں۔

کمرے میں پہنچ کر میڈم نے مجھے سیکیورٹی کے حوالے سے موجود خطرات سے آگاہ کیا اور تنبیہہ کی کہ میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتوں۔ اس کی باتوں میں وزن تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں عمران لباس تبدیل کر چکا تھا۔ میں نے بھی لباس تبدیل کیا۔ میڈم نے میرے منع کرنے کے باوجود آتش دان روشن کروایا اور ملازم سے کافی وغیرہ لانے کے لئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آتش دان کے سامنے بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ اب رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ لگتا تھا کہ ہماری طرح ابھی میڈم بھی سوئی نہیں تھی۔ سلیپنگ گاؤن ضرور اس کے جسم پر تھا مگر چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک بستر سے دور تھی۔ اس نے بتایا کہ ساتویں کے جشن کے حوالے سے جو تیاریاں ہو رہی ہیں، وہ ان میں مصروف تھی اور ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے فارغ ہوئی ہے۔ ہم ساتویں کے جشن کے بارے میں بات کرتے رہے۔ پھر گفتگو کا رخ اس قدیم رسم سامبر کی طرف مڑ گیا جس کے لئے شبھ گھڑی اب نکالی جا چکی تھی اور ہم دھیرے دھیرے اس شبھ گھڑی کی طرف سرک رہے تھے۔

میڈم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”آؤ، میں تم دونوں کو کچھ دکھاؤں۔“

ہم نے ایک دوجے کو دیکھا پھر اُٹھ کھڑے ہوئیں میڈم ہمیں لے کر ایک طویل قالین پوش راہداری سے گزری پھر لکڑی کے زینوں پر آ گئی۔ یہ زینے اوپر ایک گیلری میں جا رہے تھے۔ شیشے کی رنگین کھڑکیوں سے باہر بارش اب ایک دھیمی ہموار رفتار سے برس رہی تھی اور گاہے بگاہے بجلی بھی چمک دکھا جاتی تھی۔ ہم ایک طویل گیلری میں پہنچے۔ گیلری کی چھت اونچی تھی اور یہاں اوپر تک لکڑی کی پالش شدہ الماریاں چنی ہوئی تھیں۔ یہ دراصل اس لال حویلی کا شاندار کتب خانہ تھا۔

میڈم ایک الماری تک پہنچی اور اس نے کتابوں کے درمیان سے ایک بڑا سا البم نکال لیا۔ یہ دراصل سامبر کی مصور کہانی تھی۔ اس جہازی سائز کے البم میں ڈیڑھ دو سو تصویریں تھیں۔ اس میں سامبر کی تاریخ درج تھی اور پچھلے بیس پچیس سال میں جو اہم لڑائیاں ہوئی تھیں، ان کا باتصویر تذکرہ بھی تھا۔ زیادہ تر تصویریں کیمروں سے کھینچی گئی تھیں۔ کچھ ہاتھ کے بنے ہوئے اسکیچ بھی تھے۔ تصویروں کے ساتھ جو ٹیکسٹ تھا، وہ انگلش میں تھا اور وہ بھی ہر جگہ ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں راجواڑے کے اندر کتب یا اخبار وغیرہ چھاپنے کی سہولت موجود نہیں ہے۔

سویمبر اور سامبر کی تاریخ ہزاروں سال پرانی تھی۔ اس کے بارے میں اس البم کے اندر کافی کچھ لکھا گیا تھا۔ ماضی میں ہونے والے کئی سامبر مقابلوں کا ذکر بھی اس میں موجود تھا۔ شروع میں درج تھا۔ ”کسی مطلوبہ شے کے لئے نر جاتی کے درمیان زور آزمائی کرنے کا رواج اتنا ہی پرانا ہے جتنی اس زمین کی تاریخ۔ کہنے کو تو ہم سویمبر اور سامبر کو رسم کہتے ہیں لیکن یہ رسم نہیں ہے۔ یہ عین فطرت ہے...... اور یہ فطرت انسان اور حیوان دونوں میں ایک جیسی ہے۔ مادہ کے حصول کے لئے نر جان دار ہمیشہ سے سویمبر رچاتے آئے ہیں۔ چرند، پرند، چوپائے درندے سب اس میں شامل ہیں۔ یہ جاندار اپنی مادہ کے حصول کے علاوہ علاقے اور خوراک وغیرہ کے لئے بھی دوبدو مقابلہ کرتے ہیں۔ زور آور اپنا مقصد پاتا ہے اور کمزور اپنی شکست تسلیم کر کے مزید نقصان اور خون خرابے سے بچتا ہے۔ یہ سب قدرت کے اصولوں کے مطابق ہے۔ اس تصویر کے نیچے پنسل سے بنا ہوا ایک اسکیچ تھا جس میں دو جوان بارہ سنگوں کو ایک مادہ کے لئے اندھا دھند لڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

اس طرح کی اور چھوٹی بڑی تصویریں اور تحریریں بھی البم میں موجود تھیں۔ ان میں سامبر کے مختلف طریقوں اور واقعات پر روشنی پڑتی تھی۔ کیمرے کی ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹو میں حکم کے ایک ماموں کو ایک مغویہ کے سلسلے میں ایک ڈکیت سے مقابلہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ چھوٹی تلوار یعنی کٹاری کا مقابلہ تھا۔ دونوں حریفوں نے باقاعدہ زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے۔ سروں کی حفاظت کے لئے آہنی ٹوپیاں تھیں۔ تصویر میں حکم کا گرانڈیل ماموں، ڈکیت کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور اس نے کٹاری اس کی گردن پر رکھی ہوئی تھی۔

میڈم نے بتایا۔ ”یہ دیکھو، نیچے اس مقابلے کی تاریخ بھی درج ہے۔ 8 ستمبر 1938ء۔ حکم کا ماموں یہ ”باؤٹ“ جیت گیا تھا اور اس نے مغویہ لڑکی کو ڈکیت سے چھڑا کر اس سے باقاعدہ میرج کی تھی اور یہ دیکھو، یہ تصویر۔“ میڈم نے ایک اور فوٹوگراف کی طرف اشار

کیا۔ اس میں دو آدمی ”ڈیول“ کے انداز میں ایک دوسرے پر پستول سے گولی چلا رہے تھے۔ فوجی وردی والا شخص گولی چلانے میں پہل کر گیا تھا اور اس کا حریف زخمی ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ کون کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”حکم جی کے والد رائے پرتاپ کا سیناپتی اشوکا اور حکم کا عسکری استاد افگن راجپوت۔ دونوں کے درمیان ایک خوبصورت خانہ بدوش لڑکی کے لئے جھگڑا کھڑا ہوا تھا۔ افگن اس لڑکی کی شادی اپنے چھوٹے بھائی سے کرانا چاہتا تھا۔ جبکہ سیناپتی اسے خود اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں سیناپتی جیت گیا تھا۔“

”اور حکم کا استاد...... اللہ کو پیارا ہو گیا؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں، وہ بھی زندہ بچ گیا تھا۔ دراصل سامبر میں اگر اس طرح کا مقابلہ ہو تو اس میں ربر کی گولیاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ صرف زخمی کرتی ہیں۔ سامبر اور سویمبر کی لڑائی عام طور پر حریف کو صرف زیر کرنے کے لئے لڑی جاتی ہیں۔“

”سویمبر اور سامبر میں اصل فرق کیا ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”یہ پڑھو۔ یہ فرق یہاں لکھا ہے۔“ میڈم نے تھوڑی سی ورق گردانی کر کے ایک تحریر عمران کو دکھائی۔

انگریزی میں لکھا تھا۔ ”سویمبر کسی عورت کے لئے رچایا جاتا ہے۔ وہ کچھ خواہش مند لوگوں میں سے اپنے لئے شوہر چنتی ہے۔ یہ چناؤ عام طور پر جسمانی طاقت کے مقابلے سے ہوتا ہے۔ تاہم سامبر کا دائرہ وسیع ہے۔ اس میں عورت کے علاوہ جائداد، زیور یا کوئی بھی قیمتی چیز تنازعے کی وجہ ہو سکتی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ سامبر کا مقابلہ صرف دو دعوے داروں کے درمیان نہیں ہوتا۔ دعوے داروں کی جانب سے کوئی بھی شخص اس رسم میں حصہ لے سکتا ہے۔ مثلاً ایک قیمتی گھوڑے کی ملکیت پر کسی ادھیڑ عمر شخص کی طرف سے اس کا چھوٹا بھائی یا بیٹا سامبر میں حصہ لے سکتا ہے......“

تحریر میں اس حوالے سے اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔

عمران نے پوچھا۔ ”مرو یا مارو والی لڑائی اس سے پہلے بھی ہوتی رہی ہے؟“

”بالکل، ایسی مثالیں موجود ہیں۔ یہ دیکھو...... یہ ایک تصویر۔“ میڈم نے چند صفحات پلٹے۔

یہ ایک سنسنی خیز منظر تھا۔ رنگین تصویر تھی۔ نیچے تاریخ درج تھی۔ نو جنوری 1972ء۔

بڑی بڑی مونچھوں والا ایک انگریز رقص کے انداز میں اچھل رہا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک کالا بھجنگ مقامی پڑا تھا۔ اس تنومند مقامی شخص کے سینے میں دستے تک ایک خنجر پیوست تھا اور وہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ میڈم بولی۔ ''یہ پڑھو۔ مرنے والے کا نام کمار ہے۔ یہ مقامی شکاری تھا۔ اس نے حکم جی کے والد کے مہمان مسٹر ڈی جون کو ''فائٹ ٹل ڈیتھ'' کا چیلنج کیا۔ ڈی جون بھی ایک مشہور شکاری تھا اور گر شیروں پر ریسرچ کے لئے انڈیا آیا ہوا تھا۔ وہ اب بھی شاید زندہ ہے۔ دونوں میں ایک قیمتی باز کے حوالے سے جھگڑا ہوا تھا اور اس جھگڑے میں وقفے وقفے سے چار بندوں کا مرڈر بھی ہوا تھا۔ بالآخر بات سامبر تک پہنچی تھی۔ اس مقابلے نے بھی اسٹیٹ میں بہت شہرت پائی تھی۔ دراصل جب کبھی بھی کوئی ''مرو یا مارو'' والا مقابلہ ہوتا ہے اس کو بہت شہرت مل جاتی ہے۔ اس مقابلے میں یہ انگریز شکاری ڈی جون جیت گیا۔ اس تصویر کے بعد بھی ڈی جون نے اپنے دم توڑتے حریف پر خنجر کے دس پندرہ وار کئے تھے اور اسے زخم زخم کر دیا تھا۔ وہ تصویر اس البم میں شامل نہیں ہے۔''

البم میں کچھ تصویریں چونکا دینے والی تھیں بلکہ ان کو شرمناک بھی کہا جا سکتا تھا۔ ان کی تعداد آٹھ دس ہوگی۔ ''یہ تصویریں کیا ہیں؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''اس کو راندی کہا جاتا ہے۔'' میڈم نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''یہ مقامی زبان کا لفظ ہے۔ مطلب ہے لعنت بھیجنا۔ یہ سامبر کے طور طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ یہ راندی ان لوگوں کے ساتھ کی جاتی ہے جو سامبر لڑتے ہیں اور اپنے مدِمقابل سے بُری طرح ہار جاتے ہیں۔ بُری طرح ہارنے سے مطلب ایک خاص طریقے سے ہارنا ہے۔ یہ دیکھو، یہاں اس بارے میں تھوڑی سی تفصیل لکھی ہے...... جب سامبر میں ایک حریف دوسرے کو اس طرح سے ہرائے کہ اس کے پورے بوجھ کو سر سے بلند کر کے اکھاڑے میں پٹخ دے تو وہ راندی کرنے کا حق دار ہوتا ہے اور یہ مقابلہ اس کے ساتھ ہی فوراً ختم بھی ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھو...... میں تمہیں دکھاتی ہوں۔''

میڈم نے جلدی جلدی چند ورق پلٹے اور سامبر کا ایک منظر دکھایا۔ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں ایک پہلوان نما شخص اپنے حریف کو باقاعدہ بازوؤں پر اُٹھا کر زمین پر پٹخنے کی تیاری میں تھا۔

میڈم بولی۔ ''سامبر میں اس داؤ کے چل جانے کے دوسرے حریف کی بدترین شکست سمجھا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف ہارتا ہے بلکہ راندی کا شکار بھی ہوتا ہے۔''

یہ اس ساری تفصیل کا ایک اور دلچسپ پہلو تھا اور کسی حد تک شرمناک بھی۔ ہم نے راندی زدہ افراد کی تصویریں دیکھیں۔ وہ مکمل برہنہ کر دیئے گئے تھے اور جیتنے والا حریف ان کی پشت پر لات مار کر انہیں اکھاڑے سے باہر پھینک رہا تھا۔ دو چار تصویریں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ہارنے والے کو گارڈز وغیرہ نے زبردستی برہنہ کیا ہے اور انہیں بازوؤں سے جکڑ رکھا ہے تاکہ جیتنے والا حریف ان کی ننگی پیٹھ پر لات رسید کرنے کی رسم ادا کر سکے۔

''زبردست۔'' عمران نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''میں جارج گورا کو اس حالت میں دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کروں گا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مرو اور مارو والی فائٹ میں بھی یہ رول لاگو ہوتا ہے؟''

''بالکل ہوتا ہے۔'' میڈم نے کہا۔ ''بلکہ اس سلسلے میں تمہیں مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔ آئی تھنک، یہ ایک بہت خطرناک رُول ہے۔ لڑائی کے کسی بھی مرحلے میں اگر تمہارا حریف تمہیں بازوؤں پر سیدھا اوپر اُٹھا کر پٹخ دے تو سمجھو کہ کھیل وہیں پر ختم ہو گیا۔ یعنی مرو یا مارو والی لڑائی بھی وہیں پر ختم ہو جائے گی اور پٹخا جانے والا حریف دفاع کے قابل بھی ہوا تو مکمل طور پر دوسرے حریف کے رحم و کرم پر آ جائے گا لیکن......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

''لیکن کیا میڈم؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے مارشل آرٹ وغیرہ کی اتنی سمجھ بوجھ تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ حقیقی لڑائی میں کسی شخص کا اپنے جیسے مدِمقابل کو بازوؤں پر اُٹھا کر سر سے بلند کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ ایسا واقعہ شاذ و نادر ہی رُونما ہوتا ہوگا۔'' وہ سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' عمران نے تائید کی۔ ''نورا کشتیوں کے سوا ایسا کبھی کبھار ہی ہو پاتا ہے...... بہرحال، خطرہ تو خطرہ ہی ہوتا ہے اور اس خطرے کا ثبوت یہ آٹھ دس فوٹوگراف بھی ہیں۔''

''ہاں، میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ جارج بھی کم از کم ایک بار تو یہ کارنامہ انجام دے ہی چکا ہے۔''

میڈم نے ورق گردانی کی اور ایک رنگین فوٹوگراف دکھایا۔ یہ قریباً تین برس پرانی تصویر تھی۔ اس لڑائی میں چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں استعمال ہوئی تھیں۔ دونوں حریفوں نے زرہ بکتر جیسے لباس پہن رکھے تھے اور سروں پر آہنی ٹوپیاں تھیں۔ جارج نے اپنے مدِمقابل کو بازوؤں پر اُٹھا کر سر سے بلند کر رکھا تھا اور اسے پٹخنے کے مرحلے میں تھا۔ ان کے اردگرد

سیکڑوں پُر جوش تماشائی نظر آ رہے تھے۔ جس کو اُٹھایا گیا تھا، وہ تنومند شخص تھا۔ زرہ بکتر نما شے نے اسے مزید بوجھل کر رکھا تھا۔ اس منظر سے جارج کی غیر معمولی جسمانی طاقت کا سراغ بھی ملتا تھا۔ میڈم نے بتایا کہ اس شخص کو خاص طریقے سے ہرانے کے باوجود جارج نے اس کے ساتھ رانڈی نہیں کی تھی۔ یعنی اسے کپڑے اُتارنے پر مجبور نہیں کیا۔ ہاں، غصے کے اظہار کے لئے اس پر تھوکا تھا اور دھکا دے کر اکھاڑے سے باہر کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ یہاں نیچے درج ہے۔ ایسے ہی چھوٹے بڑے واقعات کی وجہ سے یہاں جارج کے پرستاروں کی حلقہ موجود ہے جو اسے شکتی دیوتا کا نام دیتا ہے۔''

لگتا تھا کہ میڈم نے اس ضخیم البم کے ٹیکسٹ کو کافی غور سے پڑھ رکھا تھا۔ اس نے ہمیں گراں قدر معلومات فراہم کیں۔

میڈم آج ہم دونوں کے ساتھ کافی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو تمہارے اور جارج صاحب کے سامبر کے بارے میں سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ شبھ گھڑی بھی آ چکی ہے لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ شاید یہ لڑائی نہ ہو سکے یا اس میں کوئی اور رکاوٹ آ جائے۔ بس ایک خیال سا ہے میرا۔''

''خیال کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے میڈم؟'' عمران نے کہا۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور عمران کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہیں اتنی انفارمیشن دیں، اتنا کچھ بتایا لیکن تم دونوں بہت کچھ چھپاتے ہو اور چھپا رہے ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں میڈم؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر گہرا کش لے کر بولی۔ ''مجھے ایک بات سچ سچ بتانا...... کیا اس دن تم کرتب دکھاتے ہوئے واقعی گرے تھے یا یہ ایک ڈراما تھا؟''

عمران ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا۔ ''آپ کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا؟''

''ثمرین جو زخمی ہوئی ہے، سلطانہ کی بھابی بننے والی تھی۔ یقیناً تم دونوں کے دلوں میں اس کے لئے نرم گوشہ ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے ''فیری سلیکشن'' سے بچانے کے لئے تم نے اسے زخمی کیا ہے؟''

میڈم ایک نہایت جہاندیدہ عورت تھی۔ ہمیں پہلے ہی شبہ تھا کہ اس کا دھیان ضرور اس طرف جائے گا۔ اب اس بات کو چھپانا میڈم سے فاصلہ بڑھانے کے مترادف تھا اور ہم یہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد عمران نے یہ بات تسلیم کر لی۔ میڈم نے خفگی کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ بڑی خطرناک حرکت تھی۔ اگر کسی کو ذرا سا شبہ بھی ہو

جاتا کہ جان بوجھ کر ایسا کیا گیا ہے تو تمہارے ساتھ ساتھ ثمرین بھی سخت مصیبت کا شکار ہوتی۔ اب بھی گیتا اور منیجر مدن وغیرہ کو غفلت کا الزام دیا جا رہا ہے اور ان سے سخت باز پُرس ہوئی ہے۔ یہاں کی سزائیں بڑی سخت ہیں۔ تمہیں وہ درد کے انجکشن والی بات یاد ہے نا؟ یہ ثمرین جیسی لڑکی تو اتنی دوا کی ہلکی سی ڈوز بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوتی رہی۔ پھر میڈم کی ناراضی کم ہو گئی اور وہ نارمل نظر آنے لگی۔ وہ نارمل ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ ''آپ ابھی یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ سامبر کی لڑائی میں اب بھی رکاوٹ ہے؟''

وہ چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''کل ایک بڑھیا حکم جی کی کچہری میں پیش ہوئی ہے۔ مجھے پوری بات کا تو پتا نہیں۔ سنا ہے، اس نے حکم جی کے سامنے واویلا کیا ہے اور کہا ہے کہ سلطانہ اور اس کا پتی دھرم ورودھی ہیں۔ ان مہا پاپیوں کو کسی بھی رسم یا شرط وغیرہ کی آڑ میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے ان دھرم ورودھیوں کی سزا کی خاطر اپنا بیٹا اور بہو قربان کئے ہیں۔ اپنے پوتے کے سہارے سے محروم ہوئی ہوں، وغیرہ وغیرہ۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دھیان فوراً مالا کی دادی ساس یعنی ستیش کی کھوسٹ دادی کی طرف چلا گیا جو دقیانوسیت اور توہم پرستی میں اپنی مثال آپ تھی۔ اس کے ساتھ ہی فتح پور کے مندر میں پیش آنے والے خونی واقعات بھی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ ان واقعات کے بعد ستیش، مالا اور اس کی دادی ساس اچانک ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

''یہ بڑھیا کون ہے؟'' میں نے اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے میڈم سے پوچھا۔

''ابھی مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن سنا یہی ہے کہ نل پانی سے آئی ہے۔ میں صبح اس بارے میں انفارمیشن لوں گی۔''

ہم جب اپنے کمرے میں واپس پہنچے تو عمران گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تابش! میں اپنی پہلے دن والی رائے پر قائم ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے راج بھون کے سامنے جا کر اور جارج کو للکار کر جلد بازی کی ہے۔ میں اسے بہادرانہ بے وقوفی کہوں گا۔ پہلے تو اس بات میں بھی ابھی تک شبہ موجود ہے کہ جارج کے ساتھ تمہارا ''مرو یا مارو'' والا دوبدو مقابلہ ہوگا لیکن اگر یہ مقابلہ ہو بھی گیا تو اس کے بعد کی صورتِ حال واضح نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم جیت گئے تو ہمیں خراماں خراماں واپس نل پانی جانے کی اجازت دے دی جائے گی...... خدانخواستہ دوسری صورت ہوئی تو تمہیں سُولی پر لٹکا کر قصہ ختم کر دیا

جائے گا...... لیکن میرے خیال میں یہ دونوں کام مشکل ہیں۔ ہار یا جیت، دونوں ہی صورتوں میں تمہارے لئے سلطانہ والا مسئلہ وہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں تم سے معلومات حاصل کئے بغیر یہ لوگ تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے۔"

"لیکن جارج علی الاعلان یہ "کمٹمنٹ" کر چکا ہے۔"

"اس کمٹمنٹ کی چولیں ہلانے کے لئے یہ پنڈت پجاری وغیرہ جو موجود ہیں۔ جس طرح یہ اپنے مطلب کی کنڈلی نکال لیتے ہیں، اسی طرح ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔"

"لیکن ابھی تک پنڈت مہاراج نے تو کسی حد تک اصول پسندی دکھائی ہے۔ اس نے منصف کے طور پر ایک ایسا فیصلہ دیا ہے جو بہت سے لوگوں کو پسند نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے، میری اور جارج کی "مرو یا مارو" والی فائٹ کروانے کا فیصلہ۔"

"ہاں، یہ تو ہے لیکن ہو سکتا ہے اس میں وہ دیگر پنڈتوں اور پوتھیوں، شاستروں میں لکھی ہوئی تحریروں کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہو۔ پھر بھی اس نے اندر خانے تمہیں تمہارے مطالبے سے ہٹانے کی کوشش تو کی۔"

ہمارا خیال تھا کہ اگلے روز میڈم راج بھون سے بڑھیا کے بارے میں کوئی خبر لائے گی لیکن ہوا یہ کہ خود ہمیں ہی راج بھون سے بلاوا آ گیا۔ میں اور عمران اس وقت ثمرین کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ ابھی ہمارے سامنے سے گزر کر اندرونی پورشن کی طرف گئی تھی۔ وہ قدرے کمزور نظر آتی تھی۔ عمران کی تلوار سے لگنے والا زخم اس کی گردن سے شروع ہو کر کان کی لو تک چلا گیا تھا۔ سات آٹھ ٹانکے لگے تھے۔ اب پٹی کھل چکی تھی تاہم اب بھی زخم پر کوئی دوا لگی ہوئی تھی۔ اس زخم نے اس کے حسن کو گہنایا تھا مگر اس کی آبرو کو ایک فوری خطرے سے محفوظ کر دیا تھا...... اور داغ تو چاند کے چہرے پر بھی ہوتے ہیں۔ مجھے اور عمران کو یقین تھا کہ ثمرین موجودہ صورتِ حال سے خوش ہو گی۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ اسے ایک دو دن میں ہی اس کے گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ میں سوچنے لگا، کیا مستقبل قریب میں ایسا ہو سکے گا کہ ثمرین اور سلطانہ کے بھائی نبیل کو ان کی کھوئی ہوئی محبت مل سکے؟

ہم ثمرین کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جب میڈم افراتفری میں ہمارے کمرے میں آئی اور اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں دربار میں بلایا گیا ہے۔"

"دربار میں؟"

"ہاں، حکم جی نے تمہیں راج بھون میں بلایا ہے۔ بس آدھ گھنٹے کے اندر ہمیں وہاں حاضر ہونا ہے۔"

"خیریت تو ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ تو وہاں جا کر پتا چلے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی برہمن بڑھیا والا معاملہ ہو یا کوئی اور پرابلم ہو سکتا ہے۔"

عمران نے پوچھا۔ "کیا میں بھی ساتھ جا سکتا ہوں؟"

"تم کس حیثیت سے جاؤ گے؟"

"آپ کے گارڈ کے طور پر جا سکتا ہوں۔"

"دیکھو، کہیں مروا نہ دینا۔ مجھے سب سے بڑا اندیشہ یہی ہے کہ کہیں تمہارے اور تابش کے درمیان کسی طرح کا تعلق ثابت نہ ہو جائے۔"

"اس بارے میں آپ بالکل بےفکر رہیں۔" اس نے میڈم کو یقین دہانی کرائی۔

○......❖......○

اور اب میں راج بھون کی عظیم الشان عمارت کے اندر حکم کے پُرشکوہ دربار میں تھا۔ یہ دربار جدید اور قدیم آرائش کا خوبصورت امتزاج تھا۔

مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں محافظوں کے کڑے حصار میں یہاں تک لایا گیا تھا۔ میڈم اور عمران وغیرہ دوسری گھوڑا گاڑی میں یہاں تک پہنچے تھے۔ محافظوں کی ایک کھلی چھت والی جیپ ہمارے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ بلند و بالا چھت والے شاندار دربار کے اندر کھڑے ہو کر میں خود کو کسی قدیم داستان کا حصہ محسوس کرنے لگا۔ سامنے ایک زرنگار چبوترے پر ایک بہت بڑی منقش کرسی رکھی تھی۔ اس پر سونے کے پترے جڑے تھے اور قیمتی پتھر دمک رہے تھے۔ یقیناً یہ حکم جی کی نشست تھی۔ اردگرد آٹھ دس مزید کرسیاں موجود تھیں۔ ان پر مصاحبین بیٹھتے ہوں گے۔ ابھی یہ ساری نشستیں خالی تھیں تاہم دربار میں کافی افراد نظر آ رہے تھے۔ مجھے بھی زرنگار چبوترے کی ایک جانب نشست پر بٹھا دیا گیا۔ دربار میں موجود اکثر افراد کنکھیوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ان کے لئے یقیناً ایک دلچسپ چیز تھا۔ ایک ایسا شخص جو کچھ عرصہ پہلے تک مفلوج و معذور سمجھا جاتا تھا، اب ایک نئے روپ میں ان کے سامنے آیا تھا۔ اس کی ساری ہیئت ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ داستانی لیکن ٹھوس حقیقت تھا اور پچھلے چند ماہ میں، میں کئی جگہ اس کا ثبوت مہیا کر چکا تھا۔

کچھ دیر بعد زرنگار چبوترے کی اداسی ختم ہو گئی۔ ایک عقبی دروازے کا مخملی پردہ حرکت

میں آیا اور حکم جی پورے کروفر کے ساتھ نمودار ہوا۔ میں پہلی بار اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا تھا۔ رنگ گندمی اور سر پر ایک تاج نما پگڑی تھی۔ ایک قیمتی کام دار چغا اس کے پاؤں تک پہنچ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر روحانیت طاری کرنے کی شعوری کوشش کر رکھی ہے۔ اس نے آنکھیں نیم وا کر رکھی تھیں اور نپے تلے قدموں سے اپنی طلائی کرسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تمام درباری کھڑے ہو گئے اور رکوع کے بل جھک کر اسے تعظیم پیش کی۔ اس نے ہاتھ کے مدبرانہ اشاروں سے لوگوں کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے بھی بیٹھنا چاہا مگر ایک گارڈ نے مجھے کھڑا رہنے کی ہدایت کی۔

حکم جی کے ساتھ کوئی ایک درجن مصاحبین بھی تھے۔ ان میں سے کچھ چبوترے پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کچھ چبوترے کے سامنے پہلی قطار میں۔ چبوترے پر بیٹھنے والوں میں حکم کی تین بیویاں یعنی رانیاں شامل تھیں اور ان میں ایک مہارانی رتنا دیوی تھی۔ اس کا حسن آنکھیں چندھیا دینے والا تھا۔ یہی رتنا دیوی تھی جس سے جھگڑا کر کے سلطانہ زرگاں سے فرار ہو گئی تھی۔

حکم کے ساتھ جلوہ افروز ہونے والوں میں مجھے ایک جانی پہچانی صورت بھی دکھائی دی۔ یہ جارج کی بہن ماریا تھی۔ وہ ایک لمبے انگریزی اسکرٹ میں تھی۔ ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ شاید یہ دستانے انگلی کا عیب چھپانے کے لئے پہنے گئے تھے۔ کٹی ہوئی انگلی کی جگہ غالباً کوئی ''پیکنگ'' وغیرہ رکھ کر اسے برابر کر لیا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میری اور ماریا کی نظریں ملیں۔ ایک بجلی سی کوندگئی۔ وہ سارے منظر میرے ذہن میں بھی تازہ ہو گئے جن کا تعلق ماریا کے اغوا اور دیگر واقعات سے تھا۔

حکم جی دیگر حاضرین کی طرح مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بارعب آواز میں کہا۔ ''کیا تم ہمارے ایک دو سوالوں کے جواب دینا پسند کرو گے؟''

''فرمائیں۔''

''کہا جا رہا ہے کہ جب تم جیل سے فرار ہو کر نل پانی پہنچے تو تمہارے ساتھ ایک قریب المرگ شخص بھی تھا جس کا ایک بازو اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے بے باک لہجے میں کہا۔ ''عزت مآب! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں جیل سے نہیں، جارج کے گھر سے فرار ہوا تھا۔ جیل میں تو مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ رکھا ہی نہیں گیا تھا اور دوسری بات یہ کہ جس قریب المرگ شخص کی بات آپ کر رہے ہیں، آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کا نام بارونداجیکی تھا اور وہ ''قریب المرگ'' بھی آپ کے

دوست جارج کی وجہ سے ہوا تھا۔''

''سر جارج کا نام احترام سے لو۔'' چبوترے پر براجمان ایک فربہ شخص نے گرج کر کہا۔

''میرے دل میں جس کے لئے احترام نہیں، میں اپنی زبان پر اس کے لئے احترام کیسے لا سکتا ہوں؟ اور دوسری بات یہ جناب عالی کہ اس وقت ہم دونوں کے درمیان سامبر کی لڑائی طے ہو چکی ہے۔ اس رُو سے ہم دونوں صرف حریف ہیں اور حریفوں کا درجہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔''

فربہ شخص نے مزید مشتعل ہو کر کچھ کہنا چاہا لیکن حکم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''تم بارونداکے قریب المرگ ہونے کی بات تو کرت ہو لیکن یہ نا ہیں جانت کہ اس کا اپرادھ کتنا بڑا تھا۔ اس نے شاہی پریوار کی عزت پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال، ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہم صرف یہ پوچھنا چاہت ہیں کہ کیا واقعی تم بارونداجیکی کے شاگرد ہو؟ کیونکہ یہاں کچھ لوگن یہ بات بڑے وشواس کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کس حوالے سے شاگردی کی بات کر رہے ہیں؟''

''تمہارا رہن سہن...... تمہارا برتاؤ...... تمہارے لڑنے کا انداز...... اور اس جیسی دوسری چیزیں۔''

''میں خود کو اس بہت بڑے شخص کا شاگرد کہلوانے کا حق دار تو نہیں سمجھتا لیکن میں مانتا ہوں کہ میں نے اس سے تھوڑا بہت سیکھا ضرور ہے۔''

''سنا ہے کہ درد کے حوالے سے تمہارا کوئی خاص فلسفہ ہے اور تم خود کو آرام و آسائش سے دور رکھ کر اور جسمانی اذیتیں دے کر خوش ہوتے ہو؟''

''اس میں خوش ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ بس میں برداشت بڑھانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔''

''اس چکر میں بھی تمہیں باروندانے ہی ڈالا ہے؟''

''آپ اسے چکر کہہ لیں لیکن میرے نزدیک یہ بھی جینے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے...... ایک طرزِ حیات۔ میرا مذہب مجھے ایسے بھی سادہ اور پُر مشقت زندگی کی تلقین کرتا ہے۔ کم کھانا، کم سونا، خود کو زیادہ آسائشوں اور نفسانی لذتوں سے حتی الامکان دور رکھنا،

یہ سب کچھ تو کوئی بھی شخص اپنا سکتا ہے۔ آپ بھی اپنا سکتے ہو لیکن اس کے لئے اندر کی جرأت درکار ہے۔"

"اپنا لہجہ درست رکھو۔" فربہ شخص ایک بار پھر گرجا۔

حکم نے اسے دوبارہ ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

مجھے گھورتے ہوئے حکم نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ "اپنے مذہب پر بہت اتراتے ہو تم لوگن اور ہر جگہ اس کی مثالیں بھی دیوت ہو لیکن جب پڑھے لکھے لوگن میں بیٹھ کر تمہیں اپنے وچاروں کا دفاع کرنا پڑت ہے تو اکثر تم سپل (کامیاب) ناہیں ہو پاتے۔ خاص طور سے جب تم لوگن کی انتہاپسندی اور دہشت گردی کی بات ہووت ہے۔"

مجھے اپنے اندر آگ کی تپش محسوس ہوئی۔ میں نے جلتے لہجے میں کہا۔ "مسلمانوں پر انتہاپسندی کا لیبل لگانا آج کی دنیا کا فیشن بن چکا ہے اور آپ جیسے کچھ لوگ اس میں پیش پیش ہیں۔ ورنہ انتہاپسندی کس مذہب اور قوم میں موجود نہیں۔"

"یہ بڑا گھساپٹا جملہ بولا ہے تم نے...... یہ اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں تمہاری انتہاپسندی کی ایک چھوٹی سی جھلک دکھا سکتا ہوں؟" حکم نے کہا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے استفسار کیا۔

حکم نے اپنی دائیں جانب دیکھ کر ایک سینئر گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ ادب سے سر جھکا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور پھر گھوم کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کے ساتھ مجھے دو جانے پہچانے چہرے دکھائی دیئے۔ میں ششدر رہ گیا۔ ایک منحوس چہرہ تو رنجیت پانڈے کا تھا۔ وہ وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے سیاہی مائل چہرے پر اس کی سرخی مائل آنکھیں دہکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی اور میری نگاہیں بس ایک ثانیے کے لئے ملیں۔ اس ایک ثانیے میں وہ ساری نفرت اور کدورت جاگ گئی جو میرے اور رنجیت کے درمیان موجود تھی۔ مجھے لگا جیسے اس نے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہا۔ "پپو...... آخر اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا نا۔ اب تُو ہمارے رحم و کرم پر آنے والا ہے۔ اگلی پچھلی ساری کسریں نکلنے والی ہیں۔"

رنجیت کے ساتھ جو دوسرا چہرہ تھا، اسے دیکھ کر مجھے زیادہ حیرانی ہوئی۔ مجھے اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہوا۔ یہ سلطانہ کا گونگا ملازم ہاشم عرف ہاشو تھا۔ میں اسے نل پانی کی شاہی رہائش گاہ "دیوان" میں چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کے ساتھ مل کر ہمارے بچے بالو کی دیکھ بھال

بھی کر رہا تھا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں ہاشو کو یہاں دیکھوں گا اور وہ بھی اس حالت میں۔ ہاشو کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور اس کے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے قدرے فربہ چہرے پر گہرے نیل نظر آ رہے تھے۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پینتیس چالیس سالہ ہاشو لاچاری کی تصویر نظر آتا تھا۔ ایسے شخص کے ساتھ یہ سلوک سمجھ سے باہر تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے تقریباً چلا کر پوچھا۔

"یہ تم لوگن کی امن پسندی، شانتی اور پریم کا شاہکار ہے۔" حکم کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"کیا جرم کیا ہے اس نے؟"

"کوئی ایک جرم ہو تو تمہیں بتایا جاوے۔ یہ ایک لمبی لسٹ ہے اور اگر یہ دو ہفتے پہلے نل پانی سے پکڑا نہ جاتا تو یہ لسٹ اور بھی لمبی ہو جاتی تھی۔"

حکم نے رنجیت کو اشارہ کیا کہ وہ ہاشو کے بارے میں بتائے۔ رنجیت نے کہا۔ "یہ شخص بہت پرانا ہندو دشمن ہے۔ آج کل بھی یہ ایک بہت بڑے جرم کا تانا بانا بن رہا تھا۔ اگر ہمارے مخبر بروقت کھوج ناہیں لگا لیتے تو بہت جیادہ نقصان ہو جانا تھا......"

حکم نے گونگے ہاشو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا تم خود اپنے اس شان دار اپرادھ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے؟"

ہاشو کچھ دیر تک جلتی نظروں سے حکم کو گھورتا رہا پھر گرج کر بولا۔ "اگر خدا کے دشمنوں کو مارنا اپرادھ ہے تو ہم یہ اپرادھ کرتے رہیں گے۔ اپنی آخری سانس تک...... خون کے آخری قطرے تک۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ ہاشو بول رہا تھا۔ اس کی غضب ناک آواز دربار میں گونجتی اور پھیلتی چلی گئی۔ "خدا کی اس زمین سے ناپاک لوگن کے وجود کو ختم کرنا ایک ایسا کام ہے جس کے لئے میرے جیسی سیکڑوں زندگیاں خوشی سے قربان کی جا سکت ہیں۔ مجھے اگر سو بار بھی زندگی ملے تو میں سو بار اسی کام پر نثار کر دوں گا۔"

ہاشو کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور اس کا سینہ پھیل کر چوڑا ہو گیا تھا۔

حکم بولا۔ "کیا تمہیں جانکاری ہے کہ تم جو کام کرنے جا رہے تھے، اس میں سیکڑوں لوگن مارے جاتے؟ ان میں عورتیں، بوڑھے اور معصوم بچے بھی شامل ہوتے اور ہو سکت ہے کہ کچھ مسلمانوں کے پران بھی چلے جاتے۔"

ہاشو نے پلٹ کر رنجیت پانڈے کی طرف دیکھا اور گرجا۔ "اور اس کتے نے کچھ دن پہلے دیوان میں جو بم پھوڑا تھا، کیا اس میں بے گناہ لوگن کی جانیں ناہیں گئی تھیں؟"

پانڈے نے ایک زوردار تھپڑ ہاشو کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر اگلی نشستوں پر جا گرا۔ دو تین محافظ اس پر ٹوٹ پڑے اور بے دریغ اسے مارنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں ہاشو کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا اور وہ نیم جان ہو گیا۔

اس حالت میں بھی وہ پکار رہا تھا۔ ''کسی کو ناہیں چھوڑیں گے۔ ہر کافر کو مار دیں گے۔ پورے راجواڑے کو آگ لگا دیں گے......''

پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے فرش پر گرے ہوئے ہاشو کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تا کہ وہ بدزبانی نہ کر سکے۔ حکم جی نے پانڈے کو اپنے قریب بلا کر کچھ کہا۔ وہ تیزی سے باہر گیا اور پھر پولیتھین کا ایک لفافہ لے کر واپس آیا۔ اس میں ایک نیلگوں پاؤڈر سا تھا۔ اس کا وزن آدھ کلو سے کچھ ہی کم ہو گا۔ یہ ویسا ہی پاؤڈر تھا جیسا سلطانہ کے پاس سے نکلا تھا۔ اس پاؤڈر میں نیلے تھوتھے کی آمیزش تھی اور پاؤڈر کی وہ پڑیا اب بھی میرے سامان میں موجود تھی۔

حکم کے اشارے پر پانڈے نے وہ پاؤڈر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''جب ہمارے مخبروں نے اسے نل پانی کے ایک مندر کے پاس سے پکڑا تو اس پیکٹ جیسے تین پیکٹ اس کے پاس موجود تھے۔ یہ کالی کے مندر میں پکنے والے پرشاد کے اندر یہ جہر ملا چکا تھا۔ ابھی اسے کم از کم دو اور بڑے مندروں میں جانا تھا۔ ایک مندر میں اس نے بھینٹ چڑھائے جانے والے دودھ کے اندر یہ جہر ملانا تھا اور دوسرے مندر میں حلوے کے پرشاد کے اندر۔ یہ اتنا تیج جہر ہے کہ اس کی ایک چٹکی تین چار بندوں کی ہتھیا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک انداجے کے مطابق اگر یہ اپنے ارادے میں سپل ہو جاتا تو نل پانی میں کم از کم ایک ہجار ہندو موت کے منہ میں چلے جاتے اور ہو سکت ہے کہ کئی مسلمان بھی مرتے کیونکہ کئی جگہوں پر یہ لوگن بھی پرشاد کھا لیوت ہیں۔''

حکم نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''......اور...... یہ بندہ ایسے شبھ کام اب سے ناہیں، کئی برس سے کر رہا ہے۔ اس کا اصل نام ہاشم رازی ہے۔ یہ ایک بہت کٹر مُسلا ہے۔ اب اس نے سب کچھ اپنی زبان سے بتایا ہے۔ یہ کئی برس سے گونگا بن کر مختار راجپوت کے گھر میں رہ رہا تھا۔ ابھی یہ کھوج لگانا باقی ہے کہ مختار راجپوت اور اس کے پریوار کو اس کی اصل حقیقت کا پتا تھا یا ناہیں......اور اگر پتا تھا تو پھر وہ کس حد تک اس کے کاموں میں شریک تھے۔ اس شخص کی حقیقت ایک خطرناک خفیہ دشمن کی ہے۔ یہ زرگاں کے اندر کی خبریں اپنے پیر و مرشد مراد شاہ تک پہنچاتا تھا اور مراد شاہ کا پتا کسے ناہیں؟ یہی وہ شخص ہے جو نل پانی میں راج پاٹ حاصل کرنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ اس نے ہمارے چھوٹے بھائی کو ہم سے دور کیا

ہے، دھرم اور سنسار کی ساری سچائیوں سے دور کیا ہے......'' حکم نے ایک گہری سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہاں بات مراد شاہ کی ناہیں، اس زبان دراز گونگے کی ہو رہی ہے۔ یہ انہی جنونی لوگن میں سے ہے جن کے ذہن تنگ ہو کر سوکھے اخروٹوں جیسے ہو گئے ہیں۔ ان کی نظریں کیول اپنے سامنے تک ہی دیکھ سکت ہیں۔ اب اس جانور کو کون سمجھائے کہ اس طرح بے گناہ معصوم لوگن کی جانیں لے کر یہ اپنے خدا کو خوش ناہیں کر سکتا۔''

حکم کے پہلو میں شاہانہ ٹھاٹ سے بیٹھی رتنا دیوی نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ صرف ہندو جاتی کا ہی ناہیں، اپنی جاتی کا بھی دشمن ہے۔ اس نے دو تین سال پہلے ایک مسلمان لڑکے کو صرف اس لئے گھوڑا گاڑی تلے دے کر مار دیا کہ وہ بانسری بجاتا تھا...... بانسری بجانا اس کے نزدیک بہت بڑا پاپ تھا۔ پچھلے سے پچھلے سال اس نے مسلمان بچیوں کے ایک اسکول میں آگ لگائی۔ اس آگ میں تین بچیاں جھلس کر ہلاک ہو گئیں۔ ان بچیوں کا دوش یہ تھا کہ وہ چکا ہے۔ تم چاہو تو اس سے پوچھ سکت ہو۔''

میں ششدر کھڑا تھا۔ رنجیت نے رتنا دیوی کے اشارے پر ہاشو کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ گرجا اور ایک بار پھر ان لوگوں کو بے نقط سنانے لگا جن کے خیالات اس کے خیالات سے نہیں ملتے تھے۔ اس کی پُرطیش باتوں سے اندازہ ہوا کہ ابھی رتنا نے اس پر جو الزامات لگائے ہیں، وہ انہیں قبول کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے فعل کو پورے یقین کے ساتھ درست بھی سمجھتا ہے۔

وہ جب زیادہ آگ بگولا ہونے لگا تو اس کے منہ میں پھر کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ رنجیت پانڈے اور حکم کے دیگر گارڈز اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

حکم بے حد طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''کیا وچار ہے تمہارا اس طرز کے بھائی بندوں کے بارے میں؟''

''چند لوگوں کے سخت رویے کی وجہ سے آپ کسی طبقے یا پوری قوم کو الزام نہیں دے سکتے۔''

''لیکن تم لوگن نے تو اپنی شناخت ہی اس گندے رویے کو بنا رکھا ہے۔''

اچانک عمران کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''عالی جناب! کیا آپ کے اس سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں؟''

میں نے مڑ کر عمران کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ ایسی بے پناہ سنجیدگی میں نے اس سے پہلے کبھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

"تم کون ہو؟" حکم کی پاٹ دار آواز دربار میں گونجی۔

"عزت مآب! اگر آپ اجازت دیں تو میں بتاؤں؟" میڈم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں بتاؤ۔"

"جناب! یہ پاکستان میں سیالکوٹ شہر کا رہنے والا ہے۔ عمران دانش نام ہے۔ پناہ کے لئے بھاگ کر انڈیا میں آیا اور پھر یہاں تک پہنچ گیا۔ لڑائی بھڑائی والے کام خوب کر لیتا ہے۔ میں نے چھان بین کر کے اسے اپنے سیکیورٹی گارڈز میں شامل کیا ہے۔"

حکم کی تیز نظروں نے کچھ دیر عمران کو گھورا پھر وہ بولا۔ "کہو، کیا کہنا چاہت ہو؟"

"میں حضور کو اس کا جواب تفصیل سے دوں گا لیکن میری ایک گزارش ہے۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو پہلے وہ معاملہ نمٹا لیجئے جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے جناب! انل پانی کی عمر رسیدہ خاتون والا معاملہ۔"

حکم کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں آئیں، تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔ اس نے اپنے سامنے والے کلاک کی طرف دیکھ کر پہلو میں بیٹھے پنڈت مہاراج سے تھوڑی سی کھسر پھسر کی پھر رنجیت پانڈے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بزرگ خاتون کو لایا جائے۔"

حکم کے اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے بزرگ خاتون کو دیکھا۔ یہ وہی ہٹ دھرم، کھوسٹ بڑھیا تھی جس کے کہنے پر اس کے پچاس سالہ بیٹے رام پرشاد نے مندر میں پرکھشا کی خوفناک رسم ادا کی تھی اور جان سے گیا تھا۔ بڑھیا ساڑھی میں تھی۔ کندھوں پر موٹی شال اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں۔ اسے حکم کے زرنگار چبوترے کے سامنے ہی ایک آرام دہ نشست پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جھریوں بھرے چہرے پر نفرت اور طیش کی یلغار ہو گئی۔ اس نے اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور چلا اُٹھی۔ اس کے منہ میں بس دو چار دانت ہی تھے۔ اس کی بات مشکل سے ہی سمجھ میں آتی تھی۔ خاص طور سے جب وہ غصے میں تیز تیز بولتی تھی۔ وہ ہاتھ نچا نچا کر پتا نہیں کیا کچھ کہنے لگی۔ جو جملے سمجھ میں آئے، وہ اس طرح تھے۔ "تم راکھشس ہو...... تمہاری پتنی راکھشس ہے۔ ہم کو کیا خبر تھی ہم نے جس کو اتنے بڑے پُن کام کے لئے چنا ہے، وہ اتنا بڑا پاپی نکلے گا۔ تم دونوں کی سزا موت ہے، اس کے سوا کچھ ناہیں......" وغیرہ وغیرہ۔

مجھ پر اس زبانی حملے کے دوران میں بڑھیا نے اپنی نشست سے اُٹھنے کی کوشش بھی کی

لیکن گارڈز نے اس کے کندھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

بڑھیا قدرے پُرسکون ہوئی تو حکم کا فربہ اندام مشیر چبوترے سے اُتر کر بڑھیا کی نشست کے قریب آیا اور بولا۔ "ماتا جی! حکم جی چاہت ہیں کہ آپ نوتاریخ کو ہونے والے سامبر کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہت ہیں، تفصیل سے کہیں۔"

وہ فوراً بولی۔ "تفصیل سے کیا کہوں۔ مجھ کو کوئی لمبی چوڑی بات ناہیں کرنی ہے۔ میں بس یہ کہوں گی کہ اس راکھشس اور اس کی اپرادھن پتنی کی سزا موت کے سوا اور کچھ ناہیں۔ اس کتے کو الٹا لٹکا کر اس سے اس کی پتنی کا اتا پتا پوچھا جاوے اور پھر دونوں کو فوراً جوتے مار مار کر مار دیا جاوے یا سُولی چڑھا دیا جاوے۔ بس...... بس اس کے سوا ہم جو کچھ بھی کریں گے، وہ ہمارا پاپ ہووے گا۔ ہم اپنے لئے نرگ کی اگنی کا انتجام کریں گے۔"

بڑھیا فرطِ جذبات سے سرتاپا کانپ رہی تھی۔

حکم نے شاہانہ انداز میں پنڈت مہاراج کی طرف دیکھا اور کہا۔ "پنڈت جی! آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہت ہو؟"

ادھیڑ عمر پنڈت نے اپنے دراز گیسوؤں کو کندھوں پر سہلایا اور مؤدب انداز میں بولا۔

"جناب! میں نے ماتا جی کی پوری کتھا سنی ہے۔ ماتا جی کے پریوار سے ایک جرم تو ضرور ہوا ہے۔ ان لوگن نے مختار راجپوت کی لونڈیا کو ہم سے چھینا اور پھر اپنے استھان میں لے گئے۔ ان لوگن کا خیال تھا کہ زرگاں میں مختار کی لونڈیا کو مناسب سزا ناہیں مل سکے گی۔ ان لوگن نے استھان میں مختار کی لونڈیا کی ارتھی جلانا چاہی تھی مگر یہ کام نہ ہو سکا۔ بہرحال مختار کی لونڈیا کو چھین کر لے جانے کی سزا اس پریوار کو مل گئی۔ ماتا کا بڑا بیٹا رام پرشاد اپنے ہی ساتھیوں کے درمیان ہونے والی لڑائی میں ہلاک ہوا۔ رام پرشاد کی پتنی کا دیہانت دل کے دورے سے ہو گیا۔ ماتا کا پوتا اور پوتے کی پتنی اس کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ میں یہ کہوں گا کہ ماتا اور اس کے پریوار نے جو کچھ کیا یہ غلط تھا...... لیکن اس کے پیچھے جو کارن تھا، وہ یہی تھا کہ یہ لوگن اپنی سمجھ کے مطابق دھرم کا نام اونچا کرنا چاہت تھے اور اپرادھن کو سزا دینے کی اچھا رکھتے تھے۔"

حکم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سب تو ٹھیک ہے پنڈت جی...... ہم آپ سے یہ جانکاری چاہت ہیں کہ کیا موجودہ حالت میں ماتا جی کی بات ماننا چاہئے کہ سامبر کی لڑائی روک دی جاوے اور سلطانہ کے پتی کو مجبور کیا جاوے کہ وہ سلطانہ کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لئے اسٹیٹ کی مدد کرے؟"

پنڈت کے بولنے سے پہلے ہی بڑھیا پھر چلا اُٹھی۔ ''آپ کو ایسا کرنا پڑے گا۔ اس کام کے لئے میرا بیٹا قربان ہوا ہے۔ میں نے اپنی بہو کا بلیدان دیا ہے۔ میرا پوتا اور اس کی پتنی مجھ سے دور ہوئے ہیں۔ میں سنسار میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ اگر میرے یہ سارے بلیدان بیکار ہیں اور اس راکھشس نے سامبر کی آڑ میں چھوٹ کر یہاں سے چلے جانا ہے یا اسے آسان موت مل جانی ہے تو پھر مجھے بھی زندہ ناہیں رہنا۔ مجھے ناہیں چاہئے ایسا جیون۔ میں سوگندھ کھاوت ہوں، میں ہتھیا کر لوں گی۔ میں سب کے سامنے خود کو زندہ جلا لوں گی......''

بڑھیا کے سوکھے سڑے جسم میں نہ جانے اتنا زور کہاں سے آ گیا تھا۔ وہ پکڑنے والوں کی گرفت سے نکل نکل جا رہی تھی۔

اسی دوران میں عمران آگے آیا۔ اس نے حکم کے سامنے ادب سے جھک کر کہا۔ ''اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں ماتا جی سے ایک دو سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

حکم نے چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ''پوچھو۔''

عمران بڑھیا کے سامنے جا کر بولا۔ ''کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کے بیٹے کی موت کس طرح ہوئی اور آپ کے پوتے اور اس کی پتنی نے آپ کا ساتھ کیوں چھوڑا؟''

وہ کڑک کر بولی۔ ''کون ہو تم؟ میں تمہاری باندی ناہیں کہ تمہارے سوالوں کے جواب دوں۔ میں نے جن کو بتانا تھا، انہیں سب بتا چکی ہوں۔''

فربہ اندام مشیر آگے آیا اور عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''جو پوچھ رہے ہو، میں بتا دیوت ہوں۔ ماتا جی کے بیٹے رام پرشاد کی ہتھیا آپس کی لڑائی کے کارن ہوئی۔ استھان کے لوگن ''دھرمی اختلاف'' کے کارن دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ نے رام پرشاد کو مار دیا۔ رام پرشاد کی پتنی دل کے دورے سے سورگ باشی ہوئی۔''

''اور ماتا جی کا پوتا ستیش......اور اس کی بیوی مالا؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہ دونوں مخالف گروہ سے ڈر گئے۔ ویسے بھی ستیش کی پتنی امید سے تھی۔ ستیش اس کی اور اپنی جان بچانے کے لئے کہیں نکل گیا۔''

''یہ باتیں آپ کو ماتا جی نے بتائی ہیں؟'' عمران نے تصدیق چاہی۔

فربہ اندام شاہی مشیر نے اثبات میں جواب دیا۔

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے جناب! یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' مشیر خاص نے آنکھیں نکالیں۔ حکم جی نے بھی تیوری چڑھا لی۔

عمران اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ ''ماتا جی کی عمر ایسی ہے کہ ہمیں ہر صورت ان کی عزت کرنی چاہئے لیکن یہ اس معاملے میں جھوٹ بول رہی ہیں اور کئی باتیں چھپا رہی ہیں۔''

''کتے! میں جھوٹی ہوں۔ میں ادھرمی ہوں۔ حرامجادے...... نیچ بدجات! میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔'' بڑھیا جلائی اور اس نے ایک بار پھر نشست سے اُٹھنے کی کوشش کی۔

گارڈز نے اسے سنبھال لیا۔ وہ پوپلے منہ سے پتا نہیں کیا اول فول بکتی چلی گئی۔ جو ایک فقرہ سمجھ میں آ رہا تھا وہ بار بار دُہرا رہی تھی وہ یہ تھا کہ ''تم ہو کون؟ تم ہو کون؟''

وہ مجھے تو جانتی تھی لیکن عمران اس کے لئے یکسر اجنبی تھا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ ہم دونوں اس سارے خونی واقعے کے چشم دید گواہ ہیں جو فتح پور کے اس چھوٹے سے گاؤں کے مندر میں رُونما ہوا۔ جس میں گرو سوبھاش کا کٹا ہوا سر تھال میں سجایا گیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل کے کڑاہے میں ہاتھ ڈالے۔

بڑھیا ذرا شانت ہوئی تو عمران نے بڑے ہموار اور اثر انگیز لہجے میں کہا۔ ''عزت مآب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں کچھ ایسے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں جو ماتا جی آپ سے چھپا رہی ہیں۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ یہ واقعات سچے ہیں اور اگر جھوٹ ثابت ہوں تو میں ہر بڑی سے بڑی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔''

''مختصر شبدوں میں بتاؤ، کیا بتانا چاہت ہو؟'' حکم نے کہا۔

''جیسا کہ میڈم صاحبہ نے آپ کو بتایا ہے، میں پناہ کے لئے اس راجواڑے میں داخل ہوا ہوں۔ مجھے آپ کی عنایتوں کا آسرا ہے۔ آج سے چند روز پہلے تک میں زرگاں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نل پانی سے آگے نکل آیا تھا اور فتح پور نام کی بستی کے قریب ایک سانسی چرواہے کے جھونپڑے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرا وہاں فتح پور میں ہونا زبردست اتفاق تھا۔ اس اتفاق کی وجہ سے مجھے وہ مناظر دیکھنے کا موقع ملا جن کا تعلق فتح پور کے مندر سے ہے اور ساتھ ہی آپ کے سامنے کھڑی اس بڑی بی سے بھی۔''

بڑھیا نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ گارڈز نے بہ مشکل اسے چپ کرایا۔ حکم نے عمران کو بات جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

عمران نے کہا۔ ''اس روز چرواہے کو بکریوں کا دودھ بیچنے بستی کے اندر جانا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ بستی میں بہت ہلچل نظر آ رہی تھی۔ آس پاس کی چھوٹی بستیوں کے کئی لوگ بھی وہاں جمع تھے۔ بڑی پگڑیوں والے کئی پنچ بھی تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ

یہاں مندر میں آج کوئی شخص جلتے تیل کے کڑاہے میں اپنے ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے رہا ہے۔ میرے میزبان چرواہے صدیق نے تفصیل معلوم کی تو پتا چلا کہ یہ کٹر ہندوؤں کے دو گروہ ہیں۔ کسی لڑکی کا معاملہ ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ لڑکی کو دوسرے گروہ والوں نے غائب کیا ہے۔ دوسرا گروہ یہ ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ اب پرکھشا سے فیصلہ ہونا ہے کہ سچ کیا ہے۔ مندر کے اردگرد بھی خوب رونق تھی۔ اندر سنکھ بج رہے تھے اور اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ پھر میں نے آپ کے سامنے کھڑی اس بزرگ خاتون کو دیکھا۔ یہ زور زور سے اشلوک پڑھ رہی تھی اور اپنے پچاس پچپن سالہ بیٹے رام پرشاد کو پرکھشا کے لئے مندر کے اندر لے جا رہی تھی۔ رام پرشاد بھی نشے کی سی حالت میں تھا۔ یہ لوگ ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل میں اندر چلے گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد مندر کے اندر ہاہاکار مچ گئی۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ آوازیں آنے لگیں کہ بھگوان نے فیصلہ کر دیا...... دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔ چند ہی لمحے بعد پتا چلا کہ مندر کے اندر بڑھیا اور اس کا ادھیڑ عمر بیٹا پرکھشا میں ناکام ہو گئے ہیں اور لوگوں نے بڑھیا کے بیٹے کو جان سے مار دیا ہے۔"

عمران نے چند لمحے توقف کیا۔ دربار میں سناٹا طاری تھا۔ لوگ توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ صرف بڑھیا کبھی کبھی اپنے پوپلے منہ سے بول رہی تھی مگر اب اس کی آواز میں تن فن نہیں تھی۔ اس کے الفاظ بھی کسی کے پلے نہیں پڑ رہے تھے۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب! اس کے کچھ ہی دیر بعد میں نے ایک جواں سال لڑکی کو دیکھا۔ وہ شاید حاملہ بھی تھی۔ کچھ لوگ اسے بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے مندر کے اندر لے جا رہے تھے۔ مجھے لوگوں سے پتا چلا کہ بڑھیا اس لڑکی کی دادی ساس ہے...... کیونکہ پرکھشا ناکام ہو گئی ہے اس لئے اس لڑکی کو بھی مار دیا جائے گا۔ اس کے بعد جی مندر کے اندر زبردست ہنگامہ ہوا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ مندر کا بڑا دروازہ اس ہنگامے میں ٹوٹ گیا۔ میں ہمت کر کے اس دروازے کے قریب چلا گیا۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے اندر کے خونی منظر دیکھے۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے پر کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے حملہ کر رہے تھے۔ گاہے بگاہے گولی بھی چل رہی تھی۔ کم از کم تین لاشیں تو میں نے خود دیکھیں ان میں سے ایک لاش بڑھیا کے ادھیڑ عمر بیٹے کی تھی۔ پھر تیل کا ابلتا ہوا کڑاہا الٹ گیا اور مندر میں آگ لگ گئی۔ میرا دوست چرواہا مجھے کھینچ کر مندر کے قریب سے پیچھے لے آیا اور ہم کسی مصیبت سے بچنے کے لئے اپنے جھونپڑوں کی طرف چلے گئے۔

"اگلے روز مجھے معلوم ہوا کہ مندر کے خونی ہنگامے میں نو دس بندے مرے اور درجنوں

بُری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ اس واقعے کی زیادہ تر ذمے داری اسی بزرگ خاتون پر ہے۔ اسی نے اپنے بیٹے کو ایک خطرناک پرکھشا دینے پر مجبور کیا۔ اس سے دو چار دن پہلے یہ ایک اور خطرناک کام بھی کر چکی تھی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں اور اس کا پورا ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔"

"اپنی بات جاری رکھو۔" حکم نے ہدایت کی۔

عمران نے کہا۔ "اسی بزرگ خاتون اور اس کے کٹر ساتھیوں نے ایک گرو کو قتل کیا اور اس کا کٹا ہوا سر ایک تھال میں سجا کر کالی ماتا کے چرنوں میں رکھا۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ انہوں نے ایسا کیا یا نہیں؟"

دربار میں سناٹا تھا۔ بس بڑھیا ہی اول فول بول رہی تھی۔ فربہ اندام مشیر نے اسے بہ مشکل چپ کرایا اور پوچھا کہ کیا فتح پور بستی کے مندر میں کسی گرو کا سر کاٹا گیا تھا؟ بڑھیا اب بوکھلا چکی تھی۔ طیش کے سبب اس کے منہ میں جو آ رہا تھا، بولتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے پوپلے منہ سے پھس پھس کی غصیلی آوازیں نکالتے اور ہاتھ نچاتے ہوئے جو واویلا کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا...... "وہ گرو اپرادھی تھا۔ اس کے مرنے میں ہی اس کی مکتی تھی۔ اپرادھی کو اس کی سزا ملنی چاہئے۔ نہ ملے تو اس کا وبال ساری ہندو جاتی پر پڑتا ہے۔ کھیت سوکھ جاتے ہیں، ناریاں بانجھ ہو جاتی ہیں...... بیماریاں آتی ہیں اور خون خرابے ہوتے ہیں۔ اگر اس اپرادھن سلطانہ کو سزا نہ مل سکی تو بھی یہی کچھ ہو گا......" وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

عمران کی خوبصورت آنکھوں میں ایک تیز چمک تھی۔ چہرے پر چھائی ہوئی بے پناہ سنجیدگی نے اس چمک کو کچھ اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "عزت مآب! میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ انتہا پسند ہر جگہ موجود ہیں اور جہاں بھی ہیں، قابلِ مذمت ہیں۔"

عمران کا یہ ایک فقرہ لاتعداد دلیلوں اور تاویلوں سے زیادہ وزنی تھا۔ کچھ دیر کے لئے کوئی کچھ بھی نہیں بولا۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی سیاست دان یا دانشور نہیں ہوں جنابِ عالی...... مگر اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں شدت پسندی اور انتہا پسندی سے نفرت کرنی چاہئے، کسی خاص قوم، مذہب یا فرقے سے نہیں۔ انتہا پسندی انسان کو جنونی بناتی ہے۔ انسان ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے جو شاید وہ عام حالت میں کبھی نہ کرتا۔ اب آپ اس بزرگ خاتون کو ہی دیکھئے۔ یہ عمر کے اس حصے میں ہیں جب انسان جھوٹ بولنے جیسی غلطیوں کو بھی بہت بڑے گناہوں میں شمار کرنے لگتا ہے لیکن یہ پورے وشواس اور زور و شور سے

جھوٹ بول رہی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان کا پوتا ستیش اور اس کی پتنی مالا اس لئے ان سے جدا ہو گئے کہ وہ مخالف گروہ سے خوفزدہ ہو گئے تھے لیکن ایسا نہیں ہے عزت مآب۔"

"تو پھر کیا ہے؟" حکم نے دریافت کیا۔

"اب تک میں نے جو کچھ بتایا ہے، میں اس کا چشم دید گواہ ہوں لیکن جو بات میں اب بتاؤں گا، وہ میں اندازے سے بتا رہا ہوں۔ مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ میرا اندازہ درست ہے۔ بزرگ خاتون کی توہم پرستی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ یہ اپنے عقیدے کی اتنی پکی ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتیں۔ جلتے کڑاہے میں ہاتھ ڈالنے والا امتحان اس لئے دیا گیا تھا تا کہ بزرگ خاتون کے پوتے اور اس کی پتنی مالا کی بے گناہی ثابت ہو سکے۔ ہاتھ ڈالنے والے کے ہاتھ جل گئے کیونکہ انہیں جلنا ہی تھا لیکن یہ بزرگ خاتون پھر بھی اپنی بے مثال دقیانوسیت پر قائم ہے۔ پرکھشا کے طریقے پر نظر ثانی کرنے کے بجائے اب یہ اپنے پوتے اور اس کی بے گناہ پتنی کے خلاف ہو چکی ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ وہ واقعی مجرم تھے، اگر مجرم نہ ہوتے تو رام پرشاد کے ہاتھ کیوں جلتے۔ اسی بات پر پوتا اور اس کی پتنی مالا اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ عزت مآب! شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انتہا پسند دن بہ دن محدود اور تنہا ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ زہریلے بھی۔"

بڑھیا پوپلے منہ سے پھنکاری۔ "یہ نیچ کمینہ جھوٹ بولت ہے، بکواس کرت ہے...... ایسا...... کچھ نا ہیں ہوا......"

اس کا لہجہ ہی گواہی دے رہا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے۔ اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ وہ زیادہ واویلا کرنے لگی تو حکم کے اشارے پر پہرے دار اسے سمجھاتے اور سنبھالتے ہوئے باہر لے گئے۔

میں حیرت سے عمران کو تک رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں کسی عدالت میں ہوں اور کسی بہت بڑے وکیل نے بڑی مہارت اور خوبصورتی سے آناً فاناً جیوری کو لاجواب کیا ہے۔ میرے لئے سب سے بڑی حیرت وہ خاص قسم کی سنجیدگی تھی جو میں نے آج پہلی بار عمران کے چہرے پر طاری دیکھی تھی۔

میں ابھی تک عمران کے ماضی میں نہیں جھانک سکا تھا۔ یقیناً وہاں کوئی خاص کہانی موجود تھی...... کہیں...... ایسا تو نہیں تھا کہ عمران بھی کسی ایسی ہی انتہا پسندی اور جنونیت کا ڈسا ہوا ہو؟ ان مہلک رویوں نے کوئی گہرا زخم لگایا ہوا ہے؟

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑھیا کے جنونی رویے کی وجہ سے بڑھیا کا کیس کافی حد تک

کمزور ہو گیا ہے۔ وہ سامبر کا مقابلہ رکوانا چاہتی تھی اور اس کی دلیل یہ تھی کہ میری سزا دردناک موت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ بہرحال، اب یہ معاملہ پنڈت مہاراج اور اس کے ساتھیوں کے سامنے پیش تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ حکم دل ہی دل میں اب بھی یہی چاہتا ہے کہ یہ مقابلہ نہ ہو لیکن وہ لکھے ہوئے قانون اور پنڈتوں کی رائے کی اہمیت سے بھی آگاہ تھا۔

لمبے بالوں والے پنڈت اور اس کے درجن بھر ساتھیوں کے درمیان تادیر مشورہ ہوا، چند سال خوردہ کتابوں اور پوتھیوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ آخر پنڈت مہاراج نے سب کے سامنے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "عزت مآب! ہمارے پاس سامبر کے بارے میں بہت کھلی اور واضح جانکاریاں موجود ہیں۔ اگر کوئی منش کسی دوسرے منش کو سامبر کی دعوت دے دیوت ہے اور دوسرا اسے قبول بھی کر لیوت ہے اور سامبر کی شبھ گھڑی بھی نکل آوت ہے تو پھر واپسی کی گنجائش نا ہیں رہتی۔ اگر کوئی دوسرا معاملہ ہو بھی تو پہلے سامبر رچنا کا ہونا ضروری ہو جاوت ہے۔"

پنڈت مہاراج نے سنسکرت کی ایک قدیم کتاب کا اقتباس پڑھتے ہوئے کہا۔ "سن 512 ب، مہینا بیساکھ، تاریخ 30۔ راجستھان کے راجواڑے واشو کے مشہور راجا کرشن کمار سہائے کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تھا۔ ایک شخص آنند لال پر چوری اور ہتھیا کا الزام تھا لیکن اس کے پکڑے جانے سے پہلے ہی اس کا سامبر اپنے سوتیلے بھائی سے طے ہو چکا تھا۔ راجا نے ہتھیارے کو سزا دینے سے پہلے اس کا سامبر کرانے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ ہو سکتا ہے سامبر کے مقابلے میں ہی انصاف ہو جائے۔ یہ مرو اور مارو کا مقابلہ تھا۔ اس میں ملزم آنند لال بچ گیا اور اس کا سوتیلا بھائی مارا گیا۔ بعد میں یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ ملزم بے گناہ تھا اور اصل دوشی اس کا سوتیلا بھائی ہی تھا...... اور عزت مآب! ایسی اور بھی کئی مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں۔"

"حکم نے کہا۔ "پنڈت جی! کیا آپ یہ چاہت ہیں کہ سلطانہ کے پتی کو سامبر کی آگیا دی جاوے اور اگر یہ اس یدھ (لڑائی) میں کامیاب جاوے تو پھر اسے مطلوبہ عورت کے ساتھ نل پانی جانے دیا جاوے؟"

"بالکل سرکار! ہم کو ایک مرتبہ تو ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ بھگوان نہ کرے اگر یہ شخص سامبر جیت جاوت ہے تو پھر اسے کم از کم ایک بار تو زرگاں کی حدوں سے نکل جانے کی آگیا دینی ہو گی۔"

اس موقع پر میں نے پر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن

میں آپ کے لفظوں کو درست نہیں سمجھتا۔ مجھے زرگاں کی حد سے نکلنے کی نہیں، نل پانی پہنچنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ یہ تو سراسر مذاق ہوگا کہ آپ مجھے زرگاں سے تو نکلنے دیں لیکن آپ کے اہلکار میرے ساتھ ساتھ رہیں اور زرگاں کی حد ختم ہوتے ہی مجھے پھر دھر لیا جائے۔"

"تم بال کی کھال مت اُتارو۔" حکم نے پہلی بار برہم ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم خوب اچھی طرح سمجھت ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ اور یہ مت سمجھو کہ ہم تمہیں اور تمہاری پتنی کو نل پانی سے واپس ناہیں لا سکتے۔ اگر ہم چاہیں تو تمہیں زمین کی ساتویں پرت سے بھی کھینچ لیا جاوے گا۔"

پنڈت مہاراج نے اپنے لمبے بالوں کو کندھوں پر سنوارتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے بھگوان سے پوری آشا ہے کہ جناب کہ اس سب کی نوبت ہی ناہیں آوے گی۔ اس پاپی کے پاپوں کا گھڑا سامبر کے مقابلے میں ہی پھوٹ جاوے گا۔"

جارج کی بہن ماریا اپنی جگہ سے اُٹھی اور پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ "میں اس موقع پر پنڈت مہاراج، حکم جی اور دیگر معزز ارکان سے بس ایک ہی بات کہنا چاہوں گی۔ یہ شخص جرم وار ہے اور خدا نے چاہا تو یہ سامبر میں ضرور شکست کھائے گا لیکن اس کو اکھاڑے میں ہی مار دیا گیا تو یہ ان سب لوگوں کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی جو مختار راجپوت کی بیٹی کو انصاف کے کٹہرے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری پُرزور درخواست ہے کہ سامبر کے بعد اس شخص سے اس کی بیوی کا اتا پتا دریافت کیا جائے اور اسے برآمد کیا جائے۔" پنڈت مہاراج نے ماریا کی باتوں کی تائید کی۔

چند منٹ مزید گفتگو جاری رہی اور پھر وہیں دربار میں سب کچھ طے پا گیا۔ دو روز بعد ساتویں کا جشن تھا اور اس سے دو روز بعد یعنی نو تاریخ کو میرا اور جارج کا مقابلہ دن کے تیسرے پہر میں ہونا تھا۔

آخر میں حکم جی نے مجھے پیشکش کی کہ اگر میں راج بھون کی سیر کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ اس نے متعلقہ لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ مجھے راج بھون میں گھمائیں پھرائیں۔

ساتویں کا جشن دو روز بعد تھا لیکن اصل میں یہ جشن شروع ہو چکا تھا۔ گارڈز کے نرغے میں حکم کے فربہ اندام مشیر خاص اوم پرکاش نے ہمیں راج بھون کے مختلف حصے دکھائے۔ ہمارے ساتھ میڈم صفورا، رنجیت پانڈے اور اس کے ایک درجن ساتھی بھی تھے۔ مجھے پانڈے کی نگاہوں میں اپنے لئے طیش اور کینہ صاف نظر آ رہا تھا۔

راج بھون کے مختلف حصوں کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ یہ سب کچھ آنکھیں چندھیا دینے والا تھا۔ شاید مجھے سیر کرانے کا مقصد مجھ پر اس شان و شوکت کا رعب ڈالنا تھا۔

ساتویں کے جشن کی سب سے اہم خوبصورتی و رنگینی وہ ایک بہت بڑا قطعہ تھا جسے جنتِ ارضی کی طرح سجایا گیا تھا۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا بے ستون کا ہال تھا۔ اس کی چھت گنبد نما تھی۔ اس گنبد نما چھت کو اس طرح پینٹ کیا گیا تھا کہ دن میں بھی رات کا سماں ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہزاروں ستارے ٹمٹما رہے ہیں اور ان کے درمیان چاند کی خوبصورت ٹکیا روشن ہے۔ یہ چاندنی فرش تک پہنچتی تھی اور نشیب و فراز کو عجیب کیفیت میں رنگ دیتی تھی۔ یہاں تین بڑی آبشاریں تھیں جن کا پانی موسیقی بکھیرتا چھوٹے چھوٹے جھرنوں میں تبدیل ہوتا تھا اور پھر ایک بڑے حوض میں گرتا تھا۔ یہ حوض طول میں کم و بیش پچاس میٹر اور عرض میں چالیس میٹر ہوگا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی خوبصورت کشتیاں تیر رہی تھیں۔ ان کشتیوں میں شراب کی صراحیاں، جام اور دیگر لوازمات سجے ہوئے تھے۔ ہر کشتی میں خلوت فراہم کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا کاٹیج بھی تھا۔ اس طرح کا ہر کاٹیج تازہ پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان میں سے کچھ کشتیوں پر راج بھون کے خواص اپنی بیگمات کے ساتھ موجود تھے اور خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ حوض کے کنارے موجود خوش لباس سازندے موسیقی کی تانیں بکھیر رہے تھے اور چند خوبرو لڑکیاں حوض کے اردگرد رقص فرما تھیں۔ کھلی جگہ کے مقابلے میں اندر کا ماحول نیم گرم تھا۔ یہی حرارت تھی جس کے سبب رقاصاؤں نے نہایت مختصر لباس پہن رکھے تھے اور پھر بھی خوش و خرم تھیں۔ اس وسیع و عریض کمپاؤنڈ کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا فوارا نصب تھا فوارے میں سے سات رنگوں کا شفاف پانی پھوٹتا تھا اور فوارے کے اردگرد بنے ہوئے ایک گول حوض میں جمع ہوتا تھا۔ شیشے کے اس گول حوض کی چاروں طرف آرام دہ نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ ان نشستوں پر کچھ لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے اور رقاصاؤں کے تھرکتے جسموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ لطف اندوزی صرف دیکھنے تک محدود نہیں تھی۔ گاہے بگاہے کوئی شخص اپنے اردگرد ناچتی رقاصہ کو چھوتا تھا یا آغوش میں کھینچ لیتا تھا۔ گل پوش کشتیوں میں بیٹھی بیگمات ان مناظر سے صرفِ نظر کرتی تھیں۔ غالباً یہ ساری رعایتیں اور گنجائشیں ساتویں کے جشن سے نسبت رکھتی تھیں۔

میڈم نے مجھے بتایا۔ "جشن کے دن اس فوارے میں یہ سات رنگوں والا پانی نہیں ہوگا۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"مہنگی ترین امپورٹڈ شراب۔ اس شراب سے یہ گول حوض لبالب بھر جائے گا۔ لوگ اس کے اردگرد بیٹھ کر رقص دیکھیں گے اور ساتھ ساتھ مہ نوشی کریں گے۔ رقاصائیں بھی یہ نہیں ہوں گی۔ یہ وہی چالیس لڑکیاں ہوں گی جن میں سے سات رنگوں کی سات پریاں چنی

جانی ہیں۔"

"وہ کیا ہے میڈم؟" میں نے شیشے کے ایک بڑے چوکور ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے اندر کوئی سنہری چیز ہلکورے لیتی تھی۔

"لیکوئیڈ گولڈ...... سیال سونا۔" میڈم نے بتایا۔

"کیا مطلب؟"

میڈم کے بجائے ایک فوجی افسر بولا۔ "یہ پگھلا ہوا سونا ہے۔"

میں اور عمران دنگ رہ گئے۔ اگر یہ واقعی سونا تھا تو پھر ڈیڑھ دو من تو رہا ہوگا۔ اس سیال سونے کے بیچوں بیچ ایک برہنہ لڑکی کی دو فٹ اونچی مورتی نظر آ رہی تھی۔ یہ مسکراتی ہوئی مورتی کسی بہت سخت شیشے سے بنی ہوئی تھی لیکن لگتا تھا کہ یہ موم کی ہے۔ یعنی پگھلے ہوئے سونے کے اندر موم کی لڑکی۔ لڑکی کا صرف بالائی دھڑ نظر آتا تھا پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی سیال سونے میں اوجھل ہوگئی۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ دوبارہ اُبھری تو سیال سونے میں لتھڑی ہوئی نظر آئی لیکن شیشے کے باکس کے اندر اس قدر درجۂ حرارت تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پگھلا ہوا سونا پانی کی طرح اس کے بلوری جسم سے ڈھلک کر واپس گر گیا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی...... پگھلے ہوئے سونے میں مسکراتی لڑکی کا برہنہ جسم۔ یہ چھوٹا سا تماشا ایک طرح کی علامتی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ سونا، دولت اور اختیار کی علامت تھا...... دولت اور اختیار جو عورت کے برہنہ جسم کو عیش وعشرت کی آگ میں جھلساتے تھے۔ وہ جھلستی تھی لیکن پھر بھی سب کچھ جھیلتی اور مسکراتی رہتی تھی۔

لڑکی کی مورتی کو پگھلے ہوئے سونے میں ڈوبنے اور پھر ابھارنے کے لئے کوئی مشینی تکنیک استعمال کی گئی تھی۔ ہر بیس تیس سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ سیال سونے میں غوطہ زن ہوتی تھی اور پھر باہر نکل آتی تھی۔ اس تماشے کا سب سے بہترین منظر وہ تھا جب پگھلا ہوا سونا پانی کی دھاروں کی طرح اس کے بلوری جسم سے جدا ہوتا تھا۔

ہماری چاروں جانب بجتے ہوئے ساز رکے تو رقص بھی تھم گیا۔ رقاص لڑکیاں مختلف گوشوں میں اوجھل ہوگئیں۔ ایک خوبرو لڑکی اپنی ساڑھی کو چٹکیوں میں ٹخنوں سے اوپر اُٹھائے دوڑتی ہوئی آئی...... وہ ہنس رہی تھی اور اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں نشے میں دھت ایک امیر زادہ تھا۔ وہ غالباً پریمی جوڑا تھا۔ لڑکا، لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی بل کھا کر لہرائی اور چکما دے کر اس کی زد سے نکل گئی۔ دونوں ہنستے ہوئے ایک جانب اوجھل ہوگئے۔

یہاں ہر طرف خرمستی اور مدہوشی کا ماحول نظر آ رہا تھا۔ ابھی ایک دو دن میں اس ماحول کو مزید پروان چڑھنا تھا اور جشن کے دن کلائمیکس تک پہنچنا تھا۔

مجھے اس وسیع وعریض کمپاؤنڈ کی کھڑکیوں کے نیلے شیشوں میں سے راج بھون کے وسیع لان کا منظر نظر آیا۔ باہر دن اور اندر رات تھی۔ راج بھون کی بیرونی دیوار پر خاردار باڑ لگی تھی۔ اس فصیل نما دیوار کے اوپر باڑ کے ساتھ ساتھ مسلح پہرے دار گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے دو پہرے داروں کے ہاتھوں میں مجھے رکھوالی کے کتے بھی دکھائی دیئے۔

چند روز پہلے ہم اسی دیوار کی طرف سے راج بھون میں گھسے تھے اور تہلکہ مچایا تھا۔ اب یہاں سخت نگرانی تھی اور چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی لیکن اس ساری نگرانی کے باوجود ہم کسی اور روپ میں راج بھون کے اندر موجود تھے۔

......رقص اب ختم ہو چکا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر گانے والی اپنے چاندی بال چمکاتی ہوئی سازندوں کے قریب جا بیٹھی اور ایک ہندی گیت گانے لگی۔ مغنیہ کی آواز پُرسوز تھی۔ لَے بھی اچھی تھی۔ رقص کی دھنا دھن سے یہ موسیقی کہیں بہتر تھی۔ گیت کے بولوں کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

رنگ وبُو کے دھاروں میں
روز وشب کے پُرشور ہنگاموں میں
گرجتی برستی بارشوں میں اور تیز آندھیوں میں
غرض زندگی کے کسی بھی تیز بہاؤ میں
میں تجھے بھول نہیں پاتا
تیری یاد میرے ساتھ رہتی ہے، سردیوں کی دھوپ کی طرح
اور صحرا کی رم جھم کے مانند
باغوں کی چاندنی کی مثال
اور جلتے راستوں پر ملنے والے گھنے پیڑوں کی طرح

گیت کے بول میرے دل میں سرایت کرنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا، میں بھی کسی کو یاد کرتا ہوں۔ کوئی ہر وقت میرے ساتھ بھی رہتا ہے۔ وہ کون ہے؟ شاید سلطانہ جو میری زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ جس کی دل نواز محبت مدھم بارش کی طرح میرے دل کی زمین میں اندر تک سرایت کر گئی تھی۔ میں اس کے پاس واپس جانا چاہتا تھا، آنکھوں میں فتح مندی اور کامیابی کی چمک بھر کر۔ پھر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا اور اس کی شفاف

آنکھوں سے نکلنے والے سارے آنسو اپنے ہونٹوں سے چن لینا چاہتا تھا۔ ہاں، وہ ایک سائے کی طرح میرے ساتھ تھی...... لیکن...... لیکن اس سائے کے پیچھے ایک اور سایہ بھی تو تھا۔ ایک اور مدھم سا ہیولا بھی، ایک لڑکی...... جو ایک سہانی شام کی راہ تکا کرتی تھی۔ جو ڈائری پر لکیریں کھینچ کر انتظار کی تاریخیں کاٹا کرتی تھی اور جو شہنائیوں کی گونج سے پہلے ہی کہیں گم ہوگئی تھی...... کبھی نہ ملنے کے لئے۔ سلطانہ کے سائے کے پیچھے اس کا سایہ بھی تو تھا۔ میں ایک بار...... زندگی میں بس ایک بار اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کو دیکھنا چاہتا تھا اور اگر وہ سننا پسند کرلیتی تو اس سے صرف معذرت کہنا چاہتا تھا۔

ہاں، سلطانہ کے سائے کے پیچھے وہ سایہ بھی تو تھا۔ کیا میں اب بھی اس سے محبت کرتا تھا؟ کیا ایسا ممکن تھا کہ میں ایک ہی وقت میں سلطانہ کو چاہوں اور ثروت کو دیکھنے کی حسرت بھی دل میں رکھوں؟ کیا سلطانہ سے میری محبت جسمانی رخ اختیار کرچکی تھی اور ثروت سے روحانی؟ سلطانہ کے لئے میرے اندر طلب تھی کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی بے خبری کے زمانے میں اس کے بہت قریب رہا ہوں۔ اس کے جسم کی ساری حرارت اور رعنائی میرے اندر جذب ہوتی رہی ہے۔ اب میں اس حرارت اور رعنائی کا خلا محسوس کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بیوی کی حیثیت سے سلطانہ کی بے پناہ قربانیاں بھی مجھے اس کی طرف کشش کرتی تھیں لیکن ثروت کی محبت اس کانٹے کی طرح تھی جو جسم کے اندر ٹوٹ چکا تھا۔ ایک بار تکلیف برداشت کرکے اس کانٹے کو نکالا جانا ضروری تھا۔

لیکن یہ سب کچھ تو تب ہوتا جب میں اپنے مہلک حالات کے گھیرے سے نکل سکتا۔

ابھی مجھ پر صرف موت کا پہرا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ آنے والے چار پانچ دنوں میں میرے ساتھ کیا ہونا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر جارج کے ساتھ میرا مقابلہ ہوا تو یہ یادگار اور بہت خوفناک ہوگا۔ مغنیہ کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ گیت کے آخری مرحلے میں تھی۔

ہمارے آنسو کبھی تمہارے دامن پہ نہ بہہ سکے
افسوس یہ ہے کہ تمہیں الوداع بھی نہ کہہ سکے
اور دل میں بے شمار باتیں لئے
کچھ دکھی برساتیں اور بے چین راتیں لئے
یادوں کی جھولی میں چند ادھوری ملاقاتیں لئے
ہم تم سے دور جانے پر مجبور ہوئے
ہاں بہت دور ہوئے

...... بہت جلد اس گنبد نما وسیع و عریض چیمبر میں مجھے پہچان لیا گیا۔ بیشتر لوگ اپنی دلچسپ مصروفیات چھوڑ کر میری طرف آ گئے۔ ان میں راج بھون کے حکام تھے۔ شاہی مہمان اور ان کی بیگمات و ساتھی خواتین تھیں۔ حتیٰ کہ رقاصائیں اور ملازمین وغیرہ بھی مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور میرے گرد اکٹھے ہونے لگے تھے۔

یہ صورت حال پانڈے کو بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لوگ میرے گرد اکٹھے نہ ہوں لیکن وہ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ سب کے سب معززین میں سے تھے۔ پانڈے انہیں تو کچھ نہ کہہ سکا مگر رقاصاؤں اور دیگر ملازمین پر بگڑنے لگا۔ ''آپ لوگن کیا کرتے ہو، یہ تماشا نا ہیں۔ چلیں اپنے اپنے کام کریں۔ پیچھے ہٹ جائیں۔''

میرے ہاتھوں کی جلد سینڈ بیگ کی مار سے سیاہ ہو چکی تھی۔ سوکھے چمڑے کی طرح کھردری اور سخت۔ ایک گورا چٹا چودھری نما شخص آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر ہولے سے بولا۔ ''سنا ہے تم خالی ہاتھ سے بندے کی کھوپڑیا توڑ سکت ہو؟''

اس کا ساتھی بولا۔ ''مجھے پتا ہے، تم اس سے کس کی کھوپڑیا تڑانا چاہت ہو۔''

''کیا بکواس ہے؟'' پہلا شخص بولا۔

دوسرے نے کہا۔ ''معشوقہ کے لئے پتنی کو مروانا بڑا پرانا رواج ہے اور پتنی کھوپڑیا ٹوٹنے سے مرے، یہ تو اور بھی مزے کی بات ہے۔''

''مجھ کو لگت ہے کہ تم اپنے گھریلو حالات یہاں بیان کررہے ہو۔'' پہلے شخص نے کہا اور بھنایا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

رنجیت پانڈے جھلا کر مشیر خاص اوم پرکاش سے بولا۔ ''میں اسی لئے کہوت ہوں جناب! یہ سیر اب ختم کیجئے۔''

اس سے پہلے کہ مشیر خاص جواب میں کچھ کہتا، ایک نوجوان امیرزادہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے کیمرے سے کھٹا کھٹ میری دو تین تصویریں اُتار لیں۔ ایک تصویر اس نے خاص طور سے میرے ہاتھوں کی اُتاری تھی۔

بڑی بڑی مونچھوں والا ایک شخص جو کوئی امیر کبیر مراٹھی سیٹھ لگتا تھا، آگے بڑھا اور شرابی لہجے میں کیمرے والے کو ڈانٹ کر بولا۔ ''یہ کیا ناٹک ہے بھئی۔ یہ سالا کوئی قومی ہیرو ہے جس کے فوٹو اُتار رہے ہو؟ یہ اپرادھی ہے اور جوتوں کا حق دار ہے۔ اگر اس کی فوٹو ہی اُتارنی ہے تو تب اُتارنا جب سُولی پر ٹانگ کر اس کی ہڈیوں کا چُورا کیا جاوے گا۔ کتا...... ذلیل۔''

''اپنا منہ سنبھال کر بات کرو۔'' میں نے پھنکارتے لہجے میں کہا۔

سیٹھ نما شخص آگے بڑھا اور اس نے بالکل غیر متوقع طور پر ایک زور کا مکا میرے منہ پر رسید کیا۔ میں بے خبر تھا۔ اچھی خاصی چوٹ لگی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ بے ساختہ میرا دایاں ہاتھ گھوما۔ غالباً سیٹھ کو بھی امید نہیں تھی کہ اتنا فوری اور ایسا سخت جواب ملے گا۔ حالانکہ میں نے زیادہ زور کا ہاتھ نہیں مارا تھا پھر بھی وہ شخص ڈکراتا ہوا پیچھے کی طرف گیا اور حوض میں گر گیا۔ وہ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ ایک دم غوطے کھانے لگا۔ دو گارڈز نے پانی میں چھلانگیں لگائیں اور اسے سنبھالا۔ اس کے ہونٹوں سے خون جاری تھا۔ وہ گالیاں بکنے لگا۔ گارڈز نے مجھے گھیرا ڈال لیا اور شرابی سیٹھ کو بھی سنبھال کر مجھ سے دور لے گئے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میرے اس جچے تلے مکے نے سیٹھ کا دم خم ختم کر ڈالا تھا اور ساتھ ہی اس کا نشہ بھی ہرن ہوا تھا۔ اسی دوران میں ایک شخص پکار کر بولا۔ ”جارج گورا صاحب اس طرف آ رہے ہیں۔“ یہ سن کر میڈم صفورا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں بولی۔ ”یہ شخص جسے تم نے گھونسا مارا ہے، جارج صاحب کے کلوز فرینڈز میں سے ہے۔ جارج کو پتا چلا تو وہ پھڈا کرے گا۔“

رنجیت پانڈے نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ مشیر خاص اوم پرکاش مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب تمہیں یہاں سے نکلنا چاہئے ورنہ معاملہ خراب ہو جاوے گا۔ چلو اس طرف سے آ جاؤ۔“

اس نے ایک بغلی دروازہ کھولا اور مجھے وہاں سے نکلنے کو کہا۔

ہم ”جنت ارضی“ کی خوش گوار حرارت سے نکل کر دروازے میں داخل ہوئے اور ایک طویل راہداری سے گزر کر سیدھے اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کھلی جگہ پر پہنچ کر عجیب سا احساس ہوا۔ یہاں سرما کی زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا جبکہ ابھی ہم جنتِ ارضی والے کمپاؤنڈ کے اوپر تاروں بھرا آسمان دیکھ رہے تھے اور چاند کی چاندنی گنگناتی آبشاروں کو منور کر رہی تھی۔ یوں لگا جیسے پچھلے آدھ گھنٹے سے ہم جاگتی آنکھوں کے ساتھ خواب دیکھ رہے تھے۔ ہمیں فوراً گھوڑا گاڑیوں میں بٹھایا گیا اور وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔

جارج کے ساتھ ایک ممکنہ ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ جیسا کہ ہمیں بعد میں پتا چلا، جارج بہت غصے میں وہاں پہنچا تھا اور اس نے مسلح گارڈز کو سخت برا بھلا کہا تھا جن کے ہوتے ہوئے سیٹھ کے ساتھ میرا جھگڑا ہوا اور میں اسے ایک شدید ضرب لگانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ گھوڑا گاڑیاں راج بھون کا وسیع احاطہ پار کر کے مین گیٹ کی طرف بڑھیں۔ دور بائیں

طرف ہمیں وہ بلند بالکونی نظر آ رہی تھی جہاں چند دن پہلے رتنا دیوی کے ہاں بچے کی پیدائش کا جشن منایا جا رہا تھا اور میں نے عمران کے ہمراہ، اس بالکونی پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے جشن کو درہم برہم کیا تھا۔ وہاں شاید ہماری چلائی ہوئی گولیوں کے نشان ابھی تک موجود تھے۔

پھر وہ مین دروازہ دکھائی دیا جہاں سے میں اور عمران اندھا دھند بھاگتے ہوئے فرار ہوئے تھے اور پانڈے کا...... ہم شکل ”چچازاد“ ہمارے پیچھے آیا تھا۔ ہم گیٹ سے باہر نکلے تو یہاں ایک اور ہی منظر دکھائی دیا۔ گیٹ کے باہر راستے کی دونوں جانب سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ یہ زیادہ تر مسلمان نظر آتے تھے۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ سب لوگ مجھے یہاں دیکھنے کے لئے جمع ہیں۔ میڈم میرے ساتھ ہی گاڑی میں موجود تھی، وہ بولی۔ ”یہ دیکھو، تمہاری للکار نے کام دکھایا ہے۔ زرگاں کے ایک بڑے طبقے نے تمہیں اپنے خیالوں کا مرکز بنا لیا ہے۔ یہ لوگ تمہاری ایک جھلک دیکھنا چاہتے ہیں۔“

پانڈے کے چہرے پر برہمی تھی۔ اس نے جھلاہٹ کے عالم میں گاڑی کی کھڑکیوں کے پردے نیچے گرا دیئے۔

باہر لوگوں کا شور تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے گاڑی کا راستہ روک رکھا ہے۔ گارڈز انہیں راستے سے ہٹانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ گرج برس رہے تھے اور سیٹیاں بجا رہے تھے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک گاڑی کا عقبی دروازہ کھلا اور ایک سفید ریش بوڑھے شخص کا سرخ و سپید تمتمایا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ جوش کے سبب اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں...... وہ چلا کر بولا۔ ”ہم تمہارے ساتھ ہیں...... فتح تمہاری ہوگی۔ اللہ مدد کرے گا۔ تم جیتو گے......“ وہ ہیجانی لہجے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے عقب میں ایک گارڈ نمودار ہوا۔ اس نے بوڑھے شخص کو کالر سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور پیچھے گھسیٹ لیا۔ تب مزید دو افراد کے چہرے نمودار ہوئے۔ وہ بھی شکلوں سے مسلمان ہی لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لئے محبت اور خیر خواہی کی بلند لہریں تھیں، اس کے ساتھ ساتھ ایک جوشیلا رنگ تھا۔ ان افراد کو بھی گارڈز نے عقب سے کھینچ کر گاڑی سے دور ہٹا دیا۔

اس کے بعد شاید کچھ لاٹھیاں وغیرہ بھی چلیں۔ بھگدڑ کے آثار نظر آئے اور گاڑی متحرک ہو کر آگے بڑھی۔ ”تیز چلاؤ“ گاڑی کے اندر سے رنجیت نے کرخت لہجے میں کوچبان کو حکم دیا۔ گاڑی نے رفتار پکڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے راج بھون سے دور آ گئی۔ اب

وہ تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ میڈم صفورا نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ رنجیت پانڈے کے سامنے اس نے کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ پانڈے طیش سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ مجھے اسی جگہ شوٹ کر دیتا اور شوٹ کرنے کے بعد بھی میری لاش پر گولیاں برساتا رہتا۔ یہ بات وہ بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر مجھے یہاں آناً فاناً شہرت ملی ہے اور لوگوں نے مجھے جارج کا خطرناک مدِمقابل سمجھنا شروع کیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ میں نے نل پانی کی لڑائی میں اسے نیچا دکھایا ہے۔ یہ بات اب شاید کسی سے بھی چھپی نہیں رہی تھی کہ دیوان کے اندر ہونے والی لڑائی میں رنجیت پانڈے نے ہوشیاری سے مین سوئچ آف کر کے اندھیرا کیا تھا اور موقع سے کھسک کر اپنی جان بچائی تھی۔

میڈم کی رہائش گاہ لال بھون میں واپس پہنچ کر میں عجیب اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ میرے ذہن میں بار بار ہاشو کی شبیہہ اُبھر رہی تھی۔ اس کا کردار عجیب ڈھنگ سے سامنے آیا تھا۔ وہ گونگا نہیں تھا اور گونگے کے طور پر ایک مدت سے مختار راجپوت کے گھر میں مقیم تھا۔ اس پر راج بھون کی طرف سے بہت الزامات لگائے جا رہے تھے اور یہ نہایت سنگین الزام تھے۔ ہاشم عرف ہاشو خود اعتراف کر رہا تھا کہ جو زہر کے پیکٹ ہمیں دکھائے گئے، وہ اسی کے تھے اور وہ ان سے بہت سے لوگوں کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سب کے سامنے برملا کہا تھا کہ اگر ابھی اس کی زندگی باقی ہوئی اور اسے آزاد فضا میں پہنچنا نصیب ہوا تو وہ پھر یہی کچھ کرے گا جو اس نے اب کیا ہے۔

میری گہری سوچ اور فکرمندی عمران کو بھی متاثر کر رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''کس فکر میں کھو گئے ہو جگر؟''

''وہی ہاشو والا معاملہ......'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بھی دیکھ لیا ہوگا...... اس پیکٹ میں ویسا ہی زہر تھا جیسا سلطانہ کے پاس پڑیا میں تھا۔''

''ہاں...... یہ بات تو واقعی غور کرنے والی ہے مگر اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ سلطانہ کے پاس وہ پڑیا ملنے کا مطلب خدانخواستہ یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ ہاشو کے کاموں میں شریک ہے یا اس کے مقصد سے جڑی ہوئی ہے۔''

''پھر بھی ذہن میں وسوسہ تو پیدا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور وسوسوں کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وسوسہ ہی رہتا تھا کہ ہے یا نہیں۔ ویسے یار! مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ حکیم لقمان کی وجۂ شہرت اس کی قابلیت تھی یا پھر یہ محاورہ تھا۔''

میں نے قالین پر لیٹ کر اپنا سر بازو کے تکیے پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ فکرمندی دل و دماغ میں سرایت کر رہی تھی۔ کہیں سلطانہ کا تعلق سچ مچ تو ایسے لوگوں سے نہیں تھا جن کا مذہب اور عقیدہ صرف اور صرف خوں ریزی ہوتا ہے۔ کیا وہ اس طرح کی سوچ ذہن میں پال سکتی تھی؟ ذہن نے فوراً جواب دیا...... نہیں، وہ ایسی نہیں ہو سکتی۔

لیکن یہ تو ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی ناسمجھی کے سبب کسی کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہو۔ کسی اَن چاہے دھارے میں بہہ گئی ہو۔ ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں تھا۔ شاید میں واقعی ایک شوہر کی حیثیت سے اسے پیار کرنے لگا تھا۔ اس کے اچھے بھلے کی فکر کرنے لگا تھا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر تشویش کی یہ لہریں کیوں میرے رگ و پے میں ہلچل مچا رہی تھیں۔

ہاشو کا کردار کسی طور بھی قابلِ تعریف نہیں تھا، بالکل جیسے مالا کی دادی ساس کا کردار قابلِ تعریف نہیں تھا۔ بہرحال، جو کچھ بھی تھا آج عمران نے بھرے دربار میں حکم، اس کے مصاحبوں، پنڈتوں اور عاملوں کا منہ بڑی خوب صورتی سے بند کیا تھا۔ انتہا پسند کس جگہ موجود نہیں ہیں...... ہاں کس جگہ موجود نہیں ہیں۔

میں وہیں لیٹے لیٹے اونگھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میرے کانوں میں عمران اور ایک لڑکی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گوری نامی یہ لڑکی ہماری دو خادماؤں میں سے تھی۔ پارسن ہونے کے باوجود یہ گوری چٹی اور قبول صورت تھی۔ عمران اکثر اس سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ عمران کسی لڑکی کی طرف متوجہ ہو اور وہ توجہ نہ دے...... وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور یہی نہیں، اس کی گفتگو کی مقناطیسی طاقت کسی کو اپنے جال سے نکلنے نہیں دیتی تھی۔ یہ گوری نامی لڑکی ان بے دام کی کنیزوں میں سے تھی جو اپنے مالکوں کی ہر ''قسم'' کی خدمت کے لئے ہر وقت اور ہر جگہ تیار رہتی ہیں...... عمران اشارہ بھی کرتا تو وہ اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاتی اور اسے خوش قسمتی بھی سمجھتی لیکن وہ تو صرف وقت گزاری کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بڑے خلوص سے لڑکی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی تعریف کر رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ ایسی آنکھیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں ایک امراؤ جان ادا ہوئی تھی یا پھر اب وہ ہے جو ایسی دھانسو آنکھیں رکھتی ہے۔

پھر وہ بولا۔ ''لیکن گوری! ایسی بڑی بڑی لاجواب آنکھیں رکھنے کے باوجود تم کپڑے ٹھیک سے استری نہیں کرتی ہو۔ اب دیکھو، تم یہ جو پینٹ استری کر کے لائی ہو، یہ اوپر سے اب بھی سلوٹوں والی ہے۔''

وہ ہکلائی۔ ''دراصل...... اوپر سے...... اوپر سے...... آپ کا پتلون استری کرتے

ہوئے ہام کو شرم آتا ہے......"

"ہائیں، یہ کیا بات ہوئی؟"

"بس جی...... پہلے ایسا نہیں تھا، پر اب ایسا ہوتا ہے۔"

"یہ کیا پہیلی ہے...... کیا کوئی بھی پتلون استری کرتے ہوئے ایسا ہوتا ہے؟"

"ناہیں جی ناہیں...... بس آپ کا پتلون۔" وہ کسی دوشیزہ کے انداز میں ہنسنے لگی۔

"پھر کیا کرتی ہو؟"

"ہام آنکھیں بند کر کے استری پھیرتا ہے۔"

"وہ تو پتلون دیکھ کر ہی پتا چل رہا ہے۔"

"آپ ہام کو بہت اچھا لگتا، ہام آپ کے لئے یہ گلاب کلی لایا۔" پھر اس نے شاید اپنے لباس کے اندر سے کوئی کلی نکال کر عمران کو دی۔

عمران نے کہا۔ "سچی بات ہے کہ تم بھی ہام کو بہت اچھا لگتا ہے۔ ہام تم سے شادی کرنا مانگتا ہے لیکن اگر ہام شادی کرنا مانگتا تو ہمارا پہلا دو وائف ہمارا سر توڑنا مانگتا۔"

"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ نے شادی ناہیں بنائی۔"

"ہام نے کہاں بنائی، ہام سے زبردستی بنائی گئی اور ایک بار نہیں دو بار۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "ہام کا اتنا قسمت کہاں کہ ہام آپ سے شادی بنانے کا سوچے۔ ہام تو بس آپ کا خوشبو سونگھ کر ہیپی ہو جاتا۔" اس کے لہجے میں نوخیزی اور الھڑپن کی جھلک تھی۔

"اوہ، خوشبو سے یاد آیا کہ کل غسل خانہ ٹھیک سے صاف نہیں ہوا تھا۔" عمران نے کہا۔

"اوہ سوری! ہام ابھی کرتا، بالکل شیشہ بنا دیتا۔" اس نے کہا۔

اس کے قدموں کی آواز آئی۔ یقیناً وہ عمران کو اپنی چال کی دل ربائی دکھاتی ہوئی غسل خانے کی طرف چلی گئی تھی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ عمران میرے قریب آ کر لیٹ گیا۔ دو تین منٹ بعد میں نے کروٹ بدلی تو میری نگاہ غسل خانے کے ادھ کھلے دروازے پر پڑی۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے تیزی سے اُٹھنا پڑا۔ مجھے غسل خانے میں گوری فرش پر گری نظر آئی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پکار کر پوچھا اور تیزی سے غسل خانے کی طرف بڑھا۔

عمران بھی اُٹھ بیٹھا تھا۔ "رک جاؤ۔" مجھے اپنے عقب سے عمران کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں اس وقت تک غسل خانے کے دروازے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یکا یک میرے پاؤں کے نیچے سے قالین نکل گیا۔ قالین کو زور سے پیچھے کی طرف کھینچا گیا تھا۔ میں اوندھے منہ عین دروازے کے سامنے گرا۔ قالین کھینچنے والا عمران تھا۔

عمران لپکتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اب ہم دونوں باتھ روم میں دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ گوری گیلے فرش پر پڑی تھی......اور مر چکی تھی...... اسے غسل خانے کی ٹونٹی سے بجلی کا زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس کا گورا چٹا ہاتھ ابھی تک ٹونٹی پر تھا اور عجیب انداز سے مڑا ہوا تھا۔

"آگے نہ جانا۔" عمران نے ایک بار پھر وارننگ دی۔ "نلکوں میں کرنٹ دوڑ رہا ہے۔"

عمران کی زوردار آوازیں سن کر دو گارڈز کھڑکی کے سامنے آ گئے تھے۔ "کیا ہوا سر؟" ایک نے بلند آواز میں پوچھا۔

"یہاں کرنٹ ہے۔ مین سوئچ بند کرو۔"

گارڈز دوڑتے ہوئے ایک طرف اوجھل ہو گئیں چند سیکنڈ بعد بجلی کی رو منقطع ہو گئی۔ ہم غسل خانے میں گئے۔ گوری کو اُٹھا کر کمرے میں لائے۔ اس میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ پھر بھی ہم دونوں نے اسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے منیجر مدن اور درجن بھر گارڈز کمرے میں پہنچ گئے۔

منیجر مدن نے گوری کو طبی امداد کے لئے لے جانا چاہا مگر جلد ہی اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے۔ صرف چند منٹ پہلے عمران کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرنے والی اور دلنشیں انداز میں مسکرانے والی یہ نوخیز ملازمہ اب مٹی کا ڈھیر بن چکی تھی۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" منیجر مدن نے ہکلا کر پوچھا۔

"یہ ہوا نہیں کیا گیا ہے۔ نلکوں میں جان بوجھ کر کرنٹ چھوڑا گیا ہے۔" عمران نے پورے وثوق سے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ دوسرے غسل خانوں میں بھی کرنٹ آ رہا ہو۔" مدن بولا۔

"بالکل نہیں۔ تم چیک کر کے دیکھ لو۔"

میں اور عمران منیجر مدن کے ساتھ دوبارہ غسل خانے میں آئے۔ ایک منٹ کے اندر اندر ساری صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔ غسل خانے کے بلب کے پیچھے سے ایک تار نکالا گیا تھا اور اسے ایک پائپ کے پیچھے پیچھے چھپا کر نہانے والی ٹونٹی تک پہنچایا گیا تھا۔

''یہ اس لمبے گارڈ کا کام ہے جسے تم لوگ لمبو کہتے ہو۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔

''وہ کیسے؟'' مدن نے پوچھا۔

''کل میں نے نہانا تھا مگر پانی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ پانی نہیں آ رہا...... وہ دو تین اوزار لے کر غسل خانے میں گیا اور چار پانچ منٹ وہاں رہا۔ بعد میں دیر ہو جانے کی وجہ سے میں نے نہانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اسی بندے کا کام ہے بلکہ اس نے پانی بھی جان بوجھ کر بند کیا ہوگا۔''

گوری کی نیلگوں لاش کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی سراسیمگی تیرنے لگی تھی۔ اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ ہم پر دوسرا قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ ہم دونوں اور بالخصوص ''میں'' اس حملے کا نشانہ تھا۔ کچھ لوگ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے آقا مرلی جارج گورا کے سامنے آؤں اور اس سے ''مرو یا مارو'' کی فائٹ کروں...... کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا بھی ہانپی کانپی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اسے سارے واقعے کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ دو تین گارڈز اپنی ڈیوٹی پر موجود نہیں اور ان میں وہ دراز قد گارڈ بھی شامل ہے۔

یہ بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔ میڈم صفورا کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''میں اسی لئے تم سے بار بار کہہ رہی ہوں کہ تمہیں اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ خاص طور سے فائٹ کے روز تک۔''

منیجر مدن، میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اگر یہ خبر باہر نکلی تو لوگن میں بڑا غم وغصہ پیدا ہووے گا۔ عام لوگن میں پہلے ہی یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ کچھ بڑے لوگن ہرگز ناہیں چاہتے کہ سامبر کا مقابلہ ہو۔ وہ تابش صاحب کو راستے سے ہٹانے کا جتن کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں بھون کے معاملات کا مجھے زیادہ تجربہ نہیں لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ خبر باہر نہ پھیلے تو پھر یہاں موجود گارڈز اور ملازموں کو کسی صورت باہر جانے کی اجازت نہ دیں۔ خاص طور سے لڑکیوں کی ٹرینر گیتا مکھی کو۔''

''یہ سب کچھ میرے ذہن میں بھی آ رہا ہے۔ میں اس بارے میں کچھ کرتی ہوں۔'' میڈم صفورا نے کہا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

چوکس گارڈز ہمارے اردگرد آ موجود ہوئے۔ یہ سب کے سب میڈم صفورا اور منیجر مدن کے انتہائی قابلِ اعتماد لوگ تھے لیکن کسی کے دل میں کس نے جھانک کر دیکھا ہوتا ہے؟ ان لوگوں کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں تھیں اور انہوں نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی

تھیں۔ واقعی ایک محافظ کے لئے قاتل بننا کتنا آسان ہوتا ہے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''میرا تو دل چاہتا ہے ان سارے خدائی فوجداروں کو اپنے اردگرد سے ہٹا دوں۔ یہ سیکیورٹی دے رہے ہیں اور سیکیورٹی رسک بھی۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر تو ہمارا خون ویسے ہی خشک ہو جائے گا اور خون خشک ہو گیا تو ہمارا پسٹن یعنی دل جام ہو جائے گا۔''

میں اور عمران کمرے میں آ گئے اور دھات کا بنا ہوا سلائیڈنگ دروازہ بند کر دیا۔ میں نے عمران کو تشکر کی نظروں سے دیکھا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ بولا۔

''ایک بار پھر تم نے مجھے خودکشی کرنے سے بچایا ہے۔''

''خودکشی؟''

''ہاں...... آج گندم میں رکھنے والی گولیاں نہیں تھیں...... بجلی کا کرنٹ تھا۔ میں تو بھاگا جا رہا تھا گوری کو تھامنے کے لئے۔ تم نے میرے نیچے سے قالین کھینچا اور مجھے گرا دیا۔ بڑی بروقت کارروائی تھی۔ آئی رئیلی اپری شیٹ یو۔''

''لگتا ہے تم پر میڈم کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ ورنہ تم اردو میں بھی شکریہ ادا کر سکتے تھے۔ شکریہ اردو میں ادا کیا جائے تو خوشی بھی اردو میں ہوتی ہے......'' وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا اور مجھے اپنے موضوع سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ شام کے بعد کا ذکر ہے۔ ہمارے لئے کھانا آیا۔ حسبِ معمول یہ کھانا آٹھ بجے کے قریب آیا۔ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے ہمیں کھانا پہنچانے کا کام ملازمین کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ منیجر مدن خود ہمارے لئے کھانا لاتا تھا۔ اس کھانے کو باقاعدہ چیک بھی کیا جاتا تھا۔ آج اس حوالے سے مزید احتیاط نظر آئی۔ میڈم صفورا خود کھانا لائی۔ ایک ملازمہ نے بڑی ٹرے اُٹھا رکھی تھی اور میڈم اس کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔

کھانے کے دوران میں میڈم ہمارے پاس ہی موجود رہی۔ اس نے کہا کہ دراز قد گارڈ کی تلاش میں مختلف جگہوں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں اور ایک دو بندوں کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ اس نے ہمیں شہر کی صورتِ حال سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ نو تاریخ کو ہونے والے مقابلے کے حوالے سے لوگوں میں زبردست جوش وخروش پایا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سارا زرگاں دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک طرف جارج گورا کے حمایتی ہیں اور دوسری طرف تمہارے۔ چھوٹے بڑے جلوس نکالے جا رہے ہیں۔ دیواروں پر چاکنگ کی گئی ہے اور گلیوں میں کپڑے کے بڑے بڑے بینرز آویزاں کئے جا رہے ہیں۔

''کون کس کی حمایت کر رہا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ غیر واضح ڈویژن ہے۔'' میڈم نے جواب دیا۔ ''اوور آل یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچانوے فیصد مسلمان تمہاری سائیڈ پر ہیں۔ اس کے علاوہ نچلا طبقہ اور ہندوؤں کی نیچ ذاتوں کے لوگ بھی تمہاری حمایت کر رہے ہیں۔ دراصل یہ نفسیاتی قسم کی صورتِ حال ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر ایسی سچویشن بن جایا کرتی ہے۔ لوگوں کی دبی ہوئی نفرت اور محرومی مناسب موقع دیکھ کر اُبھر آتی ہے اور انہیں اپنے آقاؤں کے خلاف کھڑا کر دیتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن یہ ماحول خطرناک بھی تو ہے۔ یہ کوئی حق و باطل کی جنگ تو نہیں ہے۔ یہ دو بندوں کے درمیان ایک انفرادی مقابلہ ہے۔ اس میں کسی کی پیٹھ بھی لگ سکتی ہے۔ اگر کسی ایسے مقابلے کے ساتھ بہت زیادہ جذبات اور عقیدے وابستہ کر لئے جائیں تو پھر فرسٹریشن بھی بڑی گھمبیر ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن رائے عامہ کا ایک اپنا بہاؤ ہوتا ہے۔ یہ بہاؤ اپنا راستہ خود سلیکٹ کرتا ہے۔ اس کا رخ موڑنا یا اس میں کمی بیشی کرنا بہت جان جوکھم کا کام ہے۔''

کھانا مزے دار تھا۔ لکھنوی طرز کی چٹ پٹی بریانی کے ساتھ دہی پودینے اور ٹماٹر کا رائتا تھا۔ ساتھ میں کھڑے مسالے والا چکن، ماش کی دال اور گرما گرم روٹیاں تھیں...... ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ میڈم کے جانے کے بعد بھی ہم گپ شپ میں مصروف رہے...... ہماری گفتگو کا اہم موضوع آج پیش آنے والا حادثہ ہی تھا۔ کھڑکیوں سے باہر ایک تاریک سرد رات گلی کوچوں کو اپنے نرغے میں لے چکی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی خاموشی اور تنہائی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہر کے باسی شاید آج جلدی سو گئے ہیں۔

......اچانک یوں لگا کہ خاموشی کی اس جھیل میں زبردست شور کے ساتھ سیکڑوں پتھر آ گرے ہیں۔ یکا یک ایک نقارے کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی بے شمار دھماکے ہوئے اور مختلف رنگوں کی اَن گنت روشن لکیریں فضا میں بلند ہوئیں۔ کچھ بلندی پر جا کر ان لکیروں میں سے پٹاخے چھوٹے اور آتش بازی کے ہزار ہا رنگ زرگاں کی فضاؤں میں بکھر گئے۔

''اوہ گاڈ! لگتا ہے ساتویں کا جشن شروع ہو گیا ہے۔'' عمران نے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، یہ ساتویں کے جشن کا آغاز تھا۔ زرگاں کا آسمان لاتعداد رنگوں سے جگمگایا اور اس کے گلی کوچوں میں شورِ محشر برپا ہو گیا۔ اس شور میں باجا گاجا تھا، نعرہ زنی تھی اور آتش بازی کے دھماکے تھے۔ ہمارے کمرے کی کھڑکی میں سے دور کچھ فاصلے پر کسی گھر کی بلند چھت نظر آ رہی تھی۔ اس چھت پر ایک ساتھ کئی انار چلائے گئے۔ ان اناروں میں سے

شرارے فواروں کی طرح پھوٹے اور قرب و جوار کو منور تر کر گئے۔ ان شراروں کی روشنی میں چھت پر مرد و زَن رقص کرتے نظر آئے۔

ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ شدید ترین آتش بازی تو قریباً آدھ گھنٹے تک رہی لیکن اس کے بعد بھی یہ کام رکا نہیں۔ ہم کمرے میں آرام دہ نشستوں پر بیٹھے رہے اور یہ مناظر دیکھتے رہے۔ ایسے ہی مناظر میں نے کچھ عرصہ پہلے نل پانی میں دیکھے تھے۔ اس وقت عمران میرے ساتھ نہیں تھا۔ میں اس کی یاد میں تڑپ رہا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ میں اسے ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہوں لیکن آج وہ میرے ساتھ تھا۔ ہم ایک دوسرے کا بازو تھے۔ ایک اور ایک گیارہ کی زندہ مثال کی طرح۔ بے شک ہم دشمنوں کے گھیرے میں تھے اور کل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن آج ہمارا تھا...... اور ہم اس ''آج'' کو اس کی ساری خطرناکیوں کے ساتھ انجوائے کر رہے تھے۔ ایک میٹھا میٹھا درد بھی تھا، کچھ تیز تیکھے اندیشے بھی تھے۔ کھڑکی سے باہر کوریڈور کی دیوار پر فلمسٹار ریکھا کی تصویر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہی تھی۔

ہمارے سامنے چائے کے مگ تھے۔ عمران سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے کش لے رہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر شعلے دکھائی دیئے، ان شعلوں کے درمیان ایک بندر اچھل کود کر رہا تھا...... اس کی دُم میں آگ لگی تھی۔ دراصل یہ ایک تنومند شخص تھا جس نے ہنومان کا روپ دھارا ہوا تھا اور جو شعلے نظر آ رہے تھے، وہ راون کی لنکا کے جلنے کے تھے۔ بھون کے وسیع و عریض گراسی لان میں یہ ناٹک رچایا جا رہا تھا۔ یہ ہندو دیو مالا کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ تھا۔

عمران نے ایک آہ بھری اور کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''کل منیجر مدن کہہ رہا تھا، دیو مالا کے واقعات کو ناٹک کے طور پر پیش کرنے سے بلائیں ٹلتی ہیں اور بھگوان کی طرف سے روزی میں برکت ہوتی ہے اور منیجر مدن ایک تعلیم یافتہ شخص ہے۔'' میں سمجھ گیا کہ عمران کیا کہنا چاہ رہا ہے...... وہ دقیانوسیت اور توہم پرستی کی بات کر رہا تھا۔ اچانک مجھے آج سہ پہر والا سارا واقعہ یاد آ گیا۔ عمران نے جس طرح بھری محفل میں حکم اور اس کے مصاحبوں کو لاجواب کیا، وہ یادگار تھا...... اس کے علاوہ اس موقع پر عمران کے شوخ چہرے پر جو بے پناہ سنجیدگی دکھائی دی، وہ بھی ایک خاص الخاص چیز تھی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''عمران! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم بھی کسی ایسی ہی دقیانوسیت کے ڈسے ہوئے ہو جس کے منظر آج حکم کے دربار میں نظر آئے...... اور ہاشو اور مالا کی دادی ساس جیسے لوگ

جس کے نمائندے ہیں۔"

"میں تو سمجھتا ہوں جگر کہ ساری انسانیت ہی ایسے مہلک واہموں کی ڈسی ہوئی ہے۔ کوئی تھوڑا متاثر ہے، کوئی زیادہ اور کوئی بہت زیادہ۔"

میں نے بغور عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے نشست سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ خوبصورت آنکھوں میں کھوئی کھوئی کیفیت تھی۔ زرگاں میں ہونے والی آتش بازی کے رنگ اس کے چہرے پر منعکس ہو رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "عمران! ہماری دوستی کو کئی سال ہو گئے ہیں لیکن تم آج بھی میرے لئے ایک پہیلی ہو۔ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ایسا کیوں ہے یار؟"

"تم اکیلے ہی تو میرے بارے میں بے خبر نہیں ہو۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

"لیکن تم مجھے اپنا قریبی دوست اور ہمدم کہتے ہو۔ کیا قریبی دوست اور ہمدم اسی طرح بے خبر ہوتے ہیں؟"

"یار! کیوں گڑے مُردے اکھاڑنا چاہ رہے ہو؟ بہت سے زخم چھل جائیں گے، مہینوں تک خون رستا رہے گا۔" وہ پھر مسکرایا۔ اب اس کی مسکراہٹ میں حزن کی آمیزش تھی۔

میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "عمران! صرف چار دن بعد میری زندگی میں ایک بہت اہم واقعہ رُونما ہونے والا ہے۔ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی موت کی لڑائی لڑنے والا ہوں جسے یہاں شکتی کا دیوتا کہا جاتا ہے...... وہ دیوتا ہے یا نہیں، یہ علیحدہ بات ہے لیکن یہ بات تو تم بھی مانو گے کہ وہ ایک نہایت خطرناک حریف ہے۔ چار دن بعد میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے یار! اور اگر واقعی میرے ساتھ کچھ ہو گیا تو کیا میں تمہارے بارے میں کچھ جاننے کی حسرت دل میں لے کر ہی چلا جاؤں گا؟ کیا تمہیں یہ سب اچھا لگے گا؟"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ کچھ بولے گا لیکن وہ بولا نہیں۔

کتنی ہی دیر تک کمرے میں گھمبیر خاموشی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر آتش بازی کے رنگ بکھرتے رہے اور باجے گاجے کا مدھم شور ہمارے کانوں تک پہنچتا رہا۔ پھر عمران نے نیا سگریٹ سلگایا اور بغیر کسی تمہید کے ایکا ایکی بولنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز گم گشتہ یادوں کے بوجھ سے لدی ہوئی تھی۔ اس کے الفاظ دھیرے دھیرے میرے سامنے ایک کہانی کی پرتیں کھولنے لگے۔ ایک گداز روداد کے پیچ و خم میرے سامنے نمایاں ہوتے چلے گئے۔ واقعات کا ایک جہاں سا آباد ہو گیا۔ میں عمران کی اس روداد کو اپنے الفاظ میں قارئین کے سامنے بیان

کر رہا ہوں۔ اس میں پچانوے فیصد باتیں عمران کی کہی ہوئی ہیں۔ جہاں جہاں خلا تھا، وہ میں نے اپنے تصور سے پُر کیا ہے۔ اس میں جو انوکھا پن ہے، وہ غیر حقیقی نہیں۔ اس کی سائنسی بنیاد موجود ہے۔ نفسیات کے ماہر بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی ذہن کی کیمسٹری کے بارے میں ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے۔ عمران کی کہانی کچھ یوں ہے۔

وہ شمالی پنجاب کا ایک گاؤں تھا۔ برسات کی ایک طوفانی رات تھی۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور پھر گھن گرج سے...... در و دیوار لرز جاتے تھے۔ ہر جاندار و بے جان شے سہمی ہوئی نظر آتی تھی اور ان سب سے زیادہ سہمے ہوئے وہ دو نفوس تھے۔ ایک تنہا کچے گھر میں ایک ماں اور اس کا بیٹا۔ چاندی بالوں والی ماں کی عمر قریباً پچاس سال رہی ہو گی۔ بیٹا قریباً سولہ سال کا تھا۔ اس خوفناک طوفانی رات میں ماں نے بیٹے کو یوں بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا جیسے مرغی چوزے کو پروں سے ڈھانپتی ہے۔

یہ واقعی بہت خوفناک رات تھی۔ یوں لگتا تھا کہ مکان مسمار ہو جائیں گے اور درخت جڑوں سے اکھڑ جائیں گے۔ آسمان اپنے ذخیروں کا سارا پانی زمین پر الٹ دینا چاہتا تھا اور ہوائیں اپنی ساری سرکشی آزما لینا چاہتی تھیں۔ اچانک بڑے زور سے بجلی چمکی۔ اس کا لشکارا گھروں کے اندر تک آیا پھر ایسا کڑاکا سنائی دیا کہ سینوں میں دل دہل گئے۔ عورت نے چلا کر اپنے جواں سال بچے کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

"یا اللہ خیر...... یا اللہ خیر...... لگتا ہے بجلی پنڈ میں گری ہے۔" اس نے بے تاب ہو کر کہا۔

"نہیں امی، کہیں کھیتوں میں گری ہو گی۔" لڑکا بولا۔

"کھیتوں میں نہیں پنڈ میں گری ہے۔ تجھے پتا ہی ہے، سارے لوگ کہتے ہیں کہ بجلی چودھری کے پتر نیاز پر عاشق ہے۔"

"نہیں امی! یہ باتیں ہوتی ہیں۔ ماسٹر جی کہتے ہیں کہ ایسی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہئے۔ بجلی تو اس لئے چمکتی ہے کہ ایک بادل پر جمع کا چارج ہوتا ہے، دوسرے پر تفریق کا...... جب یہ دونوں بادل......"

"اچھا...... اچھا بس کر...... اب اپنی تقریر شروع نہ کر دینا...... کچھ اللہ توبہ کر...... آیت الکرسی آتی ہے نا...... بس وہ پڑھتا رہ......"

لڑکے کے لئے ماں کا کہا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا اور اس نے منہ میں ورد شروع کر دیا۔

بجلی تڑپتی رہی، بادل دھاڑتے رہے اور پانی برستا رہا۔ ماں بیٹا دیے کی لو میں ایک دوسرے سے لپٹے بیٹھے رہے۔ یہ ایک طوفانی رات تھی اور طوفانی راتوں کی ہلاکت خیزیاں صبح کے وقت عیاں ہوتی ہیں۔ اس طوفانی رات کی صبح بھی اس ماں بیٹے کے لئے ایک بڑی مصیبت لے کر آ رہی تھی۔

بیٹے کا نام عمران تھا۔ اسے پیار سے عمو کہا جاتا تھا۔ وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا تھا۔ اس سے پہلے اس کے چار بہن بھائی ایک سال کی عمر کے اندر ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اس کی ماں بس اسے پروان چڑھا سکی تھی اور اب وہ اس کا واحد سہارا تھا۔ پانچ چھ سال پہلے عمو کا والد بھی ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا کاشت کار تھا۔ اس کے پاس بہت تھوڑی سی زمین تھی تاہم اس زمین کو اس نے اتنے اچھے طریقے سے استعمال کیا تھا کہ اس چھوٹے سے کنبے کی گزر بسر آسانی سے ہو جاتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ یعنی عمو کی والدہ اس زمین کو سنبھال نہیں سکی تھی۔ اس نے گھر چلانے کے لئے یہ زمین ٹھیکے پر دے دی تھی۔ کچھ اناج اور کچھ پیسے مل جاتے تھے جس سے وہ جیسے تیسے زندگی کی گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ اس کا عمران پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی بن جائے، ایک افسر، ایک ڈاکٹر یا پھر ایسا ہی کوئی قابلِ عزت شخص۔ وہ اسے اپنا پیٹ کاٹ کر پڑھا رہی تھی۔ وہ ایک مثالی ماں تھی۔ ایثار، شفقت اور وفا کا پیکر۔ عمو کے لئے وہ ایک ایسے شجر سایہ دار کی طرح تھی جس کے تلے وہ دنیا کے ہر رنج و غم سے دور تھا۔ اس کی زندگی کا محور صرف اور صرف اس کی ماں تھی۔

اس طوفانی شب کی صبح بھی ماں اسے اسکول بھیجنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کی کتابیں سنبھالنے کے بعد رومال میں اس کا کھانا باندھ رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر جا کر عمو نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ اپنے سامنے اونچی پگڑی والے چودھری سجاول اور اس کے منشی اکبر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

چودھری سجاول نے عمو کے سر پر پیار دیا اور پھر کھنگورے مارتا ہوا اندر آ گیا۔ عمو کی ماں نے گاؤں کے چودھری کو اپنے سامنے دیکھ کر جلدی سے اوڑھنی درست کی اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

"چودھری جی! ہمارے اتنے بھاگ کہ آپ ہمارے گھر میں آئے۔ یہاں تو ایسی کرسی بھی نہیں کہ آپ کو بٹھا سکیں۔"

چودھری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بھین شریفاں! میں آج یہاں چودھری نہیں

سوالی بن کر آیا ہوں۔"

"ہائے میں مر گئی چودھری جی...... یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ ہم غریبوں کی اتنی حیثیت کہاں کہ آپ ہم کو کوئی ضرورت بتائیں۔"

"بس آج کوئی ایسی ہی بات ہے بھین شریفاں۔" چودھری نے خلافِ معمول عجز کے لہجے میں کہا پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ "تمہیں پتا ہے، رات کو کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا ہے چودھری جی۔" عمو کی ماں نے چونک کر پوچھا۔ یقیناً اسے رات کو سنائی دینے والا بجلی کا زبردست کڑکا یاد آ گیا تھا۔

چودھری نے بتایا۔ "حویلی کے پچھواڑے، باہر والی دیوار کے بالکل پاس بجلی گری ہے۔ دو بھینسیں مر گئی ہیں، بوڑھ کا درخت بھی جل کر کوئلہ ہو گیا ہے۔"

"ہائے میں مر گئی۔" عمو کی والدہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے رات کو ہی لگا تھا کہ بجلی پنڈ کے اندر ہی کہیں گری ہے۔"

"بس بھین شریفاں! بال بال بچے ہیں۔ ایویں آٹھ دس قدموں کا فرق رہ گیا۔ ساتھ ہی تو وہ کمرے ہیں جہاں سوتے ہیں ہم...... بس سب وہی پتر نیاز والا معاملہ ہے۔ پچھلے مہینے میں اسے گجرات کے قریب شہنشاہ پیر کے مزار پر بھی لے کر گیا تھا۔ وہاں کے گدی نشین پیر صادق شاہ نے بھی یہی کہا ہے۔ نیاز پہلوٹی کا بچہ ہے اور بجلی اس پر عاشق ہے۔ یہ اس کو کسی بھی وقت نقصان پہنچا دے گی۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، نیاز کے بڑے تایا کی جان بھی اسی طرح گئی تھی۔ اللہ نہ کرے...... اللہ نہ کرے اس کی زندگی کو بھی......" چودھری کی آواز بھرا گئی اور وہ پگڑی کے پلو سے نادیدہ آنسو خشک کرنے لگا۔

"آپ ایسی بات منہ سے کیوں نکال رہے ہیں۔ چودھری جی؟ رب نہ کرے چھوٹے چودھری پر کوئی آنچ آئے۔ ہماری جندگی، ہمارے بچوں کی جندگی چھوٹے چودھری کو لگ جائے۔"

چودھری کچھ دیر خاموش رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "بھین شریفاں! اللہ تمہاری اور تمہار بچے کی حیاتی لمبی کرے...... میں تم سے بس ایک چھوٹی سی منت کرنے آیا ہوں اگر تم مان لو تو۔"

"آپ حکم کریں چودھری جی۔" عمو کی والدہ نے کہا۔ "لیکن پہلے آپ بتائیں آپ کی کیا خدمت کروں...... کوئی لسی پانی، دودھ وغیرہ؟"

چودھری نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"بھین شریفاں! میں نے تمہیں بتایا ہے نا، پچھلے مہینے کی دوسری جمعرات میں پیر صادق شاہ کے آستانے پر گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پتر نیاز پر سے یہ مصیبت ٹالنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کا سر منڈوا کر اسے چولا پہنایا جائے اور کم از کم ایک سال کے لئے مزار کی خدمت کے لئے بھیج دیا جائے۔ اس کا کھانا پینا، سونا سب کچھ وہیں مزار کے اندر ہو۔ میں اس کام کے لئے بالکل تیار تھا لیکن یہاں مصیبت یہ آ پڑی ہے کہ پتر نیاز کو میلتی بخار چڑھا ہوا ہے۔ ایک مہینا ہو گیا ہے، بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ نیاز کو مکمل علاج اور آرام کی لوڑ ہے۔ میں نے اس بارے میں پیر صادق شاہ سے بات کی تھی۔ انہوں نے اس کا ایک حل بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی ایسا بچہ جو نیاز کی عمر کا ہو اور اپنے ماں پیو کی آخری اولاد ہو، نیاز کی جگہ مزار پر خدمت کر سکتا ہے۔ اس کے لئے پیر صاحب نے ایک دو شرطیں بتائی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ دس ہزار روپے کا نذرانہ مزار کو دینا پڑے گا۔ یہ سب کچھ تو اتنا مشکل نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ وہ بچہ مل جائے جو نیاز کی جگہ ایک سال کے لئے اپنے گھر والوں سے دور رہ سکے۔"

عمو کی والدہ نے ایک دم چونک کر چودھری سجاول کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یکا یک اَن گنت اندیشے جاگ اُٹھے۔

منشی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "وڈی آپا! اگر تمہارا بیٹا عمو، پتر نیاز کی جگہ لے سکے تو چودھری صاحب اور ہم سب تمہارے بڑے احسان مند ہوں گے۔ پھر عمو کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہم اس کا وہاں پورا پورا خیال رکھیں گے۔ تم دو ڈھائی مہینے میں ایک بار وہاں جا کر اس سے مل بھی سکو گی۔"

چودھری نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم اگر خود چاہو تو حویلی میں ہمارے مہمان کی طرح رہ سکو گی۔ تمہیں ہر طرح کا آرام ہوگا۔ زمین کی طرف سے بھی فکر کرنے کی کوئی لوڑ نہیں ہوگی۔"

"لل...... لیکن چودھری جی! عمو کے تو دسویں کے امتحان ہونے والے ہیں؟"

"اس کی فکر نہ کرو بھین! اگلے سال اس کو دو جماعتیں اکٹھی پاس کرا دیں گے۔"

"پر چودھری جی! یہ تو...... یہ تو میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا...... کملا ہو جاتا ہے میرے بغیر۔ یہ کیسے رہ سکے گا ایک سال تک گجرات میں؟"

"بھین شریفاں! تم سے کہا تو ہے کہ تم ڈیڑھ دو مہینے بعد جا کر اس سے مل سکو گی۔ ہم بھی پورا دھیان رکھیں گے اس کا۔" چودھری سجاول کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔ یوں لگتا تھا

کہ وہ عمو کو اپنے بیٹے نیاز کی جگہ گجرات کے اس دور دراز دیہہ میں بھیجنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا ہے، اب عمو کو وہاں جانا ہی جانا ہے، پیار محبت سے یا پھر دباؤ سے۔

عمو کی والدہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس اچانک آفت کا مقابلہ کیسے کرے اور گاؤں کے چودھری کو کیا جواب دے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ یہ آسان معاملہ نہیں ہے اور اسے ٹالنا بھی نہایت مشکل ہوگا۔ چودھری کو اپنے لاڈلے بیٹے پر سے بلا ٹالنے کے لئے کسی کی قربانی کی ضرورت تھی۔ اسے نیاز کا ایک ہم عمر لڑکا چاہئے تھا اور وہ بھی ایسا جو اپنے والدین کی آخری اولاد ہو اور وہ مزار کا خادم بننے کے لئے رضامند بھی ہو جائے۔ یہ ساری شرطیں گاؤں میں کہیں اور پوری ہونے کا امکان نہیں تھا۔

عمو کی والدہ، چودھری سجاول اور منشی اکبر میں بات چیت جاری رہی۔ عمو کو کچھ دیر کے لئے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا۔ مدھم آوازیں عمو کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بات چیت میں تلخی آ چکی ہے۔ چودھری سجاول کا لہجہ اب واضح ناراضی لئے ہوئے تھا۔ وہ گاہے بگاہے ان احسانوں کا ذکر بھی کر رہا تھا جو ماضی میں حویلی والوں کی طرف سے عمو کے گھرانے پر کئے گئے تھے۔

عمو کے سینے میں کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ وہ ماں کے بغیر چند گھنٹے مشکل سے گزارتا تھا۔ اسکول کے بعد گھر کی طرف یوں لپکتا تھا جیسے لوہ چون، مقناطیس کی طرف۔ اگر کسی دن کسی مجبوری کے سبب ماں گھر میں نہ ہوتی تو اسے سب کچھ خالی خالی لگتا، بھوک مر سی جاتی اور اسے محسوس ہوتا کہ چھٹی ہو کر بھی چھٹی نہیں ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد عمو نے دیکھا کہ چودھری سجاول غصے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے باہر جا رہا ہے۔ چھوٹے قد کا منشی اکبر بھی اس کے ساتھ تھا۔ عمو نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے ماں کو دیکھا، وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ ابھی عمو سوچ ہی رہا تھا کہ ماں کے پاس جائے یا نہیں کہ گھر کے دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ ماں نے جلدی جلدی آنسو پونچھتے ہوئے عمو کو آواز دی۔ "دیکھ ذرا باہر کون ہے؟"

عمو نے صحن میں جا کر دروازہ کھولا۔ منشی اکبر پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ منشی اکبر نے عمو کے سر پر پیار دیا اور اندر آ گیا۔ وہ کمرے میں آ کر عمو کی ماں کے قریب ہی پیڑھی پر بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں اسے سمجھانے بجھانے لگا۔ "وڈی آپا! چودھری جی مشکل میں ہیں...... چودھرانی جی کا بھی رو رو کر بُرا حال ہے۔ دیکھو وڈی آپا! میں تمہیں اندر خانے کی بات بتاتا ہوں۔ چودھری جی مجبور ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی رستہ ہی نہیں ہے کہ نیاز کی جگہ عمو

کومزار کی خدمت کے لئے بھیجیں۔ ہمارے پنڈ میں اور اردگرد کے پنڈوں میں کوئی اور ایسا لڑکا ملا ہی نہیں جو پیر جی کی بتائی ہوئی شرطوں پر پورا اُتر سکے۔ صرف میاں پور میں ایک ملا تھا مگر وہ لوہار برادری کا ہے۔ پیر جی کی یہ شرط بھی ہے کہ لڑکا کمی ذات کا نہ ہو۔ وڈی آپا! اب یہ بات تو صاف ہے کہ عمو کو گجرات جانا ہی پڑے گا۔ تمہاری رضامندی سے چلا جائے گا تو اس میں اس کا فائدہ ہوگا اور تمہارا بھی۔ چودھری جی تمہیں خوش کر دیں گے۔ دوسری صورت میں تمہارے لئے مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ تمہیں پتا ہی ہے تمہاری زمین والے کاغذوں میں تھوڑی سی گڑبڑ ہے۔ پٹواری عاشق بڑا کمینہ بندہ ہے۔ اگر وہ اب تک چپ بیٹھا ہوا ہے تو یہ چودھری جی کی ہی مہربانی ہے۔ نہیں تو اس نے ضرور کوئی نہ کوئی پنگا ڈال دینا تھا......''

عمو کی والدہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''پر بھائی اکبر، کاغذوں میں وہ ہیرا پھیری کی بھی تو پٹواری نے ہی ہے...... پورا پنڈ جانتا ہے کہ یہ زمین اللہ بخشے عمو کے پیو کے حصے میں آئی تھی۔ سارے بھائیوں کے انگوٹھے ہیں اور......''

''وڈی آپا! یہ قانونی چکر ہیں، تم نہیں سمجھو گی۔'' اکبر نے تیزی سے بات کاٹی پھر مزید دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اور سچی بات یہ ہے وڈی آپا کہ یہ چودھری لوگ اگر کسی کو تنگ کرنے پر آ جائیں تو پھر ان کے پاس سو طریقے ہوتے ہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ اگر چودھری جی بڑے ماسٹر صاحب کو کہہ دیں کہ اسکول میں سے عمو کا نام کٹ جائے تو کیا کوئی ایسا بندہ ہے جو عمو کی پڑھائی چالو کرا سکے؟ میں بس تمہیں ایک مثال دے رہا ہوں۔''

عمو کی والدہ سسکنے لگیں۔

......ٹھیک پانچ دن بعد چودھری سجاد کی حویلی میں عمو کے سر کے بال مونڈ دیئے گئے اور اسے ایک لمبا چغا پہنایا گیا۔ کلائیوں میں تانبے کے دو کڑے ڈالے گئے اور ایک ایسے تانگے میں بٹھا کر جس کی چاروں طرف کپڑے سے پردہ کیا گیا تھا، اسے گجرات کے اس دور دراز گاؤں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ وقتِ رخصت ماں اسے دیر تک اپنے ساتھ لپٹا کر روئی تھی اور عمو کو بھی یوں لگا تھا جیسے اس کا دل سینے میں سو ٹکڑے ہو گیا ہے لیکن اس نے کوشش کر کے اپنے آنسو روکے رکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ماں اس کے آنسو دیکھے گی تو اور دکھی ہوگی اور وہ اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

شیخوپورہ کے مضافاتی گاؤں سے تانگے کے ذریعے عمران کو پکی سڑک تک پہنچایا گیا۔ وہاں سے بس کا سفر شروع ہوا جو گجرات پر ختم ہوا۔ یہاں سے ایک کھٹارا کار میں نہایت مشکل اور ناہموار راستوں پر سفر کر کے وہ قریباً دو گھنٹے میں ایک دیہہ تک پہنچے۔ اس دیہہ کا بہت

بڑے گنبد والا مزار کافی فاصلے سے ہی نظر آتا تھا۔ عمو کے ساتھ یہاں تک آنے والوں میں منشی اکبر کے علاوہ چودھری کے دو دیگر ملازم بھی تھے۔ وہ عمو کو مزار کے خدمت گاروں کے پاس چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

مزار میں پہنچنے سے پہلے ہی عمو کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسے یہاں ایک سال نہیں بلکہ سترہ چاندوں تک رہنا ہے اور یہ قریباً ڈیڑھ سال بنتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی درست نہیں تھی کہ اس کی ماں ہر ڈیڑھ دو مہینے بعد آ کر اس سے ملاقات کر سکے گی۔ یہ پیر صاحب کی مرضی پر تھا کہ وہ عمو کے کسی رشتے دار کو کب اس سے ملنے کی اجازت دیتے ہیں۔

مزار کا کرتا دھرتا پیر مخدوم صادق شاہ تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی، اچھی صحت اور خوراک کی وجہ سے وہ پینتیس کے لگ بھگ نظر آتا تھا۔ رنگ سرخ و سپید تھا، لمبے بال تیل میں چپڑے رہتے تھے اور آنکھیں ہر وقت سرمے کی دکان نظر آتی تھیں۔ اس کے چار خاص ماتحت تھے جنہیں درویش کہا جاتا تھا۔ یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ مخدوم صادق شاہ نے ان چاروں مریدوں کو ''اثر'' دیا ہوا ہے۔ یہ لوگ پیر صاحب کی جگہ لوگوں کو تعویذ دیتے تھے، جھاڑ پھونک کرتے تھے اور اس طرح کے دیگر فرائض انجام دیتے تھے۔ اردگرد کے دیہات سے لوگ کثیر تعداد میں یہاں آتے تھے۔ پیر صادق شاہ سے فیضیاب ہونے کا شرف بس خاص خاص لوگوں کو ہی حاصل ہوتا تھا۔ مزار کافی بڑے رقبے پر واقع تھا۔ درویشوں، خاص مریدوں اور ملازمین کے کمرے تھے۔ روزانہ دو طرح کے لنگر بھی یہاں پکائے جاتے تھے۔ قریباً بیس مرد خادم اور اتنی ہی خادمائیں مزار کے انتظام و انصرام میں مصروف رہتے تھے۔

عمران عرف عمو صبح سویرے سے رات تک صفائی ستھرائی کے کاموں میں مصروف رہتا اور پھر اپنی کوٹھری میں دیر تک آنسو بہانے کے بعد سو جاتا۔ ماں کی یاد ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں چبھی ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا، ماں کیا کر رہی ہوگی؟ کیا سوچ رہی ہو گی؟ اس نے کھانا کھایا ہوگا یا نہیں؟ اس نے آرام کیا ہوگا یا نہیں؟

قریباً ایک ماہ بعد جب وہ بہت بے تاب ہوا تو اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے پتا چلا کہ یہاں نگرانی کا کافی سخت انتظام ہے۔ پہرے داروں نے اسے روک لیا اور واپس مزار میں پہنچا دیا۔

اس رات وہ ماں کے لئے بہت رویا تھا۔ اس کے ساتھی لڑکے قاضی نے اسے بمشکل چپ کرایا اور تھوڑا بہت کھانے پر مجبور کیا۔ قاضی کئی دوسرے لڑکوں کی طرح دو تین سال سے

یہاں خدمت انجام دے رہا تھا اور یہاں کی اونچ نیچ کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

اس نے کہا۔ ''عمو! اس دفعہ تو تمہیں کچھ نہیں کہا گیا اور پیار محبت سے سمجھا دیا گیا ہے لیکن اگلی دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ لوگ سختی کریں گے اور پھر نوبت زنجیروں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہاں دو تین لڑکے اب بھی ایسے ہیں جنہیں زنجیریں ڈالی جاتی ہیں اور پھر سوچو کہ بھاگ کر جاؤ گے بھی کہاں؟ ماں کے پاس...... اور ماں تمہیں پھر یہاں بھیج دے گی۔ وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہے۔''

''میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ میرے بغیر نہیں۔'' عمو سسکا۔

''لیکن یار سوچو یہ ہمیشہ کی بات تو نہیں ہے۔ سال ڈیڑھ سال کی بات ہے۔ تم دیکھنا، دو تین مہینوں میں تمہارا دل یہاں لگ جائے گا۔ پھر باقی کے دن کاٹنا تمہارے لئے زیادہ مشکل نہیں رہے گا......''

بات عمو کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ یہاں سے بھاگتا تو بھی اسے جانا تو ماں کے پاس ہی تھا۔ ماں چودھری کے حکم سے مجبور تھی، وہ اسے پھر یہاں بھیج دیتی۔ ماں کی جدائی کے علاوہ عمو کو یہاں مزار میں کوئی زیادہ تکلیف بھی نہیں تھی۔ بس مشقت تھی جو اسے دوسرے خادموں کے ساتھ مل کر کرنا پڑتی تھی۔ وہ صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتا تھا۔ فرش دھوتا تھا۔ دستی نلکوں سے پانی بھرتا تھا اور کبھی کبھی درویشوں کی مٹھی چاپی بھی کرتا تھا...... وہ لڑکوں میں سب سے خوب صورت تھا۔ قد کاٹھ بھی دلکش تھا۔ ایک درویش ارباب علی اس سے بہت لگاؤ رکھتا تھا اور اسے بیٹا کہہ کر بلاتا تھا۔ ارباب علی کی کوشش سے ہی عمو کو شام کے وقت کچھ دیر کھیل کود کی اجازت بھی مل گئی۔ عصر کے بعد مزار کے پچھواڑے احاطے میں والی بال اور گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلا جاتا تھا۔ ارباب کی کوشش سے ہی عمو کو کسی وقت اچھے والے لنگر سے کھانا بھی ملنے لگا۔

تین مہینے بعد عمو کی ماں اس سے ملنے کے لئے آئی۔ منشی اکبر اور چودھری کا ایک کاماں منظور بھی اس کے ساتھ تھا۔ ماں بیٹا مل کر خوب روئے۔ ماں اس کے لئے گاؤں سے کئی سوغاتیں لے کر آئی تھی۔ ماں نے عمو کو اور عمو نے ماں کو تسلی دی۔ ماں نے انگلیوں پر گن کر عمو کو بتایا کہ تین مہینے گزر گئے ہیں، اب بس تیرہ چودہ مہینے باقی ہیں۔

ماں سے ملاقات کے دس بارہ روز بعد تک عمو بہت دکھی رہا لیکن پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنا دل ٹھکانے پر کر لیا اور ماں سے اگلی ملاقات کے لئے دن گننے شروع کر دیئے۔ ارباب علی نے عمو کو یقین دلایا تھا کہ اگلی ملاقات تین مہینے کے وقفے سے ہوگی اور ضرور ہوگی۔

قاضی کی باتوں سے عمو کو...... صادق شاہ کے بارے میں کافی کچھ پتا چلتا رہتا تھا۔ صادق شاہ اپنے مرحوم والد کے برعکس کافی خوش خوراک شخص تھا۔ اس کی تین بیویاں تھیں۔ ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور ایک کو طلاق دے کر اس سے دوبارہ شادی بھی کی تھی۔ صادق شاہ کو گھوڑوں اور بندوقوں وغیرہ کا بھی شوق تھا۔ اس کے زمیندار مرید اکثر اس کے شوق کے مطابق تحفوں کا انتظام کرتے رہتے تھے۔

ایک دن درویش عطا محمد نے عمو اور قاضی کو صادق صاحب کے حجرے سے دسترخوان اُٹھانے کے لئے بھیجا۔ عمو اور قاضی پیر صاحب کے وسیع و عریض حجرے میں داخل ہوئے۔ یہاں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور قالین پر ایک خوبصورت دسترخوان بچھا تھا۔ بھنے ہوئے بٹیر، مچھلی، دیسی مرغ کا گوشت، سندھی بریانی اور پتا نہیں کیا کچھ یہاں موجود تھا۔ پلیٹیں ہڈیوں سے بھری ہوئی تھیں اور روغنی نانوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔

جن تین چار مہمانوں نے یہ دعوت اُڑائی تھی، ان میں سب سے نمایاں ایک عورت تھی...... اسے بلاشبہ ایک گرانڈیل عورت کہا جا سکتا تھا۔ عمر پینتیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس کا چہرہ بہت بڑا تھا، رنگ سانولا، نقوش سخت اور ناک بالکل چپٹی تھی۔ اس کی دبنگ شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو اس کا لباس تھا۔ اس نے مردوں کی طرح کالی دھوتی اور کڑھائی والی کالی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ مردوں ہی کی طرح آلتی پالتی مارے پیر صاحب کے قریب بیٹھی تھی۔

اس نے غور سے عمو کو دیکھا اور بھاری آواز میں بولی۔ ''یہ منڈا کون ہے؟''

صادق شاہ بولا۔ ''شیخو پورہ کا رہنے والا ہے۔ خدمت کے لئے آیا ہوا ہے۔''

''صادق شاہ! تم نے بڑے ملائم منڈے رکھے ہوئے ہیں اپنے پاس۔'' وہ ہنس کر بولی۔ اس کے دانت پان سے متاثر تھے۔ پھر وہ عمو سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''کیا نام ہے تیرا کاکا؟''

''عمو جی۔''

''میرے ساتھ چلو گے؟''

''کک...... کہاں جی؟'' وہ ڈر کر بولا۔

اس کے ڈرنے کے انداز نے عورت اور اس کے ساتھیوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ عورت کا ایک نشیلی آنکھوں والا ساتھی عمو کی پیٹھ پر ہلکا سا دھپ مار کر بولا۔ ''اوئے ڈر کیوں رہا ہے۔ تُو کوئی لڑکی ہے جو تجھے لے جا کر بازار میں بیچ دیں گے۔''

عمو نے بے بسی سے صادق شاہ کی طرف دیکھا۔ صادق شاہ کے چہرے پر ہلکا پھلکا تاثر تھا۔ وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ ''اچھا اچھا، تم پلیٹیں اُٹھاؤ اور جاؤ۔''

عمو پلیٹیں وغیرہ اُٹھا کر باہر نکل آیا۔ قاضی دستر خوان کو صاف کرنے اور سمیٹنے لگا۔

عمو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اگلے روز صبح سویرے کیا ہونے والا ہے...... عمو کو خلافِ معمول منہ اندھیرے ہی اُٹھا دیا گیا۔ ایک خادم نے اسے بتایا کہ عطا محمد نے اسے حجرے میں بلایا ہے۔ وہ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر حجرے میں پہنچا تو وہاں...... ارباب علی بھی موجود تھا۔ ارباب کی آنکھوں میں دکھ تھا اور اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک عطا اور ارباب میں کسی بات پر زوردار بحث ہوتی رہی ہے۔

عطا محمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمو! تجھے کچھ دنوں کے لئے یہاں سے باہر جانا ہوگا۔ صادق صاحب کی مہمان جو کل یہاں آئی ہیں، انہیں اپنے ڈیرے پر ایک کامے کی لوڑ ہے۔ ان کا پرانا کاما کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی آئے گا، تم یہاں واپس آ جاؤ گے۔''

ایک دم عمو کی آنکھوں کے سامنے کل والی عورت کا کرخت چہرہ گھوم گیا۔ وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ پھر اس کا لہجہ، اس کے دیکھنے کا انداز۔ بچپن میں اس نے اپنی ماں سے ایک ایسی خطرناک عورت کی کہانی سنی تھی۔ جو گھروں کی ڈیوڑھیوں سے معصوم بچے اُٹھا کر فروخت کر دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں، اس عورت کو دیکھ کر عمو کے ذہن میں وہ کہانی گھومنے لگی تھی۔

وہ کچھ بول نہ سکا۔ بس خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ عطا محمد بولا۔ ''گھبرانے کی لوڑ نہیں۔ زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا بلکہ یہاں سے بھی ہلکا کام ہوگا۔''

''پپ...... پر...... مم...... میری۔'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔ آواز گلے میں اٹک گئی۔

''بولو...... بولو کیا بات ہے؟'' عطا نے تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

وہ بمشکل بولا۔ ''مم...... میری امی...... آ رہی ہے...... اگلے ہفتے۔''

عطا محمد کے چہرے پر ناگواری کی شکن اُبھری لیکن اس نے اپنی آواز ہموار ہی رکھی اور بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اگلے ہفتے تم واپس ہی آ جاؤ اور دیکھو، یہ صادق صاحب کا حکم ہے۔ ہم اس میں کسی طرح کی چوں چراں نہیں کر سکتے۔ چلو جا کر تیار ہو جاؤ۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ان لوگوں نے یہاں سے جانا ہے۔''

عمو نے ارباب کی طرف دیکھا۔ وہ یکسر خاموش تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے عمو کو مزید پریشان کیا۔ عمو چاہتا تھا کہ ارباب کچھ بولے لیکن وہ بولا نہیں۔ عمو اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا حجرے سے باہر آ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کا سارا سامان باندھا جا چکا ہے۔ جستی ٹرنک کے پاس ہی اس کا بستر بھی گول کیا ہوا پڑا تھا۔ عطا تو کہہ رہا تھا کہ اسے چند دن کے لئے جانا ہے۔ اگر چند دن کی بات تھی تو پھر سارے سامان کی کیا ضرورت تھی؟ بہرحال سوالات کی گنجائش یہاں نہیں تھی۔

وہ لوگ گھوڑوں پر سوار وہاں سے روانہ ہوئے۔ وہ کل آٹھ افراد تھے۔ ان میں گرانڈیل عورت بھی شامل تھی جس کا نام عمو کو بعد میں ماجھاں معلوم ہوا۔ ان سب نے کچے راستے کے گرد و غبار سے بچنے کے لئے منہ، سر کپڑوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ چار افراد کے پاس پکی رائفلیں موجود تھیں۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے ڈاکوؤں یا وارداتیوں کا گروہ کہیں کارروائی ڈالنے کے لئے جا رہا ہو۔

عمو کو گھڑسواری کا زیادہ تجربہ نہیں تھا اس لئے اسے ایک صحت مند گھوڑے پر ایک دوسرے شخص کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ یہ خاردار داڑھی والا شخص تھا اور اس کے جسم سے مردار کی بُو اُٹھ رہی تھی۔ وہ عمو کے پیچھے بیٹھا تھا۔ جب گھوڑا بھاگتا اور عمو دائیں بائیں کھسکتا تو وہ شخص مذاق کے انداز میں کہتا۔ ''اوئے، سنبھل کر بیٹھ کاکا۔ کیا صابن کی گاچی کی طرح پھسل رہا ہے۔''

ایک بار اس نے عمو کی کمر پر بہت زور سے چٹکی بھی کاٹی۔ عمو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

سفر کافی طویل ثابت ہوا۔ گرمی اور دھوپ نے اسے مزید مشکل بنا دیا...... راستے میں کہیں کہیں اکا دکا لوگ ملے۔ ماجھاں اور اس کے ساتھیوں کی ان سے مختصر بات چیت بھی ہوئی۔ اس بات چیت سے عمو کو معلوم ہوا کہ گرانڈیل عورت کا نام ماجھاں ہے اور اسے مالکن یا چودھرانی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی موضع ''کیکراں'' کے رہنے والے تھے اور وہیں جا رہے تھے۔

تپتے دن میں نہایت دشوار راستوں پر سفر کر کے وہ لوگ شام سے کچھ ہی پہلے ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہاں سو فیصد مکان کچے تھے۔ گاؤں کی مسجد اور حویلی بھی حلی تھی۔ حویلی کا احاطہ بہت بڑا تھا اور اس کے اردگرد بہت سے درخت لگے تھے۔ ان درختوں میں زیادہ تر کیکر ہی نظر آتے تھے۔ اس جگہ کیکروں کی بہتات تھی، شاید اسی لئے اس گاؤں کا نام کیکراں تھا...... حویلی کے احاطے میں ایک جگہ بہت سی بیل گاڑیاں اور گھوڑے خچر وغیرہ دکھائی دے رہے تھے۔ عمو کو حویلی سے ملحقہ ایک ڈیرا نما جگہ پر پہنچا دیا گیا۔

O……❖……O

اگلے تین چار روز میں عمران عرف عمو کو یہاں کے حالات کے بارے میں بہت کچھ پتا چلا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ جرائم پیشہ لوگوں کا گاؤں تھا۔ بارڈر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں شراب کی بھٹیاں تھیں۔ یہاں کی شراب اردگرد کے دیہات میں بھی بھیجی جاتی تھی۔ یہاں اسمگلنگ کا سامان بھی آتا تھا۔ یہاں جوئے کی ایک بڑی بیٹھک تھی جسے عرفِ عام میں سراں کہا جاتا تھا۔ علاقے کی پولیس کو ان غیر قانونی کاموں میں مداخلت کی ہمت کم ہی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ ماجھاں تھی۔ وہ بڑے دھڑلے کی عورت تھی۔ وہ دو مشہور ڈکیتوں ساجے اور ناجے کی سگی بہن تھی۔ ساجا تو کوئی دو سال پہلے مارا گیا تھا مگر ناجا زندہ تھا۔ وہ پچھلے قریباً ایک سال سے رُوپوش تھا۔ ماجھاں خود بھی بہت دراچھی تھی۔ اس کی آتشیں طبع کا ایک ثبوت وہ گہرا زخم بھی تھا جو اس کی پیشانی سے رخسار تک چلا گیا تھا اور جس کی وجہ سے اس کی ناک ضرورت سے زیادہ چپٹی نظر آتی تھی۔

ابھی تک عمو کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے اور اس سے کیا کام لیا جائے گا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ ماجھاں کو ''کامے'' کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا کاما کہیں گیا ہوا ہے لیکن یہاں تو کئی کامے موجود تھے اور ان میں عمو کے ہم عمر تین چار لڑکے بھی تھے۔

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا، کچھ دیر پہلے ہلکی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے گرمی کا زور ذرا ٹوٹ گیا تھا۔ ایک ملازمہ شہناز عمو کے پاس آئی۔ وہ عمو کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''وے تجھے مالکن نے بلایا ہے۔''

''کون مالکن؟''

''وے چودھرانی جی اور کون؟ یہاں تیری ماں تو مالکن نہیں ہے۔''

عمو ملازمہ کے ساتھ ہولیا۔ ڈیرے اور حویلی کا درمیانی دروازہ پار کر کے وہ حویلی میں آ گئے۔ ملازمہ شہناز اسے اندر لے گئی۔ یہاں ایک کمرے میں رنگین پایوں والا شاندار پلنگ بچھا ہوا تھا۔ چھت پر کوئی چھ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا جھالر والا پنکھا حرکت کر رہا تھا۔ اس پنکھے کو کسی ساتھ والے کمرے سے ڈوری کے ذریعے حرکت دی جا رہی تھی۔ پلنگ پر مالکن ماجھاں موجود تھی۔ عمو کو دیکھ کر وہ پلنگ سے اُٹھی اور رنگین پایوں والی، بان کی ایک کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کے بوجھ سے جیسے کرسی چرچرا اُٹھی۔

اس نے عمو کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اور بھاری بھرکم آواز میں بولی۔ ''اوئے منڈیا! کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا نہیں۔ کیا بوتھی نکالی ہوئی ہے۔ رنگ بھی پیلا ہو گیا ہے۔''

''کھاتا ہوں جی۔'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

''زور ہے تیرے میں؟'' اس نے پوچھا۔

عمو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا، چل دیکھ لیتی ہوں۔ ذرا مونڈھے دبا میرے۔''

عمو سکتہ زدہ سا کھڑا رہا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں عمو کو ماں کی گالی دی اور بولی۔

''اوئے……ایسے کیا تک رہا ہے بٹر بٹر؟ کیا کبھی کسی کا پنڈا نہیں دبایا؟''

عمو جلدی سے اس کے عقب میں آ گیا اور اس کے چربی دار مونڈھوں کو اپنے ہاتھوں سے دبانے لگا۔

اسی دوران میں سانولے رنگ کا ایک غریب صورت شخص اندر آیا۔ اس نے پہلے زمین کو دونوں ہاتھ لگا کر اس بات کا اشارہ دیا کہ وہ ماجھاں کے پاؤں چھو رہا ہے پھر وہ کمرے کی دہلیز پر ہی جوتیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے عاجزی سے دانت نکالے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مالکن! میرے پتر نے چوری نہیں کی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا جی۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ وہ بھلا کسی کی بھینس چوری کرے گا؟ میں آپ کے سامنے ہتھ جوڑتا ہوں۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ اس کی جان بچائیں……پلس والے مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔''

ماجھاں نے اطمینان سے کہا۔ ''پر تھانے دار قادر کہتا ہے کہ اس نے لوٹا فال نکالی ہے اور فال میں تیرا پتر امین ہی سامنے آیا ہے۔''

غریب صورت شخص روتے ہوئے بولا۔ ''آہو جی، انہوں نے لوٹا گھمایا تھا……پر لوٹا غلط بھی تو گھوم سکتا ہے نا۔ میرا امین چور نہیں ہے۔''

ماجھاں نے بلاتردد غریب صورت شخص کو گالی دی اور بولی۔ ''پچھلے سال جب تیری دھی کا داج (جہیز) چوری ہو گیا تھا تو تُو نے خود دہائی مچائی تھی اور کہا تھا کہ لوٹا گھما کر چور کا پتا لگایا جائے۔ تُو نے کہا تھا یا نہیں؟''

غریب صورت شخص کا سر مزید جھک گیا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ ''مالکن! میں اتنا جانتا ہوں، میرے پتر نے رستا گیری نہیں کی۔ اس پر الزام لگایا گیا ہے……''

''اچھا، دوسروں کی واری لوٹا سچا اور اپنی واری جھوٹا۔'' ماجھاں نے طنزیہ انداز میں کہا اور غریب صورت شخص کی نامعلوم بہن کا رشتہ ایک پلید جانور سے جوڑا۔

اس شخص نے ایک بار پھر زمین پر دونوں ہاتھ لگا کر اپنی عاجزی کا اظہار کیا اور بولا۔

"مالکن! تم مائی باپ ہو۔ تمہارے سوا کسی کا آسرا نہیں۔ میرے بچے کی جان بچاؤ۔ وہ پلس کی مار کھانے جوگا نہیں۔" اس نے اپنا سر زمین سے ٹکایا اور بھوں بھوں رونے لگا۔

ماجھاں کچھ دیر چپ رہی پھر گھمبیر آواز میں بولی۔ "چل اُٹھ۔ کیا زنانیوں کی طرح اتھرو وگا رہا ہے۔"

غریب صورت شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی چھدری داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔ ماجھاں نے اسے چند سخت باتیں سنائیں پھر کہا۔ "چل جا، میں کچھ کرتی ہوں اس کے لئے۔"

وہ شخص سلامیں کرتا ہوا چلا گیا۔ ماجھاں نے نوکرانی شہناز کو آواز دے کر بلایا اور اسے اپنے پاؤں کے ناخن کاٹنے کا حکم دیا۔ نوکرانی شہناز، اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ایک چھوٹی قینچی سے اس کے پاؤں کے ناخن کترنے لگی۔

عمو بدستور اس کے سخت کندھے دبا رہا تھا۔ نوکرانی ناخن کاٹ کر چلی گئی تو خضاب لگے سر اور گھنی مونچھوں والا ایک شخص اندر آیا۔ اس کے کندھے سے ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ اس نے ماجھاں کو سلام کیا اور بولا۔ "مالکن! وہ دیناں مسلی میرے پاس بیٹھا زنانیوں کی طرح رو رہا ہے۔ اس کا کیا کرنا ہے؟"

"کرنا کیا ہے؟" ماجھاں نے پوچھا۔

"وہ کہتا ہے کہ آپ نے اس کے پتر کو پلس سے چھڑانے کا وعدہ کیا ہے...... ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"ہاں، وعدہ تو کیا ہے۔" ماجھاں بولی۔

"تو پھر...... اگر آپ کا حکم ہو تو میں اس کے ساتھ چلا جاؤں تھانے؟" گھنی مونچھوں والے نے پوچھا۔

"ہاں چلے جاؤ۔ تھانے دار قادر سے مل لینا...... دینے کے سامنے اس کے پتر کو چھوڑنے کی بات کرنا۔ پر ابھی اس ذلیل کو چھڑانا نہیں ہے۔ چار پانچ روز ابھی اس کو رگڑے لگنے دینے ہیں۔ اس کو ہیضہ ہو گیا ہے اپنی پڑھائی کا۔ اُلو کا پتر، خود کو لاٹ صاحب سمجھنے لگا ہے۔"

گھنی مونچھوں والے نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور سلام کر کے باہر چلا گیا۔ عمو حیرانی سے سوچتا رہا۔ یہ کتنی دغاباز عورت تھی۔

کندھے دبا دبا کر عمو کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا بلکہ پچھلے آدھ گھنٹے سے

سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی اسے بس کرنے کا کہے گی لیکن وہ تو جیسے اسے آرڈر کر کے بھول ہی چکی تھی۔ عمو کی عمر سولہ سال سے تھوڑی ہی زیادہ ہو گی۔ اس نے تھوڑا قد کاٹھ نکال لیا تھا لیکن ابھی اس کے جسم میں وہ مردوں والا زور کہاں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ اور بازو شل ہو گئے۔ جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔ وہ مست بیٹھی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اذیت پسند طبع رکھتی ہے۔ جانتی بھی تھی کہ عمو بُری طرح تھک چکا ہے پھر بھی اسے رکنے کے لئے نہیں کہہ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جب عمو کے ہاتھوں میں بالکل جان نہ رہی تو اس نے گھوم کر اسے دیکھا اور بولی۔ "اوئے لکڑی دے باندر! تُو تو کہتا تھا کہ زور ہے تیرے اندر۔ یہ چرخا کات رہا ہے کہ مونڈھے دبا رہا ہے؟"

عمو کچھ نہیں بولی۔ اس کے ماتھے پر پسینا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو ماجھاں کے کندھوں پر حرکت دیتا رہا۔

چند سیکنڈ بعد وہ بولی۔ "اچھا چل چھوڑ۔ وہ سامنے الماری میں سے پانی کی بوتل پکڑ کر لا۔"

عمو اس کے اشارے پر الماری کی طرف گیا۔ اس نے الماری کھولی اور بوتل تلاش کرنے لگا۔ پانی کی بوتل تو نظر نہیں آئی لیکن شراب کی سیاہی مائل بوتل وہاں موجود تھی۔ ماجھاں کی بھاری آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ "اوئے بٹر بٹر کیا دیکھ رہا ہے، یہی بوتل لانی ہے۔"

عمو نے لرزتے ہاتھوں سے بوتل تھامی اور اسے ماجھاں کے سامنے تین ٹانگوں والی گول میز پر رکھ دیا۔

یہاں گلاس پڑا تھا اور ایک جگ میں تھوڑا سا پانی بھی رکھا تھا۔ ماجھاں نے ملازمہ شہناز کو اپنی بھاری بھرکم آواز میں پکارا۔ وہ چند سیکنڈ میں اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ ٹرے کے اندر پلیٹ میں برف کے ٹکڑے رکھے تھے اور کچھ نمکو وغیرہ تھی۔ عمو کو عجیب اُلجھن ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورت کیا کر رہی ہے۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ شراب بہت بُری چیز ہے۔ اسے بدمعاش لوگ پیتے ہیں اور پینے کے بعد زیادہ خبیث ہو جاتے ہیں۔ اسے ہرگز پتا نہیں تھا کہ کچھ عورتیں بھی شراب پیتی ہیں۔

ماجھاں کی آنکھوں میں عجیب سی سرخی اُترتی جا رہی تھی۔ اس نے جگ میں برف کے ٹکڑے ڈال کر جگ کو ہلایا پھر عمو سے مخاطب ہو کر بولی۔ "چل، یہ کالا پانی ڈال۔"

"کک...... کس میں؟"

''اپنی بے بے کے سر میں۔ اوئے اس گلاس میں ڈال...... یہ جو تیرے سامنے رکھا ہے۔''

عمو نے لرزتے ہاتھوں سے بدبودار سیال گلاس میں انڈیلنا شروع کیا۔ گلاس ایک تہائی بھر گیا تو ماجھاں نے عمو کا ہاتھ روک دیا۔ پھر اس نے اپنے حساب سے اس میں ٹھنڈا پانی مکس کیا اور غٹا غٹ چڑھا گئی۔

اس کمرے میں اس نے یہی عمل دو تین بار دہرایا اور اس کا چہرہ تمتما گیا۔ آنکھیں سرخ نظر آنے لگیں...... بالکل انگاروں کی طرح۔ عمو کو اس سے ڈر لگنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ کہیں اسے مارنا نہ شروع کر دے۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی اُٹھی۔ اس نے عمو کے گال پر ایک سخت چٹکی لی اور کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

عمو کے سینے میں دل کبوتر کی طرح پھڑک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کچھ غلط ہونے والا ہے۔

یک دم کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط ہلکی سرسراہٹ اور چرخی کی مدھم آواز سے پتا چلتا تھا کہ چھت پر جہازی سائز کا جھالر والا پنکھا حرکت کر رہا ہے۔

یکا یک عمو نے سخت جسم والی ماجاں کو اپنے بالکل پاس محسوس کیا۔ اس کی سانسوں سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اس کے بازو عمو کے اردگرد تھے۔ عمو کو گھن محسوس ہوئی۔ وہ مرد عورت کے تعلق کے بارے میں جانتا تھا لیکن یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی بڑی عمر کی اور ایسی بھدی عورت اس سے کوئی تعلق بنائے گی۔

''مم...... میں نے باہر جانا ہے۔'' وہ ہکلایا۔

''باہر چلے جانا۔ ابھی تو ادھر چلو۔''

''کہاں...... جی؟''

''اوئے ادھر۔'' اس نے اسے بستر پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت اب پہلے سے سخت تھی۔

چند ہی لمحے بعد عمو نے خود کو ایک بے پناہ بوجھ تلے محسوس کیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس بدبودار عورت کے چہرے پر زوردار دوہتڑ مارے اور یہاں سے بھاگ نکلے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہاں بڑے کرخت قسم کے پہرے دار موجود ہیں اور ان کے کندھوں سے ہر وقت بندوقیں جھولتی رہتی ہیں۔ شہنشاہ کے مزار کے پہرے دار ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔

وہ بڑے مکروہ اور اذیت ناک لمحے تھے۔ وہ خود کو کسی شکاری جانور کے پنجوں میں محسوس کر رہا تھا۔ کراہ رہا تھا اور کسمسا رہا تھا۔ ماجھاں جب مطلب برآری میں ناکام ہوئی تو ایک دم جھلا اُٹھی۔ اس نے عمو کو اس کی گردن سے پکڑ کر زوردار جھٹکے دیئے اور پھر اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ پہلے وہ اسے خالی ہاتھوں سے مارتی رہی پھر اس نے چمڑے کا ایک دیسی جوتا پکڑ لیا۔ یہ بڑے ذلت ناک لمحے تھے۔ وہ بے دردی سے اس کے جسم پر ضربیں لگاتی رہی اور گالیاں بکتی رہی۔ کوئی عمو کو چھڑانے نہیں آیا۔ کسی نے مداخلت نہیں کی۔ عمو کراہتا رہا اور بستر پر لوٹتا رہا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا اور عمو کی پشت پر لات رسید کر کے اسے باہر پھینک دیا۔ ایک سیکنڈ بعد عمو اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز سن رہا تھا۔

ایک گوشے سے ملازمہ شہناز نمودار ہوئی۔ ''چل اُٹھ جا۔'' اس نے ترس آمیز اور کسی حد تک طنز آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔

عمو کراہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس رات اپنے کمرے میں جا کر عمو خوب رویا تھا۔ اس نے آج رات عورت کا ایک نیا روپ دیکھا تھا۔ ان گھڑیوں میں شاید اسے عورت ذات سے ہی نفرت ہو جاتی اگر اس کے تصور میں چاندی بالوں والے ایک مقدس چہرے کی شبیہہ نہ اُبھر آتی۔ یہ اس کی پیاری ماں کا چہرہ تھا۔ وہ روتا رہا اور سوچتا رہا کہ کتنا فرق ہے ان دو عورتوں میں۔ اسے اپنی ماں ٹوٹ کر یاد آئی۔ آج سے سات آٹھ روز بعد اس کی ماں کو اس سے ملنے شہنشاہ پیر کے مزار پر آنا تھا۔ یقیناً وہ دن گن گن کر اس وقت کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ مزار پر نہیں تھا۔ خبر نہیں کہ عمو کو وہاں نہ پا کر اس کی ماں پر کیا گزرنی تھی۔ اس نے اپنی ماں کی ویران آنکھیں اور اس کا زرد چہرہ دیکھا۔ اس کا دل سینے میں ٹوٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا۔ وہ ساری رات سسکتا رہا اور اپنی چوٹوں کو سہلاتا رہا۔ اسے بے پناہ توہین کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت جب ہر طرف چلچلاتی دھوپ پھیلی تھی، ملازمہ شہناز پھر مالکن ماجھاں کا بلاوا لے کر پہنچ گئی۔ عمو اندر تک لرز گیا۔ کل والے سارے کراہت انگیز واقعات اسے پھر یاد آ گئے تھے۔ وہ چارونا چار پھر شہناز کے ساتھ ماجھاں کے پاس پہنچا۔ آج وہ ذرا مختلف موڈ میں تھی۔ آج وہ برآمدے میں تھی اور سوتر کی بنی ہوئی ایک رنگین چارپائی پر پھیل کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے نیچے گاؤ تکیہ تھا۔ پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی اس کے سرہانے کھڑی ایک بڑا پنکھا دونوں ہاتھوں سے جھل رہی تھی۔ اٹھارہ سال کا ایک گورا چٹا لڑکا اس کے لئے حقہ تازہ کر رہا تھا۔ حقہ تازہ کر کے اس نے ماجھاں کے قریب رکھا اور اس کی لمبی نئے

ماجھاں کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ ماجھاں نے پنکھا جھلتی ہوئی لڑکی کو بھی صحن میں بھیج دیا اور عمو کو ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا...... عمو بیٹھ گیا۔

وہ بولی۔ ''کل پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں تمہیں مار بیٹھی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ پر اس میں تمہارا بھی تھوڑا بہت قصور ہے۔ میرے کہنے پر چلو گے تو بہت خوش رہو گے۔ ہر طرح کا آرام ملے گا لیکن اپنی مرضی دکھاؤ گے تو پھر میں بڑی سخت بھی ہوں۔ ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا۔'' اس کا لہجہ آخر میں دھمکی آمیز ہو گیا۔

عمو بس سر جھکا کر رہ گیا۔ اس کے ہونٹوں نے ایک بے ساختہ حرکت ضرور کی مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

''کیا کہنا چاہتا ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''کک...... کچھ نہیں جی۔''

''میں بتاتی ہوں۔ تُو واپس جانا چاہتا ہے اور تیرے دل میں یہاں سے بھاگنے کا فتور بھی ہے۔ یہ بھاگنے والا فتور اپنے دل دماغ سے بالکل نکال دے۔ جب تک میں نہ چاہوں گی، تیرے فرشتے بھی یہاں سے نکل نہیں سکتے...... اگر آزمانا چاہتا ہے تو آزما کر بھی دیکھ لے اور اگر نہ ہی آزمائے تو چنگا ہے۔'' ماجھاں کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کہتی ہے، کر کے بھی دکھاتی ہے۔

عمو اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گیا۔ کہیں پاس ہی طویلے کی طرف رکھوالی کے بڑے بڑے کتے پُرہول آواز میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ عجیب شکل صورت کی عورت تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ وہ گاؤ تکیے پر سیدھی ہو کر بیٹھی تو تکیہ تھوڑا سا ایک طرف کھسک گیا۔ تکیے کے نیچے سیاہ رنگ کے پستول کی جھلک نظر آئی۔

ماجھاں نے حسبِ سابق کالا تہبند پہن رکھا تھا۔ وہل کی سفید قمیص تھی جس کے بازو اس نے مردوں کی طرح اڑس رکھے تھے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ خاصی خوش خوراک بھی ہے۔ عمو کی موجودگی میں ہی اس نے پکی لسی کی ایک بڑی گڑوی ایک ہی ڈیک میں خالی کر دی اور پھر مردوں کے انداز میں زوردار ڈکار لی۔

اسی دوران میں اچانک احاطے کے پھاٹک پر کھڑے پہرے داروں میں ہلچل سی نظر آئی پھر ایک تازی گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی رکاب میں کسی شخص کا پاؤں بُری طرح پھنسا ہوا تھا۔ وہ شخص گھوڑے کے ساتھ ساتھ ہی گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ گھوڑے کے تعاقب میں کئی افراد تھے۔ وہ شاید اسے روکنا چاہ رہے تھے لیکن وہ ان کی پہنچ سے دور تھا اور

اگر پاس بھی ہوتا تو شاید اس کی سرکشی کے سبب وہ اسے روک نہ سکتے۔ ایسا جوان اور قد کاٹھ والا گھوڑا عمو کی نظروں سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔ وہ دیوانی رفتار سے وسیع احاطے کے اندر دوڑ رہا تھا۔ زخمی سوار کسی ہلکی پھلکی چیز کی طرح اس کے ساتھ گھسٹتا اور پلٹتا چلا آ رہا تھا۔ سامنے سے لپکنے والے دو افراد نے گھوڑے کے راستے میں آنے کی کوشش کی۔ وہ بلاخیز تیزی کے ساتھ انہیں چکما دے گیا اور شمالی حصے کی طرف بڑھا۔

اور یہی وقت تھا جب عمو کی نگاہ گھوڑے کے پیچھے گھسٹتے ہوئے شخص پر پڑی۔ عمو لرز گیا۔ اس سے پہلے اس نے اپنے گاؤں میں اڑوس پڑوس میں مرنے والوں کے مُردہ جسم دیکھے تھے مگر ایسی بھیانک لاش کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بدنصیب شخص نہ جانے کتنی دور سے گھوڑے کے پیچھے رپٹتا چلا آ رہا تھا اور کہاں کہاں ٹکرایا تھا۔ اس کا سر تربوز کی طرح پھٹ چکا تھا اور سامنے کی طرف سے سینے کی کھال مکمل طور پر اُتر چکی تھی۔ ایک سائیس نما شخص نے گھوڑے کی لگام تھامنا چاہی مگر اس نے گھوم کر ایسی دولتی چلائی کہ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ایک شخص نے اضطراب کے عالم میں گھوڑے پر رائفل تانی۔ ''اوئے...... اوئے۔ گولی نہیں چلانا۔'' ماجھاں دھاڑی اور گھوڑے کی طرف بڑھی۔

ماجھاں نے گھوڑے کو اس کے نام سے پکارا۔ ''ہیرے...... ہیرے۔'' پھر وہ ایک دم چکما دے کر دائیں طرف سے آگے بڑھی۔ وہ گھوڑے کی لگام تھامنا چاہتی تھی لیکن گھوڑا تو چھلاوا بنا ہوا تھا۔ وہ ہنہناتا ہوا اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑا ہوا اور تقریباً الف ہو کر واپس پلٹا۔ واپس پلٹنے کی وجہ سے اس کا رخ سیدھا عمو کی طرف ہو گیا۔ پانی کے دو بڑے مٹکوں کو توڑتا اور ایک چارپائی الٹتا ہوا وہ عمو کی طرف آیا۔ عمو اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا۔ اس نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش کی مگر دیر ہو چکی تھی۔ سرکش گھوڑا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے بے اختیار اندھا دھند اپنا ہاتھ گھمایا۔ اس دوران میں اس کی آنکھیں بے ساختہ بند ہو چکی تھیں۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آئی۔ اس کے بازو کو شدید جھٹکا لگا۔ وہ بری طرح ڈگمگایا مگر گرنے سے بچ گیا۔ یہی لمحے تھے جب تنومند ماجھاں گھوڑے پر جھپٹی۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد گھوڑا چند لمحوں کے لئے سکتہ زدہ سا ہو گیا۔ شاید یہ صورتِ حال اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی یا وہ پھر سے دیوانہ وار اچھل کود شروع کرنے کے لئے پینترا بدل رہا تھا۔ ماجھاں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے پورے وزن کے ساتھ گھوڑے کی گردن پر جا پڑی۔ گردن کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس نے کچھ اس طرح زور لگایا کہ گھوڑا زمین پر آ رہا۔ اس کے گرنے کی دیر تھی کہ موقع پر موجود افراد چیونٹیوں کی طرح اس سے چمٹ گئے۔

جس کے ہاتھ میں گھوڑے کے جسم کا جو حصہ آیا، اس نے جکڑ لیا۔ دو تین افراد گرے ہوئے گھوڑے کے اوپر ہی چڑھ بیٹھے۔ اس کی چرمی لگام ابھی تک عمو کے ہاتھ میں تھی۔ عمو نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑا رہا۔ سائیس نما شخص نے ایک دوسرے ملازم کے ساتھ مل کر تیزی سے گھوڑے کی ٹانگیں باندھنا شروع کیں۔ دو تین منٹ کے اندر سرکش تازی گھوڑا پوری طرح بے بس ہو چکا تھا۔

گھوڑے کو سنبھالنے اور گرانے میں زیادہ کردار ماجھاں ہی کا تھا۔ بہر طور اس میں کچھ نہ کچھ حصہ عمو کا بھی تھا۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد ہی گھوڑے کی غیر معمولی سرکشی میں کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کوشش میں عمو کی ایک کہنی بری طرح چھل گئی اور اس سے خون رِسنے لگا۔ دو تین مزید افراد کو بھی چوٹیں آئیں۔ بہر حال، سب سے خوفناک منظر اس لاش کا تھا جو سرکش گھوڑے کے ساتھ گھسٹتی ہوئی حویلی کے احاطے میں پہنچی تھی۔ یہ لاش ایک چالیس بیالیس سالہ شخص کی تھی۔ اس کے جسم پر عام سا لباس تھا۔ اس کی پگڑی اور جوتے وغیرہ اُتر چکے تھے۔ سارا جسم زخموں اور خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ سر کی چوٹ سب سے مہلک تھی۔ کھوپڑی تربوز کی طرح پھٹ کر کھل چکی تھی۔ لاش پر فوراً چادر ڈال دی گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں احاطے کے اندر بہت سے افراد جمع ہو گئے۔ مرنے والے کا نام فاضل تھا۔ وہ حویلی کے ''کاموں'' میں سے تھا۔ مشتعل گھوڑا اسے قریباً دو کلو میٹر سے گھسیٹتا ہوا حویلی تک لایا تھا۔ اچانک عمو کو ایک روتی پیٹتی لڑکی نظر آئی۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی لاش کی طرف بڑھی۔ ''ہائے ابا جی...... ہائے ابا جی۔'' وہ پکار رہی تھی۔

عمو نے پہچان لیا۔ یہ وہی پندرہ سولہ سالہ معصوم صورت لڑکی تھی جسے اس نے کل ماجھاں کے سرہانے کھڑا دیکھا تھا، وہ اسے مسلسل پنکھا جھل رہی تھی۔

لڑکی نے لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹائی اور پھر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی گریہ زاری دل دوز تھی۔ ''ہائے ابا جی! آپ کو کیا ہو گیا...... آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ ہائے اللہ، اب میں کیا کروں گی۔ مجھے بھی موت آ جائے...... یا اللہ، مجھے بھی موت آ جائے۔''

لاش کے مسخ چہرے پر دوبارہ کپڑا ڈال دیا گیا۔ ماجھاں کے اشارے پر حویلی کی ملازماؤں نے لڑکی کو بہ مشکل سنبھالا اور اسے لاش سے دور لے گئیں۔ عمو بھی حویلی کے اس حصے میں واپس آ گیا جسے ڈیرا کہا جاتا تھا۔ اس کے زخمی بازو کی بھی مرہم پٹی کر دی گئی۔

○......❖......○

روتی چلاتی لڑکی کا نام شبانہ تھا۔ وہ گھوڑے سے گر کر مرنے والے فاضل کی بیٹی تھی اور باپ کے ساتھ ہی یہاں حویلی میں رہتی تھی۔ اس کی والدہ اور دو چھوٹے بھائی ایک قریبی موضع کے رہنے والے تھے۔ وہ لاش لے کر اپنے علاقے کی طرف چلے گئے تھے۔

عمو کی کہنی پر اچھا خاصا زخم آیا تھا۔ تیسرے روز ماجھاں نے اسے حویلی میں بلایا اور اس کا حال چال پوچھا۔ عمو کو ہلکا سا بخار بھی تھا۔ ماجھاں نے ملازمہ شہناز سے کہا۔ ''جب تک اس منڈے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی، یہ حویلی میں ہی رہے گا۔ اسے ایک کمرا دے دو اور ذرا اچھی طرح کھلاؤ پلاؤ اسے۔ دیکھو کس طرح ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں خبیث کی۔''

''مم...... میں اُدھر ہی ٹھیک ہوں جی...... ہلکا سا بخار ہے، کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔'' عمو منمنایا۔

''تُو زیادہ ڈاکٹر نہ بن۔ جو کہہ رہی ہوں وہ کر۔'' ماجھاں رعب سے بولی اور شہناز کو اشارہ کیا کہ وہ عمو کو لے جائے۔

شہناز نے عمو کو لیا اور احاطے کے اندر ہی ایک ہوادار کمرے میں لے آئی۔ یہاں تین طرف سلاخ دار کھڑکیاں تھیں۔ ویسے بھی یہ کرانیم کے درخت کی گھنی چھاؤں میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں گرمی کا گزر ہی نہیں۔ ایک پلنگ، ایک الماری اور ضرورت کی دیگر چیزیں اس کچے کمرے میں موجود تھیں۔ شہناز نے مسکراتی ہوئی معنی خیز نظروں سے عمو کو دیکھا اور بولی۔ ''تمہاری تو لاٹری نکلی ہوئی ہے۔ کھاؤ پیو اور آرام کرو۔ کام شام کرنے کے لئے ہم غریب غربا جو ہیں۔''

عمو جل کر بولا۔ ''میری جگہ تم آ جاؤ۔ میں تمہارے کام شام کر لیتا ہوں۔''

وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ ''تمہاری جگہ میں کیسے لے سکتی ہوں۔ تمہاری جگہ تم

ہی لے سکتے ہو۔"

اس کے جانے کے بعد عمو پلنگ پر چت لیٹ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ اس کا دل غم واندوہ میں بھر گیا۔ ماں کے چاندی بال اس کی نگاہوں میں چمکنے لگے اور اس کی تھکی تھکی ویران آنکھوں کا تصور عمو کی آنکھوں میں نمی جگانے لگا۔

اس کمرے میں اسے واقعی ہر طرح کا آرام ملا۔ بہترین کھانا، نئے ریشمی کپڑے، اس کے علاوہ آرام دہ بستر، نہ مکھی نہ مچھر۔ دو دن بعد ایک دو بار ماجھاں کی جھلک بھی نظر آئی۔ اس کا رویہ اب بہتر نظر آتا تھا۔ اس کے کہنے پر اس کا ملازم خاص ماکھا عمو کو گاؤں کے حکیم کے پاس بھی لے کر گیا اور اس کے بازو کی مرہم پٹی کرا کے لایا لیکن چوتھے روز وہی ہوا جس کا عمو کو ڈر تھا۔ وہ بالائی دار دودھ کا بڑا گلاس پی کر بستر پر سونے کے لئے لیٹا ہی تھا کہ شہناز آ گئی اور سپاٹ لہجے میں عمو سے بولی کہ اسے مالکن یاد کر رہی ہے۔ یہ ایک اندھیری رات تھی۔ حویلی میں کہیں کہیں چراغوں کی مدھم روشنی تھی۔ عمو دھڑکتے دل کے ساتھ حویلی کے وسیع صحن میں سے گزرا۔ ماکھا اور حویلی کے دیگر مسلح ملازم ایک طرف چارپائیوں پر بیٹھے شراب پی رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک بڑی لالٹین روشن تھی۔ اس روشنی میں رکھوالی کے تین بڑے کتے بھی اپنے کھونٹوں سے بندھے نظر آ رہے تھے۔

عمو کو اندرونی حصے کی طرف جاتے دیکھ کر ماکھے نے نشیلی آواز میں ہانک لگائی۔ "دو پتر اناراں دے۔ تیرا حسن ویکھیا تے، کھوتے نس گئے کمہاراں دے......"

ملازمہ شہناز، عمو کو ماجھاں کے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ عمو کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ماجھاں موڑھے پر پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ آج پھر تمتما رہا تھا اور سانسوں سے بو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ تپائی پر شراب کی آدھی بوتل پڑی تھی۔ وہ عجیب انداز سے عمران عرف عمو کو دیکھتی رہی پھر نرمی سے بولی۔ "چل وہ دروازہ بند کر دے۔"

عمو لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے تک گیا اور اسے بند کر دیا۔ "اوئے نامعقولا! کنڈی بھی لگانا۔" وہ ذرا درشتی سے بولی۔

عمو نے کنڈی بھی چڑھا دی۔ "چل بیٹھ جا ادھر میرے پاس۔" اس نے اپنے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی موٹی کلائی میں ایک چمک دار دھاتی کڑا نمایاں نظر آتا تھا۔

یہ دو نشستوں والا موڑھا تھا۔ عمو پھنس کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا وزنی بازو عمو کے کندھے پر ڈالا اور بھرائی ہوئی پاٹ دار آواز میں بولی۔ "دیکھ، مجھ سے ڈرنے کی لوڑ نہیں۔ بڑے آرام سے بیٹھ...... سمجھ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔"

عمو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس سے پوچھنے لگی کہ وہ کس طرح شہنشاہ پیر کے مزار تک آیا تھا...... اور اس قسم کی دوسری باتیں۔ تاہم ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ اس کے قریب بھی آتی جا رہی تھی۔ اب اس کا بازو ہی عمو کے کندھوں پر نہیں تھا، وہ خود بھی اس پر لدسی گئی تھی۔ عمو کے اندر وہی سات دن پہلے والی کراہت جاگ گئی۔ وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا مگر اس کا دم گھٹنے لگا۔ ماجھاں کا انداز بتدریج جارحانہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے اس کی قمیص اُتار پھینکی اور اس کی بدبودار سانسیں عمو کے چہرے سے ٹکرانے لگیں۔

کچھ دیر بعد اس نے لالٹین کی لو دوبارہ اونچی کر دی۔ وہ خفا نظر آ رہی تھی۔ تاہم اس خفگی کا کھلا اظہار اس نے عمو پر نہیں کیا۔ کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر سگریٹ کے چند طویل کش لے کر بولی۔ "پانی پیئے گا؟"

عمو کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ماجھاں نے شیشے کا گلاس تپائی پر رکھنے کے بعد پانی کے بجائے "کالے پانی" کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے گلاس میں تھوڑی سی شراب انڈیلی پھر اس میں ٹھنڈا پانی ملایا اور بولی۔ "لے تھوڑا سا پی لے۔ ایک دم بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

"نہیں...... نہیں...... اس میں سے بو آتی ہے۔"

"اوئے باندر! یہی بو تو بندے کو شیر بناتی ہے۔ چل پی لے تھوڑا سا۔ چل شاباش۔" اس نے گلاس پکڑ کر عمو کے ہونٹوں سے لگایا۔

عمو نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے۔ اس کے کانوں میں ماں کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے عمو کو بتایا تھا، شراب بہت بری چیز ہے۔ کبھی بھول کر بھی اس کے پاس نہیں جانا۔ یہ انسان کو جانور بنا دیتی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر کر دیتی ہے...... اور اس نے عمو کو منع کیا تھا کہ وہ ایسے بندوں کے پاس بھی نہیں بیٹھے گا جو نشہ کرتے ہیں۔

اس نے اپنے ہونٹ بند رکھے اور منہ پھیر کر کراہت کا اظہار کرتا رہا۔ دوسری طرف ماجھاں کا اصرار بڑھتا گیا۔ وہ اب اس سے باقاعدہ زبردستی کر رہی تھی۔ "دو گھونٹ پی لے۔ مر نہیں جائے گا۔ میرے کہنے پر پی لے......" اس نے انگلیوں کا بے رحم دباؤ ڈال کر عمو کا منہ کھولنا چاہا۔ شراب کا تلخ ذائقہ عمو کی زبان پر آیا۔ اسے ابکائی سی آ گئی۔ اس نے ہاتھ جھٹکا۔ گلاس ماجھاں کے تنومند ہاتھ سے نکل کر کچے فرش پر گرا۔ ماجھاں کا پارا ایک دم ساتویں آسمان پر چلا گیا۔ وہ دو سیکنڈ کے لئے سکتہ زدہ رہی، تب یکایک عمو پر پل پڑی۔ "اوئے، کتے

دے پتر! تیری یہ جرأت؟ تیری یہ جرأت؟" اس نے عمران عمو پر گالیوں کے ساتھ ہی تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بھی بارش کر دی۔ اس کے اندر حیوانی قوت تھی۔ وہ واقعی ایسی عورت تھی جس سے خوف کھایا جانا چاہئے تھا۔ اس نے عمو کو اُٹھا اُٹھا کر دیواروں سے پٹخا پھر وہی چرمی جوتا پکڑ لیا جس نے سات دن پہلے عمو کی چمڑی ادھیڑی تھی۔ ایک بار پھر عمو زبردست چھتروں کی زد میں آ گیا۔ اس کے پنڈے اور ٹانگوں پر انگارے سے دہکنے لگے۔ اس کے زخمی بازو سے درد کی لہریں اُبھریں اور پورے جسم میں پھیل گئیں۔ مارنے کے ساتھ ساتھ وہ عمو کو غلیظ ترین گالیاں دے رہی تھی۔ عمو کے لئے ان میں سب سے اذیت ناک وہ گالیاں تھیں جن میں اس کی ماں کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ ہانپ گئی تو اس نے پہلے دن کی طرح ایک بار پھر اسے لات مار کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔ "ناجو...... ناجو۔" اس نے ملازمہ شہناز کو آوازیں دیں، وہ ڈری ہوئی سی سامنے آئی۔ ماجھاں، عمو کی طرف اشارہ کر کے پھنکاری۔ "لے جاؤ اس کتے کو اور ماکھے سے کہو سراں میں رکھ کر اس کا دماغ ٹھیک کرے۔"

شہناز نے اثبات میں سر ہلایا اور عمو کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ماجھاں نے کمرے کا دروازہ بند کیا لیکن پھر فوراً ہی کھول دیا۔ شہناز سے مخاطب ہو کر بولی۔ "......اور اس اچھو کو بھیج دے میرے پاس۔"

عمو آنسو بہاتا ہوا شہناز کے ساتھ باہر صحن میں آیا۔ ماکھا ابھی تک اپنی ٹولی میں بیٹھا ہوا تھا۔ شہناز نے اس کے پاس جا کر کچھ کھسر پھسر کی۔ ماکھے نے اثبات میں سر ہلایا اور عمو کو گدی سے دبوچ کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ عمو کا جسم جوتوں کی مار سے سلگ رہا تھا۔ اس نے بس ایک شلوار پہن رکھی تھی۔ ماکھے کی ٹولی کے افراد نے عمو کو تمسخر آمیز نظروں سے دیکھا۔

جب عمو حویلی کے احاطے سے باہر نکل رہا تھا، اس نے انیس بیس سال کے گورے چٹے لڑکے اچھو کو دیکھا۔ وہ شہناز کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ غالباً آج رات اسے ...د کی جگہ پُر کرنا تھی۔

خضاب لگے سر والا لمبا تڑنگا ماکھا عمو کو لے کر ڈیرے کے پچھواڑے سراں میں آ گیا۔ یہ دراصل وہی مکان تھا جس میں جوئے کی بہت بڑی بیٹھک بھی تھی اور شام کو یہاں خوب گہما گہمی ہوتی تھی۔ حقے گڑگڑاتے تھے، شراب کی بو پھیلتی تھی اور تاش کے پتے بکھرتے تھے۔ ماکھے نے عمو کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اس کی دیواریں کچی لیکن بہت موٹی تھیں۔ کوٹھڑی میں بس ایک دروازہ اور ایک سلاخ دار کھڑکی تھی۔ کچا فرش گیلا اور بدبودار تھا۔ اس بو سے عمو کو

اندازہ ہوا کہ یہاں شاید کتے بھی باندھے جاتے ہوں گے۔ عمو کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ صبح سویرے دو دیوہیکل بلڈاگ بھی عمو کے ساتھ ہی اس کوٹھڑی میں باندھ دیئے گئے۔ انہیں مضبوط کھونٹوں سے باندھا گیا لیکن پھر بھی ان کی قربت کی دہشت عمو کے اعصاب چٹخانے لگی۔ کوٹھڑی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اسے خود کو ایک گوشے تک محدود کرنا پڑا۔

وہ بالکل بھوکا پیاسا اڑتالیس گھنٹے تک اس کوٹھڑی میں بند رہا۔ سارا دن دونوں کتے اس کے ساتھ بندھے رہتے تھے، رات کو انہیں نکال لیا جاتا تھا۔ ان کے فضلے اور پیشاب کی بو نے شروع میں تو عمو کو بے حد پریشان کیا لیکن پھر بتدریج اس کی حس شامہ کند سی ہو گئی۔ تیسرے دن دوپہر کو جب وہ خود کو بھوک پیاس کی وجہ سے قریب المرگ محسوس کر رہا تھا، سلاخ دار کھڑکی کی طرف تھوڑی سی آہٹ ہوئی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا، وہی پندرہ سولہ برس کی معصوم صورت لڑکی کھڑکی کے سامنے تھی جو چند دن پہلے اپنے باپ کی ناگہانی موت پر دیوانہ وار روئی تھی۔ غالباً وہ اپنے باپ کی تجہیز و تکفین کے بعد حویلی واپس آ چکی تھی۔ اس کے سر پر روٹیوں والی بڑی چنگیر تھی اور ہاتھ میں لسی کا ڈول تھا۔ اس نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ شکر ہے دوپہر میں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے نمکین لسی کا گلاس بھر کر عمو کی طرف بڑھایا جسے وہ غٹا غٹ پی گیا۔ لڑکی نے ایک تہ کی ہوئی روٹی بھی عمو کی طرف بڑھائی، اس کے اندر سالن بھی تھا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ "چھپا کر کھانا۔ نہیں تو بھا ماکھا تمہاری جان کو آ جائے گا اور میری بھی شامت آئے گی۔"

پھر وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ عمو کو اس لڑکی کا نام شبانہ معلوم ہوا تھا...... وہ اچھے خدوخال کی تھی اور اس کے چہرے پر خصوصیت اس کی آنکھیں تھیں جن میں معصومیت اور محبت سچے موتیوں کی طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

رات کو ماکھا عمو کے لئے تھوڑا سا بدمزہ کھانا اور پانی لے کر آیا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ عمو کو آج بھی کچھ نہ دیا گیا تو صبح تک کوٹھڑی میں اس کی لاش سے "ملاقات" بھی ہو سکتی ہے۔

جب عمو روکھی سوکھی روٹی، نیم ٹھنڈے پانی کے ذریعے گلے سے اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا، ماکھے نے اس کی ٹھوڑی کو اپنے پنجے میں دبوچ کر اس کے سر کو زور سے دائیں بائیں ہلایا اور پھنکارا۔ "اڑیل ٹٹو نہ بن بے وقوفا...... جندڑی برباد ہو جائے گی تیری...... مالکن کا دل تیرے اوپر آیا ہوا ہے۔ اسے خوش رکھ، وہ تجھے خوش رکھے گی۔"

عمو خاموش رہا۔

ماکھے نے زور سے اس کے بازو پر ٹہوکا دیا۔ "اوئے بولتا کیوں نہیں...... ابھی تُو نے

مالکن کے غصے کی چھوٹی سی جھلک دیکھی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، فلم کا ٹیلر دیکھا ہے، فلم نہیں دیکھی ہے ابھی۔ اس نے ابھی تو تجھے صرف کتوں کے ساتھ بندھوایا ہے پھر کتا بھی بنا دے گی اور صرف کتا ہی نہیں بنائے گی، تجھے اپنے پاؤں چاٹنے پر بھی مجبور کرے گی۔ کرنا تو تجھے وہی پڑے گا جو مالکن چاہے گی لیکن جو کام پیار محبت سے ہو جائے وہی چنگا ہوتا ہے۔''

''پپ...... پر...... یہ تو گناہ ہے۔ بہت بڑا گناہ ہے۔''

''اوئے...... اوئے مولوی ثناء اللہ...... زیادہ فتوے بازی نہ کر۔ یہاں گناہ ثواب کا مطلب کچھ اور ہے۔ گناہ وہی ہے جو مالکن کو پسند نہ ہو...... اور اپنے گناہ گاروں کے لئے مالکن کے پاس دوزخ بھی اپنا ہی ہے۔ دو چار دن میں تجھے اُٹھا کر پھینک دے گی اس میں۔''

عمو کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اپنی ماں کی دور افتادہ آواز کسی مقدس سرگوشی کی طرح اس کے کانوں گونج رہی تھی۔

ماکھے نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تُو تیار ہے تو میں جا کر مالکن سے بات کروں؟''

عمو کا دل ایک بار پھر کراہت سے بھر گیا۔ ایک بدبودار بوجھ کے تصور سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ ماکھے نے اپنا سوال دُہرایا تو عمو نے نفی میں سر ہلا دیا اور دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

ماکھے نے اسے ایک گالی دی اور بولا۔ ''لگتا ہے تیری تقدیر ہی خراب ہے۔'' پھر وہ اس کے ہاتھ سے سالن والی پلیٹ چھینتا ہوا باہر چلا گیا۔

اگلے چھ سات روز عمو کے لئے بہت اذیت ناک تھے۔ اس کے جسم پر فقط ایک شلوار تھی۔ اس کے ننگے پنڈے پر ساری رات مچھر کاٹتے تھے اور دن کے وقت مکھیاں ستاتی تھیں۔ کوٹھڑی کی صفائی بس ایک دو بار ہی کی گئی تھی۔ بُو سے اس کے حواس مختل رہتے تھے۔ دن کے وقت اسے کتوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا، یہ بڑے خونخوار قسم کے کتے تھے تاہم غیر متوقع طور پر عمو کے ساتھ ان کا رویہ نرم ہی تھا یا انہوں نے مجبوری کے تحت اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

عمو کو بس ایک وقت رُوکھی سوکھی روٹی بچے کھچے سالن یا دہی وغیرہ کے ساتھ دی جاتی تھی۔ وہ اس کی جسمانی ضروریات کے لئے بالکل ناکافی تھی۔ اگر اسے شبانہ کا چوری چھپے کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید وہ بالکل نیم جان ہو جاتا۔ شبانہ دراصل سراں میں ''کاموں'' کو کھانا وغیرہ پہنچانے آتی تھی۔ واپسی پر وہ عمو والی کوٹھڑی کے سامنے سے گزرتی تھی۔ رات کے وقت عموماً اس طرف گھپ اندھیرا ہوتا تھا۔ وہ نظر بچا کر کچھ کھانا کھڑکی میں سے اندر ''پاس''

کر دیتی تھی۔ کبھی روٹی جس پر بھنے ہوئے مرغ کا پیس رکھا ہوتا تھا، کبھی سموسے یا جلیبی وغیرہ، کبھی کوئی پھل۔ وہ اسے عمو بھائی کہہ کر بلاتی تھی اور اس سے بہت ہمدردی رکھتی تھی۔

ایک رات وہ آئی تو عمو نے کہا۔ ''تُو ایسا نہ کیا کر شبانہ! کسی نے دیکھ لیا تو تیرے لئے مصیبت ہو جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں عمو بھائی۔ کوئی ایسی بات ہوئی تو سنبھال لوں گی۔'' وہ جلترنگ بجاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیسے سنبھال لوگی؟'' عمو نے سرگوشی میں پوچھا۔

''بس کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔ تم فکر نہ کیا کرو۔'' وہ تہ شدہ روٹی کھڑکی میں سے عمو کو تھماتے ہوئے بولی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی چوڑیاں چھنکیں اور اس کے ملائم ہاتھوں کا لمس عمو کے سراپا میں بجلی دوڑا گیا۔ یہ روٹی کے بجائے دیسی گھی میں پکا ہوا پراٹھا تھا اور اس پر آلو کی بھجیا رکھی تھی۔

عمو نے کہا۔ ''شبانہ! مجھے تیرے ابا جی کی موت کا بڑا دکھ ہے۔ اتنے دن گزر گئے، اب بھی کبھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو تیرے ابا جی کا لہولہان چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔''

''بس عمو بھائی! ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ وہ ہر طرح کے گھوڑوں، گھوڑیوں کو سدھا لیتے تھے، پر اس منحوس گھوڑے پر کاٹھی ڈالتے ہوئے ان کو بھی ڈر لگتا تھا۔ انہوں نے مالکن سے کہا بھی تھا کہ اس گھوڑے کو گولی مار دیں یا پھر کہیں بکتا ہے تو بیچ دیں لیکن مالکن اڑ گئی۔ اس نے کہا کہ یہ گھوڑا یہیں حویلی میں رہے گا اور تم اس کو سدھاؤ گے بھی۔ میرے ابا جی سمجھ گئے کہ اگر اب انہوں نے انکار کیا تو نوکری تو جائے گی ہی، اوپر سے کوئی سخت مصیبت بھی آ جائے گی۔ گھر میں پہلے ہی بیماری اور بھوک تھی۔ وہ کیا کرتے۔ مالکن کے کہے پر عمل کیا......'' شبانہ کی آواز بھرا گئی اور وہ آنسو پونچھنے لگی۔

عمو نے سوچا، اس نے خواہ مخواہ اس کے ابا کی موت کا ذکر چھیڑ کر اسے دکھی کر دیا ہے۔ اس نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔ ''اب تو اکیلی ہی نوکری کرتی ہے یہاں؟''

''ہاں عمو بھائی، ماں بیمار ہے۔ کسی طرح گھر تو چلانا ہے نا لیکن پانچ چھ مہینے بعد جب چلی جاؤں گی تو پھر شاید ماں کو ہی یہاں آنا پڑے۔''

''کہاں چلی جاؤ گی؟''

''میری شادی ہے نا۔'' وہ جیسے روانی میں کہہ گئی۔ تاہم کہنے کے بعد ایک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

اچانک عمو کو لگا جیسے اس کے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی ہے اور سینے کے اندر کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ شبانہ کی شادی کا سن کر اسے شاک لگا تھا ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کے ساتھ کیا تعلق تھا عمو کا؟ ابھی چند روز پہلے ہی تو وہ ایک دوسرے سے آشنا ہوئے تھے...... اور وہ اسے عمو بھائی کہہ کر بلاتی تھی۔ چند بار کسی کی سانسوں کی مہکار محسوس کر لینے سے اور چوڑیوں کی چھنکار سن لینے سے اور ہاتھوں کا لمس لینے سے...... کسی سے کوئی تعلق تو نہیں بن جاتا...... پھر عمو کو تعلق ٹوٹنے کا جھٹکا کیوں محسوس ہوا تھا؟

وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ ''عمو بھائی! کیا بات ہے۔ تم چپ کیوں ہو گئے؟''

''کچھ نہیں...... بس یونہی سوچ رہا ہوں...... ابھی تو...... میرا مطلب ہے، ابھی تو تمہاری عمر چھوٹی ہے؟'' وہ ہکلایا۔

''ہمارے میں شادیاں چھوٹی عمر میں ہی ہوتی ہیں۔ میری بہن کی شادی صرف چودہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ میں تو پھر بھی اس سے ڈیڑھ دو سال بڑی ہوں۔''

رات گہری ہو چکی تھی۔ سراں میں دیے جل چکے تھے مگر کوٹھڑی کے پچھواڑے جہاں شبانہ کھڑی تھی، مکمل اندھیرا تھا۔ عمو جانتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر کتوں کو بچا کچا گوشت اور روٹی وغیرہ ڈالتی تھی۔ اب بھی اگر کوئی اتفاقاً ادھر آ جاتا تو وہ کوئی معقول بہانہ بنا سکتی تھی۔

عمو نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''شبانہ! کہاں ہو رہی ہے تیری شادی؟''

''میرے چاچے کا پتر ہے اشرف۔ شہر میں ویلڈنگ کا کام کرتا ہے۔'' شبانہ نے کہا۔

شبانہ نے یہ فقرہ عام سے لہجے میں کہا تھا مگر یہ فقرہ کہتے ہوئے اس کے انداز میں ایک ایسی اداسی اُتر آئی جسے عمو نے بہت واضح محسوس کیا۔

وہ کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن اسی دوران میں کسی گھڑسوار کی ٹخ ٹخ سنائی دی اور شبانہ اپنی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

یہ سلسلہ پندرہ بیس دن مزید جاری رہا۔ مالکن ماجھاں اسے کتوں کے ساتھ بند کروا کے جیسے بھول ہی گئی تھی۔ پھر عمو کو شبانہ کی زبانی پتا چلا کہ وہ کسی کام سے گاؤں سے باہر ہے۔ شبانہ موقع دیکھتے ہی اس کی کوٹھڑی کے پچھواڑے کھڑکی پر آ جاتی تھی۔ اس بدبودار کوٹھڑی میں وہ عمو کے لئے تازہ ہوا کا واحد جھونکا تھی۔ وہ اس کا انتظار کرتا تھا۔ اگر کسی دن وہ نہ آپاتی تو وہ اداس ہو جاتا۔ لگتا کہ کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے۔ اسے خلا محسوس ہوتا، قدموں کی مدھم چاپ کا، چوڑیوں کی چھنکار کا اور بدن کی خوشبو کا اور کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ شبانہ بھی اس سے نہ مل کر

بے قرار ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ تو اسے عمو بھائی کہتی تھی اور اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کی باتوں سے عمو کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی...... مگر چونکہ یہ بچپن کا بندھن تھا اور ماں باپ کا دیا ہوا قول نبھانا تھا، اس لئے وہ آمادہ تھی۔

گرم بے چین راتوں کی تنہائی میں عمو اپنا سر گھٹنوں میں دے لیتا اور خوب روتا۔ اسے ماں ٹوٹ کر یاد آتی۔ وہ سوچتا ماں کتنے انتظار کے بعد اس سے ملنے شہنشاہ پیر کے مزار پر آئی ہو گی اور پھر اسے وہاں نہ پا کر اس پر کیا گزری ہو گی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ فربہ اندام...... صادق شاہ نے اور اس کے مریدوں نے اس کی ماں کے سامنے کیا بہانہ بنایا ہو گا...... ہو سکتا ہے انہوں نے اس کی ماں کو یہ بتایا ہو کہ اس کا بیٹا یہاں سے بھاگ گیا ہے...... اور کچھ چرا کر بھی لے گیا ہے...... یا اس طرح کی کوئی اور کہانی سنا دی ہو۔ یہ بات تو عمو کی سمجھ میں اچھی طرح آ چکی تھی کہ اس کی جان جلدی یہاں سے چھوٹنے والی نہیں ہے۔ وہ کچھ خطرناک لوگوں میں آن پھنسا تھا اور ان میں سب سے خطرناک خود ماجھاں تھی۔ وہ بدنام ڈکیت ناجے کی بہن تھی۔ اس کی بدمعاشیاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ کوئی آٹھ دس سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی اور کہا جاتا تھا کہ اس نے اپنی ساس اور اپنے شوہر کو خود اپنے ہاتھوں سے کلہاڑیوں کے وار کر کے ہلاک کیا تھا۔ اب وہ چاروں شرعی عیبوں کے ساتھ اس گاؤں کی مختارِ کل تھی۔ وہ شراب پیتی تھی اور شراب کا کاروبار بھی کرتی تھی۔ اس کی جوئے کی بیٹھک پورے علاقے میں مشہور تھی اور بڑے دھڑلے والے لوگ یہاں آتے تھے۔ ماجھاں نے کھلم کھلا ناجائز تعلقات بھی قائم کر رکھے تھے۔ سب سے پہلے وہ جنوبی پنجاب سے ابرار نامی ایک کشمیری لڑکے کو اغوا کر کے یہاں لائی تھی اور اسے حویلی میں اپنے ساتھ رکھا تھا۔ چند مہینوں بعد اس لڑکے نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ ایک کماد میں چھپ گیا۔ وہاں جنگلی سور بھی چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے مار ڈالا...... ماجھاں کو اس کے مرنے کا افسوس ہوا لیکن پھر اس کے بعد یہ سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔ اب کئی لڑکے اس کی حویلی میں اور ڈیرے پر موجود تھے۔ ان میں نیا اضافہ خود عمو تھا۔

ماجھاں اپنے کام سے فارغ ہو کر گاؤں واپس آ گئی تو ایک بار پھر ماکھے نے عمو سے بات کی۔ وہ ایک بڑے پیالے میں اس کے لئے دودھ جلیبیاں لے کر آیا۔ ساتھ میں آلو والے کرارے نان اور دہی کا رائتہ تھا۔ انہوں نے ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر یہ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ماکھا بولا۔ ''مالکن تجھ سے بہت ناراض ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کسی

وقت وہ تیرا کوئی ہتھ پیر ہی نہ توڑ ڈالے۔ اس کا غصہ بڑا برا ہے۔ مجھے تجھ پر بڑا ترس آتا ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ اگر تو کہے تو مالکن سے تیری مافی کی بات کر کے دیکھوں؟''

''مافی...... سے کیا مطلب...... ہے؟'' عمو نے لڑکھڑاتے ہوئے پوچھا۔

''مافی سے مطلب یہ ہے کہ تجھے مالکن کا غصہ دور کرنا ہوگا۔ اس کے کہنے پر چلنا ہوگا جس طرح اچھو چلتا ہے، مقبول چلتا ہے اور دوسرے چلتے ہیں......''

عمو نے نفی میں سر ہلایا...... اس کے ساتھ ہی وہ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر ماکھے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''نہیں نہیں، اتنی جلدی جواب نہ دے۔ اک آدھ دن اور چنگی طرح سوچ لے۔ میں پرسوں پھر تجھ سے بات کروں گا۔''

عمو اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس کا جواب دو دن بعد بھی یہی ہوگا اور دو سال بعد بھی لیکن آواز اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ دوبارہ کتوں والی کھولی میں کتوں کے ساتھ بند ہوگیا۔ اس کے اندر آہستہ آہستہ بغاوت پروان چڑھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے ایک طیش سا اس کے اندر سے اُبھرنے لگتا تھا۔ مگر وہ جانتا نہیں تھا کہ یہ طیش آمیز بغاوت بہت جلد دم توڑنے والی ہے۔

یہ اگلے روز شام کے بعد کی بات ہے۔ کتے اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے کوٹھڑی سے باہر جا چکے تھے۔ شبانہ پورے تین روز سے دکھائی نہیں دی تھی۔ عمو اس کے لئے بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کئی طرح کی فکروں نے بھی اسے گھیرا ہوا تھا۔ وہ کیوں نہیں آئی؟ حالانکہ وہ جانتی بھی تھی کہ وہ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہا ہے۔ اندھیرا ذرا گہرا ہوگیا تو کھڑکی کے پاس کھٹ پٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی مرغ پلاؤ کی مدھم خوشبو بھی اس کے نتھنوں تک پہنچی۔ یہ شبانہ ہی تھی۔ اس نے محتاط انداز میں چاولوں والا شاپر سلاخوں میں سے عمو تک پہنچایا۔ عمو نے بے چین لہجے میں کہا۔ ''تم کہاں چلی گئی تھیں؟''

''کہیں نہیں، ماں آئی ہوئی تھی۔ آج ہی واپس گئی ہے۔ پیسے لینے آئی تھی۔ وہ بہت پریشان ہے۔ میرا ہونے والا، گھر والا تنگ کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے پندرہ ہزار روپیا چاہئے...... میں نے شہر میں کرائے پر دکان لینی ہے۔ پہلے بھی اسی طرح دس پندرہ ہزار لے کر جا چکا ہے۔ پر کیا کرایا کچھ بھی نہیں...... خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم ٹھیک تو ہونا عمو بھائی؟''

''ٹھیک ہوں...... پر تمہاری وجہ سے بہت پریشان رہا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر ہولے سے بولی۔ ''پریشان نہ ہوا کرو۔ مجھے تو ایک دو

مہینے میں چلے جانا ہے۔ پھر کیا کرو گے؟''

''پھر میں بھی چلا جاؤں گا۔''

''کہاں؟''

''یہ تو پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں سے نکل جاؤں اور پھر واپس جا کر کسی دور کے رشتے دار کے گھر چھپ جاؤں...... اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں سے نکلنے سے پہلے ہی یہ لوگ مجھے گولی مار دیں اور میں اوپر ہی چلا جاؤں۔ پھر میری لاش بھی ابرار کی طرح کماد کے کسی کھیت میں دبا دی جائے۔''

شبانہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی نرم کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کے ہاتھ کے لمس نے عمو کے بدن میں برق سی دوڑا دی۔ پھر پتا نہیں یہ کیسے ہوا؟ اس نے بے ساختہ اس کا ہاتھ چوم لیا۔

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ''شبانہ!'' عمو نے کہا لیکن وہ تیزی سے گھوم کر واپس چلی گئی۔

عمو ایک دم پسینے میں نہا گیا۔ اسے لگا کہ اس نے سنگین غلطی کر دی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ چاول کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن یہ مجبوری تھی۔ وہ انہیں کھڑکی سے باہر نہیں پھینک سکتا تھا۔ اگر کوٹھڑی میں رکھتا تو صبح ماکھا اس سے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ کتے بھی رکھوالی کے لئے جا چکے تھے ورنہ وہ ان کے آگے ہی ڈال دیتا۔ اس نے نم آنکھوں کے ساتھ جیسے تیسے چاول گلے سے نیچے اُتارے اور بے دم سا ہو کر لیٹ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شبانہ کے حوالے سے تمام غلط خیالات اپنے دماغ سے نکال دے گا۔ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا اور اگر وہ کسی وقت کھڑکی پر آئے بھی تو اسے منع کر دے گا۔

اگلے روز دوپہر کے بعد اس نے کھڑکی ویسے ہی بند کر دی۔ پھر شام ہوگئی۔ اس نے کوٹھڑی میں لالٹین روشن کر دی۔ کتے رکھوالی کے لئے چلے گئے۔ آج کوٹھڑی کی صفائی ہوئی تھی۔ بو قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کچی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی، اسے بند کھڑکی کی دوسری جانب مدھم آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے کھڑکی پر دباؤ ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں کھلی۔ تب مدھم دستک دی گئی۔ اس دستک کے ساتھ چوڑیوں کی ہلکی سی چھن چھن بھی شامل تھی۔ عمو کا دل بے طرح دھڑک اُٹھا۔ اس نے کھڑکی کھولی اور ڈرتے ڈرتے شبانہ کی طرف دیکھا۔ اسے لگا کہ وہ کوئی سخت بات کہہ دے گی مگر

جب اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مدھم مسکراہٹ دیکھی تو اس کی جان میں جان آئی۔

''کھڑکی کیوں بند کی؟'' اس نے پوچھا۔

''بب...... بس یونہی...... مچھر آ رہے تھے۔''

''ناراض تو نہیں ہو؟''

''کس بات پر؟'' عمو کے سینے میں جلترنگ سے بج اُٹھے۔

''کل میں جلدی سے چلی گئی تھی۔ تمہارے بلانے پر بھی رکی نہیں۔''

عمو خاموش رہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا دھڑکنیں تھیں۔ شبانہ نے کل والی ''بے ساختہ حرکت'' کا برا نہیں مانا تھا۔

''شبانہ! میں...... ہر وقت...... تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔'' وہ عجیب لرزتے لہجے میں بولا۔

''کیوں؟'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''پتا نہیں۔''

''ایسا نہ کیا کرو عمو...... بھائی۔'' اس نے آخری لفظ ذرا اٹک کر ادا کیا۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے...... تم...... جانتے ہو میری شادی ہونے والی ہے۔''

''مجھے سب پتا ہے شبانہ...... پھر بھی......''

''پھر بھی کیا؟'' اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

''تم سب کچھ مجھ سے ہی پوچھتی جاتی ہو، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی ہو۔ کیا...... تم بھی...... میرا مطلب ہے، تم بھی میرے بارے میں سوچتی ہو؟''

اس نے شرما کر عمو کی طرف دیکھا اور پھر عجب دل رُبا انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ واپس جانے کے لئے مڑی لیکن ٹھٹک گئی۔ دوبارہ پلٹ کر اس نے ہاتھ میں تہ کی ہوئی روٹی عمو کی طرف بڑھائی۔ اس پر شکر اور مکھن لگا ہوا تھا۔ وہ لجائے ہوئے انداز میں عمو کو روٹی تھما کر واپس ہو جانا چاہتی تھی مگر عمو نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چوڑیوں کی کھن کھن، کلائی کا نرم لمس...... عمو کے سینے میں ترنگ سی دوڑ گئی۔

''مجھے زیادہ انتظار نہ کرایا کرو شبانہ...... میں، بس شام کے انتظار میں ہی سارا دن کاٹتا ہوں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولی۔ ''ہاتھ چھوڑو عمو بب بھائی...... کوئی آ جائے گا۔''

عمو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہاتھ کو پھر چوم لے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک گرج

دار آواز سنائی دی۔ ''اچھا...... تو یہاں یہ چکر چل رہے ہیں۔''

شبانہ نے بدک کر اپنا ہاتھ عمو کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ عمو بھی سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ حویلی کا خطرناک صورت ملازم کالیا اور اس کا ایک ساتھی کھڑکی کے سامنے تھے۔ کالیے نے شبانہ کو چوٹی سے پکڑا اور آگے پیچھے زوردار جھٹکے دیئے۔ شبانہ کی اوڑھنی اُتر کر دور جا گری۔ کالیے نے زوردار آوازیں دیں۔ ''ماکھے بھائی...... شوکے...... صوفی۔''

یکا یک اردگرد ہلچل نظر آنے لگی۔ چند سیکنڈ کے اندر کھڑکی سے باہر کافی افراد جمع ہو چکے تھے۔ ماکھا بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر کالیا پھنکارا۔ ''یہاں عشق مشوقی کا چکر چل رہا ہے ماکھا بھائی۔ یہ دو چھٹانک کی کڑکی خیر سے ہیر بنی ہوئی ہے اور یہ اندر رانجھا کھڑا ہے۔ یہ اس کے لئے چُوریاں لے لے کر آ رہی ہے۔ ہم پچھلے تین دن سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک تھپڑ شبانہ کو مارا۔

وہ چھریرے جسم کی تھی، لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ ماکھا بھی آگ بگولا نظر آنے لگا۔ اس نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ عمو کو گریبان سے پکڑ کر اس نے زوردار جھٹکا دیا اور باہر گھاس پر پھینک دیا۔ چند ہی لمحے میں عمو کا جسم تھپڑوں اور ٹھوکروں کی زد میں آ گیا۔ اسے غلیظ گالیوں سے بھی نوازا جا رہا تھا۔ دوسری طرف شبانہ کی مرمت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے چلانے کی آوازیں عمو کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان اذیت ناک لمحوں میں اس نے سوچا، ان کا قصور تو اتنا بڑا نہیں ہے جتنی بڑی انہیں سزا دی جا رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ماجھاں بھی وہاں آن موجود ہوئی۔ اس کو ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے بھی شبانہ کو دو تین تھپڑ مارے پھر عمو کو شلوار کے نیفے سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہ پہلے ہی نشے میں دھت تھی۔ اس کے منہ میں الائچی سپاری پان دبا ہوا تھا۔

''اچھا تو یارانے پالے جا رہے ہیں یہاں؟'' اس نے عمو کے گال کو چٹکی میں دبایا اور بے دردی سے آگے پیچھے جھلایا۔

عمو کے ہونٹوں سے خون رِس رہا تھا نمکین ذائقہ اس کے منہ میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ کراہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ ''کتنی دیر سے یہ عشقیہ فلم چل رہی تھی رانجھا صاحب؟'' وہ اسے گریبان سے دبوچ کر بولی۔

''ایسا کچھ نہیں تھا جی...... وہ تو بس ترس کھا کر کسی وقت مجھے روٹی دینے آ جاتی تھی۔''

''روٹی نہیں مکھن والی چُوری۔ پھر تُو عشق کی بانسری بجاتا ہو گا اور وہ تیرے صدقے واری جاتی ہو گی۔ میری واری موت پڑتی تھی تجھے...... موت پڑتی تھی؟''

"آپ کو...... غلطی لگ رہی ہے جی......"

اس نے عمو کے گریبان کو اندھا دھند جھٹکے دیئے اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا۔ وہ زہرناک انداز میں پھنکاری۔ "مجھے غلطی لگ رہی ہے نا...... پر اب تُو غلطی نہ کرنا۔ جو کچھ کیا ہے، سب کو صاف صاف بتا دینا۔ وہ کتنی واری تیری کوٹھڑی کے اندر آئی تھی؟ اور اس کے علاوہ کیا کیا کرتے رہے ہو تم؟ یہاں سے بھاگ جانے کا پروگرام تو ضرور بہ ضرور بنایا ہو گا تم نے؟ میں پھر کہہ رہی ہوں، جھوٹ بولنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ بہت برا ہو گا۔"

ماجھاں کا انداز عمو کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ وہ اب اس پر پوری طرح حاوی ہونے کا سوچ رہی تھی لیکن وہ بھی دل میں پوری طرح ٹھان چکا تھا کہ ماجھاں کی کسی من مانی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کی ہڈیاں ہی توڑ ڈالے گی نا۔ اس کو جان سے ہی مار دے گی نا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے اندر پیدا ہونے والی بغاوت اب کچھ قد نکال چکی تھی۔

ماجھاں کا کراہت آمیز وجود ایک "دھمکی" کی طرح اس کے سامنے تھا اور وہ اپنا دم گھٹتا محسوس کر رہا تھا۔

ماجھاں سرسراتی آواز میں بولی۔ "دیکھ منڈیا! اگر تُو سچ نہ بتائے گا نا تو پھر میں اس نمک حرام سے پوچھوں گی اور وہ جھوٹ نہیں بول سکے گی۔ میرے پوچھنے کا طریقہ ہی ایسا ہو گا۔ میں اس شتونگڑی کو دو تین گھنٹے کے لئے کالیے کے حوالے کر دوں گی اور کالیا ابھی جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ ڈھائی سال سے اس نے زنانی کی شکل نہیں دیکھی۔"

ایک دم عمو کو بے پناہ کمزوری محسوس ہوئی۔ اسے لگا اس کے اندر کا سارا دم خم مسمار ہو رہا ہے۔ وہ اس پھٹی پرانی اوڑھنی والی، معصوم صورت لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ اسے ہرگز ہرگز گوارا نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے اس لڑکی پر کوئی آفت آئے۔ وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔

شاید زمانہ ساز ماجھاں نے بھی اس کے چہرے کی بدلی ہوئی رنگت دیکھ لی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کے فقرے بڑے کارگر رہے ہیں اور جب وہ ایک بار سمجھ گئی تو پھر عمو کے پاس ہار ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس نے اپنے اندر کی کراہتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا......

○......❖......○

......اب عمو کی حیثیت ماجھاں کے زرخرید غلام کی سی تھی۔ وہ جب چاہتی، اسے اپنی خلوت میں بلا لیتی۔ بعض دفعہ نشے میں دھت ہو کر اس سے توہین آمیز سلوک بھی کرتی۔ اس

کے علاوہ بھی اسے ماجھاں کی خدمات انجام دینا پڑتیں۔ وہ اس کا حقہ تازہ کرتا، اس کو پنکھا جھلتا، اس کے پاؤں دباتا۔ جب وہ قدرے مہربان ہوتی تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا بھی کھلاتی لیکن جب موڈ آف ہوتا تو ذرا ذرا سی بات پر اسے ڈانٹتی اور گالیاں دیتی۔ اب عمو کو اچھا کھانا اور اچھا لباس مل رہا تھا۔ بس ماجھاں کی منحوس قربت کے سوا اسے کوئی تکلیف نہیں تھی اور یہ تکلیف اسے اکثر تنہائی میں خون کے آنسو رُلاتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ شبانہ کے لئے برداشت کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں اس نے سرکشی دکھائی، شبانہ پر عرصۂ حیات تنگ ہونا شروع ہو جائے گا۔ شبانہ سے ملاقات کا موقع اسے کم ہی ملتا تھا۔ وہ بس دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ شبانہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی خاطر عمو کس طرح کے امتحان سے گزر رہا ہے۔

ایک شام کسی زمین کی ملکیت پر ایک زوردار جھگڑا ہوا۔ ماجھاں کا ایک کارندہ صوفی شدید زخمی ہو کر گاؤں آیا۔ اس کے ساتھ ہی ماجھاں اور اس کے درجنوں ساتھیوں نے گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالیں اور اسلحہ لہراتے ہوئے گاؤں سے نکل گئے۔ حویلی میں بس اکا دکا افراد ہی تھے۔ ہیڈ ملازمہ شہناز عرف ناجو بیمار تھی اور چھت پر جا کر لیٹی ہوئی تھی۔ شبانہ اور عمو کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کی یہ ملاقات قریباً تین مہینے بعد ہوئی تھی۔ یہ بھوسے والی کوٹھڑی تھی۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔ شبانہ یہاں بھوسہ لینے آئی تھی۔ عمو نے اسے دیکھ لیا تھا اور ہمت کر کے وہ بھی کوٹھڑی میں چلا گیا تھا۔

"شبانہ۔" عمو نے اسے ہولے سے پکارا۔

شبانہ نے اسے پہچان لیا اور پھر وحشی ہرنی کی طرح اَدھ کھلے دروازے سے باہر دیکھا۔

"گھبراؤ نہیں شبانہ! یہاں کوئی نہیں۔ شہناز اور زینب بھی اوپر چھت پر ہیں۔"

عمو کے اس فقرے نے شبانہ کی گھبراہٹ ذرا کم کی۔ وہ زرد پٹا منہ پر رکھ کر سسکنے لگی۔

عمو نے دل گیر لہجے میں کہا۔ "شبانہ! تم نے تو یہاں سے چلے جانا تھا۔ تم گئی کیوں نہیں ہو؟"

"مالکن جانے دے تب نا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ جان گئی ہے کہ میں جب تک یہاں ہوں، تم بھی اس کا کہا ماننے پر مجبور ہو۔ وہ اب مجھے بالکل نہیں جانے دے گی۔"

"اور تمہاری شادی؟"

"اللہ جانے۔" شبانہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئی۔

''شبانہ! تم یہاں سے چلی جاؤ۔ یہاں تمہاری عزت ہر وقت خطرے میں ہے۔ یہاں شرابی ڈشکرے ہیں۔ کوئی کسی بھی وقت تم پر ہتھ ڈال سکتا ہے۔''

''یہ بڑی بری عورت ہے عمو...... بھائی۔ آسے پاسے کے سارے پنڈوں میں اس کے بندے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر چڑی بھی پر نہیں مار سکتی۔ تمہیں شاید پتا نہ ہو، پچھلے مہینے دینے مسلی کے پتر سلیم نے مالکن سے اجازت لئے بغیر یہاں سے جانے کی کوشش کی تھی۔ مالکن نے اسے پکڑ کر پھر پلس کے حوالے کر دیا ہے۔ پچھلی بار اس پر چوری کا الزام تھا، اس بار ایک کڑی سے زبردستی کا الزام لگا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوتا ہے اس وچارے کے ساتھ۔''

''پر اس طرح کب تک چلے گا شبانہ؟ مجھے ہر وقت تمہارے بارے میں ڈر لگا رہتا ہے۔ میں تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔''

''میرے بارے میں نہ سوچا کرو۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''کیوں؟''

''بس نہ سوچا کرو...... تمہیں پتا ہی ہے۔''

عمو نے گہری سانس لی۔ اَدھ کھلے دروازے میں سے خالی تاریک برآمدہ دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''شبانہ! سچ بتاؤ، کیا تم اس لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''میں وہی کروں گی جو میرے وڈے کہیں گے۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

تاریکی اور تنہائی عمو کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ اس نے شبانہ کا نرم ہاتھ ہولے سے تھام لیا اور بولا۔ ''ایک بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتانا شبانہ...... میں تو ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں، کیا کبھی تم بھی میرے بارے میں سوچتی ہو؟''

''کبھی کبھی۔'' وہ ذرا شرما کر لیکن اداس لہجے میں بولی۔

''کیا سوچتی ہو؟''

''وہی کھڑکی والی ساری باتیں یاد آتی ہیں جب میں تمہیں کھانے کی چیزیں دینے آتی تھی۔'' اس نے کہا اور ہاتھ چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی۔

عمو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ بولا۔ ''کھڑکی والی ساری باتوں میں ایک خاص بات بھی تھی۔ تمہیں یاد ہے؟''

''کک...... کیا؟'' وہ ذرا چونک کر بولی۔

''مم...... میں نے...... تمہارا ہاتھ چوما تھا۔'' عمو کی آواز میں لرزش تھی۔

''اچھا...... مجھے جانے دو۔'' وہ جلدی سے بولی اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

''ایک بار اور ایسا کرنے دو شبانہ۔'' عمو نے التجا کی۔

''عمو بھائی! ایسی باتیں نہ کرو مجھ سے۔'' وہ بدک کر بولی اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا...... پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ عمو اپنی جگہ ہکا بکا اور خجل کھڑا رہ گیا۔ اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ وہیں تاریکی میں پرالی کے گٹھوں پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل غم اور ندامت سے بھر گیا تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ آتشیں آنسو اس کی آنکھوں سے رِسنے لگے۔ پھر ان کا بہاؤ تیز ہوتا گیا۔ اس کے گھٹنے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ حویلی کے رہے سہے مرد ملازم بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر کلہاڑیاں وغیرہ لہراتے ہوئے حویلی سے نکل گئے ہیں۔ شاید پنڈ سے باہر کہیں ہونے والی لڑائی شدت اختیار کر گئی تھی۔ اب حویلی میں بس چند پہرے دار اور رکھوالی کے کتے تھے۔

آدھ پون گھنٹے بعد شبانہ پھر بھوسے والی کوٹھڑی کے دروازے پر نظر آئی۔ وہ کچھ دیر دہلیز پر کھڑی عمو کو دیکھتی رہی، پھر اندر آ گئی۔ اس کی چوڑیاں عمو کے کان کے بالکل قریب چھن چھنائیں۔ اس کی نرم گرفت عمو نے اپنے پسینے سے بھیگے ہوئے بازو پر محسوس کی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''اب اُٹھ جاؤ یہاں سے۔ وہ لوگ واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ تم ابھی ڈیرے سے دودھ بھی لے کر نہیں آئے...... چلو اُٹھو......''

عمو اسی طرح بیٹھا رہا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

اس نے ذرا زور لگا کر اسے اُٹھانا چاہا اور بولی۔ ''دیکھو ایسا مت کرو عمو...... بھائی! نہیں تو میں بھی رونا شروع کر دوں گی......''

''تم جاؤ، میں آ جاتا ہوں۔'' عمو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''غصے ہو گئے ہو نا؟''

''ہاں...... لیکن اب کبھی نہیں ہوں گا۔ تم سے پکا وعدہ کرتا ہوں۔'' عمو کی آواز آتشیں آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

''اس کا مطلب ہے، بہت زیادہ غصے میں ہو۔''

عمو چپ رہا۔ وہ بھی چپ رہی۔ ایک سنسناتی خاموشی کوٹھڑی کی تاریکی میں لہریں لے رہی تھی۔ ''...... اچھا...... یہ لو......'' اچانک اس نے اپنے نرم ہاتھ کی پشت عمو کے ہونٹوں سے لگا دی۔

یکایک عمو کی رگوں میں جوش آمیز محبت کے بہاؤ نے دھوم مچا دی۔ شبانہ کا الٹا ہاتھ عمو کے ہونٹوں پر دھرا تھا۔ اس نے چاہت بھری وارفتگی سے اس ہاتھ کو چوما...... پھر بازو کو......

پھر اس نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس نے معمولی گریز دکھانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا...... اس کے گلے سے لگ گئی۔ عمو کے رخساروں پر تازہ آنسو بہنے لگے۔ "مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا شبو! میں تجھ سے پیار کرنے لگا ہوں۔ بہت زیادہ...... بہت زیادہ۔" وہ چومتا چلا گیا، اس کے بالوں کو، پیشانی کو، رخساروں کو۔

کوئی موم کی زنجیر تھی جو پگھل گئی...... کوئی ریت کی دیوار تھی جو بہہ گئی۔ وہ گم گشتہ آواز میں بولی۔ "عمو...... تم یہاں سے چلے جاؤ...... کسی طرح نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ بہت برے لوگ ہیں۔"

"میں اکیلا نہیں، تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی۔ ہم دونوں نکلیں گے۔"

"لیکن کیسے عمو؟ تم تو...... تم تو لڑکے ہو۔ بھاگ دوڑ کر جان بچا سکتے ہو...... میں تمہارے ساتھ ہوں گی تو تم جلدی پکڑے جاؤ گے۔"

"نہیں شبو! جائیں گے تو دونوں، نہیں دونوں یہیں رہیں گے۔" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ "میں تو ایک اور بات کہتا ہوں شبو۔ یہ بڑا چنگا ویلا ہے۔ وہ سوردی بچی حویلی سے باہر گئی ہوئی ہے۔ بہت سے بندے بھی باہر ہیں۔ کیوں نہ ابھی یہاں سے نکل چلیں؟"

وہ لرز سی گئی۔ اس سے علیحدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی مگر کوٹھڑی کی گہری تاریکی میں وہ ایک دوجے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ بس محسوس کر سکتے تھے۔ ان کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ ان کی دھڑکنیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھے لیکن ان کا جذبہ ان کی طاقت بن گیا تھا۔ ان کے خون کی حرارت ان کی راہنمائی کر رہی تھی...... یہ عجیب انقلاب تھا۔ اب سے صرف دس پندرہ منٹ پہلے وہ کچھ اور تھے، اب کچھ اور بن گئے تھے۔ پندرہ منٹ پہلے وہ اپنی بے بسی پر اشک بہا رہے تھے، اپنی لاچاریوں کو ناقابلِ شکست سمجھ رہے تھے۔ اب وہ یہاں سے بھاگ نکلنے کے لئے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رہے تھے۔ ایک ہی جست میں انہوں نے اظہار سے اقرار تک اور اقرار سے منزل کی جستجو تک بہت سے مرحلے طے کر لئے تھے۔

اور پھر وہ نوخیز جوڑا محبت کا ہاتھ تھام کر مالکن ماجھاں کی حویلی سے بھاگنے کو تیار ہو گیا۔ شبانہ نے ٹوپی والا دیسی برقع پہن لیا۔ عمو نے سر پر ایک صافہ سا ڈال لیا۔ دونوں حویلی کے پچھلے احاطے میں پہنچے۔ یہاں رکھوالی کا ایک بڑا کتا چکرا رہا تھا۔ عمو اور شبانہ کو دیکھ کر اس نے اپنے کان کھڑے کئے اور دم کو تیزی سے گردش دینے لگا۔ عمو نے اسے پچکارا اور اس کے

سامنے کچھ گوشت کا ایک چھوٹا ٹکڑا پھینکا۔ غیر متوقع طور پر خطرناک کتے نے ان دونوں کے ساتھ اپنا رویہ جارحانہ نہیں رکھا۔ وہ چھوٹے عقبی دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں پہرے دار سالار خاں موجود تھا۔ وہ اس کے اِدھر اُدھر ہٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد سالار خاں نے اپنا ازار بند کھولا اور ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ سنہری موقع تھا، وہ دونوں نکلے اور تیزی سے تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔ اب وہ گاؤں کی گلیوں میں تھے۔ اِکا دُکا لوگوں سے ان کا سامنا ہوا مگر کوئی بھی ان کی طرف سے شک میں نہیں پڑا۔ جلد ہی وہ گاؤں سے باہر تھے۔ جوار کے اونچے کھیتوں میں چلتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

"ہائے میں مرگئی۔" شبانہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ٹھٹک کر عمو کے بازو سے لگ گئی۔

ان کے عین سامنے سے گھوڑے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ یہ ماجھاں اور اس کے ساتھی تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کامیاب لوٹے ہیں۔ وہ اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ عمو اور شبانہ سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح ایک طرف جھاڑیوں میں دبک گئے۔ تنومند ماجھاں نے مردوں کی طرح ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور اس کے کندھے پر رائفل تھی۔ یہ لوگ ان کے قریب سے گزرے اور گاؤں کی طرف چلے گئے۔

عمو نے سرگوشی میں کہا۔ "شبو! اب یہ لوگ ہمارے پیچھے آنے میں زیادہ دیر نہیں کریں گے۔ ہمیں جلدی کرنی پڑے گی۔"

شبو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اونچے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں اور دھول سے اَٹے ہوئے کچے راستوں پر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور دھڑکنیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر ان کے اندیشے درست ثابت ہو گئے۔ انہیں دور اپنے عقب میں لالٹینوں کی متحرک روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں گاؤں کی جانب سے بتدریج ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

شبانہ نے اب اپنا دیسی برقع اُتار پھینکا تھا۔ تیز ہوا میں اس کے بال اُڑ رہے تھے۔ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ "عمو! اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ میری ٹانگوں میں جان نہیں رہی۔" وہ بے دم سی ہو کر ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔

"نہیں شبو! ہمیں ہمت کرنی پڑے گی۔ دریا زیادہ دور نہیں ہے۔ کسی طرح ہم پار کر گئے تو پھر پکڑے نہیں جائیں گے۔"

شبو ہمت کر کے دوبارہ اُٹھی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ پاؤں اور پنڈلیوں میں کانٹے

چھپے ہوئے تھے۔عمو کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔اگلے بیس تیس منٹ میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ دریا تک نہیں پہنچ سکیں گے۔گھڑسوار تیزی سے ان کے قریب پہنچ رہے تھے۔وہ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔اب عمو اور شبانہ کو پناہ کی تلاش ہوئی۔جلدی ہی انہیں ایک چھوٹا سا ڈھارا نظر آیا۔اس کی چھت نہیں تھی اور دیواریں بھی ٹوٹی پھوٹی تھیں۔اس میں بہت ساری پرانی پرالی پڑی تھی۔وہ اس پرالی کے اندر گھس گئے اور اپنے اوپر بھی بہت سی پرالی ڈال لی۔عام حالات میں وہ اس سڑاند ماری پھپھوندی زدہ پرالی میں گھسنے کی ہمت کبھی نہ کرتے۔یہاں کیڑے مکوڑے حتیٰ کہ سانپ بھی ہو سکتے تھے۔مگر اب بیرونی خطرے نے انہیں پرالی کے اندرونی خطروں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

یہ جگہ ان کے لئے ایک اچھی پناہ گاہ ثابت ہوئی......ان کے پیچھے آنے والے بس پانچ دس منٹ میں ہی ان کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ان کے گھوڑوں کی آوازیں، ان کی باتیں سب کچھ عمو اور شبانہ کے کانوں تک پہنچیں انہوں نے ماجھاں کی للکارتی ہوئی آوز بھی صاف پہچانی۔یہ لوگ ان کے قریب سے ہو کر تیزی سے دریا کی طرف بڑھ گئے...... چوڑے پاٹ والا دریائے چناب وہاں سے بس دو تین فرلانگ کی دوری پر ہی تھا۔یقیناً ماجھاں اور اس کے ساتھیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دونوں دریا کی طرف گئے ہیں۔راستے میں ملنے والے...... راہ گیروں اور کسانوں نے انہیں اس بارے میں اشارہ دیا ہوگا۔

قریباً ایک گھنٹا اسی طرح دل کی دھڑکنیں گنتے ہوئے گزر گیا۔تب عمو اور شبانہ کو اندازہ ہوا کہ وہ لوگ دریا سے واپس آ رہے ہیں۔اب ان کا رخ گاؤں کی طرف تھا لیکن اگر عمو اور شبانہ یہ سمجھ لیتے کہ یہ لوگ واپس گاؤں پہنچ جائیں گے اور پھر ٹھنڈی ہوا میں لمبی تان کر سو جائیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہوتی۔عمو جانتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔رات بھر دریا کے آس پاس اور قریبی بستیوں میں ان کی تلاش جاری رہے گی۔

رات آہستہ آہستہ آگے کو سرکتی رہی۔وہ پسینے میں شرابور پھپھوندی زدہ پرالی میں لیٹے رہے۔آثار گواہی دے رہے تھے کہ وہ لوگ ان کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔کبھی کسی گھوڑے کی ٹاپ سنائی دے جاتی، کبھی کوئی بلند آواز تیز ہوا کے دوش پر تیر کر ان تک پہنچتی۔

وہ اسی طرح ایک دوسرے کے پہلو میں دراز رہے۔تاہم تازہ ہوا میں سانس لینے کے لئے انہوں نے پرالی میں تھوڑا سا خلا پیدا کر لیا۔خطرے کا احساس قدرے کم ہونے لگا تو انہوں نے ایک دوسرے کے جسم کا لمس محسوس کیا۔شبانہ ہولے سے ایک طرف کھسک گئی لیکن وہ کتنا بھی کھسکتی، وہ لیٹے تو پہلو بہ پہلو تھے۔عمو کے بازو نے شبانہ کے سر کے نیچے تکیہ بنا رکھا

تھا۔عمو کو اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔اس کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔عمو نے اس کے آنسو پونچھے اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔''پریشان نہ ہو شبو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔یہاں دریا میں بہت سی کشتیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ہم دریا کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں گے اور پرکہیں آگے جا کر کسی کشتی والے کو پندرہ بیس روپے دیں گے اور دریا پار کر جائیں گے۔وہاں پکی سڑک ہے اور بسیں چلتی ہیں۔ہم ایک بار بس پر بیٹھ گئے تو پھر ان کے ہتھ نہیں آئیں گے۔''

وہ آزردہ آواز میں منمنائی۔''یہاں سے نکلنا مشکل ہے عمو لیکن اگر نکل بھی گئے تو جائیں گے کہاں؟''

عمو نے ایک گہری سانس لی اور اس کی آنکھوں میں اپنی چاندی بالوں والی ماں کا مقدس چہرہ گھوم گیا۔وہ بولا۔''شبو! میں اور تم ایک بار امی تک پہنچ گئے تو پھر کوئی ڈر نہیں رہے گا۔میری امی کے پاس ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔وہ یہ حل بھی نکال لے گی۔ہو سکتا ہے کہ وہ ہم دونوں کو لے کر کسی دور کے رشتے دار کے پاس چلی جائے یا پھر ملتان لے جائے۔وہاں امی کی ایک بڑی پکی سہیلی رہتی ہے۔بچپن سے اس کی بہن بنی ہوئی ہے۔''

''لگتا ہے اپنی امی پر بڑا بھروسا ہے تمہیں؟'' شبانہ نے کہا۔

''ہاں شبو! بڑا بھروسا ہے۔'' وہ اس کے سوا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اس کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں تھے کہ وہ اپنی ماں کے حوالے سے اپنی کیفیت کا اظہار کر سکتا۔وہ اس کے نزدیک دنیا کی سب سے زیادہ محبت کرنے والی، سب سے بڑھ کر مہربان اور چارہ گر عورت تھی......اور اگر وہ ایسا سوچتا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا۔عمو کو اپنی سولہ سترہ سالہ زندگی کا ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ اپنی ماں کی محبت میں بھیگا ہوا نظر آتا تھا۔اپنی ماں سے بچھڑنے کے بعد وہ ہر پل اس کی یاد میں تڑپتا رہا تھا۔اب بھی وہ اس تک پہنچنے کے لئے بے تاب تھا۔جلد سے جلد اس کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا۔

وہ اسی طرح پرالی کے اندر دم سادھے لیٹے رہے...... سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح......نصف شب کے قریب انہیں بوگیر کتوں کی آوازیں بھی آنے لگیں لیکن شکر کا مقام تھا کہ یہ آوازیں شمال کی طرف سے آ رہی تھیں اور ہوا جنوب سے شمال کی طرف چل رہی تھی۔عمو کو پتا تھا کہ اگر ہوا الٹی سمت میں چلی رہی ہو تو بوگیر کتے اپنے شکار کی بو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔آدھ پونے گھنٹے بعد کتوں کی آوازیں معدوم ہو گئیں وہ کسی اور طرف چلے گئے۔

عمو اور شبانہ کے جسموں پر چھوٹے موٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔ کسی وقت انہیں اپنے آس پاس چوہے یا چھپکلی وغیرہ کا احساس بھی ہوتا تھا مگر وہ یہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

عمو نے شبانہ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ صبح روشنی ہونے سے پہلے پہلے ہم یہاں سے نکل کر دریا کی طرف چل پڑیں۔ اب ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لئے کہ ایک تو دن کے وقت یہاں اتنی گرمی ہو جائے گی کہ ہمارے کباب بن جائیں گے...... دوسرے دن کے وقت یہ لوگ کچی زمین سے ہمارا کھرا اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ہمارے پیروں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے اس پرالی تک پہنچ سکتے ہیں۔''

عمو کی بات شبانہ کی سمجھ میں آ گئی لیکن وہ ڈری ہوئی بھی تھی۔

جب چڑیوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں تو وہ دونوں اس پرانی پرالی سے نکلے اور جھاڑیوں کے اندر چلتے ہوئے دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انہیں بتا رہے تھے کہ دریا دور نہیں ہے۔ پھر انہیں پانی کی جھلک دکھائی دینے لگے۔ وہ دریا کے کنارے چلتے چلے گئے اور ڈیڑھ دو میل آگے نکل گئے۔ یہاں انہیں ایک پرانی کشتی نظر آئی۔ اس میں چپو بھی پڑے تھے...... اردگرد کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عمو نے بڑی احتیاط سے کشتی کا رستا کھولا۔ پھر وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور عمو اسے دوسرے کنارے کی طرف کھینچنے لگا۔ اچانک کنارے کے سرکنڈوں میں ایک ٹارچ کی روشنی چمکی۔ کسی نے پکار کہا۔ ''اوئے کون ہے؟''

عمو کی رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے تیزی سے چپو چلانے شروع کر دیئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کنارے پر کئی افراد کے ہیولے نظر آنے لگے۔ تب تک عمو اور شبانہ دریا کے وسط تک پہنچ چکے تھے اور تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے......

''رک جاؤ...... نہیں تو گولی مار دیں گے۔'' ایک پکارتی ہوئی آواز آئی۔

اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ ماجھاں ہی کے لوگ تھے۔ وہ کنارے پر موجود تھے اور انہوں نے گھات لگا رکھی تھی۔ یہ کشتی بھی انہوں نے غالباً پھندے کے طور پر ہی یہاں باندھی ہوئی تھی۔

''ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟'' شبانہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

عمو کیا کہتا۔ وہ تو خود سرتاپا پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اور تیزی سے چپو چلانا شروع کر دیتا۔ کنارہ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ کوشش کرتے تو اس تک پہنچ سکتے تھے۔ پھر فائرنگ کی آواز گونجی۔ چند لمحے کے لئے تو عمو اور شبانہ کو لگا کہ آخری وقت آ گیا ہے تاہم یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ انہوں نے فضا میں بلند ہوتی چنگاریاں صاف دیکھیں اور تب ان پر ایک اور انکشاف ہوا...... دریا کے دوسرے کنارے پر بھی ماجھاں کے کارندے موجود تھے۔ یہ ہوائی فائرنگ انہیں ہوشیار کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد دوسرے کنارے پر بھی ایک دو ٹارچیں چمکنے لگیں اور ہیولے دکھائی دینے لگے......

شبانہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا عمو! یہ لوگ ہمیں نکلنے نہیں دیں گے۔ اب...... پتا نہیں کیا ہوگا ہمارے ساتھ۔''

عمو کے ہاتھ پاؤں سے بھی جیسے جان نکل چکی تھی۔ اس نے بے دم سا ہو کر چپو کشتی میں گرا دیئے اور خالی نظروں سے شبانہ کو دیکھنے لگا۔ ان کے سر پر نیم تاریک آسمان تھا اور صبح کے چند آخری تارے چمک رہے تھے۔ ان دونوں کے ذہنوں میں ایک جیسا خیال ہی کوندر رہا تھا۔ کیا وہ خود کو چناب کے اس رواں پانی میں ڈبو کر اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر لیں...... یہ چناب شاید ہمیشہ سے ایسا ہی مزاج رکھتا تھا۔ یہ ''محبت'' کو ہوا دیتا تھا، اس کی پرورش کرتا تھا لیکن پھر محبت کرنے والوں کو نگل بھی لیتا تھا۔ کچے گھڑے ٹوٹ جاتے تھے اور لہریں سوہنیوں کو اپنے اندر چھپا لیتی تھیں۔

لیکن یہ کہانی نہیں تھی۔ یہ ایک زندہ حقیقت تھی۔ وہ مٹیالے رنگ کی ٹوٹی پھوٹی کشتی میں سکڑے سمٹے بیٹھے تھے...... اپنی جان دینے کا سوچ رہے تھے...... اور حقیقت کی دنیا میں جان دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ سوچتے رہے اور کشتی دھیرے دھیرے بہتی رہی۔ بہنے کے ساتھ وہ بتدریج کنارے کی طرف بھی کھسک رہی تھی۔ کنارہ...... جہاں کوئی ایک درجن مسلح افراد ان دونوں کے استقبال کے لئے تیار تھے۔ کنارے تک رسائی پانا، خوشی کا استعارہ ہے مگر آج اس استعارے نے اپنا مفہوم بدل لیا تھا۔

O......❖......O

اور اب وہ دونوں پھر سے حویلی میں تھے۔ بہت بڑے چہرے اور سرخ آنکھوں والی ماجھاں سرتاپا قہر نظر آ رہی تھی۔ اس نے پہلے تو شبانہ کو بری طرح مارا اور اس کے ناک منہ سے

خون چھڑا دیا پھر وہ عمو پر پل پڑی۔ اس کے جسم میں مردوں سے بڑھ کر طاقت تھی۔ اس نے عمو پر تھپڑوں اور ٹھڈوں کی بارش کر دی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور گاہے بگاہے وہ اسے پستول کا دستہ بھی مار رہی تھی۔ وہ اسے بالوں سے گھسیٹ کر صحن کے درمیان لے آئی اور غلیظ گالی دے کر بولی...... ''چل مرغا بن...... مرغا بن یہاں۔''

عمو کے اندر بغاوت جنم لے رہی تھی۔ گاہے بگاہے اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس خبیث عورت پر جھپٹ پڑے۔ اسے دھکا دے کر دور گرائے اور نتائج سے بے پروا ہو کر یہاں سے بھاگ نکلے...... لیکن ہر بار اس کے سامنے شبانہ کا چہرہ آ جاتا تھا، وہ اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا...... وہ ابھی ہر ستم برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

''سنا نہیں بچے! مالکن کیا کہہ رہی ہے۔'' ماکھے نے کہا پھر اس کا سر پکڑ کر زبردستی اس کے گھٹنوں میں گھسا دیا اور بازو ٹانگوں کے نیچے سے گزارے۔ وہ سخت دھوپ میں مرغا بنا کھڑا رہا۔ اسے مزید اذیت پہنچانے کے لئے اس کی کمر پر چند کچی اینٹیں رکھ دی گئیں۔ اس کی ناک سے پسینے اور خون کے قطرے ایک ساتھ گر رہے تھے اور یہ سب کچھ شبانہ کے سامنے ہو رہا تھا۔

ماجھاں نے گاؤں کے حجام کو بلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد روتی سسکتی زخمی شبانہ کا سر استرے سے مونڈ دیا گیا اور پھر اس کی بھویں بھی صاف کر دی گئیں۔

بے بسی کے آنسو تواتر کے ساتھ عمو کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ کتنی تیزی سے تبدیل ہوا تھا سب کچھ۔ تین چار گھنٹے پہلے تک وہ اپنی ماں سے ملنے کے لئے اور اس کی گود میں سر رکھنے کے لئے پُر امید تھا اور اب گاؤں والوں کے سامنے ایک تماشا بنا ہوا تھا۔ جب کمر پر رکھا ہوا بوجھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جسم سے پسینا باقاعدہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ خون کے دباؤ سے چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ماجھاں ایک بار پھر اس پر پل پڑی اور ایک سوٹے سے اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی۔ جب وہ نیم جان ہو گیا تو اسے اُٹھا کر کتوں والی کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔

وہ سارا دن اور رات گئے تک درد سے سسکتا اور کراہتا رہا۔ کہتے ہیں کہ نیند سُولی پر بھی آ جاتی ہے پھر اسے بھی نیند آ گئی۔ اگلے روز شدید گرمی کی وجہ سے آنکھ کھلی تو ذہن میں پہلا خیال شبانہ کا ہی آیا۔ پتا نہیں کہ اس کے ساتھ کیا بیتی تھی؟ وہ کس حال میں تھی؟ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی وجہ وہ خود ہی تھا۔ وہی اسے لے کر یہاں سے نکلا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت اسے پھر ماجھاں کی منحوس شکل نظر آئی۔ اسے شدید اذیت

اور ذلت سے دوچار کرنے کے باوجود ابھی اس کا غصہ پوری طرح اُترا نہیں تھا۔ وہ نشے میں دھت تھی اور اس کی آنکھوں میں خباثت کا دریا بہہ رہا تھا۔ جب وہ کچھ بدتر کرنے کے موڈ میں ہوتی تھی تو اس کی ناک کچھ اور بھی چپٹی اور سیاہ دکھائی دینے لگتی تھی۔ اب بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔

وہ پھنکاری۔ ''تجھے کہا تھا نا کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت بری طرح پیش آؤں گی...... اور ایک وار نہیں دس وار کہا تھا۔ بول کہا تھا نا؟'' اس نے جوتے کی نوک سے عمو کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اُٹھانے کی کوشش کی۔

عمو کچھ نہیں بولا۔

''حرامزادے! اب منہ میں گھنگنیاں کیوں ڈال لی ہیں؟ اس کمینی کے لئے سب کچھ کیا ہے نا تُو نے۔ اسی کتی کے عشق کا بخار چڑھا ہوا تھا نا تجھے؟''

عمو نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔

ماجھاں نے اپنی ویل کی سفید قمیص سامنے سے اوپر اُٹھائی اور اپنے سیاہ تہ بند کی ڈب میں سے پستول نکال لیا۔ شراب ایک زہر کی طرح اس کے آتشیں دماغ کو چڑھی ہوئی تھی۔

''اوئے! کسی گونگے کے تخم...... بولتا کیوں نہیں؟ بولتا ہے یا پھر ٹپکاؤں تیرے اندر گولیاں؟''

عمو کو لگا کہ وہ چاہے بھی تو نہیں بول سکے گا۔ وہ بس سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ''اچھا نہیں بولے گا تُو...... نہیں بولے گا تُو؟'' وہ بہکی ہوئی خطرناک آواز میں بولی۔ اس نے پستول کا حفاظتی کھٹکا ہٹایا۔ اسے عمو کی طرف سیدھا کیا اور جنونی لہجے میں دہاڑی۔ ''نہیں بولے گا تُو...... نہیں بولے گا؟''

اس کے ساتھ ہی اس نے عمو پر فائرنگ کر دی۔ عمو چلا اُٹھا۔ ماجھاں نے پستول کی چھ کی چھ گولیاں عمو پر چلا دیں۔ آخری وقت میں عمو نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور زمین پر گر گیا تھا۔ اسے لگا کہ شاید وہ مرنے والا ہے لیکن پھر یکایک اسے احساس ہوا کہ گولیاں اس کے جسم پر نہیں لگیں۔ اس کے بالکل آس پاس کچی زمین میں لگی ہیں۔

وہ جیسے موت کو چھو کر واپس آ گیا تھا۔ ماجھاں اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ بڑی بے رحم تھی۔ کئی گولیاں عمو کے جسم کو جیسے چھو کر گزری تھیں۔ ایک طرح سے اس نے اپنے بہترین نشانے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

وہ عمو کی ٹانگ پر پاؤں رکھتے ہوئے بولی۔ ''ایک دن تُو نے ناجو کو بتایا تھا نا کہ مالکن کے پنڈے سے تمباکو کی بو آتی ہے۔ بتایا تھا نا؟''

عمو چپ رہا۔ اسے یاد آیا کہ شاید کچھ دن پہلے اس نے بے دھیانی میں کوئی ایسی بات کہی تھی۔ وہ پھنکاری۔ ''تیری یہ ناک بڑی تیز ہے۔ اس کی تیزی مارنے کے لئے کچھ کرنا پڑے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کالیے کو آوازیں دیں۔

کالیا بھاگتا ہوا آیا۔ وہ ایک صافہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ ''اس میں تھوڑا سا گوبر لا اور ساتھ میں ایک رسّی بھی۔''

کالیا جیسے پہلے سے جانتا تھا کہ مالکن کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ ''جی اچھا'' کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ مطلوبہ چیزوں کے ساتھ حاضر تھا۔ وہ ساتھ میں لمبے تڑنگے ماکھے کو بھی لایا تھا۔ دونوں نے مل کر عمو کو زبردستی الٹا کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ پھر اس کے پاؤں بھی رسّی کی بے رحم گرفت میں جکڑ دیئے گئے۔ تب نیلے رنگ کا صافہ جس میں گوبر تھا، عمو کے منہ پر باندھ کر سر کے پیچھے مضبوط گرہ لگا دی گئی۔

وہ عمو کے لئے زندگی کی اذیت ناک ترین گھڑیاں تھیں۔ ماں اس کے سر میں چنبیلی کا خوشبودار تیل لگاتی تھی اور جب وہ اسکول جاتا تھا تو اس کے بستے میں گلاب کے پھول رکھ دیا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی، گلاب کی خوشبو بندے کو شاہ دماغ بناتی ہے۔ آج اس کے منہ پر تعفن زدہ گوبر بندھا ہوا تھا اور اس کا دم سینے میں گھٹ رہا تھا۔ وہ لوگ اسے بند کر کے چلے گئے اور وہ مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ وہ صافے کو اپنے منہ سے ہٹانا چاہ رہا تھا لیکن ایسا کر نہیں پا رہا تھا۔ اسے مسلسل ابکائیاں آ رہی تھیں۔ پیٹ پرسوں شام سے خالی تھا، ورنہ اس کی مصیبت اور بڑھ جاتی۔ بالآخر وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ شاید گوبر کی بو نے بھی دھیرے دھیرے اثر کھونا شروع کر دیا تھا۔

○……❖……○

اس دن کے بعد حویلی میں عمران عرف عمو کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس سے ساری سہولتیں چھین لی گئیں۔ عام ''کاموں'' کی طرح اسے گھٹیا لباس پہنایا گیا اور مویشی خانے میں کام پر لگا دیا گیا۔ مویشی خانے کا نگراں وہی کالیا نامی کرخت شخص تھا۔ وہ کام لینے کے معاملے میں بہت سخت بلکہ سفاک تھا۔ عمو کے پاؤں میں باقاعدہ ایک زنگ آلود بیڑی ڈالی گئی تھی۔ اسے اس بیڑی سمیت صبح منہ اندھیرے سے شام تک مختلف کام کرنا پڑتے تھے۔ ان میں سے سخت ترین کام دستی ٹوکے پر چارا کاٹنا تھا۔ ہر روز کم از کم چھ گھنٹے کے لئے عمو کو ایک دوسرے لڑکے مولے کے ساتھ مل کر چارا کترنا پڑتا تھا۔ وہ پسینے میں نہا جاتے تھے اور دم جیسے آنکھوں میں آ جاتا تھا مگر کالیے کی بے رحم نگاہوں کا خوف انہیں ہاتھ چلائے رکھنے پر

مجبور کرتا تھا۔ سُستی کی صورت میں کالیا نہ صرف غلیظ گالیاں دیتا بلکہ بے دریغ مار پیٹ بھی کرتا تھا۔

مویشی خانے میں کل پانچ ملازم تھے۔ ان میں سے صرف عمو اور مولے کو یہ ''امتیاز'' حاصل تھا کہ انہیں بیڑیاں لگائی گئی تھیں۔ بیڑی کی وجہ سے وہ دونوں شلوار نہیں پہن سکتے تھے۔ انہیں اپنا جسم صرف لنگوٹی یا دھوتی سے ڈھانپنا ہوتا تھا۔

قریباً دو مہینے بعد مولے کی بیڑی تو اُتار دی گئی مگر عمو کی بدستور رہی اور اس کے ٹخنوں کو مسلسل زخمی کرتی رہی۔ ماجھاں کی منحوس شکل اب اسے کم ہی نظر آتی تھی۔ اسے پتا چلا تھا کہ آج کل دیئے مسلّی کا پڑھا لکھا بیٹا باؤ سلیم ماجھاں کی زد میں ہے۔ ماجھاں نے اسے پتا نہیں کن کن چکروں میں پھنسایا تھا کہ وہ بے چارہ حویلی کا چاکر بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے ذمے ''منشی'' کا کام لگایا گیا تھا۔ وہ گھنگریالے بالوں والا بائیس تئیس سال کا قبول صورت لڑکا تھا۔ شلوار قمیص پہنتا تھا۔ عمو نے اکثر اسے ایک بوسیدہ سے رجسٹر کے ساتھ حویلی میں آتے جاتے دیکھا۔

ایک دن جب عمو چارے کا وزنی گٹھر کندھے پر اُٹھائے حویلی کے مین دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا، اسے ماجھاں کے گرجنے برسنے کی آواز آئی۔ اُدھ کھلے پھاٹک سے اس نے ماجھاں کی بس ایک جھلک دیکھی……اور بھونچکا رہ گیا۔ ماجھاں باؤ سلیم پر برس رہی تھی۔ باؤ سلیم کے گلے میں ایک رسّی تھی۔ اس رسّی کا دوسرا سرا ماجھاں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے کسی جانور کی طرح برآمدے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ باؤ سلیم کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ وہ جب کسی کو تھپڑ وغیرہ مارتی تھی تو اس کی کلائی کا وزنی کڑا بھی اس ''کارِ خیر'' میں شریک ہو جاتا تھا اور مضروب کے چہرے پر نشان چھوڑ جاتا تھا…… ماکھا اور کالیا وغیرہ قریب ہی کھڑے مضحکہ خیز انداز میں باؤ سلیم کی یہ درگت دیکھ رہے تھے۔

ماجھاں کے لئے ایک عجیب سی نفرت عمو کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اس عورت کو چیر کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا اور دیوہیکل بوہلی کتوں کے آگے ڈال دیتا۔

رات کو اس نے مولے سے ذکر کیا۔ مولا بولا۔ ''باؤ سلیم نے وہی غلطی کی تھی جو اس جیسے پڑھے لکھے لوگ عام طور پر کرتے ہیں۔ اس نے پنڈ میں پانچویں تک کا اسکول کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بس اسی بات پر چودھرانی ماجھاں سے اس کی تُسل ہو گئی۔ چودھرانی سے ٹکر لے کر بھلا اس علاقے میں کوئی رہ سکتا ہے۔ یہ تو بندے کو اپنے پاؤں چٹنے پر مجبور کر دیتی

ہے۔"

"کوئی اس کا کچھ کر نہیں سکتا؟" عمو نے دکھی لہجے میں کہا۔

"تُو نے کیا کر لیا ہے؟" مولے نے الٹا اس سے سوال کیا۔

اس سوال نے عمو کو چپ کرا دیا۔ مولا بولا۔ "یہ بڑی دراچھی زنانی ہے۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... اور سچی گل پوچھتا ہے نا تو مجھے تو اس کڑی شبو کی طرف سے بھی خطرہ ہی رہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" عمو نے چونک کر پوچھا۔

"وہ بگیاڑوں کے اندر بکری کے بچے کی طرح ہے۔ اس کے ساتھ کسی ویلے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

مولے کی بات نے عمو کے اندر دبے ہوئے سارے اندیشے ایک دم ابھار دیئے۔ اس کے سینے میں کچھ سلگنے لگا۔ پچھلے دو ڈھائی مہینے میں بس دو چار بار ہی وہ شبو کو دیکھ سکا تھا۔ اس کے سر پر اب چھوٹے چھوٹے بال آ گئے تھے۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد نظر آتا تھا۔ سخت گیر شہناز کی زیر نگرانی وہ حویلی کے کام کاج کرتی دکھائی دیتی تھی۔ شاید مولا سچ ہی کہہ رہا تھا۔ ماکھے، کالیے اور صوفی جیسے بگیاڑوں کے درمیان وہ ایک کمزور بکری ہی تو تھی۔

مولے کی آواز نے اسے چونکایا۔ "مجھے تو ایک اور شک ہو رہا ہے عمو۔ سنا ہے کہ چودھرانی کا ڈکیت بھائی ناجا ڈیڑھ دو مہینے تک حویلی واپس آ رہا ہے۔ وہ پھر حویلی میں ہی رہے گا۔ کہتے ہیں کہ علاقے کی پُلس کے ساتھ اس کا لمبا چوڑا مک مکا ہو گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ چودھرانی نے شبو جیسی سچل کڑی کو اپنے بھائی کی دل پشوری کے لئے ہی بچا کر رکھا ہوا ہے۔"

مولے کے بات کرنے کے انداز سے عمو بھنا گیا۔ "مولے! اس کے بارے میں تمیز سے بات کر۔"

"یار تُو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے وہ معشوق نہیں، زنانی ہے تیری۔"

عمو اندر سے کھول کر رہ گیا۔ وہ منہ پھیر کر اُٹھا اور دوسری طرف چلا گیا۔ مویشی خانے کی تاریکی اور بو میں وہ رات دیر تک جاگتا رہا اور بان کی چارپائی پر پہلو بدلتا رہا...... مولے کی باتوں نے شبو کے حوالے سے اس کے بدترین اندیشوں کو ہوا دی تھی اور اب وہ بری طرح بے قرار تھا۔ ہو سکتا تھا کہ مولے نے ماجھاں کے ڈکیت بھائی کے حوالے سے جو اندیشہ بیان کیا تھا، وہ پوری طرح درست نہ ہو لیکن یہ بات تو ٹھوس حقیقت تھی کہ اس حویلی

میں لاچار شبو کے ساتھ کسی بھی وقت کوئی "معاملہ" ہو سکتا ہے۔

صرف تین چار روز بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ پتا چلا کہ حویلی میں دو تین بندے زخمی ہو گئے ہیں۔ ان میں دینے مسلّی کا بیٹا باؤ سلیم بھی شامل تھا۔ باؤ کو شدید چوٹ آئی تھی۔ پتا چلا کہ اس کی دو پسلیاں ٹوٹ کر اس کے پھیپھڑے میں جا گھسی ہیں اور اسے زخمی حالت میں تحصیل اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ یہ حادثہ گھوڑوں اور گھوڑیوں کو نمبر لگانے کے دوران میں پیش آیا۔ نمبر لگانے کے لئے جانوروں کو داغا جاتا ہے۔ جب ماجھاں کے لاڈلے تازی گھوڑے کو داغا جانے لگا تو وہ اپنی روایتی سرکشی پر اُتر آیا۔ اس نے مختصر سے طویلے میں زبردست اودھم مچایا۔ باؤ سلیم جو منشی کے طور پر وہاں موجود تھا اور نمبر لگوا رہا تھا، وہ بھی گھوڑے کی زد میں آیا اور اس کی دولتی سے شدید زخمی ہوا۔ یہ وہی منہ زور گھوڑا تھا جو اس سے پہلے بھی سائیس اور اس کے ساتھی کو زخمی کر چکا تھا۔

باؤ سلیم گھائل ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور اس کے آٹھ دس روز بعد ہی ماجھاں کی "نظر کرم" ایک بار پھر عمو پر پڑ گئی۔ وہ اپنی بدعادات سے مجبور تھی۔ عمو کو کسی بھولی ہوئی ملکیتی شے کی طرح مویشی خانے کے "اسٹور روم" سے نکالا گیا اور جھاڑ پونچھ کر پھر اپنے عشرت کدے میں سجایا گیا...... وہی نیم تاریک کمرا، وہی کراہت، وہی بدبودار بوجھ، وہی غلیظ سانسیں۔ وہ اب پہلے سے دگنا کالا پانی یعنی شراب پیتی تھی اور اس کی خباثت میں بھی اسی شرح سے اضافہ ہوا تھا۔ وہ عمو کی دکھتی رگ جان چکی تھی۔ اس نے شبانہ کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ لڑکی یہاں اسی وقت تک خیریت سے ہے جب تک عمو سیدھا سیدھا چلتا رہے گا۔

...... اب وہ عمو کو گاہے بگاہے حویلی میں بلانے لگی۔ تاہم عمو کی وہ سہولتیں بحال نہیں ہوئیں جو شروع میں اسے حاصل تھیں۔ وہ بدستور مویشی خانے میں قیام پذیر تھا اور سارا دن جانور کی طرح مشقت کرتا تھا۔ اس کا کھانا پینا بھی حویلی کے ادنیٰ کارندوں کے ساتھ تھا۔ صرف اتنا فرق پڑا کہ اس کی بیڑی اُتار لی گئی۔

وہ بڑے تکلیف دہ شب و روز تھے۔ سردیوں کے بعد بہار شروع ہو رہی تھی۔ نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، مست ہوا چلتی تھی لیکن عمو کے اندر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی...... وہ ہر وقت معصوم چہرہ شبانہ کی سلامتی کے بارے میں سوچتا رہتا اور اس فکر میں رہتا کہ وہ کسی طرح اس مہلک جال میں سے نکل جائے۔ عمو کو معلوم ہو چکا تھا کہ شبانہ کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ ایک ناپسندیدہ شوہر کے پلے بندھنے سے بچ گئی ہے مگر اس کے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات ہوئی تھی۔ وہ اب ماجھاں کے پاس تھی۔ بظاہر تو اس کی حیثیت ملازمہ کی تھی۔

اس کے رشتے داروں کو حویلی میں آ کر اس سے ملنے کی اجازت بھی تھی لیکن حقیقت میں وہ قیدی تھی۔ اس کے گرد ایک نادیدہ پنجرہ تھا۔

عمو پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ اس کا تھوڑا سا مزید قد بھی نکلا تھا اور اس کے شانوں کی چوڑائی بڑھی تھی۔ اس کے اندر بغاوت کسی انگارے کی طرح سلگتی رہتی لیکن اس انگارے کو شعلہ بننے کا موقع دور دور نظر نہیں آتا تھا...... ہاں، وہ بہار کے دن تھے۔ بہار کی ہوا میں نمو کی تاثیر ہوتی ہے۔ اس ہوا میں زردی کے اندر سے سبزہ پھوٹتا ہے...... بیجوں سے کونپلیں بنتی ہیں اور کبھی کبھی جذبوں کے انگارے بھی شعلوں میں بدل جاتے ہیں۔ ان دنوں حویلی میں راجا نام کا ایک نوجوان بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ راجا کے پاس ایک بہت کھٹارا لوڈر تھا۔ اس پر اردو میں ''پاٹے خاں'' لکھا ہوا تھا۔ راجا اس لوڈر میں دو تین پنجرے رکھ کر لایا تھا...... ان میں چار پانچ شکاری کتے تھے۔ عمو کو معلوم ہوا تھا کہ یہ بندہ شکاری کتوں کو سدھاتا ہے اور پھر انہیں فروخت کرتا ہے۔ اس دن عمو بہت اداس بیٹھا تھا۔ اتنے میں کالیا آ گیا۔ اس نے عمو سے کہا کہ وہ بھوری بھینس کا دودھ دھو دے۔ بھوری کبھی کبھی اڑ جاتی تھی اور اسے ٹیکا لگا کر دودھ دھونا پڑتا تھا مگر عمو ایسے موقعوں پر بغیر ٹیکے کے ہی اسے رام کر لیتا تھا۔

وہ اسٹیل کی بڑی بالٹی لے کر بھوری کے پاس آیا۔ اس کے چمکیلے پنڈے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اور اس کے تھنوں کو سہلا سہلا کر اسے تیار کرتا رہا۔ پھر بالٹی اپنے دونوں گھٹنوں میں دبائی اور بھوری کے نیچے بیٹھ گیا۔

یہ مویشی خانے کا ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جس میں صرف دو بھینسیں اور بندھی ہوئی تھیں۔ اچانک بھگدڑ کی آوازیں آئیں۔ ایک زوردار کڑاکا سنائی دیا اور احاطے کا لکڑی کا دروازہ ٹوٹ کر دور جا گرا۔ ایک گھوڑا اپنے گھڑ سوار سمیت تیزی سے اندر داخل ہوا۔ عمو نے فوراً پہچان لیا۔ یہ ماجھاں کا وہی سرکش گھوڑا تھا جس نے دہشت پھیلا رکھی تھی۔ عمو نے اس کے سوار سالار خاں کو اچھل کر ہوا میں تیرتے اور پھر بھینسوں کی کھرلی کے پاس گرتے دیکھا۔ گرتے ہوئے اس کا سر کھرلی سے ٹکرایا تھا اور وہ بے سدھ ہو گیا تھا۔ گھوڑے کی ٹانگ لگنے سے عمو بھی دور لڑھک گیا اور دودھ والی بالٹی ہوا میں اڑتی نظر آئی۔ گھوڑا بلند آواز میں ہنہنا رہا تھا اور چاروں طرف ٹانگیں چلا رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگر سالار خاں چند سیکنڈ بھی اپنی جگہ پڑا رہا تو وحشی گھوڑا اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دے گا۔ یہی وقت تھا جب عمو اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور نتائج سے بے پروا ہو کر گھوڑے پر جا پڑا۔ گھوڑے نے گردن کے

زوردار ہلارے سے عمو کو ضرب لگائی اور چارے کے گٹھوں پر گرا دیا۔ عمو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پھر اُٹھا اور گھوڑے پر جھپٹا۔ اس مرتبہ گھوڑے کی لگام عمو کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے لگام کو دو تین جھٹکے دیئے۔ یکایک اسے لگا کہ گھوڑا غیر متوقع طور پر شانت ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی غیر معمولی مستی کافور ہو گئی۔ عمو نے اس کے ساتھ بھاگتے بھاگتے احاطے کا ایک چکر لگایا۔ لگام بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر اس نے ہمت کی اور جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ یہ غیر معمولی اقدام تھا۔ اس وقت ماجھاں سمیت حویلی میں موجود کوئی بھی شخص ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ عمو نے گھوڑے کو سنبھالتے ہوئے گھڑ سواری کا انداز اختیار کیا۔ وہ اس کی اچھل کود کو بتدریج کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اسے بڑے احاطے میں لے آیا اور بڑے اعتماد سے اسے اِدھر اُدھر دوڑانے لگا۔ ماجھاں اس وقت حویلی میں نہیں تھی لیکن جو لوگ اسے دیکھ رہے تھے، وہ یقیناً حیرت زدہ تھے۔ اس سرکش گھوڑے پر اتنی کامیابی سے ابھی تک کوئی نہیں بیٹھا تھا۔

ان دیکھنے والوں میں ماجھاں کا مہمان راجا بھی تھا۔ کچھ دیر بعد جب عمو گھوڑے سے اُترا اور اس کی گردن پر تھپکیاں دینے کے بعد اسے ایک کھونٹے سے باندھ دیا تو راجا دھیمے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ راجا چھریرے بدن کا تھا، اس کے بال لمبے تھے۔ آنکھیں چمکیلی اور نقوش تیز تھے۔ وہ عام سی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس نے عمو کا کندھا تھپکا اور بولا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''عمرن...... ویسے عمو کہتے ہیں۔''

''لگتا ہے گھوڑوں کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہو...... اور گھڑ سواری میں بھی ماہر ہو۔''

''نہیں، بہت کم گھوڑے پر بیٹھا ہوں۔ یہاں حویلی آ کر تو تین چار بار سے زیادہ نہیں بیٹھا۔''

''یا تم جھوٹ بول رہے ہو...... یا پھر......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

بے ہوش سالار خاں کو اُٹھا کر باہر لایا جا رہا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ راجا نے دیگر ملازموں سے بھی پوچھا۔ انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ عمو کبھی کبھار ہی گھوڑے پر بیٹھتا ہے۔ وہ کوئی ماہر گھڑ سوار نہیں۔

راجا، عمو کو لے کر حویلی کے اس حصے میں آ گیا جہاں مہمان وغیرہ ٹھہرتے تھے۔ یہ دراصل ڈیرے ہی کے تین چار کمرے تھے۔ یہاں بڑی بڑی دو چارپائیاں اور تازہ حقے

پڑے رہتے تھے...... یہیں پر ایک طرف نیم کے درختوں کے نیچے وہ آہنی پنجرے پڑے تھے جنہیں راجا کسی جگہ سے لے کر جا رہا تھا۔ ان میں کتے تھے۔ ایک کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ راجا نے اپنے کان کی چھوٹی سی طلائی بالی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''تیرے اندر فن ہے بھائی! میں خود بھی گھوڑے سدھاتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی ایسے گھوڑے کو اتنی آسانی سے رام ہوتے نہیں دیکھا۔''

''میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے پہلے کبھی کسی ایسے گھوڑے پر سواری نہیں کی۔'' عمو سادگی سے بولا۔

''اچھا اس گھوڑے سے پہلے بھی کبھی تمہارا آمنا سامنا ہوا ہے؟''

''بس دو چار بار ہی ہوا ہے۔''

''کبھی ایسی حالت میں بھی سامنا ہوا ہے جب یہ اسی طرح مستا (بپھرا) ہوا تھا؟''

عمو نے ذہن پر زور دیا اور بولا۔ ''ہاں، جب میں شروع شروع میں یہاں آیا تو ایک دن اس گھوڑے نے بڑا اودھم مچایا تھا۔ وہ ایک سوار کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا یہاں لایا تھا اور وہ بے چارہ مر چکا تھا۔''

راجا بڑے دھیان سے عمو کی بات سن رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''اس وقت گھوڑے سے تمہارا سامنا ہوا؟''

اچانک اس وقت کے مناظر عمو کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ گھوڑے نے سائیس کو گرایا تھا پھر ماجھاں اسے چکما دے کر اس کی لگام تھامنے کے لئے آگے بڑھی تھی لیکن وہ تو چھلاوا بنا ہوا تھا۔ ایک دم الف ہو گیا اور گھوم کر سیدھا عمو کی طرف آیا۔ عمو نے حفاظتِ خود اختیاری کے طور پر اندھا دھند اپنا ہاتھ گھمایا تھا۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آ گئی تھی۔ عمو کے بازو کو شدید جھٹکا لگا۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد گھوڑا چند لمحوں کے لئے سکتہ زدہ سا ہو گیا تھا۔ ماجھاں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے تنومند جسم کی پوری طاقت کے ساتھ گھوڑے کی گردن سے لپٹ گئی تھی۔

''کس خیال میں کھو گئے؟'' راجا کی آواز نے اسے چونکایا۔

''ہاں، اس وقت بھی پانچ دس سیکنڈ کے لئے اس سے میرا سامنا ہوا تھا۔'' عمو نے راجا کے سوال کے جواب میں کہا۔

راجا نے عمو سے چند مزید سوال پوچھے۔ اس کے لب و لہجے میں حیرت بدستور موجود تھی۔

اسی دوران میں اندرونی کمرے سے زرق برق کپڑوں والی ایک لڑکی نے راجا کو پکارا۔ راجا اس کی بات سننے کے لئے کمرے میں چلا گیا۔ عمو کتوں کو دیکھنے کے لئے پنجرے کی طرف آ گیا۔ ایک کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی آوازیں کل رات بھی مسلسل حویلی کے مکینوں کو بے آرام کرتی رہی تھیں۔ یہ پتلی کمر اور لمبی تھوتھنی والا ہاؤنڈ کتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور تیور خطرناک تھے لیکن اب پچھلے دس پندرہ منٹ سے وہ قدرے خاموش نظر آ رہا تھا۔ اس کتے کو علیحدہ پنجرے میں بند کیا گیا تھا۔ عمو کتے کے نزدیک پہنچا تو وہ دُم کو ہولے ہولے گردش دینے لگا اور اس نے اپنی تھوتنی پنجرے کی سلاخوں سے لگا دی۔ کتے عام طور پر عمو سے جلد ہی مانوس ہو جاتے تھے۔ ماجھاں نے اپنے طیش کے دور میں عمو کو کئی ماہ تک ''بل ڈاگز'' کے ساتھ ایک بدبودار کوٹھڑی میں بند رکھا تھا۔ ان کتوں سے شروع میں عمو کو خطرہ محسوس ہوا لیکن پھر بڑی تیزی سے یہ خطرہ کم ہوتا چلا گیا تھا۔

ہاؤنڈ کتنے نے اپنی پتلی تھوتھنی کا ایک تہائی حصہ تنگ سلاخوں کے خلا سے باہر نکال لیا تھا۔ عمو نے اپنی انگلی سے تھوتھنی کے بالائی حصے کو ہولے ہولے سہلایا۔ کتے کی دُم کی بے ساختہ گردش تیز ہو گئی۔ اسی دوران راجا واپس آ گیا۔ وہ عمو کو کتے کے پاس دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے عمو کو کتے سے پیچھے ہٹایا اور بولا۔ ''زیادہ بہادری نہ دکھاؤ یارا...... یہ کسی بھی ویلے حملہ کر سکتا ہے۔''

عمو اور راجا دوبارہ جہازی سائز چارپائی پر آ بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ راجا، عمو سے پوچھنے لگا کہ وہ یہاں کیسے اور کیونکر آیا۔ یہاں ہر کسی کو عمو کی کہانی معلوم تھی۔ عمو نے راجا کو بھی یہ سب کچھ بتانے میں عار نہیں سمجھا۔ اس نے اسے بتا دیا کہ کیسے وہ ایک چودھری کے پتر کو آسمانی بجلی والی نحوست سے بچانے کے لئے شہنشاہ نامی پیر کے مزار پر پہنچا اور کیسے یہاں کیکراں گاؤں تک آیا...... اس گفتگو کے دوران میں ہی راجا تھوڑا سا چونکا۔ ہاؤنڈ کتے نے اب پھر پنجرے میں چکرانا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ راجا کچھ دیر تک پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُٹھ کر اس کے قریب گیا۔ اس نے عمو کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ عمو پنجرے کے سامنے پہنچا تو کتے کی بےقراری کم ہو گئی۔ اس کا شور بھی تقریباً معدوم ہو گیا۔ وہ اپنی تھوتھنی سلاخوں سے رگڑ رہا تھا۔

کچھ دیر تک کتے کے پاس رک کر عمو اور راجا پھر چارپائی پر جا بیٹھے۔ ایک ملازمہ ان دونوں کے لئے مکھن والی میٹھی لسی لے آئی۔ کتا اب پھر حسبِ معمول پنجرے میں چکرا رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔

لسی پینے کے بعد راجا نے اپنی تیکھی مونچھیں صاف کیں اور ایک زوردار ڈکار لینے کے بعد کھوئی کھوئی نظروں سے عمو کو دیکھنے لگا...... کچھ دیر بعد بولا۔ ''میرے استاد، اللہ بخشے بابا مہر مشتاق کہا کرتے تھے، کچھ بندوں کے ساتھ پالتو جانور خاص طور سے کتے اور گھوڑے وغیرہ بڑی جلدی ہل جاتے (مانوس ہو جاتے) ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بھی ان لوگوں میں سے ایک ہو۔ کوئی خاص بات ہے تمہارے اندر...... یا پھر ہو سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ پیدا ہو رہی ہو۔''

''مم...... میں سمجھا نہیں بھارا جا؟''

''شاید میں تمہیں سمجھا نہ سکوں۔ استاد جی کی ساری باتیں تو میری کھوپڑی میں بھی نہیں آتی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ...... ہر بندے کے اندر سے کچھ لہریں نکلتی ہیں۔ یہ لہریں اس بندے کے آسے پاسے کے سارے جی جناوروں پر اثر ڈالتی ہیں...... یہ لہریں ان جی جناوروں کو بتاتی ہیں کہ یہ بندہ چنگا ہے، برا ہے، یا بہت چنگا ہے یا بہت برا ہے۔ بس اس طرح کی بات کہا کرتے تھے استاد جی۔ اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو پھر مجھے لگتا ہے کہ تیری لہریں بھی بڑی ٹیٹ قسم کی ہیں۔''

''یہ ٹیٹ کیا ہوتا ہے؟''

''یار! انگریزی کا لفظ ہے۔ مطلب ہے تگڑی مضبوط۔''

عمو سمجھ گیا کہ وہ ''ٹائٹ'' کو ٹیٹ کہہ رہا ہے۔

رات کو عمو سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ راجا کی کہی ہوئی ساری باتیں اس کے ذہن سے نکل چکی تھیں۔ وہ بس ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ وہ شبانہ کو اس خطرناک حویلی سے کیسے نکال کر لے جا سکتا تھا؟ وہ اس کے لئے بہت اہم ہو چکی تھی۔ اس کی رگِ جاں میں بس گئی تھی اور خون بن کر اس کی شریانوں میں دوڑتی رہتی تھی۔ وہ اس سے عشق کرنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے عشق کو بچانے کے لئے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شبانہ کی ماں اور دیگر رشتے داروں میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شبانہ کو ماجھاں کے چنگل سے نکال کر لے جا سکتے۔ ایسا کرنے والوں کا حشر یہاں دینے مسلّی کے بیٹے باؤ سلیم جیسا ہو ہوتا تھا۔

ایک دن بعد راجا سے پھر عمو کی ملاقات ہوئی۔ وہ اسے بڑی محبت سے ملا۔ دونوں مہمان خانے میں بیٹھے تربوز کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ راجا کا ہر دم شور مچانے والا...... خوفناک کتا آج پھر پہلے دن والے رویے کا مظاہرہ...... کر رہا تھا۔ وہ قدرے پُرسکون نظر آ رہا تھا...... اس نے حیران کن طور پر عمو کو اپنے پنڈے پر ہاتھ لگانے کی اجازت

بھی دی تھی۔ تربوز کھانے کے دوران میں عمو نے راجا سے پوچھا۔ ''وہ رنگ برنگے کپڑوں والی کڑی کہاں گئی؟''

''واپس چلی گئی ہو گی اپنے کوٹھے پر۔'' راجا نے بیڑی سلگا کر کہا۔

''کیا مطلب؟ وہ طوائف تھی؟''

''اوئے کھوتے، آہستہ بول۔ آپاں ماجھاں نے سن لیا تو غصہ کرے گی۔ تجھے پتا ہی ہے، سچی بات اسے کتنی کڑوی لگتی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں بھارا جے۔''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''آپاں ماجھاں نے یہ کڑی مجھے ذرا موج میلے کے لئے دی تھی۔ کہتی تھی گھریلو کڑی ہے۔ بڑی مشکل سے پھنسا کر لائی ہوں۔ وہ بھی بات بات پر ہائے اللہ توبہ اللہ، نہیں جی، نہ جی کہتی تھی۔ پر یارا! ہم نے بھی تھاں تھاں کا پانی پیا ہے۔ زنانی کی آواز سن کر بتا دیتے ہیں کہ یہ کس کھیت کی مولی ہے۔ بازاری کڑی تھی خانہ خراب...... میں نے بھی سوچا چلو وقت ہی پاس کرنا ہے نا۔''

''تو اس میں اصل قصور تو مالکن ماجھاں کا ہوا نا۔'' عمو نے کہا۔

''یہ تیری مالکن ماجھاں بڑی کتی شے ہے عمو...... میں اس کے ساتھ کبھی کبھی کاروبار کرتا ہوں اس لئے مجبوراً اسے آپاں کہنا پڑتا ہے۔ ایسا کہتے ہوئے جو میرے دل پر گزرتی ہے، میں ہی جانتا ہوں لیکن میں اس کی کسر ''ماجھاں'' کہتے ہوئے نکال دیتا ہوں۔ شاید تو نے غور نہیں کیا۔ میں اسے ماجھاں کے بجائے ماچاں کہتا ہوں۔''

''ماچاں کا کیا مطلب؟''

''بڑا کرارا مطلب ہے۔ ایک دم ٹیٹ۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ عمو کے استفسار پر اس نے بتایا۔ ''ماچاں، پوٹھوہار کے خانہ بدوشوں کی بولی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے جنگلی سور کی مادہ جس کے پیٹ میں بچہ ہو......'' بات کرتے کرتے راجا ایک دم ٹھٹک گیا۔ اپنی شریر مسکراہٹ سمیٹ کر بولا۔ ''لو آ گئی آپاں ماچاں۔''

ماجھاں اپنے تنومند جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی وہاں پہنچی۔ اس کے منہ میں تمباکو والا پان تھا۔ ایک نگاہِ غلط انداز عمو پر ڈالنے کے بعد وہ راجا سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں بھئی راجے...... کیسی تھی کڑی؟''

''ایک دم ٹیٹ...... آپاں ماچاں۔'' وہ آنکھ دبا کر بولا۔

''ویسے راجے! تُو ہے بڑا کمینہ۔ اسے دو چار سو روپیا ہی دے دیتا۔''

"کیسی بات کرتی ہو آپاں! وہ گھریلو کڑی تھی۔ غصہ کر جاتی تو پھر؟ اگلی بار آؤں گا تو کوئی تحفہ شحفہ لاؤں گا۔"

"تُو بہت وڈا کھوچل ہے۔" ماجھاں نے تیوری چڑھا کر کہا۔ پھر بولی۔ "اچھا وہ انگریزی بوتل کہاں ہے جس کا کہہ رہا تھا؟"

"ہاں ہاں آپاں ماجاں! وہ تو تیرے لئے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ قسم سے ایک دم انگریزی ہے، بالکل سیل بند۔"

راجا اندر گیا اور پھر اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی امپورٹڈ شراب کی ایک نفیس بوتل اُٹھا لایا۔ "یہ لو...... کیا یاد کرو گی اپنے بھائی کو۔" وہ بولا۔

تھوڑی سی مکالمے بازی کر کے ماجھاں واپس چلی گئی تو راجا کے چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "ایسے مسکرا کیوں رہے ہو بھا راجے؟" عمو نے پوچھا۔

"سچی سچی بتاؤں؟"

"ہاں ہاں...... مجھے کون سا کسی کو بتانا ہے۔"

راجا خود کو عمو سے کافی بے تکلف محسوس کرنے لگا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ "کہتے ہیں نا کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اس نے مجھے کنڈم کڑی دی، میں نے اسے کنڈم شراب دی۔" وہ ٹیٹ کو "اچھے" اور کنڈم کو "خراب" کے معنوں میں استعمال کرتا تھا۔

"کنڈم شراب؟ کیا مطلب؟" عمو نے پوچھا۔

"یہ سیل بند بوتل نہیں ہے اور اس میں جو شراب ہے، وہ بھی بچی کھچی ہے۔ کچھ دن پہلے فیروز آباد گاؤں کے زمیندار ملک آفتاب کے ڈیرے پر ایک بڑی شراب پارٹی ہوئی تھی۔ وہاں بڑی ٹیٹ انگریزی شراب چلی تھی۔ میں بھی وہاں تھا۔ پارٹی کے بعد میں نے گلاسوں میں بچی کھچی شراب اس بوتل میں جمع کر لی تھی......" وہ دبی آواز میں ہنسا۔

"اور یہ بوتل کی سیلیں؟" عمو نے پوچھا۔

"یہ سیلیں شیلیں جھوٹی ہوتی ہیں یارا...... ہر طرف ایک دم کنڈم مال چل رہے ہیں۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔

اگلے دو تین روز میں راجے سے عمو کی چند ملاقاتیں مزید ہوئیں۔ وہ عمو سے بہت متاثر نظر آتا تھا۔ اسے عمو کی تقریباً ساری روداد معلوم ہو چکی تھی۔ یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ یہاں عیاش ماجھاں نے اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا ہے۔ ماں کے حوالے سے اپنی تڑپ کے بارے میں بھی عمو نے راجا کو بہت کچھ بتایا تھا۔ ایک دن بیڑی پیتے پیتے اس نے

اچانک عمو سے پوچھا۔ "یہاں سے بھاگنا ہے عمو؟"

عمو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ...... کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ ہکلایا۔

"یہ مجھ پر چھوڑ۔ یہ بتا یہاں سے بھاگنا ہے تجھے؟"

عمو نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر بولا۔ "ہاں...... پر اکیلے نہیں۔ شبو کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے، اس کو بھی لے چلتے ہیں لیکن...... میری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"گھبرا مت یارا۔ کوئی ایسی شرط نہیں۔ تُو آسانی سے پوری کر دے گا لیکن تجھے بتاؤں گا بعد میں۔"

"لیکن...... تم ہمیں یہاں سے نکالو گے کس طرح؟" عمو نے پوچھا۔

"کہا ہے نا، یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ بس تمہیں تھوڑی سی ہمت دکھانی پڑے گی۔"

"تمہارے اندازے سے بڑھ کر ہمت دکھاؤں گا۔" عمو نے عجیب ولولے سے کہا پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ "مگر پروگرام کب کا ہے؟"

"بس ایک دو دن کے اندر۔ تیری مالکن ماجاں سے کوئی شے خریدنی ہے۔ اس کا سودا ہو جاتا ہے تو پروگرام پکا کر لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بھا راجے...... پر میری تو ملاقات شبو سے ہوتی نہیں ہے۔ کسی طرح تُو اس سے ملاقات کر لے اور اسے بتا دے کہ وہ بھاگنے کے لئے تیار رہے۔"

"اور اگر وہ نہ مانی تو؟"

"تم اسے ساری بات بتانا نا۔ اسے بتانا کہ ماجھاں کا ڈکیت بھائی بس دو تین ہفتے میں یہاں تشریف لانے والا ہے۔ وہ آ گیا تو پھر اس کے لئے بڑی مصیبت ہو جائیگی۔ اسے ساری حقیقت کھول کر سمجھا دینا۔"

راجا نے چالاکی دکھائی اور اگلے روز مہمان خانے میں شبو سے ملاقات کر لی۔ نہ صرف ملاقات کر لی بلکہ کالے اور صوفی کو چکما دے کر دو تین منٹ کے لئے عمو کو بھی اس ملاقات میں شریک کر لیا۔ شبو بھی شاید اپنی طرف بڑھنے والے خطروں کو بھانپ چکی تھی۔ اس نے نیم رضامندی ظاہر کر دی۔

اگلا روز عمو کے لئے بہت افسوس ناک تھا۔ وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کر سکا۔ صبح سویرے حویلی میں یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ دینے مسلّی کا پڑھا لکھا بیٹا باؤ سلیم جو شدید زخمی تھا، گجرات کے اسپتال میں انتقال کر گیا ہے۔ وہ ماجھاں کے ظلم کے...... شاہ کاروں میں سے

ایک شاہ کار تھا۔اس کی خطا صرف یہ تھی کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی اور جاہلیت میں غرق اس ''کیکراں گاؤں'' میں بچوں کو پڑھانا چاہتا تھا۔ وہ افسر بننے کے لائق تھا، پر ماجھاں نے اسے حویلی میں رکھ کر منشی...... کا کام سونپا تھا۔ اسے اپنی عیاشی کا سامان بنایا تھا اور ذلیل وخوار کیا تھا۔ وہ بیس بائیس سال کا تھا۔اس عمر میں تو زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ سپنے دیکھے جاتے ہیں۔ راستے چنے جاتے ہیں۔ تازہ حوصلوں کے ساتھ سہانی مسافتوں کی شروعات ہوتی ہے اور وہ خشک ہونٹوں، ویران آنکھوں کے ساتھ منوں مٹی کے نیچے جا سویا تھا۔ بظاہر اس کی موت گھوڑے والے حادثے کی وجہ سے ہوئی لیکن یہ حادثہ نہ ہوتا تو کوئی اور ہو جاتا۔اس حویلی میں اس کی زندگی کو برباد تو ہونا ہی تھا۔

باؤ سلیم والے واقعے نے عمو کے ارادے کو مزید پختہ کیا۔اس نے تہیہ کیا کہ وہ راجا کا تعاون حاصل کرے گا اور شبو سمیت اس حویلی سے نکلنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ اس دن شام کو جب وہ راجا کے ساتھ ڈیرے پر بیٹھا تھا اور اس کے ہاؤنڈ کتے کو اپنے ہاتھ سے گوشت کھلا رہا تھا، راجا نے سرگوشی میں ماجھاں کو ایک کلاسیکل گالی دی اور بولا۔''عمو! تیری خاطر ایسا کنڈم سودا کر رہا ہوں، نہیں تو قسم سے لات مار دیتا اس مال پر اور مال والی کی ''تشریف'' پر۔''

''کس مال کی بات کر رہے ہو بھا راجے؟'' عمو نے پوچھا۔

راجے نے قمیص کے نیچے سے چاقو نکالا اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد قریب رکھے ایک چھوٹے سے تربوز کو بیچ میں سے کاٹ دیا۔ عمو دنگ رہ گیا۔ تربوز اندر سے بالکل خالی تھا۔ اس کے خول میں پولیتھین کا ایک موٹا لفافہ تھا۔ لفافے میں کوئی سیاہی مائل شے نظر آ رہی تھی۔ یہ افیم تھی۔ راجا نے تھوڑی سی افیم نکالی۔ اسے چٹکی میں مسلا۔ زبان کی نوک سے چکھا پھر ناک سے لگایا...... اور دوبارہ ماجھاں کو گالی دی۔''ایک دم کنڈم ہے۔ جتنے پیسے مجھ سے لے رہی ہے، اس سے آدھے بھی نہیں دینے چاہئیں۔ پر تیری اور شبو کی خاطر یہ گھاٹا بھی قبول ہے۔''

وہ اپنے خاص انداز میں مسکرایا۔

''تو کیا تمہیں یہ افیم کہیں لے کر جانی ہے؟''

''تو کیا خود کھا کر اللہ بخشے ہونا ہے؟''

عمو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔''ایسے چھوٹے سائز کے آٹھ دس تربوز ایسے ہیں جن میں یہ افیم بھری گئی ہے۔ ان تربوزوں کو دوسرے تربوزوں میں ملا کر لوڈر میں بھر دیا جائے گا۔ کسی کے باپ کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ

تربوزوں میں ''کھوچل'' تربوز بھی ہیں۔''

''پہلے بھی یہ کام کرتے رہے ہو؟''

''ہاں، دو چار بار تو کیا ہے۔ ایک وم ٹیٹ کام ہے۔ یہ دیکھو، تربوز پر مٹی وغیرہ بھی لگی ہوئی ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ جوڑ کہاں ہے۔ اسے آپاں ماچاں کے کارندے مسالا لگا کر بڑی صفائی سے جوڑ دیتے ہیں۔'' ماجھاں کو ماچاں کہتے ہوئے اس کے چہرے پر شریر سی چمک آ جاتی تھی۔

عمو نے کہا۔''بھا راجے! تم نے یہ کیوں کہا ہے کہ یہ گھاٹے کا سودا تم میرے اور شبو کے لئے کر رہے ہو؟''

اس نے اپنے لمبے بالوں کو سہلایا اور بولا۔''یارا! ان تربوزوں کی آڑ میں ہی تو تم دونوں کو یہاں سے لے کر جانا ہے۔ لوڈر پر تربوزوں کا ڈھیر ہو گا اور اس کے اندر ہی تمہارے بیٹھنے کے لئے جگہ ہو گی۔''

''بھا راجے! کہیں تربوزوں کے نیچے ہماری سانس ہی نہ گھٹ جائے۔ تم نے دیکھا ہی ہے، شبانہ تو ویسے بھی ملوک سی ہے۔''

''اور یہ تربوز بھی تو دیکھو ملوک سے ہیں۔ بڑے خربوزے جتنا سائز ہے ان کا۔'' راجا نے تربوز کو ہاتھوں میں گھمایا۔

O......❖......O

قریباً اڑتالیس گھنٹے بعد وہ تینوں حویلی سے نکلنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ راجا کو صبح سویرے حویلی سے روانہ ہونا تھا۔ کتوں والے تین پنجرے اور تربوز رات کو ہی لوڈر پر بار کر دیئے گئے تھے۔ آدھی رات کے بعد راجا نے ان تربوزوں میں سے پچیس تیس دانے علیحدہ کر کے ڈیرے میں پڑی پرالی کے اندر چھپا دیئے۔ یہ تربوز کم ہونے سے اتنی گنجائش پیدا ہو گئی کہ عمو اور شبانہ بھی تربوزوں میں چھپ سکیں اور تربوزوں کا حجم بھی زیادہ نظر نہ آئے۔ مویشی خانے میں اپنے دیرینہ ساتھی مولے سے عمو نے رات ہی کو الوداعی ملاقات کر لی تھی۔ بہرحال، مولے کو یہ ہرگز پتا نہیں تھا کہ یہ الوداعی ملاقات ہے۔ پروگرام کے مطابق صبح اجالا ہونے سے پہلے ہی عمو اور شبانہ ڈیرے پر راجا کے پاس پہنچ گئے۔ راجا نے بڑی احتیاط سے انہیں خستہ حال لوڈر کے اندر تربوزوں میں چھپا دیا۔ تربوزوں کے اندر خلا موجود تھا، اس لئے عمو اور شبانہ کو سانس لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ بہرطور پھل کا بوجھ وہ اپنے جسموں پر ضرور محسوس کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ حالات ان کے حق میں ہیں۔ آدھی رات کے

وقت ہی ماجھاں تین گھڑسواروں کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ان میں عقابی آنکھوں والا ماکھا بھی شامل تھا۔کہا جارہا تھا کہ ماجھاں کا ڈکیت بھائی کسی پاس کے گاؤں میں آیا ہوا ہے اور وہ اس سے ملنے گئی ہے۔

صبح کے ملگجے میں راجا کا لوڈر ایک جگر پاش آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہوا۔یوں لگا کہ پوری حویلی اس کی پاٹ دار آواز سے تھرانے لگی ہے۔وہ اتنا دھواں اگل رہا تھا کہ کئی ٹرک ایک ساتھ مل کر بھی نہیں اگل سکتے تھے۔کچھ دیر بعد اس کے پہیوں نے حرکت کی اور وہ حویلی کے بڑے پھاٹک سے گزر کر کچے راستے پر آ گیا۔یہاں ماجھاں کے مسلح کارندے وجود تھے اور وہ جانتے تھے کہ اس لوڈر میں کیا جارہا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ''جو کچھ'' جارہا ہے اس کے نیچے کیا جارہا ہے۔

کیکراں گاؤں کی مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد لوڈر باہر جانے والے کشادہ راستے پر آ گیا۔گاہے بگاہے راجا کی چہکتی ہوئی آواز عمو اور شبانہ کے کانوں تک پہنچتی تھی۔وہ راہ میں ملنے والے کسی شخص کو سلام کرتا یا اس کے سلام کا جواب دیتا تھا۔ان ملنے والوں میں زیادہ تر یقیناً ماجھاں کے کارندے ہی تھے۔

لوڈر کے اندر تربوزوں کے نیچے عمو اور شبانہ ایک دوسرے سے پیوست ہو کر لیٹے تھے، ایسا کرنا ان کی مجبوری تھی۔صورتِ حال تناؤ بھری تھی، اس کے باوجود شبانہ کے جسم کا پُرگداز لمس عمو کے سراپا میں سنسنی دوڑا رہا تھا۔اس نے اپنے ہونٹ شبانہ کے چھوٹے چھوٹے ملائم بالوں پر رکھ دیئے اور سرگوشی میں بولا۔''شبو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، ہم ساتھ جئیں مریں گے۔''

''میں بھی......'' شبو نے اپنا چہرہ اس کے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔اس کی خوب صورت ناک کی چبھن اپنے سینے پر عمو کو بڑی بھلی محسوس ہوئی۔اس کا دل چاہا کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں چھپالے۔اسے اتنا پیار کرے کہ گزارے ماہ وسال کے ان سارے زخموں کا مداوا ہو جائے جو اس کے کومل جسم پر لگے ہیں۔

لوڈر کو لگنے والے جھٹکے بتا رہے تھے کہ اب اس کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔ان جھٹکوں کے ساتھ تربوزوں کا بوجھ بھی تکلیف دہ ہوتا جارہا تھا۔کبھی کبھی شبانہ کو کراہنا پڑتا اور وہ کسمسانے لگتی۔ایک جگہ پہنچ کر لوڈر کی رفتار سُست ہونے لگی اور پھر وہ رک گیا......عمو سمجھ گیا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں اور راجا شاید ان پر سے تربوزوں کا بوجھ کم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے......

لیکن اصل صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔عمو اور شبانہ اس سے یکسر بے خبر تھے......

چند سیکنڈ بعد انہیں اپنے اردگرد گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں اور پھر ایک پاٹ دار آواز سن کر عمو کا کلیجا منہ کو آ گیا۔یہ ماجھاں کی آواز تھی اور وہ راجا سے اس کا حال چال پوچھ رہی تھی۔اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس گاؤں کی طرف جارہی ہے۔

شبانہ کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ سہم کر عمو سے چمٹ سی گئی۔چند لمحے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہوگئی۔ماجھاں کی آواز آئی۔اس نے راجا سے پوچھا۔''مال ٹھیک ٹھاک جارہا ہے؟''

''بالکل ٹیٹ آپاں۔'' راجا نے مختصر جواب دیا۔

ماجھاں تربوزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔کسی کسی تربوز کو وہ انگلی کی گانٹھ سے ٹھونک کر بھی چیک کرتی۔عمو کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔وہ دونوں کسی بھی وقت ماجھاں کی نظر میں آ سکتے تھے۔وہ دم سادھے لیٹے رہے۔یکا یک عمو کے پاؤں کے پاس حرکت ہوئی۔وہاں سے تربوز اُٹھایا گیا تھا۔عمو کا پاؤں ننگا ہو چکا تھا۔دو سیکنڈ بعد ماجھاں کی پُرحیرت آواز عمو کے کانوں میں پڑی۔''اوئے...... یہ کیا ہے؟''

اس کے ساتھ ہی عمو نے ایک کرخت گرفت اپنے ٹخنے پر محسوس کی۔یقیناً یہ ماجھاں ہی تھی۔اس نے عمو کی ٹانگ کو پوری طاقت سے کھینچا اور اسے تربوزوں کے نیچے سے باہر گھسیٹ لیا۔سورج کی چمکیلی کرنوں میں عمو نے ماجھاں کا بہت بڑا تھوبڑا دیکھا۔اس کی آنکھوں میں غضب ناک چمک تھی اور اس کی رنگت ''سیاہی مائل سرخ'' ہو رہی تھی۔عمو نے دیکھا کہ راجا لپک کر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا ہے۔عمو کے اندر ایک مدت سے دھیرے دھیرے جو بغاوت پروان چڑھ رہی تھی، وہ یکا یک توانائی بن کر اس کے دست و بازو میں دوڑ گئی۔اَن گنت شب و روز سے سینے کے اندر سلگتا ہوا انگارہ دفعتاً شعلہ جوالا بن گیا۔عمو نے پوری طاقت سے اپنا دایاں ہاتھ گھمایا اور ماجھاں کے چربی دار تھوبڑے کو نشانہ بنایا۔یہ بڑی کارگر ضرب تھی اور کیوں نہ ہوتی......اس کے پیچھے بہت سے زخموں کا درد، بہت سے دکھوں کی تلخی اور بہت سی توہین کا زہریلا احساس موجود تھا۔اس چوٹ نے ''چٹاخ'' کی آواز پیدا کی اور ماجھاں اپنے تنومند جسم کے ساتھ اچھل کر دور جا گری۔اس کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔

یہی وقت تھا جب ماکھے نے عمو کو ایک گندی گالی دی اور اچھل کر لوڈر پر چڑھا۔اب عمو کے ہاتھ میں چاقو تھا۔یہ چاقو اسے راجا نے ہی علی الصباح دیا تھا۔اس سے پہلے کہ ماکھا اپنی

رائفل کندھے سے اُتارتا اور اسے عمو اور شبانہ کی طرف سیدھا کرتا، عمو ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا۔ راجا نے اسے تاکید کی تھی کہ کسی کو جان سے نہیں مارنا ہے۔ اگر یہ تاکید عمو کے ذہن میں نہ ہوتی تو وہ شاید سیدھا ماکھے کے پیٹ میں چاقو گھونپتا لیکن اس نے ماکھے کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ پہلے اس نے ماکھے کی بائیں ران میں دستے تک چاقو اُتارا پھر اس کی دائیں ران پر جانگ کے بالکل پاس وار کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سر کی شدید ضرب ماکھے کے پیٹ میں لگا کر اسے لوڈر سے نیچے پھینک دیا۔ اس وقت تک لوڈر حرکت میں آ چکا تھا اور اپنے پیچھے سیاہ دھوئیں کے بادل چھوڑتا رفتار پکڑ رہا تھا۔

اس نے زخمی ماکھے کو گرد میں لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ باقی دو افراد ماجھاں سمیت تیزی سے گھوڑوں پر سوار ہوتے نظر آئے۔ دھول سے اٹے ہوئے اونچے نیچے راستے پر راجا کا پاٹے خاں تیزی سے بھاگتا چلا گیا۔ اس نے غیر متوقع رفتار پکڑ لی اور اس رفتار کی وجہ سے بعض جگہ کئی کئی فٹ اچھل رہا تھا۔ خطرے کو محسوس کر کے کتے قیامت خیز شور مچا رہے تھے۔ تربوز لڑھک لڑھک کر لوڈر سے نیچے گرتے چلے جا رہے تھے۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لئے عمو اور شبانہ نیچے بیٹھ گئے اور ایک اینگل آئرن کا سہارا لے لیا۔

''وہ......وہ پیچھے آ رہے ہیں۔'' عمو نے چلا کر راجا کو اطلاع دی۔

''جو آتا ہے آنے دو۔'' کیبن کی طرف سے راجا کی پُر جوش آواز آئی اور اس کے ساتھ لوڈر کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔

ماجھاں کے دونوں ساتھیوں میں سے کالیے کے کندھے پر رائفل موجود تھی۔ تاہم بھکٹٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے پر سے گولی چلانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ لوڈر کی طرف دو تین فائر کئے گئے مگر ان میں سے کوئی لوڈر کو نہیں لگا۔ عمو نے دیکھا، سامنے ایک بہت بڑا بارشی جوہڑ تھا اور راستہ بند نظر آتا تھا۔ دائیں بائیں اونچے اونچے کھیتوں نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ ''ہائے......اب کیا ہوگا؟'' شبانہ نے بالکل مری ہوئی آواز میں کہا۔

یہی سوال عمو کے دماغ میں بھی تھا لیکن پھر یہ دیکھ کر عمو کو حیرت ہوئی کہ راجا نے لوڈر کو بلاتردد جوہڑ میں اُتار دیا ہے۔ کھٹارا لوڈر کا سائیلنسر تھوڑی سی بلندی پر لگایا گیا تھا تاکہ پانی وغیرہ سے محفوظ رہے۔ یہ جان کر عمو کو حیرت ہوئی کہ لوڈر جیسے تیسے ہچکولے کھاتا اس ڈھائی تین فٹ اونچے پانی سے گزرتا چلا گیا۔ عقب میں دھول اور دھوئیں کے بادل چھٹ گئے تھے۔ ماجھاں اور اس کے دونوں ساتھی نظر آ رہے تھے۔ ماجھاں کے دونوں ساتھی گھڑسوار تو جوہڑ کے کنارے کنارے بائیں طرف بھاگے تاکہ کلاوا کاٹ کر جوہڑ کی دوسری طرف پہنچ

جائیں مگر مشتعل ماجھاں نے اس نصف فرلانگ چوڑے جوہڑ کا چکر کاٹنے کا رسک نہیں لیا اور اپنا گھوڑا لوڈر کے پیچھے ہی سیدھا جوہڑ میں ڈال دیا۔ غیظ وغضب نے اسے جیسے دیوانہ کر رکھا تھا۔ جوہڑ کے درمیان پہنچ کر ماجھاں کے گھوڑے نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ماجھاں نیچے اُتری اور پاپیادہ ہی لوڈر کے پیچھے لپکی۔ وہ کسی فربہ اندام آبی مخلوق کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ چلا رہی تھی اور لوڈر کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوڈر یعنی راجا کے پاٹے خاں نے توقع سے بڑھ کر اس کا ساتھ دیا اور جوہڑ سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ ماجھاں تب تک کافی نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اس کے پاس پستول نہیں تھا ورنہ اس موقع پر وہ ضرور فائر کرتی۔ راجا کے پاس بھرا ہوا پستول موجود تھا لیکن اس نے یہ ساری کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی عمو کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی کو جان سے مارنے کا رسک نہیں لیں گے۔ اگر بہت زیادہ پھنس گئے تو پھر زخمی کرنے کی حد تک جائیں گے۔

جونہی پاٹے خاں خشکی پر پہنچا، ماجاں بھی پہنچ گئی۔ اس کا جسم فربہ ضرور تھا لیکن ساتھ ہی صحت منداور زور آور بھی تھا۔ بہ وقتِ ضرورت وہ خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اب بھی وہ اپنے گٹھے ہوئے جسم کی پوری توانائی کے ساتھ پاٹے خاں کے پیچھے لپکی تاکہ اس پر ہاتھ ڈال سکے اور پھر پائدان پر پاؤں رکھ کر اس پر چڑھ سکے اور وہ جانتی تھی کہ یہ کام اسے پاٹے خاں کے رفتار پکڑنے سے پہلے پہلے کرنا ہے...... یہ بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے تیزی سے پاٹے خاں پر ہاتھ ڈالا۔ آہنی کنارہ اس کے ہاتھ میں آیا......مگر اس کا پاؤں ٹھیک سے پائدان پر نہیں پڑا۔ وہ گری اور پھر لوڈر کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

شبانہ عمو سے چمٹی ہوئی تھی اور چلا رہی تھی۔ اس کے لئے ماجھاں کسی ''موذی جانور'' کی طرح تھی جو لوڈر پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے لئے عمو حیران ہوا کہ ماجھاں کی گرفت کتنی مضبوط ہے جو وہ بھاری تن وتوش کے ساتھ لوڈر کے پیچھے گھسٹتی چلی آ رہی ہے۔ مگر پھر اسے اصل حقیقت کا پتا چلا۔ ماجھاں کی کلائی کا موٹا دھاتی کڑا لوڈر کے ایک زیریں ہک میں اٹک گیا تھا۔ ایسے ہک عموماً ترپال وغیرہ تاننے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

راجا نے چلتے لوڈر کی کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی پھر پکار کر پوچھا۔

''کہاں ہے ماچاں؟''

''پیچھے گھسٹ رہی ہے۔ چھوڑ نہیں رہی۔'' عمو ہانپی آواز میں بولا۔

''چھڑا دو۔ کوئی چیز مار دو۔''

''اس کا کڑا ہک میں پھنس گیا ہے۔''

"زور لگا کر نکال دو۔" راجا پکارا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دونوں گھڑسواروں نے جوہڑ کا چکر مکمل کر لیا ہے اور اب تیزی سے لوڈر کے پیچھے آ رہے ہیں۔

تنومند ماجھاں کے لوڈر کے پیچھے گھسٹنے کا منظر دیدنی تھا۔ وہ قریباً کندھوں تک گھسٹ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ غضب ناک انداز میں چلا بھی رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اپنا دوسرا ہاتھ استعمال کرتی تھی اور کڑے کو ہک سے نکالنے کی کوشش کرتی تھی...... لوڈر کو لگنے والے کسی جھٹکے کی وجہ سے کڑا خود بخود بھی ہک میں سے نکل سکتا تھا...... عمو کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ نفرت الاؤ بن چکی تھی۔ ماں بہن کی وہ اَن گنت گالیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں جو گزرے ماہ وسال میں اسے دی گئی تھیں۔ وہ سارے تھپڑ، وہ سارے زخم، ساری توہین اور وہ سارے کراہت آمیز لمحے اس کے تصور میں تھے جن سے اس کا واسطہ پڑتا رہا تھا۔

اس نے ماجھاں کی کلائی اور آہنی ہک کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا کہ ان کے "جدا" ہونے کا امکان کم سے کم ہو گیا۔ فرنٹ سیٹ پر سے راجا کی آواز آئی۔ "ہاں عمو! کڑا چھوٹ گیا؟"

"نہیں بھا راجے...... بری طرح پھنسا ہوا ہے۔" وہ ایسے انداز میں بولا جیسے کڑا چھڑانے کے لئے زور لگا رہا ہو۔ حالانکہ وہ کڑا پھنسائے رکھنے کے لئے زور لگا رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا سفاک جھوٹ تھا جو اس نے بولا...... ماجھاں کی موت کا منظر بڑا بھیانک تھا۔ وہ لوڈر کے پیچھے گھسٹتے ہوئے اچھل رہی تھی، پلٹ رہی تھی، چلا رہی تھی۔ اس کا چربیلا جسم لہولہو ہو رہا تھا۔ کپڑے پھٹ رہے تھے، چمڑی اُتر رہی تھی۔ کچے راستے کے کنارے، ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے سے وہ ٹکرائی، اس کا لہولہان چہرہ ایک طرف سے پچکا ہوا نظر آیا۔ اپنی آنکھوں کو ان مناظر سے محفوظ رکھنے کے لئے شبانہ لوڈر کے فرش پر بیٹھ گئی تھی اور اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔

راجا جانتا تھا کہ کالیا اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تیزی سے پیچھے آ رہے ہیں۔ وہ اپنے "پاٹے خاں" کی رفتار کم نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پھر چلا کر پوچھا۔ "کڑا چھوٹا؟"

"نہیں بھا راجے۔" عمو نے پھر وہی جواب دیا۔

ماجھاں اب تقریباً ایک لاش میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کے جسم کے کئی حصوں کے چیتھڑے اُڑ چکے تھے۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہ دیکھنے کے بعد عمو نے اس کی کلائی اپنی طرف کھینچ کر تھوڑا سا زور لگایا اور دھاتی کڑے کو ہک میں سے نکال دیا۔ ماجھاں کی خونچکاں

لاش چند پلٹیاں کھا کر کنارے پر اُگی ہوئی جھاڑی میں جا رکی۔

لوڈر کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ عقب میں دھول کے بادل کچھ اور دبیز ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ماجھاں اور اس کے دونوں ساتھی ان بادلوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گئے۔

○......❖......○

راجا کا مکان ٹھیکرا نامی گاؤں میں تھا۔ مکان کا احاطہ کافی بڑا تھا۔ ایک طرف گھوڑوں کو سدھانے اور بھگانے کے لئے علیحدہ جگہ تھی۔ لوہے کے کئی زنگ آلود پنجرے بھی یہاں نظر آ رہے تھے۔ عمو نے ماجھاں کو بہت بری حالت میں دیکھا تھا لیکن وہ ابھی تک یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مری ہے یا نہیں۔

راجا از حد پریشان تھا۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتا تھا کہ ماجھاں پر کیا بیتی ہے۔ عمو اور شبانہ کو گھر چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح آیا تھا۔ کتوں والے پنجرے اور بچے کھچے تربوز ابھی تک لوڈر میں ہی تھے۔ راجا آتے ساتھ ہی چلایا۔ "عمو...... جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ بس دو منٹ لگاؤ۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ مر گئی ہے۔ کیکراں میں تڑتھلی مچی ہوئی ہے۔ اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے لوہے کا ایک پنجرہ گھسیٹ کر لوڈر کے قریب کیا۔ اس میں کتے کے چند چھوٹے پلے تھے۔

عمو نے اس خبر پر بظاہر دکھی چہرہ بنایا لیکن درحقیقت اس کے سینے میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ راجا کے ساتھ مل کر اس نے پلوں والا پنجرہ لوڈر پر چڑھایا۔ راجا نے افراتفری میں کچھ چیزیں ایک بیگ میں رکھیں اور لوڈر میں آ بیٹھا۔ اس کے اشارے پر عمو اور شبانہ بھی سوار ہو گئے۔ پاٹے خاں کا انجن پُرشور آواز سے بیدار ہوا۔ غالباً سائیلنسر کو نقصان پہنچنے سے پاٹے خاں کچھ اور بھی "پاٹے خاں" ہو گیا تھا۔ دو منٹ کے اندر اندر وہ لوگ گھر چھوڑ چکے تھے اور تیز رفتاری سے کسی نامعلوم مقام کی طرف جا رہے تھے۔

شبانہ کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ اس کے لئے وہ مناظر ہی کم خوفناک نہیں تھے جو جوہڑ سے نکلنے کے بعد پیش آئے تھے۔ اب وہ ماجھاں کی موت کی مصدقہ اطلاع بھی سن رہی تھی...... اور ماجھاں کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ وہ اس علاقے کی "پھولن دیوی" تھی۔ ہر جگہ اس کے تعلقات تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ناجے جیسے ڈکیت کی بہن تھی۔ اگر راجا پریشان تھا تو اس کی پریشانی سمجھ میں آتی تھی۔

اس مرتبہ پاٹے خاں پر ان کا سفر بغیر رکے قریباً آٹھ گھنٹے جاری رہا۔ ڈیزل ختم ہو گیا تو کیبن میں رکھا ہوا ایک ''کین'' کام آیا۔ ایک جگہ انہیں سخت جان پاٹے خاں کا پہیا بھی تبدیل کرنا پڑا۔ ان کا سارا سفر کچے راستوں اور بے آباد زمینوں کا تھا۔ چھوٹے موٹے ٹیلے اور کٹی پھٹی زمین ان کے راستے میں آ رہی تھی۔

وہ اب پنجاب کی ایک اور دور دراز بستی میں پہنچے۔ اس کا نام شاد پورہ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں سے قریب ترین پکی سڑک قریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ نزدیکی شہر خوشاب تھا اور اس کا فاصلہ بھی کم و بیش چالیس کلومیٹر تھا۔ شاد پورہ سے باہر ہی آموں کا ایک بڑا باغ تھا۔ اس باغ کے اندر ایک کھلے احاطے والا گھر تھا۔ یہ باغ اور جگہ کبیر احمد نامی ایک ادھیڑ عمر شخص کی ملکیت تھی۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا اور بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ دو تین سال پہلے کبیر کو راجا نے ایک بڑے حادثے سے بچایا تھا۔ ان دنوں کبیر کی اپنی ٹریکٹر ٹرالی تھی۔ وہ پھل بیچ کر خوشاب منڈی سے گاؤں واپس آ رہا تھا۔ ٹونا کے قریب اسے موٹر سائیکل سوار راہزنوں نے روک لیا اور لوٹنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ فائر کی آواز سن کر راجا اپنے لوڈر پر وہاں پہنچا۔ اس کے پاس پستول تھا۔ اس نے ہوائی فائر کئے اور ڈاکوؤں نے اس پر سیدھی فائرنگ کر دی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ ڈاکوؤں کا ایک ساتھی شدید زخمی ہوا، دوسرے کو راجا نے پکڑ لیا تھا۔ اردگرد کے کھیت مزدور موقع پر پہنچ گئے اور ڈاکو فرار ہو گئے۔

کبیر احمد اس واقعے کے بعد راجا کا بہت زیادہ احسان مند تھا۔ اس نے دو تین بار راجا کو خط لکھا کہ وہ اس کے پاس شاد پورہ آئے۔ وہ خود تو ٹانگ کے زخم کی وجہ سے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب راجا، عمو اور شبانہ سمیت اس شخص کے پاس پناہ کے لئے پہنچا تھا۔

چالیس پینتالیس سالہ کبیر احمد ایک خوش اخلاق اور ہمدرد شخص ثابت ہوا۔ اس نے ان تینوں کو محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر ہیں۔ راجا نے کبیر احمد کو اصل کہانی تو نہیں سنائی تھی، تاہم بتایا تھا کہ ایک دشمنی کی وجہ سے اسے کم از کم ڈیڑھ دو ماہ کے لئے یہاں پناہ چاہئے۔ کبیر احمد نے مسکرا کر کہا۔ ''ڈیڑھ دو ماہ کیا یار! تم ویسے ہی یہاں پر ٹک جاؤ۔ یہ دیکھو، باغ اجڑ رہا ہے۔ میرا آگے پیچھے کون ہے جو اسے سنبھالے گا۔ گھر والی اللہ کے پاس چلی گئی ہے۔ ایک بیٹی تھی جو بیاہ کر اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ بیٹا ایسا دبئی گیا ہے کہ اس نے چھ سال سے پلٹ کر نہیں دیکھا۔''

یہ بڑی ٹھنڈی اور پُرسکون جگہ تھی۔ ہر طرف درختوں کے سائے تھے۔ کبیر نے ایک چھوٹا ٹیوب ویل لگا رکھا تھا جسے پپی کہتے تھے۔ یہ پپی ڈیزل انجن سے چلتی تھی۔ کبیر نے شاید اپنی تنہائی کم کرنے کے لئے بہت سی مرغیاں بطخیں اور طوطے پال رکھے تھے۔ کچھ بطخیں اور مرغیاں بہت مہنگی تھیں جنہیں وہ لاہور سے لے کر آیا تھا۔ کبیر یہاں اپنے نہایت قابلِ اعتماد ملازم محمد شریف اور اس کی بیوی مریم کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دونوں بے اولاد تھے۔ کبیر نے عمو کو پتر اور شبانہ کو دھی رانی کہہ کر بلانا شروع کر دیا۔ راجا کو وہ اس کے نام سے بلاتا تھا۔ راجا اسے وڈھا بھا کہتا تھا۔ گاؤں میں کبیر نے اپنے ملنے والوں کو یہی بتایا کہ یہ اس کے دور پار کے رشتے دار ہیں۔

وہ تینوں ایک نہایت محفوظ مقام پر آ گئے تھے، اس کے باوجود راجا، عمو اور شبانہ کے دلوں میں ماجھاں کی موت کا خوف موجود تھا۔ یقینی بات تھی کہ علاقے میں بڑی کھلبلی مچی ہو گی۔ شبانہ کو یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اس واقعے کی وجہ سے اس کی والدہ اور دیگر رشتے داروں پر کوئی آفت نہ آئے۔ وہ ہر وقت گم صم رہتی۔ عمو اور راجا اس کی دل جوئی میں لگے رہتے۔ وہ ہر آہٹ پر چونک جاتی۔ ہر اجنبی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ بہرحال جب بیس پچیس روز خیریت سے گزر گئے تو بتدریج ان کا خوف کم ہونے لگا۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ وہ یہاں خیریت سے ہیں۔

ایک روز، رات کو بڑی مزیدار ہوا چل رہی تھی۔ عمو اور راجا گھر کی چھت پر چارپائیاں ڈالے لیٹے تھے اور سگریٹ پھونک رہے تھے۔ عمو نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ''بھا راجا! میری ماں کا پتا کراؤ۔ اللہ جانے وہ کس حال میں ہو گی۔ وہ تو میرے بغیر ایک دن بھی بڑی مشکل سے گزارتی تھی۔ یہ ڈیڑھ دو سال اس نے پتا نہیں کیسے گزارے ہوں گے۔''

راجا بولا۔ ''جو کچھ تُو سوچ رہا ہے، میں بھی وہی سوچ رہا ہوں لیکن یارا! ابھی دو چار ہفتے ہمیں بالکل سکون سے گزارنے چاہئیں اور کسی طرح کا چھوٹا بڑا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔''

''لیکن بھا راجا......''

''میں تیرے اندر کی حالت سمجھتا ہوں عمو۔ تُو فکر نہ کر۔ میں نے اس بارے میں شریف سے تھوڑی بہت بات کی تھی۔ وہ بالکل ایک نمبر کا سچل بندہ ہے۔ ہر لحاظ سے بالکل ٹیٹ۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے تیرے گھر کا ایڈریس دے کر شیخوپورہ بھیجوں۔ سب کچھ معلوم وہ کر لے گا۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم ماں جی کو یہیں بلا لیں۔''

اس رات وہ اس بارے میں دیر تک بات کرتے رہے۔ شبانہ کا معاملہ بھی زیر بحث

آیا۔ راجا نے عمو کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ''میں تو ایک بات جانتا ہوں عمو! جو کرنا ہے کرو، دنیا سے مت ڈرو۔ یہ دنیا کمینی ایک دم کنڈم ہے۔ تم شبانہ سے پیار کرتے ہو، وہ تم سے کرتی ہے۔ اس کا پہلا رشتہ کنڈم ہو چکا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں کسی مولوی کو بلا لاتے ہیں۔ ایک ٹیٹ سا کھانا پکاتے ہیں۔ خود کھاتے ہیں، مولوی صاحب کو بھی کھلاتے ہیں اور تمہارے دو بول پڑھا دیتے ہیں۔''

''یہ اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے بھا راجا! کم از کم ماں کو تو یہاں ہونا چاہئے اور پھر ابھی تو میں نے شبو سے بھی ٹھیک طرح بات نہیں کی۔ کیا پتا، وہ اس طرح شادی پر راضی بھی ہو یا نہیں۔''

''تو بھی نرا بدھو ہے۔ پیارے، ہم زنانی کی چال دیکھ کر اس کے پورے خاندان کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔ وہ تجھ پر سو جان سے مرتی ہے کھوتے۔ ہاں، ماں کے یہاں پہنچنے والی بات پر غور کیا جا سکتا ہے۔''

اچانک رات کے سناٹے میں بطخوں کی خوفناک قیں قیں گونجی اور اس کے ساتھ ہی شکاری کتے کا زبردست شور سنائی دیا۔ عمو اور راجا بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اُترے۔ صحن کا منظر خوفناک تھا۔ راجا کا گرے ہاؤنڈ کتا جسے اس کی شعلہ مزاجی کی وجہ سے راجا علیحدہ پنجرے میں بند کرتا تھا، کسی طرح باہر نکل آیا۔ شاید پنجرے کا دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہوا تھا۔ اب یہ کتا کبیر احمد کی نایاب بطخوں پر حملہ آور تھا۔ وہ ایک بطخ کو ادھیڑ کر پھینک چکا تھا اور اب دوسری پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ کبیر احمد بھی اپنی بیساکھی کے سہارے باہر نکل آیا تھا اور بری طرح چلا رہا تھا۔ کتے نے اب جس بطخ کو منہ میں دبوچا تھا، وہ نر یعنی بطخا تھا۔ چھ مادہ بطخوں کے لئے یہ نر کبیر احمد نے بڑی مشکلوں سے ڈھونڈا تھا۔ اب یہ پرندہ کسی بھی وقت ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتا تھا۔

''پارے...... پارے۔'' راجا نے کتے کو اس کے نام سے پکارا اور اسے روکنے کی کوشش کی۔

کتے نے فقط ایک سیکنڈ کے لئے تڑپتے ہوئے بطخے کو چھوڑا اور دوبارہ پکڑ لیا۔ وہ پوری طرح مشتعل تھا۔ ''چھوڑ دے پارے۔ میں کہتا ہوں چھوڑ۔'' راجا نے ایک بار پھر پارے کے پٹے پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

عمو بے ساختہ راجا کی مدد کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے بھی پارے کو اس کے نام سے پکارا۔ یکا یک صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہوئی۔ کتے نے زخمی پرندے کو چھوڑا اور

زبردست شور مچاتا ہوا احاطے میں چکرانے لگا۔

''رک جا پارے...... رک جا۔'' عمو اس کے راستے میں آیا۔

یہ عمل خطرناک تھا مگر کارگر رہا۔ کتا عمو کے اردگرد چکرانے لگا۔ پھر چند ہی سیکنڈ بعد اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ عمو نے اس کی تھوتھنی سہلائی۔ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اپنے کلاوے میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے راجا کو اشارہ کیا۔ وہ پہلے سے تیار تھا، اس نے آگے بڑھ کر کتے کے منہ پر حفاظتی جالی چڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اسے دوبارہ پنجرے کے اندر پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

بڑے سائز کے خوب صورت بطخے کو زخم تو آئے تھے مگر طبی امداد سے اس کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ کبیر احمد اور شریف اسے لے کر جلدی سے گودام کی طرف چلے گئے۔

اس واقعے نے راجا کی نظر میں عمو کی اہمیت اور بڑھا دی۔ عمو پر اس کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوا۔ اگلی صبح جب ایک گرم اور طویل دوپہر کی شروعات ہو رہی تھی اور وہ گھنے باغ کی ٹھنڈی چھاؤں میں چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے، راجا نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''عمو یار! تیرے اندر کوئی بات ہے ضرور۔ شاید کسی پیر فقیر کی دعا ہے تجھے۔ پالتو جانور تجھ سے بڑی جلدی ہل جاتے ہیں۔''

''یہ بات تم ہی مجھے بتا رہے ہو۔ پہلے تو کسی نے نہیں کہا۔''

''پہلے کسی نے غور ہی نہیں کیا ہو گا۔ پر میرا تو کام ہی جانوروں کو سدھانا ہے...... خاص طور سے اڑیل جانوروں کو۔''

''اچھا بھا راجا! مجھے یاد آیا، جب ہم ماجھاں کی حویلی سے نکلنے کا پروگرام بنا رہے تھے، تم نے کہا تھا کہ تمہاری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔''

''ہاں...... لیکن وہ کوئی ایسی خاص شرط نہیں ہے۔ تم آسانی سے پوری کر سکتے ہو...... بلکہ اب تو یہ تمہارے فائدے میں بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ عرصہ میرے ساتھ...... میرے پاس ہی رہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم گھوڑوں اور شکاری کتوں کو سدھانے میں میری زبردست مدد کر سکتے ہو۔ اگر میں تمہیں کچھ خاص خاص گر بتا دوں تو تم دیکھتے ہی دیکھتے ماسٹر بن سکتے ہو اور میں تمہیں سچ کہتا ہوں، اس کام میں بڑا فائدہ ہے۔ ایک سدھایا ہوا ٹیٹ نسل کا کتا آرام سے پندرہ وی ہزار کا بک جاتا ہے۔ خرچہ وغیرہ نکال کر اس میں سے سات آٹھ ہزار تو بچ ہی جاتا ہے۔ یہ چودھری لوگ پیسے دے کر اپنے گھوڑوں کو بھی شکار کے لئے ٹرینڈ کرواتے ہیں۔''

"پر بھا راجے! میں تو ماں اور شبو کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور پتا نہیں وہ یہاں رہنا چاہیں گی یا نہیں؟"

"جب ساری بات کا پتا تمہاری امی کو چلے گا تو دیکھنا وہ خود کہے گی کہ تم ابھی یہیں رہو۔ ماجھاں کی جان نہ جاتی تو پھر اور بات تھی۔ پر اب تو اس کے وارث ہم تینوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ وہ ہمیں دور دور تک ڈھونڈیں گے۔ ہم تینوں جتنے محفوظ اس جگہ ہیں، کہیں اور ہو ہی نہیں سکتے۔"

راجا کی باتوں میں وزن تھا۔ ابھی تک اس کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ عمو اس کے بارے میں شک وشبہے کا شکار ہوتا۔ اس میں کچھ خامیاں خرابیاں ضرور تھیں۔ وہ شراب اور عورت کا شوقین بھی تھا لیکن عمو اور شبانہ سے اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ شبانہ کے ساتھ اس کا رویہ بڑے بھائی جیسا تھا۔

رات کو عمو سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو وہ ساری باتیں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں جو آج دوپہر راجا کے ساتھ ہوئی تھیں۔ کل رات اس نے جس طرح مشتعل پارے کو کنٹرول کیا اور سنبھالا تھا، وہ خود اس کے لئے بھی حیران کن تھا۔ وہ سوچنے لگا کیا واقعی اس میں کوئی خاص صلاحیت موجود ہے...... یا پیدا ہو رہی ہے؟ اسے کئی باتیں یاد آنے لگیں...... جب ایک موقع پر ماجھاں نے سخت ناراض ہونے کے بعد اسے کتوں والی کوٹھڑی میں بند کرا دیا تھا تو وہ بہت سہما ہوا تھا۔ اسے پتا تھا کہ خوفناک کتے یہاں اس کا جینا حرام کر سکتے ہیں لیکن پھر ایک دو دن میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کتوں نے اس کمرے میں اسے اپنے ساتھ شریک کر لیا ہے۔ اس صورتِ حال نے ماکھے اور کالیے وغیرہ کو بھی حیران کیا تھا۔ پھر اسے ڈیرے کی بھوری بھینس والا واقعہ یاد آیا۔ یہ بڑی شان دار بھینس تھی لیکن دودھ دھونے کے لئے کسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔ سب کوشش کر کے ہار گئے تھے مگر عمو نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے رام کر لیا تھا۔

یہ باتیں یاد کر کے عمو کے اندر خوشی کی ایک لہر سی دوڑنے لگی۔ اس نے کہیں سے سنا تھا کہ قدرت جب دکھ دیتی ہے تو اس کا مداوا بھی کرتی ہے۔ کئی دفعہ دکھ بہت بڑا ہوتا ہے۔ انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے لیکن اس کا مداوا بھی کسی صورت آس پاس ہی موجود ہوتا ہے...... اور اگر انسان ہمت نہ ہارے تو یہ "مداوا" اسے ملتا ہے۔ عمو کے لئے ماں سے جدائی کا دکھ بھی بہت بڑا تھا...... ناقابلِ بیان و ناقابلِ برداشت...... عمو نے یہ دکھ جھیلا تھا، شاید اسی دکھ کے اندر سے خوشی اور صلاحیت کی یہ چھوٹی سی کونپل پھوٹی تھی......

عمو عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اس کے پہلو میں راجا اپنی چارپائی پر سو رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر کبیر احمد اور شریف کی چارپائیاں تھیں۔ شبو نیچے برآمدے میں شریف کی بیوی کے ساتھ سو رہی تھی۔

عمو ننگے پاؤں آہستہ آہستہ کچی سیڑھیاں اُتر کر نیچے احاطے میں آ گیا۔ پارے کے پنجرے کی چابی اس نے راجا کے تکیے کے پاس سے اُٹھا لی تھی۔ وہ پارے کے پنجرے تک پہنچا۔ پارا ایک غیر معمولی قد کاٹھ والا، نہایت طاقتور لیکن خطرناک جانور تھا۔ راجا بھی فی الحال اس کے قریب جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ عمو نے اس کا پنجرہ کھولا۔ ایک عجیب سا اعتماد تھا عمو کے اندر...... سینے میں سنسنی خیز دھڑکنیں جاگی ہوئی تھیں۔ اپنے غیر معمولی اعتماد کے سہارے ہی عمو نے ہاتھ بڑھائے اور بگیاڑی یعنی حفاظتی جالی پارے کی تھوتھنی سے اُتار دی۔ دروازہ کھلتے ہی پارا عمو کی طرف آیا۔ اس نے سیدھا اس کی گردن پر جھپٹا مارا۔ وہ چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں عمو کی شہ رگ ادھیڑ سکتا تھا لیکن یہ دوستانہ جھپٹا تھا۔ وہ اس کی گردن سے اپنی گرم تھوتھنی رگڑنے لگا۔ اس کا پارا صفت جسم مچل رہا تھا اور دُم کی گردش بڑی تیز تھی۔ عمو نے اس کی کمر اور تھوتھنی پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا تو اس کی بے قراری کم ہوتی چلی گئی۔ اب وہ عمو کے پاؤں میں لوٹ رہا تھا اور ہولے ہولے اپنا جسم اس کے جسم سے رگڑ رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی آواز میں پسندیدگی کا اظہار تھا۔

یک لخت عمو چونک گیا۔ ڈری ہوئی تیز سرگوشی عمو کے بالکل پاس سے اُبھری۔ "یہ کیا کر رہے ہو عمو؟"

عمو نے مڑ کر دیکھا، یہ شبو تھی۔ مدھم چاندنی میں اس کی پھول دار اوڑھنی سینے پر پھیلی ہوئی تھی اور بال جواب کافی بڑے ہو گئے تھے، ریشم کی طرح چمک رہے تھے۔

"کچھ نہیں شبو۔ یہ بالکل رام ہے...... دیکھو...... کیسے لاڈ کر رہا ہے۔"

"لل...... لیکن یہ تو بہت خطرناک ہے۔ اس نے تو راجا بھائی کو بھی زخمی کر دیا تھا۔"

"مگر ہمیں نہیں کرے گا۔ یہ دیکھو، کس طرح لوٹیں لگا رہا ہے۔" عمو نے سرگوشی میں کہا۔ شبو حیرت زدہ تھی۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔

عمو اسے سہلا رہا تھا، پچکار رہا تھا اور گاہے بگاہے اپنے ساتھ لپٹا رہا تھا۔ شبانہ ڈرے ہوئے انداز میں کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ پھر عمو نے شبانہ کا حوصلہ مزید بڑھانے کے لئے اپنی ننگی کلائی پارے کے کھلے ہوئے جبڑے میں دے دی۔ ایک یقین تھا کہ پارا اسے نقصان نہیں پہنچائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ پارے نے عمو کی کلائی اپنے نہایت نکیلے دانتوں میں ہولے

سے دبائے رکھی اور اپنی ادائیں دکھاتا رہا۔

"کہا ہے نا پاس آ جاؤ۔ کچھ نہیں کہے گا۔" عمو نے سرگوشی میں شبانہ کو پاس بلایا۔

وہ ہمت کر کے دو قدم آگے آ گئی مگر وہ اب بھی خوف زدہ تھی۔ عمو بولا۔ "چلو اس کی کمر پر ہتھ لگاؤ۔"

"نہیں...... نہیں۔" وہ کچھ اور سمٹ گئی۔ "اس کو پنجرے میں بند کر دو۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر کے عمو نے پارے کو پنجرے کی طرف بلایا۔ وہ جو پنجرے میں واپس جاتے ہوئے راجا کو ناکوں چنے چبوا دیتا تھا، فوراً ہی پنجرے میں چلا گیا۔ دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد عمو شبانہ کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں لکڑی کے خالی کریٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے بچھی چارپائی پر جا بیٹھے۔ آج وہ کافی دنوں بعد ملی تھی۔ عمو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پھر بے قراری سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "یہ...... تم سب کیسے کر لیتے ہو عمو؟" وہ اس کے سینے سے لگی لگی منمنائی۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے مالکن کے اتھرے گھوڑے ہیرے کو رام کر لیا۔ بھوری جیسی اڑیل بھینس تمہیں دودھ دینے لگی۔ تم کیا کرتے ہو؟"

"تمہیں بتاؤں؟" وہ دبی دبی شرارت سے بولا۔

"ہاں بتاؤ۔" وہ معصومیت سے کہنے لگی۔

عمو نے اسے اپنے ساتھ بھینچا۔ شبو نے خود کو پیچھے ہٹایا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"بتاؤ نا؟"

عمو نے گہری سانس لی اور مدھم چاندنی میں اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "سچی بات ہے شبو! میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ بھارا جا کہتا ہے کہ میرے ہتھ میں کرامات ہے۔ جانور مست ہو جاتا ہے......" پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا تم کو لگا ہے کہ میرے ہتھ میں کرامات ہے۔"

"کیا مطلب؟"

عمو نے بڑی نرمی سے اس کا ملائم گال سہلایا اور بولا۔ "کچھ لگا تمہیں؟"

وہ اس کی بات سمجھ کر ایک دم اپنے آپ میں سمٹ گئی اور شرما کر بولی۔ "تم بڑے خراب ہو۔ کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔ میں چلتی ہوں۔"

"تم...... مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟"

"تم سے نہیں...... لوگوں سے ڈرتی ہوں۔"

"کیا...... تمہارا دل نہیں چاہتا...... میرے پاس بیٹھنے کو؟"

"چاہتا ہے...... پر...... اس طرح سے نہیں۔" وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

عمو کے اندر جیسے ایک دم سے کوئی روشنی بجھ گئی۔ وہ اداس ہو گیا۔ شبو جو جانے کے لئے بالکل تیار تھی، عمو کی اداسی محسوس کر کے رک گئی۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر شبو نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

عمو بولا۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شبو...... جیسے جو کچھ ہے میرے ہی دل میں ہے۔ تیرے دل میں کچھ نہیں۔ بس مجبوری کی وجہ سے تو میرے ساتھ ہے۔"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہی، تب عجیب لہجے میں بولی۔ "عمو! تجھے پتا ہے کہ میرا رشتہ کیوں ٹوٹا؟"

"کیوں ٹوٹا؟"

"اس لئے میں نے اپنے پنڈ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ جب مالکن کے بندے مجھے اور تمہیں دریا سے پکڑ کر واپس لائے اور مالکن نے ہم دونوں کو مارا پیٹا تو اس کے ڈیڑھ دو مہینے بعد مالکن کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میری ماں نے اس کا منت ترلا کیا، اس کے پاؤں کو ہتھ لگائے اور اس نے ماں کو اجازت دے دی کہ وہ مجھے حویلی سے لے جا سکتی ہے۔ جہاں میرا رشتہ ہوا تھا، ان لوگوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوا تھا۔ وہ میری ڈولی لے جانے کو تیار تھے، پر میں نے کہا کہ میں پنڈ نہیں جاؤں گی۔ میں...... میں تمہارے پاس رہنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ حویلی میں کسی وقت میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے، پر میں تمہاری دوری برداشت نہیں کر سکتی تھی......" شبو کی آواز بھرا گئی۔

عمو ٹھٹکا ہوا اس کی جانب دیکھتا رہا۔ اس حوالے سے ان دونوں میں چند سوال جواب مزید ہوئے۔ عمو کو یقین ہو گیا کہ شبو جو کچھ بتا رہی ہے، ویسا ہی ہوا ہے۔ اس کا اپنا دل بھی بھر آیا۔ اس نے شبو کو پھر گلے سے لگا لیا۔ وہ اس کے بھیگے رخساروں کو چومنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھونے لگے۔

عمو نے کہا۔ "شبو! بھارا جا کہتا ہے، ہم دونوں شادی کر لیں۔"

"اپنے بڑوں کے بغیر ہم اکیلے یہ کیسے کر سکتے ہیں عمو! ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی تو مجھے ہر ویلے اپنی ماں اور ماموؤں کی فکر لگی رہتی ہے۔ ہماری برادری کافی بڑی

ہے، پر سارے غریب لوگ ہیں۔ اگر مالکن کے مرنے کی وجہ سے ان پر کوئی آفت آئی تو وہ تو رُل کر رہ جائیں گے......"

"بھاراجا کہتا ہے، بس دو چار ہفتے گزر جائیں تو وہ شریف کو بھیج کر سارے حالات کا پتا کرالے گا۔ پھر ہوسکتا ہے کہ کسی طرح میری اور تمہاری ماں بھی یہاں پہنچ جائیں۔ یا ہم ہی کہیں جا کر ان سے مل سکیں۔"

شبانہ الجھی الجھی نظروں سے عمو کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں چاندنی کا عکس تھا اور ایک سوالیہ رنگ بھی تھا۔ وہ بولی۔ "عمو! ایک بات سچ بتانا۔ اس دن تم نے جان بوجھ کر مالکن ماجھاں کا کڑا گاڑی کے کنڈے سے نہیں چھڑایا تھا نا؟"

وہ ذرا توقف سے بولا۔ "نہیں شبو...... میں نے تھوڑی سی کوشش تو کی تھی...... شاید اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔"

"نہیں عمو! تم نے کوشش نہیں کی تھی...... بلکہ...... شاید تم نے یہ کوشش کی تھی کہ کہیں کڑا چھوٹ ہی نہ جائے...... بولو...... ایسا ہی ہے نا؟"

عمو کچھ دیر خاموش رہا، تب گہری سانس لے کر بولا۔ "اگر تم جانتی ہو تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ "عمو! تم اپنی ماں سے بہت پیار کرتے ہو نا...... اور تم نے ماجھاں کو اس لئے اس طرح مارا نا کہ وہ تمہاری ماں کو گالیاں دیتی تھی؟ بولو، ایسا ہی ہوا نا؟"

عمو کے نوخیز چہرے پر چٹان کی سی سختی نمودار ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اندرونی کمروں سے کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر شریف کی بیوی مریم کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "شبو...... شبو...... کہاں ہو؟"

"ہائے میں مرگئی۔" شبو نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرا اور اوڑھنی سنبھالتی ہوئی اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ عمو کچھ دیر تک اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ جب اندرونی حصے میں خاموشی چھا گئی اور وہ دونوں چارپائیوں پر لیٹ گئیں تو عمو پنجرے میں پارے کو پچکارنے کے بعد اوپر چھت کی طرف چلا گیا۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک شبو کے بارے میں سوچتا رہا۔ ماجھاں کے مویشی خانے میں اس کا دوست مولا کہا کرتا تھا، عورت ایک بجھارت کی طرح ہوتی ہے...... اس کا اندر باہر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ آج اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ ایک موقع پر ماجھاں نے شبو کو حویلی سے جانے کی

اجازت دے دی تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر حویلی کے خطروں کو نظرانداز کیا تھا اور وہیں پر اس کے ساتھ رہی تھی۔ اس طرح وہ اپنے رشتے سے بھی جان چھڑانے میں کامیاب ہوگئی تھی اور یہ سب کچھ عمو کے لئے تھا۔ تین چار ہفتے بعد عمو کے لئے شدید پریشانی کا دور شروع ہوا۔ راجا نے وعدے کے مطابق شریف کو عمو کی والدہ کا اتا پتا دے کر شیخوپورہ بھیجا اور اسے ساری ضروری ہدایات بھی دیں۔ شریف کی واپسی پورے چھ دن بعد ہوئی۔ عمو بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شریف کو عمو کے گاؤں سے پتا چلا کہ کوئی ایک سال پہلے عمو کی ماں شریفاں بی بی بیٹے کی جدائی میں سخت بیمار ہوگئی تھی۔ عمو کے پنڈ میں یہی مشہور تھا کہ عمو کی والدہ شریفاں بی بی اور گاؤں کے چودھری سجاول کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کے مطابق شریفاں کے پتر عمران عرف عمو کو قریباً ڈیڑھ سال تک شہنشاہ پیر کے مزار پر خادم بن کر رہنا تھا تاکہ چودھری کے پتر پر سے آسمانی بجلی والی نحوست ختم ہو سکے۔ اس کام کے لئے شریفاں بی بی نے چودھری سجاول سے کافی سارے پیسے لئے تھے اور اپنی زمین کے کاغذات وغیرہ بھی ٹھیک کروائے تھے۔ اس نے چودھری سجاول سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا پتر عمو پورے سترہ چاندوں تک شہنشاہ پیر کے مزار پر چاکری کرے گا لیکن صرف پانچ مہینے بعد ہی اس کا پتر عمو مزار سے فرار ہوگیا۔ اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی گئی، پر وہ نہیں ملا۔ کسی نے بتایا کہ وہ کراچی کی طرف نکل گیا ہے۔ مزار سے بھاگتے وقت اس نے مزار کا چندے والا گلا بھی توڑا تھا اور اس میں سے تین چار ہزار روپے نکال کر لے گیا تھا۔ صادق شاہ صاحب نے کہا تھا کہ چودھری سجاول کے پتر والی نحوست اب اس بھگوڑے کے پیچھے ہے اور وہ کہیں بھی چلا جائے، چین سے نہیں رہ سکے گا...... یہی حالات تھے جن میں عمو کی والدہ بیمار پڑی اور اس نے اپنی زمین اونے پونے داموں بیچ دی۔ اس کے بعد ایک دن پتا چلا کہ وہ پنڈ چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کو بہت ڈھونڈا گیا مگر کہیں خبر نہیں ملی۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے اپنے پتر عمو کا پتا چل گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس پہنچ گئی ہے اور اب وہ سندھ کے کسی شہر میں چین سکون سے رہ رہے ہیں۔

شریف نے عمو کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "عمو! میں پوری پوری پرچول کر کے آیا ہوں۔ تمہارے پنڈ میں دو دن رہنے کے بعد میں کوٹ لکھپت میں تمہارے رشتے دار نوازش علی کے گھر پہنچا۔ وہاں سے بھی ساری بات پتا کی۔ بھائی نوازش نے بھی وہی کچھ بتایا جو تمہارے پنڈ سے پتا چلا تھا۔ اس کے بعد میں ملتان گیا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہاں ایک عورت تمہاری والدہ کی پرانی سہیلی ہے بلکہ منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔ تمہاری والدہ وہاں بھی نہیں

تھی۔ صغراں نامی یہ عورت خود بھی تمہاری والدہ کی گمشدگی پر سخت پریشان ہے اور کئی مہینوں سے اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔''

شریف کی باتیں سن کر عمو کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ اسے لگا جیسے اس کے اردگرد ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی ہے۔ اس کے ننگے پاؤں کے نیچے جلتی زمین ہے اور وہ اپنی ماں کو آوازیں دیتا پھر رہا ہے۔ کہیں...... اس کی ماں کو کچھ ہو ہی نہ گیا ہو۔ وہ بیمار تھی، اس کی جدائی میں ٹوٹی ہوئی تھی، کوئی آسرا دینے والا نہیں تھا اسے۔ وہ کہاں گئی ہوگی؟ اس کی صورت دیکھنے کے لئے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی رہی ہوگی۔

اسے صادق شاہ پر، اس کے چار درویشوں پر اور چودھری سجاول وغیرہ پر بے پناہ غصہ آیا۔ اس کے سینے میں شعلہ بن جانے والی بغاوت کی چنگاری اب الاؤ کا روپ دھارنے لگی۔ ہاں، اب وہ کمزور نہیں تھا۔ اب وہ بہت کچھ کر سکتا تھا اور اسے پتا تھا کہ اگر اس کی ماں نہ ملی تو وہ ''ذمے داروں'' کو دن میں تارے دکھا دے گا۔ ہاں...... وہ کافی بدل چکا تھا۔ وہ چاقو بھی ہر وقت اس کے پاس رہتا تھا جس سے اس نے دو ماہ پہلے ماکھے کی ٹانگوں پر مہلک وار کئے تھے۔

O......❖......O

شریف نے اپنا کام یقیناً ذمے داری سے نبھایا تھا مگر عمو جب تک خود ماں کو نہ ڈھونڈتا، اس کی تسلی کیسے ہوسکتی تھی۔ قریباً ایک ماہ بعد وہ راجا کے ساتھ بڑی خاموشی سے لاہور پہنچا اور پھر اپنے خالو نوازش علی سے ملاقات کی۔ خالو نوازش علی عمو کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ''اوئے عمران! تُو تو ایک دم جوان ہو گیا ہے۔'' اس کے خالو نے لرزتی آواز میں کہا۔

عمو اور راجا دو دن نوازش علی کے گھر میں رہے۔ انہوں نے اپنے پتے ٹھکانے کے بارے میں نواز علی کو کچھ نہیں بتایا تاہم اس سے سارے حالات پوچھے...... خاص طور سے عمو نے اپنی والدہ کے حوالے سے سب کچھ جاننے کی کوشش کی۔ اس ساری بھاگ دوڑ میں صرف ایک نئی بات معلوم ہوسکی اور وہ یہ کہ عمو کی والدہ نے زمین بیچی نہیں تھی بلکہ اسے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ قیمتی زمین اونے پونے بیچ دے اور یہ زمین اپنے ایک مزارعے کے ذریعے دراصل چودھری سجاول نے ہی خریدی تھی۔ دولت، طاقت اور جبر کی وہی صدیوں پرانی کہانی...... غربت، کمزوری اور لاچاری کی وہی قدیم روداد۔

عمو شاد پورہ واپس آ گیا۔ دل میں بے پناہ درد لئے ہوئے...... وہ دیوانوں کی طرح اپنی ماں کی تلاش میں گھومنا چاہتا تھا لیکن راجا نے اسے سمجھایا۔ ''ابھی ماجھاں کی موت والا

واقعہ تازہ ہے۔ ہم زیادہ گھومیں پھریں گے تو ہمارے لئے ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ ابھی ہمیں چار چھ ماہ بالکل چپ کر کے گزارنے پڑیں گے۔''

عمو شاد پورہ یوں واپس آیا جیسے کوئی اپنا سب کچھ لٹا کر کسی ویرانے میں آ جاتا ہے۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا، کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ بھوک نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس کی سوچیں بس اپنی ماں کے گرد ہی گھومتی تھیں۔ کہیں وہ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر تو نہیں چلی گئی؟ یہ سوال تیر کی طرح اس کے دل میں لگتا تھا اور اس کی دنیا اندھیر ہو جاتی۔

ان جاں گسل لمحات میں اگر اسے شبو کی ڈھارس اور بے لوث محبت میسر نہ ہوتی تو شاید وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ وہ اس کی امید بندھاتی تھی۔ اس کے اندر آس جگاتی کہ اس کی ماں زندہ ہے اور ایک دن ضرور وہ اس کے سینے سے لگے گا۔ راجا اور شبانہ کی کوششوں سے دھیرے دھیرے عمو کو کچھ قرار آنے لگا۔ وہ مایوسی کے اندھیرے میں آس کی روشنی جلا کر دھیرے دھیرے قدم اُٹھانے لگا۔

پارے جیسا خوفناک کتا اب عمو کا بالکل مطیع ہو چکا تھا۔ وہ اس کے اشاروں پر چلتا...... کبیر احمد، شریف اور شبو وغیرہ عمو کے لیے اس کی اطاعت مندی دیکھ کر حیران ہوتے...... اور بات صرف اکیلے پارے ہی کی نہیں تھی، دوسرے جانور بھی بہت جلد اس سے مانوس ہو جاتے۔ راجا ہاؤنڈ نسل کے جو نایاب پلے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، وہ تیزی سے بڑے ہو رہے تھے۔ راجا نے انہیں شکار کے لئے سدھانے کا کام عمو کو سونپا تھا اور وہ یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔ یوں لگتا کہ اسے زیادہ محنت ہی نہیں کرنی پڑتی، جانور خود بخود اس کی مرضی ومنشا سمجھنے لگتا ہے۔

کچھ دن بعد راجا کہیں سے دو مشکی گھوڑے لے کر آیا۔ یہ بھی ماجھاں کے ہیرے کی طرح اوّل درجے کے سرکش جانور تھے۔ دونوں بھائی تھے۔ ان کے رنگ ڈھنگ بالکل ایک جیسے تھے۔ اگر راجا انہیں خود سدھانے کی کوشش کرتا تو شاید اس کے لئے مہینوں درکار ہوتے لیکن عمو کے ساتھ مل کر اس نے تین چار ہفتوں میں ہی گھوڑوں کو ایک دم سواری اور شکار کے لئے ٹرینڈ کر دیا۔ راجا دونوں گھوڑوں کو اپنے ''پاٹے خاں'' پر لاد کر لے گیا اور اس زمیندار کو دے آیا جس سے لے کر آیا تھا۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی ایک دو گھوڑے، کبھی دو چار کتے وہاں کبیر احمد کے باغ میں پہنچنے لگے۔ راجا اور عمو انہیں مل کر سدھاتے۔ گھوڑوں کو ڈلکی اور سرپٹ چال سکھاتے۔ مالک کے اشاروں کو سمجھنے کی تربیت دیتے، کتوں کو پلٹنے اور جھپٹنے کی ٹریننگ

دیتے۔ شکار کو پکڑنے اور پھر مالک تک لانے کا طریقۂ کار انہیں سمجھاتے...... یہ دلچسپ لیکن نہایت مشکل اور کسی حد تک خطرناک کام تھا۔ عمو کی موجودگی نے اس کام کو آسان کر دیا بلکہ اب زیادہ تر ذمے داری وہ خود اُٹھا رہا تھا۔ جانور کی تربیت مکمل ہو جاتی تو راجا اسے مالک کے پاس واپس لے جاتا...... یا پھر مالک خود وہاں آ جاتا اور ایک دو روز وہیں باغ میں رہ کر اپنے اور اپنے جانور کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا...... کام کا معاوضہ وغیرہ راجا ہی وصول کرتا۔ وہ اخراجات کے لئے عمو کو معقول رقم دے دیتا تھا۔ ویسے بھی وہ ہر طرح عمو اور شبانہ کا خیال رکھتا تھا۔ بہرحال اس کی خامیاں خرابیاں بھی اس کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ گاہے بگاہے اپنی دل پشوری کے لیے اپنے ''پاٹے خاں'' سمیت باغ سے غائب ہو جاتا اور اگلے دن یا پھر ایک دن بعد واپس آ جاتا۔

زندگی ایک ہموار رفتار سے آگے بڑھنے لگی تھی۔ جون، جولائی کے دن تھے۔ پھل پک کر تیار ہو چکا تھا۔ کبیر احمد کے لئے چلنا پھرنا اب مزید دشوار ہو گیا تھا۔ وہ ٹانگ کے ساتھ ساتھ اپنے ایک کولہے کو بھی مفلوج محسوس کرتا تھا اور وہیل چیئر استعمال کرنے لگا تھا۔ وہ، شریف، اس کی بیوی اور دو ملازم لڑکے سارا دن باغ کے کاموں میں مصروف رہتے۔ اکثر شبانہ بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگتی۔ راجا اور عمو ایک کھلے احاطے میں گھوڑوں کو دوڑاتے، ان پر سواری کرتے، بانس یا رسّی کے سرے پر گوشت کے ٹکڑے باندھ کر شکاری کتوں کو پلٹنے جھپٹنے کی تربیت دیتے۔ عمو شعلہ مزاج جانوروں کا سامنا بالکل بے خطر ہو کر کرتا اور راجا حیرت سے دیکھتا رہ جاتا۔ طویل گرم دوپہروں میں جب ہر طرف سناٹا چھا جاتا، وہ باغ کی ٹھنڈی چھاؤں میں چارپائیاں ڈال لیتے...... پمپی کے شفاف پانی میں نہاتے، اپنے باغ کے آم چوستے اور کچی لسی کے گلاس بھر بھر کر پیتے۔ رات کا کھانا وہ سب اکٹھے کھاتے اور چھت پر بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ان ساری مصروفیات میں عمو کا دل لگا رہتا لیکن جب وہ فارغ اور اکیلا ہوتا تو ماں کی جدائی کا غم ایک آسیب کی طرح اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیتا اور بے حال کر دیتا۔

وہ بھی ایک ایسی ہی تاروں بھری رات تھی۔ رات کی رانی اور پختہ آموں کی ملی جلی خوشبو ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ نیچے صحن میں شبانہ اور مریم رات کے کھانے کے بعد برتن دھو رہی تھیں۔ صحن میں پاٹے خاں کی پھٹی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ راجا ابھی کہیں سے واپس آیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کچی سیڑھیاں چڑھ کر عمو کے پاس آن موجود ہوا۔ اب وہ عمو کو اکثر عمران کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی ہلکی بو آ رہی تھی۔ وہ عمو کے کندھے پر

ہاتھ مار کر بولا۔ ''عمران! بڑا اٹیٹ آرڈر ملا ہے۔ چار سور مار گھوڑے ہیں۔ سور مار سمجھتے ہو نا تم؟ جن پر بیٹھ کر برچھی وغیرہ سے سور کا شکار کھیلتے ہیں۔ ایسے گھوڑوں کو سدھانا تھوڑا مشکل ہوتا ہے۔ پر فی گھوڑا تین ہزار روپیا دے رہے ہیں۔ سودا فٹ ہے......''

عمو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔ ''کیا بات ہے یار! تیری بتی آج پھر بجھی ہوئی ہے؟''

عمو نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''بھا راجا! تم نے کہا تھا کہ برسات سے پہلے پر نکلیں گے اور ماں کا کھوج لگا کر ہی واپس آئیں گے۔''

''مجھے سب یاد ہے عمران! بلکہ تم سے بھی کچھ زیادہ ہی یاد ہے۔ میں بس باہر کے حالات دیکھ رہا ہوں۔ کہیں ذرا سی گنجائش ملی نہیں اور ہم یہاں سے نکلے نہیں۔''

''حالات کو کیا ہے؟''

راجا نے سگریٹ سلگایا اور ماچس کی تیلی پاؤں سے مسل کر بولا۔ ''عمران! میں تجھے اور شبو کو سب کچھ بتاتا نہیں ہوں کہ تم دونوں کو بھی پریشانی ہو گی لیکن سچی بات یہ ہے کہ ابھی کیکراں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ماچاں کا بھائی ناجا بہت غصے میں ہے۔ پچھلے مہینے اس نے میرے ''ٹھیکرا'' والے گھر پر ہلا بولا ہے۔ پہلے وہاں توڑ پھوڑ مچائی پھر ہوائی فائرنگ کی اور بعد میں آگ لگا دی۔ پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ ناجے نے پنڈ میں اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو میرا اتا پتا بتائے گا، وہ اس کا منہ نوٹوں سے بھر دے گا اور جو مجھے چھپانے کی کوشش کرے گا اس کا حشر نشر ہو جائے گا۔''

''پر...... یہ سب کچھ کب تک چلتا رہے گا بھا راجے! ہم کب تک چوہوں کی طرح چھپ کر یہاں بیٹھے رہیں گے؟''

''میں نے سنا ہے کہ پچھلے دو تین ہفتوں سے ناجا کیکراں میں نظر نہیں آ رہا۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے وڈے افسر پھر اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ وہ کبھی کبھی قبائلی علاقے کی طرف بھی نکل جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہمارے لئے آسانی ہو جائے گی۔''

''لیکن...... میں کیا کروں بھا راجے...... میرے لئے اب ایک ایک دن گزارنا مشکل ہے۔'' عمو کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

راجا نے سگریٹ کے دو طویل کش لئے اور اپنی تیز تیکھی ناک سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''عمران! میں تو تجھے پھر وہی رائے دوں گا۔ تُو شبو سے دو بول پڑھوا لے۔ یہ دنیا ایک دم کنڈم ہے یار! کل کے لئے اس پر بالکل اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ جو کچھ آج مل رہا ہے

نا، وہ لے لینا چاہئے۔ دیکھ وہ تجھے چاہتی ہے اور تُو اس پر مرتا ہے۔ تم دونوں کے درمیان کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔ بس ایک مولوی صاحب کی لوڑ ہے اور دو گواہوں کی......"

"پر بھاراجے! وہ اس طرح نہیں مانتی۔ میں نے دو تین دفعہ بات کر کے دیکھی ہے۔"

"اوئے ذرا ٹیٹ ہو کر بات کر۔ اسے سمجھا کہ یہاں آنے جانے والے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر نکاح ہو جائے گا تو پھر کسی کو شک کرنے کی ہمت ہی نہیں رہے گی۔"

"میں نے کہا ہے بھاراجے...... پر وہ رونے لگتی ہے۔ کہتی ہے......" وہ اٹک گیا۔

"کیا کہتی ہے؟"

"کہتی ہے...... میں تمہاری ہوں...... اور آخری ساہ (سانس) تک تمہاری ہی رہوں گی۔ پر ہمیں اس طرح یہاں شادی نہیں کرنی چاہئے۔"

"لیکن اگر کل کلاں کوئی اور پھڈا پڑ گیا تو؟"

"وہ کہتی ہے...... ہماری محبت سچی ہے۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم ضرور ملیں گے۔"

...... یہ پندرہ بیس روز بعد کی بات ہے۔ ایک طویل گرم دن گزر چکا تھا۔ ملازم لڑکوں نے احاطے میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا تھا اور مٹی کے گھڑوں میں تازہ پانی بھر دیا تھا۔ عمو کمرے میں کتوں کے لئے راتب تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں راجا کے پاٹے خاں کی آواز آنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد پھاٹک کھلا اور پاٹے خاں دھواں چھوڑتا ہوا اندر آ گیا۔ خلافِ معمول راجا اسے سیدھا برآمدے کے آخری تاریک کونے میں لے گیا۔ پاٹے خاں کے اوپر ترپال تنا ہوا تھا۔ انجن بند کرنے کے بعد راجا نیچے آیا اور برآمدے کی جہازی سائز کی چق نیچے گرا دی۔ یوں لوڈر مکمل طور پر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ راجا پیسے کمانے کے لئے ہر طرح کے کام کر لیتا تھا۔ عمو نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ آج پھر کوئی افیم یا چرس قسم کی شے لے کر آیا ہے۔ انڈین شراب کا بھی امکان ہو سکتا تھا...... لیکن تھوڑی دیر بعد عمو نے ایک عجیب بات نوٹ کی۔ دیوہیکل ہاؤنڈ کتا پارا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی گونجیلی آواز در و دیوار کو لرزا رہی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد راجا اس کے پاس پہنچا۔ اپنے لمبے بال پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "عمران! آج ایک بڑی ٹیٹ ڈیل ہوئی ہے۔" اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا اور آنکھوں میں سنسنی لہریں لے رہی تھی۔

"کچھ بتاؤ گے تو پتا چلے گا۔"

"یہ بتانے والی نہیں دکھانے والی شے ہے۔" راجا نے سرگوشی کی اور عمو کو ساتھ چلنے کے لئے کہا۔

راتب تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ عمو نے ہاتھ دھوئے اور راجا کے ساتھ ہو لیا۔ اب شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ کبیر احمد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ دوا کھا کر پچھواڑے کے باغیچے میں سویا ہوا تھا۔ راجا نے شریف کے کمرے سے فالتو لالٹین لی اور برآمدے کی طرف آ گیا۔ طویل برآمدے کے آخری گوشے میں سرکنڈے کی چقوں کے پیچھے پاٹے خاں کھڑا تھا۔ اس کے اوپر ترپال اس طرح تنا ہوا تھا کہ وہ چاروں طرف سے ڈھک گیا تھا۔ صحن کی طرف سے پارے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ عمو کی چھٹی حس بھی جیسے کچھ مبہم اشارے دے رہی تھی۔

"بھاراجا! کیا چکر ہے؟" عمو نے پوچھا۔

راجا نے لالٹین عمو کو تھمائی اور ترپال کے تسمے کھول کر اسے پچھلی طرف سے دائیں بائیں ہٹا دیا۔ عمو بھونچکا رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ لوڈر کے اندر ایک بڑا آہنی پنجرہ رکھا تھا اور اس میں دو آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ کسی کتے یا دوسرے پالتو جانور کی آنکھیں نہیں تھیں۔ یہ ایک دھاری دار شیر تھا۔ وہ اپنے کانوں کو چوکنے انداز میں حرکت دے رہا تھا اور سیدھا ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا...... جیسے حملہ کرنے کے لئے بس ایک نادیدہ اشارے کا منتظر ہو۔ وہ ایک جوان شیر تھا۔ ابھی اس کا جسم پوری طرح بھرا نہیں تھا پھر بھی اس کی دید لرزہ طاری کرتی تھی۔

راجا نے ترپال پھر برابر کر دیا اور عمو کو لے کر واپس احاطے میں آ گیا۔ "یہ کہاں سے لے کر آئے ہو بھاراجا؟" عمو نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"بس لے آیا ہوں...... اور زیادہ ڈرنے کی لوڑ نہیں۔ یہ بالکل ہی "اَن ٹرینڈ" نہیں ہے۔ تھوڑا بہت سکھایا ہوا ہے۔ جو کسر رہ گئی ہے، وہ ہم دو چار ہفتوں میں پوری کر دیں گے۔ کتے کے پچاس پلے سدھانے سے اتنے پیسے نہیں ملتے جتنے اس اکیلے کے مل جائیں گے۔ پورے چالیس ہزار میں بات ہوئی ہے۔"

"پر بھاراجا...... یہ تو بڑا خطرناک کام ہے۔ مم...... میں نے تو اس سے پہلے چڑیا گھر سے باہر شیر دیکھا ہی نہیں۔"

"لیکن میں نے تو دیکھا ہے نا۔ تُو گھبرا مت، ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو یہ سارا کام ایک دم حلوہ ہو جائے گا۔ صرف تین چار ہفتے میں چالیس ہزار روپے۔ یار عمران! یہ تھوڑی رقم تو نہیں ہے۔"

اس نے اپنی خوش گفتاری سے عمران کو چپ کرا دیا۔

عمران اب اتنا نا سمجھ نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ راجا اسے جو کچھ بتاتا ہے، اس سے کہیں زیادہ کماتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کبھی کوئی ''ناجائز پھیرا'' بھی لگا لیتا تھا۔ اس کے پاس کافی پیسے آئے تھے لیکن یہ پیسے اس کے پاس ٹکتے نہیں تھے۔ وہ انہیں شراب اور عورت وغیرہ پر اڑا دیتا تھا۔ جہاں تک جانوروں کو سدھانے کا تعلق تھا، یہ کام بھی زیادہ تر عمو کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ راجا نے اسے شروع میں چند بنیادی باتیں بتائی تھیں، اس کے بعد اس نے سارا بوجھ عمو پر ہی ڈال دیا تھا اور عمو کو کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کام بھا راجا دو مہینے میں کرے گا، وہ خود پندرہ دن میں کر لے گا۔ حیران کن طور پر جانور اس سے غیر معمولی انس محسوس کرتے تھے اور وہ بھی ان سے وابستگی محسوس کرنے لگتا لیکن یہ شیر والا کام اسے واقعی پر خطر محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اس کے رگ و پے میں پھیل گئی تھی۔

اگلے روز تک کبیر احمد، شریف، اس کی بیوی اور شبو کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ راجا کسی سرکس کے مالک سے ایک نر شیر لے کر یہاں آیا ہے اور اسے سدھانا چاہتا ہے۔ راجا کا دعویٰ تھا کہ وہ دو ڈھائی سال پہلے بھی ایک ایسے شیر کو ٹریننگ دے چکا ہے۔ شبو کو جب یہ ساری بات پتا چلی تو وہ روہانسی ہو گئی۔ اس نے عمو سے کہا۔ ''عمران! تمہارے یہ کام کسی دن میری جان لے لیں گے۔ بھا راجا جو کہتا ہے تم کرتے چلے جاتے ہو۔ اب بات خطرناک گھوڑوں، کتوں سے آگے بڑھ کر شیر تک جا پہنچی ہے۔''

رات بھر سوچنے کے بعد اب عمو کے اندر خوف کی جگہ ایک عجیب سی ترنگ جاگ چکی تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے اندر کچھ خاص ہے۔ اب وہ اس ''خاص'' کو ایک جنگلی درندے کے سامنے آزمانا چاہتا تھا۔

اس نئے کام کے لئے باغ کے ایک کشادہ گودام کو ''رِنگ'' کی شکل دی گئی۔ راجا نے دھاری دار شیر کو ذرا سست اور ڈھیلا کرنے کے لئے اسے گوشت کے ٹکڑوں پر کوئی دوا لگا کر کھلائی تھی۔ مزید احتیاط کے طور پر اس کے گلے میں دو مضبوط رسیاں ڈالی گئی تھیں تا کہ اگر وہ بپھرے تو اسے دونوں طرف سے کھینچ کر کنٹرول کیا جا سکے۔

پہلے روز عمو کو کچھ خطرہ محسوس ہوا لیکن پھر حالات حیران کن تیزی سے بدلتے چلے گئے۔ راجا اور اس کا معاون ساتھی بھی ششدر رہ گئے۔ خونخوار خصلت والا رائل بنگلہ ٹائیگر بڑی تیزی سے عمو سے مانوس ہوتا چلا گیا۔ غالباً اس ساری صورتِ حال میں اس بے پناہ اعتماد کو بھی دخل تھا جو پچھلے چند ماہ سے مسلسل عمو کے اندر پیدا ہو رہا تھا۔

پانچ چھ روز میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عمو نے کئی احتیاطی تدابیر ترک کر دیں اور کئی بار اکیلا ہی جانور کے سامنے جانے لگا۔ راجا بہت خوش تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ چار پانچ مہینوں والا کام بس دو ڈھائی ماہ میں مکمل کر لیں گے۔ انہیں بس دو اہم مراحل مکمل کرنے تھے۔ شیر کو ایک بڑے آہنی کڑے میں سے گزرنے پر آمادہ کرنا اور جست لگا کر ایک چار فٹ اونچی رکاوٹ کو پار کرنا۔

ایک روز تربیت کے دوران میں ٹائیگر نے راجا کے معاون نذیر کو پنجہ مارا اور بازو پر سے اس کی کھال ادھیڑ دی۔ اس روز کے بعد راجا اور نذیر مزید پیچھے ہٹ گئے اور عمو کی ذمے داری مزید بڑھ گئی۔ کتے کی نایاب نسل ''سلوکی ہاؤنڈ'' کے پلے بھی اب بڑے ہو چکے تھے۔ عمو ان کی تربیت بھی تن دہی سے کر رہا تھا۔

○......❖......○

نو دس ہفتے میں ہی ٹائیگر والی ذمے داری تقریباً پوری ہو گئی۔ اس دوران میں سرکس کا مالک جان محمد دو تین بار اپنے جانور کو دیکھنے بھی آیا۔ وہ چھوٹی داڑھی والا ایک ملنسار اور خلیق شخص نظر آتا تھا۔ بہر حال عمران کی کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس سے ہر طرح کی ڈیل راجا ہی کرتا تھا۔ جان محمد کے ساتھ پینٹ شرٹ والی ایک خوبرو لڑکی بھی ہوتی تھی۔ پتا چلا کہ وہ اس کی بھتیجی ہے۔ راجا، جان محمد کے علاوہ اس کی بھتیجی سے بھی خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا۔ وہ لوگ بھی راجا کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک تو ٹائیگر کو سدھانے والی ساری فن کاری راجا ہی کی تھی۔

جب بنگلہ ٹائیگر کو جان محمد صاحب کے ساتھ روانہ کیا گیا تو راجا خود بھی ساتھ ہی گیا اور تین چار روز تک خوشاب میں جان صاحب کی مہمان نوازی کا لطف اُٹھا کر واپس آیا۔ آتے ہوئے وہ خوشاب سے ہی چار پانچ تربیت یافتہ کتوں کی فروخت کا آرڈر بھی پکڑ کر لایا تھا...... اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں اس کا کام چل نکلا ہے۔

کبیر احمد اب بیمار رہنے لگا تھا۔ باغ کی زیادہ تر ذمے داری شریف اور اس کی فیملی کے سر پر تھی۔ ایک روز جب راجا اپنے پاٹے خاں کے نئے ٹائر ڈلوانے اور اس کی نوک پلک ٹھیک کروانے خوشاب گیا ہوا تھا، عمران اور شریف پچھواڑے کی پھلواری میں آ بیٹھے۔ وہ ابھی ابھی ایک زخمی کتے کی مرہم پٹی سے فارغ ہوئے تھے اور اب نومبر کی آخری سہ پہروں میں سے ایک سہ پہر کی سنہری دھوپ کا لطف اُٹھانا چاہ رہے تھے۔

گفتگو کے دوران میں شریف نے عمران سے پوچھا۔ ''سنا ہے کہ ٹائیگر والے کام کے لئے راجا نے تمہیں کوئی انعام شنام بھی دیا ہے؟''

"ہاں...... مجھے اور شبو کو دو دو نئے جوڑے سلوا کر دیئے ہیں۔ تین ہزار روپیا نقد بھی دیا ہے۔"

"تین ہزار؟" شریف نے پوچھا۔ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ شریف کچھ دیر خاموش رہا پھر دھیمے انداز میں بولا۔ "سنا ہے اس نے خود تو کافی پیسے لئے ہیں...... شاید ساٹھ ستر ہزار روپیا۔ اوپر کا خرچہ اس کے علاوہ ہے۔"

ساٹھ ستر ہزار کے ہندسے نے عمران کو بھی تھوڑا سا چونکایا لیکن اس نے اپنے اندرونی احساسات کو چہرے پر نہیں آنے دیا۔ وہ نارمل لہجے میں بولا۔ "چلو کوئی بات نہیں...... اپنا وقت ٹھیک گزر رہا ہے۔"

شریف بولا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ جان صاحب کی بھتیجی نیلم بھی راجا کے چکر میں ہے۔ آج کل اسی لئے راجا بھی خوشاب کے چکر لگا رہا ہے...... پچھلے ہفتے جب جان صاحب شیر لینے آئے تھے تو نیلم نے شیر کے ساتھ راجا کی کئی تصویریں بھی اُتاری تھیں۔ وہ تو راجا کو ہی ماسٹر سمجھتی ہے نا اور بات صرف اس لڑکی کی ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ راجا کو باکمال فن کار سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تو بس ہم دو چار بندوں کو پتا ہے نا کہ اصل فن کاری کس کی ہے۔"

"چلو، میں نے کون سا تمغہ لگوانا ہے۔ اگر بھا راجے کی عزت بن رہی ہے تو سمجھو ہماری بن رہی ہے۔"

شریف مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عمران کی غیر دلچسپی دیکھ کر خاموش رہا۔ عمران کھلے دل کا مالک تھا۔ ویسے بھی وہ راجا کو اپنا محسن وسرپرست سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بھا راجا جو کر رہا ہے، صحیح کر رہا ہے۔

راجا اب پہلے سے اچھا لباس پہننے لگا تھا۔ پہلے وہ ہفتے میں ایک رات باہر گزارتا تھا، اب دو تین راتیں باہر گزارنے لگا تھا۔ اب وہ اپنے دیرینہ ساتھی پاٹے خاں کو بھی فروخت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس پرانے لوڈر کی جگہ کوئی اور اچھی گاڑی لی جائے۔ عمران کو اس کا یہ پروگرام زیادہ پسند نہیں آیا۔ پتا نہیں کیوں اسے اس پرانی گاڑی سے اُنس سا ہو گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس گاڑی نے کوئی ایک سال پہلے بڑی سخت جانی کا مظاہرہ کر کے عمران اور شبانہ کو کیکراں گاؤں کی جان لیوا حدود سے نکالا تھا۔ بہرحال راجا کے اپنے فیصلے ہوتے تھے۔ ایک روز وہ پاٹے خاں کو کہیں چھوڑ آیا اور اس کی جگہ ایک اچھی حالت کا سیکنڈ ہینڈ لوڈر لے آیا۔

یہ پانچ چھ دن بعد کی بات ہے۔ راجا اپنے نئے لوڈر پر آندھی طوفان کی طرح باغ میں

داخل ہوا۔ وہ کل دوپہر سے کہیں گیا ہوا تھا۔ اسے لوڈر سے اُترتے دیکھ کر عمران اور شریف حیران رہ گئے۔ شبو تو باقاعدہ چلا اُٹھی۔ راجا کا سویٹر سامنے سے اُدھڑا ہوا تھا۔ قمیص کا گریبان بھی کٹا پھٹا تھا۔ راجا کی گردن اور چہرے پر زخم نظر آ رہے تھے۔ ان زخموں سے بہنے والا خون ناف تک چلا گیا تھا۔ راجا لنگڑاتا ہوا عمران کی طرف آیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "چلو عمران! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں؟ اور تم تو اتنے زخمی ہو؟"

"کوئی بات نہیں، تم بس آؤ میرے ساتھ۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"کسی ہتھیار وغیرہ کی لوڑ تو نہیں؟"

"نہیں نہیں۔ بس تم آ جاؤ۔"

عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن وہ راجا کے ساتھ اس کے نئے لوڈر میں آ بیٹھا۔ عمران نے راجا کے زخموں کو غور سے دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ زخم کسی آلے وغیرہ سے نہیں آئے تھے۔ یہ پنجوں کے زخم تھے۔ عمران کا دھیان سیدھا دھاری دار بنگلہ ٹائیگر کی طرف چلا گیا۔

لوڈر تیزی سے کچے پکے راستے پر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ عمران نے پوچھا۔ "بھا راجا! کہیں جان صاحب کے شیر نے تو کام نہیں دکھایا؟"

راجا نے اپنے مفلر سے خون صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "اسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کسی طرح سنبھالا ہی نہیں جا رہا۔ ایک ملازم کا تو اس نے تقریباً پیٹ ہی پھاڑ دیا ہے۔ ایک دو اور بندوں کو بھی زخم آئے ہیں۔"

"اوہو...... کہاں ہے وہ؟"

"جان صاحب کے گاؤں والے مکان پر۔ صحن میں گھوم رہا ہے۔ ہم نے صحن کے دونوں دروازے باہر سے بند کر دیئے ہیں۔ وہ لڑکی نیلم ابھی اندر کے ایک کمرے میں ہے۔ اسے ہم نہیں نکال سکے۔"

راجا اونچے نیچے راستے پر لوڈر کو اڑائے چلا جا رہا تھا۔ وہ دونوں بری طرح اچھل رہے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ صورتِ حال کو سنبھالنے کے لئے راجا نے پہلے خود کوشش کی ہے، جب کوئی بس نہیں چلا تو عمران کی طرف بھاگا ہے۔

قریباً ایک گھنٹے میں وہ دونوں مطلوبہ گاؤں کے مطلوبہ مکان پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک پھاٹک کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مکان کے احاطے کی دیوار سات آٹھ فٹ

اونچی تھی۔ لوگ اردگرد کی چھتوں پر سے احاطے میں جھانک رہے تھے۔ کچھ لوگ ریڑھوں وغیرہ پر کھڑے ہو کر بیرونی دیوار کے اوپر سے احاطے میں جھانکنے کی کوشش میں تھے۔ ہر چہرے پر گھمبیر تجسس اور ہراس نظر آتا تھا۔ یہاں عمران کو جان محمد صاحب اور ان کے دو تین ملازم بھی نظر آئے۔ ایک ملازم زخمی تھا اور اس کے بازو پر تازہ تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جان محمد صاحب کے ہاتھ میں پمپ ایکشن رائفل تھی اور وہ پھاٹک کی درز میں سے احاطے میں جھانکنے کی سعی میں مصروف تھے۔ عمران کے وہاں پہنچتے ہی ہر طرف ہلچل نظر آئی۔ سب لوگ گہرے تجسس اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ عمران کے پھاٹک کے سامنے پہنچتے ہی راجا نے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھلوایا اور عمران کو اندر داخل کر دیا...... خود وہ اپنے عشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کے ساتھ دروازے میں کھڑا ہو گیا تاکہ کوئی ناخوش گوار صورتِ حال پیش آنے کی صورت میں مناسب ردِعمل ظاہر کر سکے۔

ہمیشہ کی طرح عمران کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس کا ہتھیار بس اس کے اندر کا اعتماد اور وجدان تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا سینہ پُر جوش دھڑکنوں سے بھر جاتا تھا۔ وہ ہاتھ میں بس ایک چھوٹی سی چھڑی لئے بڑے نپے تلے قدموں سے برآمدے کی سمت گیا۔ اسے بتایا گیا تھا اور اسے خود بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ شیر برآمدے کی طرف ہے۔

چند ہی سیکنڈ بعد شیر یعنی رائل بنگلہ ٹائیگر اور عمران آمنے سامنے تھے۔ ٹائیگر کی آنکھوں میں آج وحشت چمک رہی تھی اور اس کی حرکات و سکنات میں تبدیلی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے اندر سے ایک بے ساختہ گونج برآمد ہو رہی تھی۔ اس دھیمی لیکن پاٹ دار گونج میں، غیظ و غضب اور خونخواری کی ساری علامات موجود تھیں۔ وہ خطرناک انداز میں عمران کی طرف بڑھا۔ عمران جانتا تھا کہ یہی فیصلے کا لمحہ ہے۔ اب اگر اس نے قدم پیچھے ہٹائے تو بپھرا ہوا جانور کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اپنے بے پناہ اعتماد اور وجدان کے سہارے وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ نہ صرف کھڑا رہا بلکہ اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔ چھڑی سے مخصوص اشارہ کیا...... اور اسے حکم دیا۔ ”بیٹھ جاؤ...... بیٹھ جاؤ۔“ اس کے حکم میں سختی کی جگہ ایک محبت بھری نرمی تھی۔

چند سیکنڈ تک انسان اور درندے نے اپنی آنکھیں ایک دوسرے میں پیوست رکھیں اور پھر فیصلہ ہو گیا۔ عمران کا جادو پھر کام کر گیا۔ ٹائیگر کا دباؤ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کم ہو گیا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ جارحانہ انداز ترک کر چکا ہے۔ چند سیکنڈ بعد اس کے آگے کو جھکے ہوئے کان نارمل حالت میں آ گئے۔ عمران نے اسے چھڑی کے اشارے سے چند قدم پیچھے ہٹایا پھر دلیری سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ وہ اس کے سینے سے اپنا سر رگڑنے

لگا۔ عمران اسے پچکارتا ہوا اس کے آہنی پنجرے کی طرف لے گیا۔ کسی اندرونی کمرے سے نیلم کے چلانے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

ٹائیگر کو پنجرے میں بند کرنے کے بعد عمران نیلم کی طرف متوجہ ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ جب اس نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ جانور دوبارہ پنجرے میں جا چکا ہے تو اس نے دروازے کی کنڈی گرائی اور بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد کسی طرف اوجھل ہو گئی۔ بدحواسی میں اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ وہ اپنا کمرا ایک اجنبی کے سامنے کھلا چھوڑے جا رہی ہے۔ وہ اپنی ریشمی نائٹی میں بھاگی تھی۔ اس کے شاندار پلنگ پر اس کا لباس بکھرا ہوا تھا اور زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ایک طرف میز پر ایک مردانہ کوٹ بھی پڑا ہوا تھا...... عمران کے لئے اس کوٹ کو پہچاننا بالکل مشکل نہیں تھا۔ یہ راجا کا کوٹ تھا۔ یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ شیر والا واقعہ پیش آنے سے پہلے راجا اس شہری لڑکی کے ساتھ یہاں اس کمرے میں موجود تھا۔ اسی دوران میں راجا بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور سب سے پہلے اس نے اپنا کوٹ ہی اس کمرے میں سے نکالا۔

عمران کی مہارت اور دلیری نے موقع پر موجود لوگوں کو اَش اَش کرنے پر مجبور کر دیا۔ جان محمد صاحب نے عمران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راجا سے پوچھا۔ ”یہ وہی لڑکا ہے نا جو وہاں تمہارے پاس کتوں کا راتب وغیرہ بناتا ہے؟“

”جج...... جی ہاں۔“ راجا ہکلایا۔ ”اس کے علاوہ یہ جانوروں کی سکھائی میں بھی میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ بڑا گن ہے جی اس کے ہتھ میں۔“

جان محمد صاحب گہری نظروں سے کبھی راجا اور کبھی عمران کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ایک جہاندیدہ زیرک شخص تھے۔ انہیں یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہاں ”پس پردہ“ بھی کچھ ہے۔

ٹائیگر کے بارے میں پتا چلا کہ پچھلے دو دن سے اس کی طبیعت میں اشتعال موجود تھا۔ صبح تجربہ کار ملازم غلام رسول اس کے پنجرے کی صفائی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بس ایک سیکنڈ کے لئے پنجرے کا دروازہ کھولا۔ ٹائیگر خوفناک تیزی سے اس پر جھپٹا اور اسے شدید زخمی کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً ایک گھنٹے تک اس نے حویلی میں تہلکہ مچائے رکھا اور کسی طرح کنٹرول نہیں ہوا۔

اب وہ حالانکہ دوبارہ پنجرے میں بند ہو چکا تھا مگر اس کے تیور معمول پر نہیں آئے تھے۔ جان محمد صاحب کی خواہش تھی کہ عمران ابھی ایک دو دن یہیں رہے۔ راجا نے بھی اس بات کی تائید کی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس صورتِ حال پر زیادہ خوش نظر نہیں آتا تھا۔

دو دن میں ہی عمران کو معلوم ہو گیا کہ جان محمد صاحب بہت اچھی طبیعت کے مالک ہیں۔ایک بڑے سرکس میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی ساجھے داری تھی اور پچھلے قریباً پندرہ سال سے یہ ساجھے داری بڑے اچھے طریقے سے چل رہی تھی......اور لگتا تھا کہ آئندہ بھی چلتی رہے گی۔ پینٹ شرٹ والی لڑکی نیلم، جان صاحب کی بھتیجی نہیں بلکہ معاون تھی......یا یہ کہہ لیں کہ سیکرٹری تھی۔ایک دفعہ اس کی شادی ہو کر ختم ہو چکی تھی اور اب وہ دوسری دفعہ شادی کرنے کی فکر میں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس مرتبہ اس نے ایک ایسا شخص شادی کرنے کے لئے چنا تھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رہا تھا اور آئندہ بھی پینا چاہتا تھا۔

عمران کو اندازہ ہوا کہ ٹائیگر والے تازہ واقعے کے بعد جان محمد صاحب راجا کے بارے میں ٹھٹک گئے ہیں اور وہ اس کے بارے میں اچھی طرح ٹوہ لگانا چاہتے ہیں۔شاید یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ راجا ایف سولہ کی رفتار سے نیلم کے قریب آتا جا رہا تھا اور وہ نیلم کو اپنی بھتیجی کہتے تھے۔ رات کو تھوڑی دیر کے لئے موقع ملا تو جان صاحب نے راجا کے بارے میں ٹوہ لینے والے سوال عمران سے پوچھے۔عمران نے بس گول مول جواب دے کر وقت ٹال دیا۔ جان صاحب عمران کی مہارت سے بہت متاثر نظر آتے تھے اور وہ اچھی طرح جان چکے تھے کہ راجا کی ''شان دار قابلیت'' کے پیچھے اصل ہاتھ کس کا ہے۔درحقیقت ٹائیگر والے واقعے نے ایک طرح سے راجا کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔

دو دن بعد عمران واپس تو چلا گیا مگر جان صاحب سے اس کا ایک قلبی تعلق سا بن گیا...... یہ دس بارہ روز بعد کی بات ہے۔راجا کسی نوخیز طوائف کے پہلو میں رات گزارنے کے لئے خوشاب گیا ہوا تھا۔جان محمد صاحب کا ملازم غلام رسول آیا۔اس نے بتایا کہ ٹائیگر پھر بگڑا ہوا ہے اس لئے اسے فوراً حویلی پہنچنا ہو گا۔غلام رسول جیپ پر آیا تھا۔کبیر صاحب سے اجازت لے کر اور پریشان شبو کو تسلی دے کر عمران غلام رسول کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ بہت کم اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلتا تھا لیکن جب بھی نکلتا تھا، ایک عجیب سا خوف اس پر طاری رہتا تھا۔اس خوف کا تعلق ماجھاں کی موت اور ماجھاں کے خطرناک ساتھیوں سے ہوتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ جان محمد صاحب کی حویلی پہنچ گیا۔یہاں پنجروں میں سرکس کے فن کار یعنی دو بندر، ایک ریچھ اور کتے وغیرہ بند تھے۔ بنگلہ ٹائیگر بھی تھا لیکن غیر متوقع طور پر وہ بالکل پُرسکون نظر آیا۔عمران کو حیرت ہوئی۔ اس کی حیرت دیکھ کر جان محمد صاحب مسکرائے اور بولے۔''آؤ میں تمہاری حیرت دور کرتا ہوں۔''

وہ دونوں حویلی کی نشست گاہ میں جا بیٹھے۔ جان صاحب کے فربہ چہرے پر گہری

سنجیدگی طاری ہو گئی۔انہوں نے کہا۔''عمران بیٹے! ٹائیگر ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں بہانے سے بلایا ہے۔میں تم سے اس خبیث راجا کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

راجا کے لئے خبیث کے خطاب نے عمران کو شاک پہنچایا۔ وہ ذرا سنبھل کر بولا۔

''جان صاحب! بھارا راجا کو میں اپنے بڑوں کی طرح سمجھتا ہوں۔''

''تم سمجھتے ہو لیکن وہ بڑا ہے نہیں......میرے خیال میں تو بڑے تم ہو جو بہت کچھ جانتے ہوئے بھی چپ ہو اور اس کی ہر بات پر ''جی جی'' کہتے ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ کل میں نے اسے ذلیل کر کے گھر سے باہر کر دیا ہے۔اگر اس میں ذرا سی بھی حیا ہے تو اب ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔تم نے دیکھا ہی ہو گا، نیلم سیدھی سادی لڑکی ہے۔شہری لڑکیوں جیسی ہوشیاری چالاکی اس میں نہیں ہے۔ یہ خبیث راجا اس کو دھوکا دینے کے چکر میں تھا۔ایک طرف اس سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا تھا، دوسری طرف شہر میں ایک طوائف کے پاس بھی راتیں گزار رہا تھا اور مجھے پورا یقین ہے کہ کل رات بھی وہ اسی کے بستر پر شراب پیتا رہا ہے۔''

''آ......آپ کے پاس کیا ثبوت ہے جان صاحب؟''

''میرے پاس راجا اور اس تھرڈ کلاس لڑکی کی تازہ تصویریں ہیں......اور گھبراؤ مت، میرے پاس ہر بات کا مکمل ثبوت ہے۔''

جان صاحب نے چند سیکنڈ توقف کیا پھر ایک رسید دکھاتے ہوئے بولے۔''یہ دیکھو، یہ رقم چند روز پہلے راجا نے مجھ سے وصول کی ہے۔ یہ اس کے دستخط ہیں۔ پڑھو، کتنی رقم ہے؟''

''بیس ہزار......اور اس کے نیچے ستر ہزار۔کل نوے ہزار۔''عمران نے جواب دیا۔

جان محمد صاحب بولے۔''یہ بیس ہزار ٹائیگر کی خوراک وغیرہ کا خرچہ تھا اور ستر ہزار روپیا اس نے ٹائیگر کی سدھائی کا لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دو چار ہزار کے علاوہ یہ ساری رقم اس کی اپنی جیب میں ہی گئی ہے اور دیکھو، بات صرف ٹائیگر کی سدھائی ہی کی نہیں ہے، میں نے سارا پتا کرایا ہے۔ جانوروں کی سدھائی کی ساری محنت تمہاری ہوتی ہے اور اس محنت کا راجا ٹھیک ٹھاک معاوضہ بھی وصول کرتا ہے۔ تمہیں وہ اس معاوضے کا چوتھا......حصہ بھی نہیں تھماتا۔ یہ ساری رقم شراب اور نت نئی لڑکیوں پر خرچ ہوتی ہے۔''

عمران خاموش رہا۔ جان صاحب جانتے تھے کہ عمران کبھی کبھار سگریٹ پیتا ہے۔ انہوں نے اسے سگریٹ پیش کیا جو اس نے جھجکتے ہوئے قبول کر لیا۔ جان صاحب بولے۔

"مجھے سچ سچ بتاؤ عمران! تم اس راجا تک کیسے پہنچے اور کب سے اس کے ساتھ ہو؟"

عمران اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے گول مول بات کی اور بتایا کہ وہ اپنے کچھ رشتے داروں کے پاس گجرات میں ٹھہرا ہوا تھا، وہیں راجا سے جان پہچان ہوئی۔

جان صاحب نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولے۔

"تم گجرات میں نہیں، گجرات کے ایک پنڈ میں ٹھہرے ہوئے تھے...... اور اپنے کسی رشتے دار کے پاس نہیں، ایک بدمعاش عورت ماجھاں کے گھر میں تھے۔"

عمران ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ جان صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "ایک روز راجا نے مجھے اس بارے میں تھوڑا سا بتایا تھا۔ بعد میں، مَیں نے اپنے طور پر چھان بین کی اور مجھے تمہارے بارے میں اور بھی کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔"

"کیسی باتیں جی؟"

جان صاحب ہولے سے مسکرائے اور اس کے چوڑے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے عمران! میرا وعدہ ہے، ہم دونوں کے تعلقات آگے چل کر کیسے بھی ہوں، میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اس بات کا تو مجھے یقین ہے جی۔"

"اب اس سے آگے میں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں...... تمہاری نظر سے بھی اوجھل ہے۔" جان صاحب نے کہا پھر نیا سگریٹ سلگا کر بولے۔ "تمہارا کیا خیال ہے، اس وقت کیکراں نام کے گاؤں میں حالات کیا ہیں؟"

"مجھے کچھ زیادہ تو پتا نہیں جی۔ راجا نے بتایا تھا کہ ماجھاں کا بھائی ناجا ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔ چار مہینے پہلے اس نے راجا کے پرانے ڈیرے پر آگ بھی لگا دی تھی اور پنڈ والوں کو دھمکیاں دی تھیں راجا کے بارے میں۔"

"اگر میں کہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تو پھر؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

جان صاحب بولے۔ "تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ناجے کو پولیس مقابلے میں مرے پورے دس مہینے ہو گئے ہیں۔ تمہارے آنے کے کچھ ہی دن بعد یہ واقعہ ہو گیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد مخالف پارٹی کے لوگوں نے ایک دم طاقت پکڑ لی...... اور ایک دو زوردار لڑائیوں کے بعد ماجھاں کے رشتے داروں کو بھی کیکراں گاؤں سے مار بھگایا۔ اب کیکراں میں ان لوگوں کا نام و نشان تک نہیں۔ تم پتا نہیں کہاں پھر رہے ہو۔"

عمران واقعی ششدر رہ گیا...... وہ کتنی ہی دیر سناٹے میں رہنے کے بعد بولا۔ "تو کیا بھا راجا نے جھوٹ بولا تھا؟"

"سفید جھوٹ...... اور یہ سب کچھ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ وہ اپنے مطلب کے لئے کسی کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ تمہیں خوف زدہ کر کے رکھنا چاہتا تھا تاکہ تم کہیں جانے کا سوچ ہی نہ سکو۔ وہ تم سے زبردست فائدے لے رہا تھا اور اب بھی لے رہا ہے عمران۔"

عمران ہکا بکا سا بیٹھا رہا...... اس کے سینے میں کچھ سلگنے لگا۔ وہ پچھلے ایک عرصے سے بری طرح اپنی ماں کے لئے تڑپ رہا تھا اور راجا نے اسے فریب کے جال میں پھنسا کر شادپورہ میں قید کیا ہوا تھا۔

جان صاحب بولے۔ "عمران! تمہارے اندر گُن ہے۔ تمہیں اللہ نے صلاحیت دی ہوئی ہے۔ تم ترقی کر سکتے ہو، آگے جا سکتے ہو۔ تمہارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی راجا ہے۔ اس کمینے سے جان چھڑا لو۔ کہیں بھی چلے جاؤ۔ تمہیں عزت ملے گی اور پیسا بھی اور اگر تم چاہو تو میرے پاس آ جاؤ۔ میں ابھی لمبے چوڑے وعدے تو نہیں کر سکتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہاں تمہاری محنت کا بھرپور صلہ ملے گا۔"

عمران کا دماغ ابھی تک کیکراں کے اردگرد گھوم رہا تھا، وہ بولا۔ "جان صاحب! کیا واقعی ناجا ختم ہو چکا ہے؟"

جان صاحب اُٹھ کر الماری کی طرف گئے اور ایک پرانا اخبار لے آئے۔ "میں نے کہا ہے نا کہ میرے پاس ہر بات کا ثبوت ہے۔"

یہ نو دس ماہ پرانا اخبار تھا۔ عمران نے دیکھا، اس میں ناجے ڈکیت اور اس کے تین ساتھیوں کی ناگہانی ہلاکت کا سارا واقعہ موجود تھا۔ ایک دم عمران کو لگا کہ وہ آزاد ہو گیا ہے، اس کے پنجرے کی تیلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس بارے میں عمران نے جان صاحب سے دیر تک بات کی اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے سارے پردے اُٹھ گئے۔

......شام سے پہلے عمران شادپورہ واپس آ گیا۔ راجا ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ وہ رات کو بھی نہیں آیا۔ رات عمران دیر تک بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ راجا یقیناً اس سے جھوٹ بولتا رہا تھا لیکن عمران کو پتا تھا کہ شریف نے جھوٹ نہیں بولا۔ اس کی والدہ واقعی شیخوپورہ میں موجود نہیں تھی اور نہ کہیں اور اس کا سراغ ملا تھا۔ عمران سب سے پہلے اپنی والدہ کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ میں ان لوگوں کے خلاف بھی نفرت بڑھ رہی تھی

جنہوں نے اسے اس کی ماں سے جدا کیا اور پھر دردر دھکے کھانے پر مجبور کیا۔ ان میں چودھری سجاول اور صادق شاہ جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ ان لوگوں کو ان کے کئے کا مزہ چکھانا چاہتا تھا...... لیکن کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ تا تھا۔ جہاں تک راجا کی بات تھی، اس کے لئے عمران کے دل میں نفرت نہیں تھی ...... ہاں، افسوس ضرور تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ راجا اسے اس طرح اندھیرے میں رکھے گا اور فریب کرے گا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں تیزی سے سوچ رہا تھا اور اب اس سوچ بچار میں راجا ہرگز شامل نہیں تھا۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت راجا نشے میں دھت واپس آیا اور اس کے ساتھ عمران کی دوٹوک بات ہوئی۔ عمران نے راجا کو اخبار کا وہ ٹکڑا دکھایا جس میں دس مہینے پہلے ناجے ڈکیت کی موت کی بریں چھپی تھیں اور لاش کی تصویریں شائع ہوئی تھیں۔

راجا یہ سب دیکھ کر ششدر ہوا لیکن بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ معلومات عمران کو کیسے اور کس سے ملی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ آخر میں راجا نے کہا۔ ”عمو یار! ٹھیک ہے کہ میں نے تجھے خطرے سے بچانے کے لئے ناجے کے بارے میں غلط اطلاع دی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم دشمن بن گئے۔ ہم اب بھی دوست ہیں۔ دشمن وہ بندہ ہے جو تمہیں ورغلا رہا ہے۔ تمہیں مجھ سے توڑ رہا ہے۔“

عمران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”جو بھی ہے بھارا جا! اب ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ اب زیادہ باریکیوں میں جائیں گے تو دکھ اور رنجش کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں، تم مجھے معاف کردو۔ ہمیں دشمنوں کی طرح نہیں، دوستوں کی طرح علیحدہ ہو جانا چاہئے۔“

راجا نے کئی پینترے بدلے مگر عمران چونکہ تہیہ کر چکا تھا، اس لئے وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا اور پھر وہ دونوں نم ناک آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

عمران نے علی الصباح ہی شبو کو اس بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ساتھ چلنے کو تیار تھی وقتِ رخصت راجا نے شبو کے سر پر پیار دیا اور آٹھ دس ہزار روپے زبردستی اس کی مٹھی میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”اپنی شادی پر مجھے بھول نہ جانا۔“

وہ اپنی طرز کا جدا بندہ تھا۔ کہیں بہت برا، کہیں صرف برا اور کہیں اچھا۔

○......❖......○

عمران اور شبو سیدھے جان محمد صاحب کے قصبہ نما گاؤں میں ان کی حویلی میں آ گئے۔ جان صاحب نے خوش دلی اور محبت سے ان کا استقبال کیا۔ حویلی میں دو معزز مہمان بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک تو کوئی مولوی صاحب تھے۔ دوسرے جان محمد صاحب کے منہ بولے بھائی اور پارٹنر حاجی احمد اشفاق صاحب تھے۔ اس رات جان صاحب نے حاجی اشفاق سے بھی عمران کی ملاقات کرائی۔ انہوں نے حاجی اشفاق کو بتایا۔ ”قدرت جب کچھ چھینتی ہے تو اس کے بدلے کچھ دیتی بھی ہے۔ اس بچے سے نوعمری میں اس کی پیاری ماں چھن گئی۔ یہ دن رات اس کے لئے تڑپا، ماں تو اسے نہ ملی...... کم از کم ابھی تک تو نہیں ملی، پر اس کا صلہ اسے ایک اور شکل میں مل گیا۔ اللہ نے اس کے ہاتھ میں بڑی کرامات دی ہیں......“

پھر جان محمد صاحب اپنے ساجھے دار کو ان حیران کن واقعات کے بارے میں بتانے لگے جو عمران اور جانوروں کے حوالے سے ان کے مشاہدے میں آئے تھے، یا انہوں نے سنے تھے۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا مگر ہاتھ کے کنگن کو آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حاجی اشفاق بھی عمران سے بہت متاثر ہوئے۔

شبو، جان صاحب کی بیوی صدیقہ بی بی کے ساتھ زنان خانے میں چلی گئی تھی۔ عمران کا بستر حویلی کی بیٹھک میں لگایا گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں آنے والی تیز رفتار تبدیلیوں پر حیران ہو رہا تھا۔ جوں جوں اسے اختیار، آزادی اور جسمانی توانائی مل رہی تھی، اپنی ماں کے لئے اس کی تڑپ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے لئے سب سے مقدم اپنی ماں کی تلاش تھی۔ رات گئے تک ماں کی تصویر اس کی نگاہوں میں پھرتی رہی۔ وہ غنودہ حالت میں بستر پر لیٹا رہا۔ اچانک ایک آواز نے اسے بری طرح چونکایا...... وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھک کے کسی

قریبی کمرے سے کسی شخص نے بڑے وجدانی انداز میں حق ہُو کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ایسا نعرہ عمران نے پہلے بھی کہیں سنا تھا۔ ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ ایسے نعرے اس نے کہاں سنے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں بجلی سی لپک گئی۔ وہ اُٹھا اور کچے فرش پر ننگے پاؤں چلتا ہوا آواز کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر وہ ایک کمرے کے سامنے پہنچا۔ اس نیم پختہ کمرے کے اندر گیس لیمپ کی سفیدی مائل روشنی تھی۔ عمران نے تھوڑی سی کوشش کی اور پھر ایک چوبی کھڑکی کی جھری میں سے اندر جھانکنے میں کامیاب رہا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ کل اسے پتا چلا تھا کہ یہاں مہمان خانے میں کوئی مولوی صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن یہ مولوی صاحب نہیں تھے۔ یہ تو شہنشاہ کے مزار کا وہی پیر فرتوت مخدوم صادق شاہ تھا جس نے ڈھائی تین سال پہلے عمران کو بڑی بے حسی سے بدمعاش ماجھاں کے سپرد کیا تھا اور پھر پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ اور فربہ ہو چکا تھا۔ سرمے سے بھری ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی نظر آئی تھیں۔ وہ غالباً بھنگ کے نشے میں تھا۔ جان محمد صاحب کی معاون نیلم کسی خادمہ کی طرح اس کے سامنے مؤدب کھڑی تھی۔ وہ خود پلنگ پر نیم دراز تھا۔ اس نے نیلم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرا نہیں بچے۔ تیری شادی ہوگی اور بڑی جلدی بڑا اچھا دولہا ملے گا۔ تیری برادری کا ہی لڑکا ہوگا۔''

اس نے نیلم کو اوڑھنی یعنی گرم شال اُتارنے کو کہا۔ نیلم نے فوراً اُتار دی۔ صادق شاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور نیلم کے جسم پر اوپر سے نیچے تک ہاتھ پھیرنے اور کچھ پڑھنے لگا۔ صادق شاہ کو دیکھ کر عمران کے سینے میں انگارے دہکنے لگے۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اس شخص سے اتنی جلدی مل پائے گا اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ آج کی رات کو صادق شاہ کے لئے یادگار اور عبرت ناک بنا دے۔ اس کے اندر وہی سفاک تدبر سر اُٹھانے لگا جو ماجھاں کی موت کے وقت اس کے ذہن میں نمودار ہوا تھا۔ وہ تیزی سے سوچنے لگا۔

کمرے کے اندر صادق اور نیلم میں گفتگو جاری تھی۔ صادق نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ کل ظفر پھر یہاں آ رہا ہے۔ جب تم دونوں میں طلاق مکمل ہو چکی ہے تو پھر وہ یہاں کیا لینے آتا ہے؟ اس کا کیا کام ہے یہاں؟''

''مجھے تو یہ خود اچھا نہیں لگتا شاہ جی۔'' نیلم کے چہرے پر نفرت نظر آئی۔

''تم خود جان صاحب سے کہو کہ وہ یہاں نظر نہ آیا کرے۔ تمہیں یاد ہے کہ پچھلی دفعہ جب یہاں آیا تھا تو میرے ساتھ کتنی بدتمیزی سے بولا تھا وہ؟ اس خبیث کے دماغ میں یہ

بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اسے تم سے دور کرنے میں میرا ہاتھ ہے۔ حالانکہ یہ اس کے کرتوت ہیں جنہوں نے اسے ذلیل کیا ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں...... یہ تمہاری ہمت ہے کہ تم اس جیسے گندے بندے کے ساتھ دو تین سال گزار گئی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ پچھلے دنوں وہ کسی تھیٹر کے گانے والے کے ہاتھوں بھی ذلیل و خوار ہوا ہے۔''

''ہاں جی، اس گویے کے ساتھ مل کر وہ کوئی نیا تھیٹر بنا رہا تھا۔ وہ بندہ اس سے بھی بڑا فریبی نکلا۔ اس کا پانچ چھ لاکھ روپیا کھا گیا۔ اب اس کا ہاتھ کافی تنگ ہے۔ اسی لئے یہاں کے چکر لگا رہا ہے اور چچا سے جھگڑ رہا ہے۔''

عمران یعنی عمو کھڑکی میں سے ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جس بندے کا نام ظفر لیا جا رہا ہے، یہ وہی ہے جس سے نیلم کی طلاق ہوئی ہے۔

''اب کیا جھگڑا ہے؟'' صادق شاہ نے نیلم سے پوچھا۔

''جھگڑا تو کوئی خاص نہیں ہے جی۔ بس وہ خواہ مخواہ اس کو بڑھا رہا ہے۔ جہیز کا سامان ہم نے واپس لینا ہے اور شادی کے موقع پر جو زیور وغیرہ ان لوگوں نے مجھے پہنایا تھا، وہ ہم نے واپس دینا ہے۔ وہ زیور کو بڑھا چڑھا کر بتا رہا ہے......''

صادق شاہ نے اپنے تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کی لٹ چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ خبیث تمہیں ملنے اور پھر سے اپنے جال میں پھنسانے کے ارادے سے یہاں آتا ہے، حالانکہ اس گدھے کو پتا ہونا چاہئے کہ طلاق مکمل ہو چکی ہے اور اب اس کا تمہاری طرف دیکھنا بھی گناہ ہے۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے جی کہ وہ مجھ سے بات وغیرہ کرنا چاہتا ہے لیکن اب مجھے تو اس کی صورت سے ہی ڈر لگنے لگا ہے۔''

صادق شاہ نے اپنی ٹانگیں پساریں اور نیلم کسی خادمہ کی طرح اس کی پائنتی بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگی۔ صادق شاہ نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''اور مجھے تو وہ دوسرا لڑکا راجا بھی ایک دم فراڈیا لگتا ہے۔ وہ تمہیں بس شادی کا جھانسا دے رہا ہے۔ بُری عورتوں سے اس کا ملنا جلنا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہاری دوسری شادی تمہاری برادری ہی کے کسی لڑکے سے ہوگی اور بڑی جلد ہوگی۔''

نیلم اور زور زور سے اس کی ٹانگیں دبانے لگی۔ صادق شاہ نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل فکر نہیں کرنا۔ سب اچھا ہو جائے گا۔ فقیروں کی دعا ہے تیرے ساتھ۔ بس اپنے چچا سے کہو کہ اس ظفر سے فوراً جان چھڑا لیں۔''

کچھ دیر بعد نیلم نے صادق شاہ کو ادب سے سلام کیا اور اجازت لے کر کمرے سے چلی گئی۔ وہ بھینسے کا بھینسا کچھ دیر تک بستر پر پڑا اپنی ٹانگیں کھجاتا رہا پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ عمو کی آتشیں نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

اس سے اگلے روز عمو نے نیلم کے سابقہ شوہر کو دیکھا۔ اس وقت عمو گھر کے وسیع صحن میں جان محمد صاحب کے ساتھ سرکس کے بے زبان فن کاروں یعنی جانوروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ مختلف جانوروں ریچھ، بندر، بارہ سنگھے وغیرہ کے پنجرے ایک قطار میں رکھے تھے۔ جان محمد صاحب کا سلوک اپنے ملازموں کے ساتھ ساتھ اپنے جانوروں سے بھی بہت اچھا تھا۔ وہ ان کی بہترین نگہداشت کے قائل تھے۔ مکمل تربیت سے پہلے ان کے سرکس کے جانور اسی جگہ رہتے تھے اور بہترین مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس وقت بھی جان محمد صاحب ایک نیم تربیت یافتہ بندر کو اپنے ہاتھ سے ڈبل روٹی مکھن کھلا رہے تھے۔ دروازہ کھلا اور نیلم کا سابقہ شوہر ظفر دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے کلف دار کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کندھوں پر گرم چادر تھی۔ اس کی پھولی ہوئی ناک سے اس کی کرخت طبع کا اندازہ ہوتا تھا۔ عمو کو معلوم ہوا تھا کہ یہ شخص خوشاب شہر میں ایک پٹرول پمپ چلاتا ہے۔ تاہم شکل سے وہ کاروباری شخص کے بجائے ایک اجڈ زمیندار نظر آتا تھا۔

اس کے ساتھ ایک ملازم نما شخص بھی تھا۔ جان صاحب سے بے دلی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد ظفر ان کے ساتھ بیٹھک میں چلا گیا۔

پانچ دس منٹ کے بعد بیٹھک کے اندر سے تیز لہجے میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں...... جان محمد صاحب اور ظفر کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ غالباً وہی زیورات والا معاملہ تھا۔ کبھی جان صاحب کی آواز بلند ہو جاتی تھی، کبھی ظفر کی۔ ظفر کی بوجھل آواز میں کبھی کبھی شرابیوں کی سی لڑکھڑاہٹ بھی آ جاتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں دیکھتے ہی بندے کے ذہن میں ناپسندیدگی کی لہر سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس گفتگو میں ایک دو بار صادق شاہ کا نام بھی آیا۔ شاید صادق شاہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ ظفر نامی شخص اپنی اور نیلم کی طلاق میں صادق شاہ کو قصوروار سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صادق شاہ نے نیلم کو الٹے سیدھے تعویذ پلائے ہیں...... جب یہ بحث چل رہی تھی، صادق شاہ مہمان خانے میں سویا ہوا تھا۔ اس نے بھنگ پی رکھی تھی۔ امید نہیں تھی کہ وہ جلد ہی جاگے گا۔

عمو (عمران) کل رات سے بہت محتاط تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ صادق شاہ کی نظروں میں نہ آ جائے۔ کل جان محمد صاحب نے جس طرح عمو کا تعارف اپنے پارٹنر حاجی احمد اشفاق

سے کروایا تھا، اسی طرح صادق شاہ سے بھی کرا سکتے تھے۔ بہرحال خیریت ہی گزری۔ ایک تو صادق شاہ سہ پہر سے پہلے جاگا ہی نہیں۔ دوسرے جاگتے ساتھ ہی وہ مصروف ہو گیا۔ گاؤں کا چودھری اور دو تین دیگر معزز افراد اس سے ملنے چلے آئے۔ وہ اس کے لئے نذرانے وغیرہ بھی لائے تھے جن میں دیسی گھی، سوہن حلوہ اور گرم چادریں وغیرہ شامل تھیں...... یہ محفل رات تک چلتی رہی۔ نیلم کا سابقہ شوہر ظفر بھی ابھی تک حویلی میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے کل صبح جان محمد صاحب سے حتمی بات کرنی تھی اور زیورات والا معاملہ طے کر کے واپس جانا تھا۔ عمو نے محسوس کیا تھا کہ صادق شاہ اور ظفر ایک دوسرے سے کلام نہیں کرتے۔

عمو کے ذہن میں جس منصوبے نے پرورش پائی تھی، اس کے لئے حالات مزید سازگار ہو گئے تھے۔ شام کو عمو نے شبانہ کے ہاتھ کے تلے ہوئے بینگن پکوڑے کھائے اور دیر تک اس سے باتیں کیں۔ جان محمد صاحب کی خوش خلق بیوی صدیقہ بی بی بھی وہیں موجود تھی۔ عمو اور شبانہ اسے خالہ کہنے لگے تھے۔ وہ بھی ان دونوں کا اپنے بچوں ہی کی طرح خیال رکھنے لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بگاہے ان دونوں کے لئے ملاقات کا موقع فراہم کر دیتی تھی۔

رات گہری ہوئی تو عمو کے سینے میں سلگتے ہوئے انگارے آگ کا روپ دھارنے لگے۔ وہ صادق شاہ کو یادگار سبق سکھانا چاہتا تھا۔ وہ بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ آخر اسے اندازہ ہوا کہ جان محمد کے اس حویلی نما گھر میں سب لوگ سو چکے ہیں۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا اور محتاط قدموں سے جانوروں کے پنجروں تک پہنچ گیا۔ جانوروں کو سردی سے بچانے کے لئے پنجروں پر ترپالیں وغیرہ ڈال دی گئی تھیں۔ رائل بنگلہ ٹائیگر کے پنجرے پر بھی ترپال تھی۔

بنگلہ ٹائیگر یوں تو تربیت پا چکا تھا اور جان محمد نے اس کی تربیت سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی راجا کو ادائیگی کی تھی، تاہم بعد میں صورت حال بدل گئی تھی۔ اپنے مزاج کے اندرونی اشتعال کی وجہ سے بنگلہ ٹائیگر نہ صرف بپھر گیا تھا بلکہ اس نے ایک ملازم کا پیٹ بھی پھاڑ ڈالا تھا۔ اب عمو یہاں موجود تھا اور اسے اندازہ تھا کہ آنے والے دنوں میں اسے ٹائیگر کے ساتھ مزید محنت کرنا پڑے گی۔

عمو نے ٹائیگر کے پنجرے کی ترپال اوپر اٹھائی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور تیزی سے دُم ہلانے لگا۔ عمو کو پہچاننے کے بعد اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ٹائیگر کے پنجرے کے دروازے کو یوں کھولنے کی ہمت یہاں عمو کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تھا...... بلکہ عام ملازم تو

اس کے پنجرے کے پاس بھی نہیں جاتے تھے۔ عمو نے دروازہ کھولا۔ ٹائیگر تیزی سے باہر آیا۔ یوں لگا جیسے وہ حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ دوستانہ جھپٹ تھی۔ عمو نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کی پشت سہلا سہلا کر اسے پچکارنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کے جادو نے کام کر دکھایا۔ ٹائیگر کا پارے کی طرح مچلتا ہوا جسم پُرسکون ہونے لگا۔ عمو نے اسے پوری طرح اپنے کلاوے میں لیا پھر اسے اس کے کالر سے پکڑ کر دھیرے دھیرے اس کمرے کی طرف بڑا جہاں صادق شاہ سو رہا تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ جس وقت عمو ٹائیگر کے ساتھ صادق شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کے پاؤں میں اپنی جوتی نہیں تھی۔ یہ ظفر کی جوتی تھی جو اس نے اس کے کمرے کے سامنے سے اُٹھائی تھی۔ یہ براؤن رنگ کی گرگابی عمو کے پاؤں میں ذرا سی کھلی تھی تاہم کام چل رہا تھا۔

عمو بڑی احتیاط سے تقریباً چار سو دس پونڈ وزنی اس ٹائیگر کو صادق شاہ کے کمرے تک لایا۔ اسے معلوم تھا کہ دروازہ بند ہے لیکن اسے اندر سے کنڈی نہیں چڑھائی گئی۔ عمو نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ ٹائیگر کے جسم میں ایک بار پھر ہلکا سا اضطراب پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی دھاری دار دُم کو تیزی سے حرکت دے رہا تھا اور گردن معمول سے لمبی نظر آ رہی تھی۔ عمو نے اسے کمرے میں دھکیلا اور دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔

اس کے بعد وہ تیزی سے پلٹا۔ ظفر کی جوتی اس کے کمرے کے سامنے اُتاری اور پھر بڑی احتیاط سے گھاس والی جگہ پر پاؤں رکھتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

اسے معلوم تھا کہ بہت جلد یہاں قیامت کا شور بلند ہونے والا ہے۔ اسے پتا تھا کہ ٹائیگر کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر صادق شاہ زبردست واویلا کرے گا۔ اس کا یہ واویلا اور اضطراب ہی اس کی بدقسمتی کا سبب بننے والا تھا۔ ٹائیگر کا مشتعل ہونا لازمی تھا۔

......اور پھر یہی کچھ ہوا۔ صادق شاہ کے کمرے سے تہلکہ خیز آوازیں بلند ہوئیں۔

صادق شاہ دہشت ناک انداز میں چلا رہا تھا اور کمرے کے بند دروازے کو دھڑا دھڑ کوٹ رہا تھا۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... دروازہ کھولو۔'' صادق شاہ کی کرب ناک آواز اتنی زوردار تھی کہ بند کمرے سے بلند ہونے کے باوجود پوری حویلی میں پھیل رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد جان صاحب کے ایک ملازم نے چلا کر کہا۔ ''مالک...... ٹائیگر پنجرے میں نہیں ہے...... مالک۔''

عمو نے دروازے کی جھری سے دیکھا۔ جان محمد صاحب ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں ٹارچ لئے بھاگتے ہوئے برآمدے میں پہنچے۔ فوری طور پر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے بس صادق کی دہشت زدہ پکار سنی۔ ''بچاؤ...... بچاؤ...... دروازہ کھولو۔''

جان صاحب بے ساختہ صادق کے کمرے کی طرف لپکے۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر ان پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ ٹائیگر بھی کمرے کے اندر ہے۔ ٹائیگر کی لرزہ خیز آواز کو پہچاننا ان کے لئے ہرگز مشکل نہیں تھا۔

چند لمحوں کے لئے جان صاحب حواس باختہ نظر آئے۔ تب وہ پیچھے ہٹے اور انہوں نے عمران کو پکارنا شروع کیا۔ ''عمو...... عمو!''

عمران کمرے کے اندر بے حس بنا کھڑا رہا۔ یہ وہی سفاک بے حسی تھی جو اس پر ماجھاں کی موت کے وقت طاری ہوئی تھی۔ اس بے حسی کا تعلق یقیناً ان بے رحم حالات سے تھا جن سے وہ گزر رہا تھا۔ ورنہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ وہ تو کتابوں، پھولوں اور موسموں سے پیار کرنے والا لڑکا تھا۔ اسے وہ سب کچھ اچھا لگتا تھا جو اس کی من موہنی ماں کے نزدیک برا تھا۔ اس کی خوبصورت دنیا اس کی ماں سے شروع ہو کر ماں پر ختم ہو جاتی تھی۔ اب ظالم لوگوں نے اس سے اس کی ماں چھین لی تھی۔ اس طویل جدائی نے عمران کے دل میں جو زہر بھرا تھا، اس کا تریاق ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

وہ حویلی میں برپا ہونے والا شورِ محشر سن رہا تھا مگر بہرا بنا کمرے کی تاریکی میں کھڑا تھا۔

اب کئی ملازم صحن میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ تب عمران نے دیکھا کہ جان صاحب بھاگتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف آ رہے ہیں۔ اب وہ مزید تاخیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی چپل پہنی اور خود ہی کمرے سے نکل آیا۔

جان صاحب اسے دیکھ کر چلائے۔ ''عمو! ٹائیگر...... پیر جی کے کمرے میں گھس گیا ہے۔'' دکھ اور دہشت کی شدت سے ان کی آواز پھٹ رہی تھی۔

عمران ان کے ساتھ لپکتا ہوا صادق شاہ کے کمرے تک پہنچا۔ صادق شاہ کی زخمی آواز مدھم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ غالباً مشتعل درندے کے سامنے اس کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

عمران نے اپنے ہاتھ بند دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھائے تو جان صاحب کے دو ملازموں نے رائفلیں سونت لیں۔ عمران نے دروازہ کھولا۔ ٹارچوں کی روشنی کمرے میں گئی۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ صادق شاہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کا جسم خونچکاں تھا۔ مشتعل درندے نے

پلٹ کر عمران کی طرف دیکھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دکھائی دیں۔ اس کے منہ پر تازہ خون کے نشان تھے۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ وہ عمران پر بھی جھپٹ پڑے گا......

عمران کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ پکارا۔ ''ٹائیگر...... ٹائیگر۔'' اس کا خیال تھا کہ ٹائیگر اس کی سمت آئے گا مگر وہ بے مہار ہو رہا تھا۔

وہ واپس پلٹا۔ اس نے طیش کے عالم میں مخملی لحاف پر پنجہ مارا اور اسے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ عمران ہمت کر کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کی وہ خداداد صلاحیت کام آئی جو اسے جانوروں سے قریب تر کر کے اسے ان کی فطرت پر اختیار دے دیتی تھی۔

چند سیکنڈ کے اندر عمران نے مشتعل درندے کو سنبھال لیا اور پھر اسے اپنے کلاوے میں لیتا ہوا آہنی پنجرے کی سمت لے گیا۔ پوری حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لالٹینیں روشن ہو گئی تھیں اور ملازم بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ کتوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

عمران نے اپنے عقب میں جان صاحب کی وحشت زدہ آواز سنی۔ وہ ملازموں سے کہہ رہے تھے۔ ''اُٹھاؤ...... جلدی کرو۔ اسپتال لے جاؤ۔ ابھی یہ زندہ ہے۔''

تب عمران نے دیکھا کہ چند ملازم فربہ اندام صادق شاہ کو ہاتھوں میں اُٹھائے جیپ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ صادق شاہ کی ادھڑی ہوئی خونچکاں شلوار زمین پر گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جیپ آندھی طوفان کی طرح حویلی کے پھاٹک سے نکلی اور خوشاب کے سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

جان صاحب دہاڑے۔ ''یہ سب کیسے ہوا؟ ٹائیگر کس طرح نکلا ہے پنجرے سے؟ کیسے پہنچا ہے پیر صاحب کے کمرے میں؟'' یقیناً یہی سوال سب لوگوں کے دماغوں میں بھی گھوم رہا تھا۔

حاجی احمد اشفاق نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''یہ حادثہ نہیں ہے۔ یہ کوئی چکر لگتا ہے۔ کسی نے جان بوجھ کر جانور کو کھولا ہے۔ وہ پنجرے سے باہر آیا ہے اور سب سے نزدیک پیر صاحب کا کمرا ہی پڑتا تھا، وہ اس میں گھس گیا ہے۔''

''ایسا کون کر سکتا ہے؟ کس کو ہو سکتی ہے اتنی ہمت؟'' جان صاحب شدید اُلجھن کے عالم میں بولے۔

یکا یک ایک ملازم حسن دین پکارا۔ ''مالک! یہ دیکھیں...... یہ پنجرے کے پاس تازہ

قدموں کے نشان ہیں۔''

حسن دین اپنی طاقتور ٹارچ کا روشن دائرہ کچی زمین پر پھینک رہا تھا۔ یہاں دو طرح کے تازہ نشان تھے۔ ایک عمران کی چپل کا تھا۔ یہ نشان تھوڑی ہی دیر پہلے بنا تھا جب عمران ٹائیگر کو کنٹرول کرنے کے بعد پنجرے کی طرف لایا تھا۔ دوسرا نشان گرگابی کا تھا۔ یہ نشان پنجرے کے سامنے سے شروع ہو کر نیم پختہ برآمدے کی طرف گیا تھا۔ ملازم حسن دین کچھ دیر تک تذبذب میں رہا پھر اس نے جان صاحب کے کان میں کچھ کہا...... جان صاحب کے چہرے پر بھی ہلچل نظر آنے لگی۔ تاہم انہوں نے اپنے اندرونی جذبات کو چھپایا اور نارمل لہجے میں حسن دین سے پوچھا کہ ظفر کہاں ہے؟

اسی دوران میں ظفر بھی شراب کے نشے میں ڈگمگاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا ہے؟ کیسا شور ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''پیر صادق صاحب سخت زخمی ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں بچتے بھی ہیں یا نہیں۔ انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں۔'' جان صاحب نے ظفر کو بتایا۔

ظفر نشیلے انداز میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''وہ کیسے زخمی ہو سکتا ہے؟ وہ تو دوسروں کو زخمی کرتا ہے۔ اس کی راکھی (حفاظت) تو اس کے دو درجن مؤکل کرتے ہیں۔''

جان صاحب غصے سے بولے۔ ''یہ مذاق ٹھٹھے کا وقت نہیں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب کو پتا تھا، ٹائیگر خطرناک ہو رہا ہے۔ پھر اس کا پنجرہ کس نے کھولا؟''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ صادق کو شیر نے زخمی کیا ہے؟'' ظفر نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

جان صاحب نے ظفر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ظفری! تم کہاں تھے؟''

''ظاہر ہے مردانے میں ہی تھا۔ زنانے میں تو اب جا نہیں سکتا کیونکہ آپ جناب کی منہ بولی بھتیجی مجھ سے طلاق لے چکی ہے۔'' وہ بدستور نشیلی آواز میں بولا۔ ''لیکن...... لیکن آپ جناب مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یونہی۔'' جان صاحب نے مختصر جواب دیا اور ایک بار پھر غور سے پنجرے کے اردگرد کچی زمین پر قدموں کے نشانات کو دیکھنے لگے۔ ان کے پریشان چہرے پر شک کی پرچھائیاں تھیں۔

O......❖......O

سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا عمران نے چاہا تھا۔ کسی کا دھیان عمران کی طرف گیا ہی نہیں۔ صادق شاہ اور نیلم کے سابق شوہر ظفر میں رنجش چلی آ رہی تھی۔ ظفر ایک دو بار صادق شاہ کو دھمکی بھی دے چکا تھا۔ پھر پنجرے کے آس پاس ظفر کے قدموں کے تازہ نشان بھی ملے۔ ہر کسی نے یہی نتیجہ نکالا کہ ظفر نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر صادق شاہ سے خوفناک بدلہ لیا ہے۔ اس نے پنجرہ کھولا ہے۔ اسے پتا تھا کہ شیر جب پنجرے سے نکلے گا تو سب سے پہلے وہ جس دروازے تک جائے گا، وہ صادق شاہ کے کمرے کا ہی ہوگا۔

صادق شاہ شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ ہنسلی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ بپھرے جانور نے اس کا ایک کندھا تقریباً چبا ڈالا تھا۔ پتا چلا کہ اسپتال میں اس کی ذہنی کیفیت بھی ابتر ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں چلا اُٹھتا ہے اور ''بچاؤ جان صاحب...... بچاؤ جان صاحب'' کی دہائی دینے لگتا ہے۔ خوشاب سے اسے لاہور کے اسپتال لے جایا گیا۔ جیسے تیسے اس کی جان تو بچ گئی مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کئی ماہ اسپتال میں گزارنے پڑیں گے۔

واقعے کے اگلے دن ہی ظفر عرف ظفری کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ''شک'' اس کی طرف جا رہا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ صادق شاہ کے سیکڑوں مرید آگ بگولا ہو رہے ہیں۔ اگر وہ ان میں سے کسی کے ہتھے چڑھ گیا تو اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ وہ جان صاحب کی حویلی سے گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا۔ اس کے خلاف کچی رپورٹ بھی درج ہو گئی تھی۔

جان صاحب نے ایک بار تو ٹائیگر کو اونے پونے بیچنے کا ارادہ کر لیا مگر پھر عمران آڑے آیا۔ اس نے جان صاحب کو یقین دلایا کہ وہ ٹائیگر کو ٹھیک کر لے گا اور ایسا ٹھیک کرے گا کہ وہ بکری کی طرح اشاروں پر چلے گا۔ جان صاحب کو بھی عمران کی حیرت انگیز صلاحیتوں پر یقین تھا۔ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

آٹھ دس ہفتے میں حالات معمول پر آ گئے...... اب ایک بار پھر جان صاحب کی حویلی میں پکوان پکتے تھے، شطرنج ہوتی تھی۔ ملازمین جانوروں کی دیکھ بھال میں مصروف نظر آتے تھے اور کبھی کبھار جب خوشاب شہر سے سرکس کا کوئی مزاحیہ فن کار آ جاتا تھا تو قہقہے بکھرتے تھے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں صادق شاہ کے ساتھ جو ہوا، وہ کس نے کیا اور اس کے پیچھے کتنی پرانی کہانی تھی۔

عمران اور شبانہ بتدریج جان صاحب کے گھرانے کے فرد بنتے جا رہے تھے۔ جان

صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی گھر والی صدیقہ بی بی بڑی محبت کرنے والی اور دانا عورت تھی۔ عمران اور شبانہ اسے خالہ کہتے تھے، وہ ان دونوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ خصوصاً وہ شبانہ سے بہت پیار کرنے لگی تھی۔ اسے شبانہ کی یہ بات بہت پسند آئی تھی کہ اس نے پورا پورا موقع ہونے کے باوجود عمران سے صرف اس لئے شادی نہیں کی کہ وہ اس شادی میں اپنے گھر والوں کی مرضی شامل کرنا چاہتی ہے۔ اس نے شبانہ کو یقین دلایا کہ وہی کچھ ہوگا جو وہ چاہتی ہے او۔ جو عمران چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔ ''شبانہ اس شادی کے سارے انتظام میں خود کراؤں گی۔ دیکھنا ہم اس کو ایک یادگار شادی بنا دیں گے۔''

خالہ صدیقہ نے جان صاحب سے کہہ کر شبانہ کے گھر والوں کا پتا ٹھکانا معلوم کر لیا تھا۔ شبانہ کی والدہ اور ماموں وغیرہ ابھی تک گجرات کے اس گھوٹکی نامی گاؤں میں ہی مقیم تھے۔ آخر ایک دن جان صاحب کا خاص ملازم حسن دین خود گھوٹکی گاؤں گیا تاکہ شبانہ کے گھر والوں کو شبانہ کے بارے میں خوش خبری سنائے اور انہیں لے کر خوشاب آئے۔

اب شبانہ کے جانے کا وقت تھا۔ عمران کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال اُٹھتا تھا، کیا وہ دونوں ایک ہو پائیں گے؟ کہیں ان کے درمیان کوئی دیوار تو کھڑی نہیں ہو جائے گی؟ اگلے روز شبانہ کے گھر والوں کو خوشاب پہنچ جانا تھا اور شبانہ کو واپس اپنے گاؤں لے جانا تھا۔ اس دن عمران بہت اداس تھا۔ شبانہ بھی چپ چپ تھی۔ خالہ صدیقہ نے رنگین پیڑھی پر شبانہ کو اپنے سامنے بٹھایا اور اس کے لمبے بالوں میں تیل لگاتے ہوئے بولیں۔ ''شبو! تُو ذرا فکر نہ کر۔ ہم بڑی جلدی تجھے پھر واپس یہیں پر لے آئیں گے۔ تیری اور عمو کی شادی کے سارے انتظام ہم خود کریں گے۔ دیکھنا یہ بڑی دھوم دھام والی شادی ہوگی۔''

''لیکن خالہ! ابھی عمران کی امی جی کا تو کچھ پتا نہیں چلا ہے۔''

''وہ بھی جلد ہی چل جائے گا۔ تمہارے خالو پوری کوشش کر رہے ہیں اور اگر فرضِ محال ابھی کوئی کھوج کھرا نہ بھی ملا تو بھی یہ شادی تو اب ہونی ہی ہے۔ ہم سب مل کر عمران کو راضی کر لیں گے۔ کیوں عمو؟'' خالہ صدیقہ نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

عمران خاموش رہا۔ خالہ نے عمران کو بھی اپنے قریب بٹھا لیا۔ پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ ''عمو! مجھے پتا ہے تم نے اپنی والدہ کو ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی ہے...... ہم بھی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ جو کچھ ہو سکا کریں گے لیکن اگر خدانخواستہ...... تمہاری امی کا پتا نہ بھی چلا تو بھی ہم تم دونوں کا نکاح کر دیں گے۔ سیانے کہتے ہیں کہ نیک کام میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے اور اس کام میں تو پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔''

عمران خاموش رہا۔ وہ ''ہاں'' میں جواب کیسے دے سکتا تھا۔ اس کی تو زندگی کا دوسرا نام ہی ماں تھا۔ وہ ابھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ماں کے بغیر وہ یہ شادی کر سکے گا یا نہیں۔

رات کو شبانہ اور عمران تنہائی میں ملے۔ حویلی کی چھت پر ہلکی سی سردی تھی۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ بستی سو رہی تھی لیکن دو پیار کرنے والے دل دھڑک رہے تھے اور ان میں نم ناک کسک جاگی ہوئی تھی۔

عمران نے شبانہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''کل تمہارے گھر والے تمہیں لے جائیں گے شبو! میں بہت اکیلا رہ جاؤں گا۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''ہم بڑی جلدی پھر ملیں گے عمران۔ اس بات کا یقین رکھنا۔ میں اب تمہارے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔''

''اس طرح کے وعدے کبھی کبھی ٹوٹ بھی تو جاتے ہیں شبو۔''

''میری طرف سے نہیں ٹوٹیں گے عمران! میں...... مرتے دم تک تمہاری ہوں۔'' وہ سسک کر بولی۔

عمران نے اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''تم مجھے بھول جاؤ تو بھول جاؤ۔ میں نہیں بھول سکتی عمران...... تمہیں بھول کر میں زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔''

''اور میں کیا زندہ رہ سکتا ہوں؟ تمہیں کیا پتا تمہارے بغیر ایک ایک دن کس طرح گزاروں گا۔''

اس نے اپنی پیاری سی ناک عمران کی گردن میں گھسا دی۔ عمران نے اسے پوری طرح اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ فلک دیکھ رہا تھا...... وہ ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے۔ پیار کرنے والوں کو...... بچھڑنے والوں کو...... وعدے کرنے والوں کو اور پیمان باندھنے والوں کو...... وہ سب جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے لیکن خاموش رہتا ہے۔ صدیاں اس کے نیچے سے دبے پاؤں گزرتی چلی جاتی ہیں اور محبت و نفرت کی ہزار ہا داستانوں کا شاہد بنتا ہے۔

اگلے روز شبانہ کی والدہ اور دو ماموں گجرات کے اس دور دراز گاؤں سے خوشاب کی اس نواحی بستی میں پہنچے۔ اپنی والدہ سے شبانہ کے ملنے کا منظر دیدنی تھا۔ دونوں رو رو کر ہلکان ہو گئیں۔ شبانہ کے دونوں ماموں بھی بھانجی کو دیر تک گلے سے لگائے رہے۔ سہ پہر کو وہ لوگ واپس گجرات کے گاؤں گھونگی روانہ ہو گئے۔

اس کے تیسرے دن عمران ایک بار پھر حسن دین کے ساتھ اپنی والدہ کی تلاش میں

شیخوپورہ اور لاہور روانہ ہو گیا۔ وہ اس سلسلے میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی کسر بھی اُٹھا نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ شیخوپورہ روانگی سے اسے ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ شبانہ کی جدائی سے وقتی طور پر اس کا دھیان ہٹ گیا۔ حسن دین کے ساتھ اس نے کئی جگہوں کی خاک چھانی، کئی لوگوں سے ملا۔ اس کی ملاقات اس کہانی کے ایک اور ناپسندیدہ کردار چودھری سجاول سے بھی ہوئی۔ چودھری سجاول کو شوگر کا مرض لاحق ہو چکا تھا اور وہ پہلے سے کافی کمزور دکھائی دیتا تھا۔ چودھری سجاول نے عمران سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ اس نے قسمیں کھا کر عمران کو یقین دلایا کہ اس کی طرف سے اس کی والدہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ اس نے اپنی زمین مرضی سے بیچی تھی اور اپنی مرضی سے ہی گاؤں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے عمران سے کہا کہ وہ شریفاں بی بی کی تلاش میں ہر طرح اس کی مدد کرنے کو تیار ہے اور اس سلسلے میں پولیس میں بھی اپنا اثر رسوخ استعمال کر سکتا ہے۔ اس نے عمران کو یقین دلایا کہ شہنشاہ کے مزار سے اس کے گم ہو جانے کے بعد انہوں نے اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی تھی لیکن مزار والوں کی طرف سے انہیں یہی بتایا گیا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

چودھری سجاول ان لوگوں میں سے تھا جن پر پیاز کی طرح تہ در تہ چھلکے ہوتے ہیں۔ ان کی اصلیت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ چودھری سجاول کے علاوہ وہ اپنے آبائی گاؤں کے کچھ اور لوگوں سے بھی ملا۔ ان میں ماسٹر عطا صاحب اور قاری سلیم وغیرہ شامل تھے...... ماسٹر عطا صاحب کی تو خیر اور بات تھی مگر باقی کسی شخص میں بھی اسے گرم جوشی یا ہمدردی نظر نہیں آئی۔ وہ لوگ اس سے لئے دیئے ہوئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر لوگوں کے نزدیک وہ شہنشاہ کے مزار کا بھگوڑا تھا۔ بہرحال قاری سلیم کے گھر میں اسے بہ وجوہ دو تین گھنٹے رکنا پڑا کیونکہ تیز بارش ہونے لگی تھی۔ اس نے وہاں کھانا کھایا اور حسن دین کے ساتھ تھوڑی دیر آرام بھی کیا۔

......قریباً دو ہفتے کی بھاگ دوڑ کے بعد عمران اور حسن دین ایک بار پھر ناکام ہو کر خوشاب کی اس نواحی بستی چک میں جان صاحب کے پاس واپس آ گئے۔

ہر طرف ناکامی نظر آتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں عمران کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز اُبھرتی تھی کہ اس کی ماں ابھی زندہ ہے۔ وہ جو اسے ''گھر'' میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتی تھی، دنیا میں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے؟ ابھی اس نے ماں کے ہاتھ سے بہت سے محبت بھرے لقمے کھانے ہیں۔ ابھی اس کی گود میں بڑے دنوں تک سر رکھ کر لیٹنا ہے اور ابھی اس کی شفقت کی بہت سی بارشوں میں بھیگنا ہے۔

ٹائیگر کے حوالے سے عمران نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس نے آٹھ دس ہفتوں میں ہی کر دکھایا۔ یہ تیز طرار جانور ایک دم شانت ہو گیا اور اشاروں پر چلنے لگا۔ جان محمد اور حاجی احمد اشفاق عمران سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے اسے باقاعدہ اپنے سرکس میں ملازمت دے دی اور عمران ''چک'' کی حویلی چھوڑ کر خوشاب آ گیا۔

جان محمد اور حاجی اشفاق کا سرکس وسطی پنجاب کا جانا پہچانا سرکس تھا اور ترقی کر رہا تھا۔ اس کا نام ''اسٹار سرکس'' تھا۔ ابھی یہ لوگ چھوٹے شہروں کے میلوں ٹھیلوں اور عرسوں وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ اس سرکس کے مختلف شعبے تھے۔ مثلاً جسمانی کرتب...... رقص و موسیقی، جوکرز اور پھر وہ کرتب جن میں مختلف جانور، ہاتھی، گھوڑے، کتے، شیر اور پرندے وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ عمران کو اس آخری شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔ یہاں آ کر عمران کو ایسے ہی لگا جیسے مچھلی پانی میں آ گئی ہے۔ وہ جیسے مدتوں سے یہ کام کر رہا تھا اور اس کی ہر ہر باریکی سے آگاہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سب کچھ کمال مہارت سے سنبھال لیا۔ اب وہ ایک جگہ مقیم نہیں تھا۔ سرکس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں اور شہروں میں اس کی حرکت جاری رہتی تھی۔

انہی دنوں میں جان محمد صاحب اور خالہ صدیقہ نے گھونکی گاؤں میں عمران کے رشتے کی بات چلا دی۔ اس رشتے میں سب سے زیادہ اہمیت شبانہ کی والدہ اور اس کے ماموؤں کی تھی۔ ان سب نے دو چار دن کی سوچ بچار کے بعد رضامندی ظاہر کر دی۔ ظاہر تھا کہ ان کے نزدیک اپنی بیٹی کی مرضی اہم تھی۔ خوشاب میں ہونے والی ملاقات میں بھی شبانہ کی والدہ نے عمران کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ان دنوں عمران کی زندگی میں خوشی کی ایک لہر آئی اور اس لہر نے وقتی طور پر ماں کی جدائی کا غم ہلکا کر دیا۔ یہ وہ دن تھے جب اس کی آنکھوں میں شبانہ کی سادہ مسکراہٹ چمکتی رہتی۔ اس کی ہنسی کے مدھر سُر عمران کے کانوں میں گونجتے اور اور اس کے جسم کی خوشبو اس کے حواس کو معطر کرتی۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ گھوڑوں پر سواری کرتا۔ خطرناک جانوروں کی ٹریننگ میں شریک ہوتا اور ٹرینڈ جانوروں کی دیکھ بھال انجام دیتا۔ تاہم ان سارے کاموں کے دوران میں اس کا دھیان شبانہ کی طرف ہی رہتا۔ ایک روز جب ان کا سرکس میانولی میں تھا اور وہ پنڈال کے پچھواڑے رائل بنگلہ ٹائیگر کے پنجرے کی صفائی کروا رہا تھا، جان صاحب وہاں پہنچے۔ انہوں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''تم ضرورت سے زیادہ کام کر رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تین چار روز کی چھٹی کرلو اور خوشاب جا کر اپنی خالہ سے مل آؤ۔''

وہ بولا۔ ''لیکن انکل! شادی پر بھی تو چھٹیاں ہونی ہی ہیں۔ ابھی مجھے کام کرنے دیجئے۔''

''جب شادی کا وقت آئے گا، تب شادی کی چھٹیاں بھی کر لینا۔ ابھی منگنی کی دو چار چھٹیاں کرلو۔'' وہ مسکرائے۔

''منگنی؟''

''ہاں، اسے منگنی بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل یا پرسوں وہ لوگ کوئی نشانی وغیرہ کرنے آئیں۔ ابھی تو شبانہ کے ماموں شیخوپورہ گئے ہوئے ہیں۔''

''وہ کس لئے؟''

''بھئی آخر وہ لڑکی والے ہیں۔ لڑکی والوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور یہ ان کا حق بھی ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں چھان بین کریں۔''

''سب کچھ تو ہم بتا چکے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

''پھر بھی وہ تمہارے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہوں گے۔''

''تو ٹھیک ہے، جان لیں۔ ہم نے کیا چھپایا ہے۔''

''ارے ہاں، یاد آیا۔ یہ دیکھو، یہ چھوٹی سی انگوٹھی ہے۔ تمہاری خالہ نے کہا تھا کہ جب عمران آئے تو یہ انگوٹھی لیتا آئے۔ تمہاری ہونے والی بیوی کے لئے ہے۔'' جان صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سرخ ڈبیا میں بند خوبصورت طلائی انگوٹھی عمران کو دے دی۔

اگلا دن کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ عمران نے شام کو خوشاب جانا تھا مگر دوپہر کو جب جان صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ بجھے ہوئے نظر آئے۔ وہ پریشان ہوتے تھے تو اس کی نشانی یہ ہوتی کہ وہ سگریٹ کو مسلسل ہونٹوں میں دبائے رکھتے اور اسی طرح گفتگو بھی کرتے۔ اس وقت بھی وہ اپنے ''شامیانہ دفتر'' میں بیٹھے یہی کچھ کر رہے تھے۔

عمران نے ان کے سامنے بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''خیریت تو ہے انکل!''

وہ کچھ دیر خاموشی سے عمران کو دیکھتے رہے پھر گھمبیر انداز میں بولے۔ ''تمہارے گاؤں جھنڈوال سے شبو کے دونوں ماموں کوئی اچھی رائے لے کر نہیں لوٹے۔ مجھے لگتا ہے کہ چودھری وغیرہ نے انہیں الٹا سیدھا بتایا ہے۔''

عمران کے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں انکل؟''

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''......تم نے وہ جو آسمانی بجلی والی بات بتائی تھی نا، وہ ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے نکلی نہیں ہے۔ خاص طور سے چودھری گھرانا تو وہ بات بڑے

یقین سے کہتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"یہی کہ تم مقررہ میعاد یعنی سترہ چاندوں تک شہنشاہ کے مزار پر رہنے کے بجائے دو تین مہینے بعد ہی وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اس لئے آسمانی بجلی والی نحوست تم پر آ گئی ہے۔ مطلب ہے کہ جو کچھ پہلے چوہدری کے پتر کے ساتھ ہوتا تھا، وہ اب تمہارے ساتھ ہوگا بلکہ ہو رہا ہے۔"

"کک...... کیا ہو رہا ہے؟"

"آسمانی بجلی تمہارے پیچھے رہتی ہے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔" عمران کا خون کھول اُٹھا۔

جان صاحب نے سگریٹ ہونٹوں میں دبائے دبائے اگر گہرا کش لیا اور بولے۔ "میں بھی جانتا ہوں، یہ سب بکواس ہے لیکن ایسی بکواس جب دلوں کے اندر گھر کر لیتی ہے اور بندے کا یقین بن جاتی ہے تو پھر اسے کھرچنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا پچھلے مہینے تم پھر شیخوپورہ گئے تھے اور چودھری سجاول، ماسٹر اور قاری سلیم وغیرہ سے بھی ملے تھے؟"

"ہاں۔" عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

جان صاحب بولے۔ "اس دن بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ تم بارش میں ہی واپس آئے تھے۔ تمہاری واپسی کے دس پندرہ منٹ بعد ہی قاری سلیم کے ٹیوب ویل پر آسمانی بجلی گری۔ ایک بھینس مر گئی اور ایک لڑکے کے دونوں بازو جل گئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بالکل ایک اتفاق ہے۔ ایسے واقعے پچھلے مہینے کی بارشوں میں کئی جگہ ہوئے ہوں گے۔ کہیں کہیں جانی نقصان بھی ہوا ہوگا مگر میں نے کہا ہے نا کہ جب وہم ہمارا یقین اور عقیدہ بن جاتا ہے تو پھر اس سے چھٹکارا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس واقعے کو بھی تمہاری آمد کے ساتھ نتھی کر کے بتا رہے ہیں۔"

عمران کے اندر آگ سی دہکنے لگی تھی۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے جان انکل سے پوچھا۔ "شبو کے ماموں کیا کہہ رہے ہیں؟"

وہ ذرا توقف سے بولے۔ "یہاں بدقسمتی یہ ہے عمران...... کہ...... شبانہ کے گھر اور برادری والے بھی ان باتوں پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ خاص طور سے اس کے ماموں اور دوسرے ننھیال والے۔ ان میں سے ایک دو گھرانے تو خاصے پیر پرست واقع ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس لڑکے کی زندگی کو اتنا بڑا روگ چمٹا ہوا ہے اور کسی بھی وقت اس کے ساتھ

کچھ ہو سکتا ہے، اسے اپنی لڑکی نہیں دینی چاہئے۔"

"یعنی وہ انکار کر رہے ہیں؟"

"فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔" جان انکل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

عمران اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اس دقیانوسیت اور توہم پرستی سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ اسی دقیانوسیت نے اس سے اس کی ماں چھینی تھی اور اب یہی اس کی زندگی کی ایک اہم ترین خوشی کے راستے میں حائل ہو گئی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" جان انکل نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"گجرات۔ میں خود بات کروں گا شبانہ سے اور اس کے گھر والوں سے۔"

"نہیں، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ اس سے بات اور بگڑ جائے گی۔ ہم جو ہیں تمہاری طرف سے بات کرنے کے لئے۔" جان انکل نے اس کے کندھے تھام کر اسے نیچے بٹھا دیا۔

اگلے چار پانچ روز بے حد تناؤ میں گزرے۔ جان صاحب سب کام چھوڑ کر خود خوشاب گئے اور پھر خالہ صدیقہ کے ساتھ گھوٹکی پہنچے۔ عمران کی اطلاع کے مطابق انہوں نے گھوٹکی کے دو چکر لگائے...... لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ عمران کو معلوم ہوا کہ اس معاملے پر گھوٹکی گاؤں کی پوری برادری ایک ہو گئی ہے اور انہوں نے رشتہ دینے سے معذرت کر لی ہے۔

اب عمران کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔ ایک دوپہر وہ میانوالی سے روانہ ہوا اور رات تک شبانہ کے پنڈ جا پہنچا۔ اس کے سینے میں آگ سلگ رہی تھی اور آنکھوں میں گھمبیر دکھ کی نمی تھی۔ کوئی اس سے اس کی زندگی کیسے چھین سکتا تھا...... وہ اور شبانہ محبت کی ناقابلِ شکست ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بے شمار شب و روز ایک دوسرے کے قریب گزارے تھے لیکن پھر بھی بہت دور رہ کر۔ انہیں اپنی محبت پر بھروسا تھا اور یقین تھا کہ وہ اپنے بڑوں کی رضامندی اور خوشنودی کے ساتھ ایک ہوں گے لیکن اب یقین ٹوٹ کر بکھر رہا تھا اور عمران نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسے بکھرنے نہیں دے گا۔ وہ سب سے پہلے شبانہ سے ملنا چاہتا تھا۔

اس رات اس نے سیدھا جا کر شبانہ کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا شبانہ کا بڑا ماموں نیاز احمد تھا۔ کہنے کو تو وہ ایک چھوٹا سا کاشت کار تھا لیکن اپنے اندر زمینداروں کی سی اکڑفوں رکھتا تھا۔ اس نے عمران کو پہچان لیا اور فوراً ہی اس کے چہرے

کا رنگ بدل گیا۔

’’کیا بات ہے عمو؟‘‘ اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

’’میں بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کس سے؟‘‘

’’آپ سے اور شبانہ سے بھی۔‘‘

’’خبردار، اگر ہماری لڑکی کا نام لیا تو...... بہت برا ہوگا۔‘‘ نیاز احمد پھنکارا۔

’’وہ میری منگ ہے۔ میں اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔‘‘ عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’اوئے کون منگ؟ کس کی منگ؟‘‘ نیاز کا انداز مزید بگڑ گیا۔

اسی دوران میں شبانہ کا چھوٹا ماموں اشرف بھی باہر آ گیا۔ وہ بڑے ماموں سے زیادہ سمجھدار تھا۔ اس نے لڑائی کو بڑھنے سے روکا اور عمران کو ایک طرف لے جا کر بولا۔ ’’تم شبانہ سے بات کرنا چاہتے ہو تو میں تمہاری بات کراؤں گا۔ پر ابھی نہیں۔ کل سویرے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں انتظار کر لیتا ہوں مگر ایک بات آپ لوگ ذہن میں رکھیں۔ اگر شبانہ کو کسی طرح مجبور کیا گیا یا اسے کوئی ڈراوا دیا گیا تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔‘‘

’’جب تم خود بات کرو گے تو پھر سب کچھ تم پر کھل جائے گا۔‘‘ شبانہ کے چھوٹے ماموں نے کہا۔

یہ اجنبی گاؤں تھا۔ عمران نے جیسے تیسے گاؤں کے ’’دائرے‘‘ میں رات گزاری۔ وہ یہاں اکیلا چلا آیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر اس کے دل میں ڈر نہیں تھا۔ اب اسے اپنے ڈر کو دبانا اور خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا آ چکا تھا۔ اب وہ نمایاں قد کاٹھ اور مضبوط جسم کا مالک نوجوان تھا۔ اس کی پیشانی روشن اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

شبانہ کے چھوٹے ماموں نے اگلے روز علی الصباح شبانہ اور عمران کی ملاقات کرا دی۔ مگر یہ ملاقات شبانہ کے گھر میں نہیں بلکہ گھر سے باہر ایک کنوئیں پر ہوئی کنوئیں کے ساتھ دو تین کچے کوٹھے سے تھے۔ ایک کوٹھے میں شبانہ موجود تھی۔ اس بات کا پتا عمران کو بعد میں چلا کہ عمران کی ملاقات گھر میں اس لئے نہیں کرائی گئی کہ کہیں اس کی نحوست گھر پر اثر انداز نہ ہو جائے اور کوئی آفت نہ ٹوٹ پڑے۔

عمران اس کچے کوٹھے کے اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اسے مزید حیرانی ہوئی کہ کمرے کے درمیان کپڑے کا ایک پردہ تھا اور شبانہ اس پردے کی دوسری جانب تھی۔ یعنی وہ اس سے

بات تو کر سکتا تھا مگر دیکھ نہیں سکتا تھا۔

وہ جو خوش رنگ سویروں اور چاندنی راتوں میں ہر وقت اس کے قریب رہتی تھی، آج اس کمرے میں اسے اپنی صورت بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہ کیسا دل فگار انقلاب تھا۔ شبانہ کے ماموں وغیرہ آس پاس ہی موجود تھے۔ ایک ماموں زاد کے ہاتھ میں باقاعدہ رائفل نظر آ رہی تھی۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی ان کے پاس آتشیں ہتھیار موجود ہوں گے۔

عمران نے کہا۔ ’’شبانہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہارے گھر والے انکار کر رہے ہیں اور میں جانتا ہوں، ایسا صرف اس چودھری سجاول کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس نے بالکل بیکار کی باتیں کر کے تمہارے ماموؤں کو گمراہ کیا ہے۔ یہ پرانے زمانے کے جاہلوں والے خیال ہیں۔ زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ ان جعلی پیروں کے ہاتھ میں نہیں۔ کیا تم ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہو؟‘‘

دوسری طرف خاموشی رہی۔ یہ بڑی بوجھل خاموشی تھی۔ آخر اس خاموشی کی دیوار ٹوٹی اور شبانہ کی گھمبیر آواز سنائی دی۔ ’’جو کچھ بھی ہے عمران...... مم...... میرا فیصلہ وہی ہے جو میرے بڑوں کا ہے۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔‘‘

’’کیوں...... شبانہ کیوں......؟‘‘ عمران تڑپ کر بولا۔

’’بس میں نے کہا ہے نا۔ میں اپنے بڑوں کے خلاف نہیں جا سکتی...... وہ میرے لئے جو سوچیں گے، ٹھیک ہی سوچیں گے۔‘‘ شبانہ کی آواز کی تہ میں اشکوں کا بہاؤ تھا لیکن اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

’’شبانہ! یہ گھسی پٹی باتیں ہیں...... تم اندر کی بات نہیں بتا رہی ہو۔ تمہیں مجبور کیا جا رہا ہے شبانہ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔‘‘

’’مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا۔‘‘ شبانہ کے لہجے میں اشکوں کا بہاؤ کم ہو گیا اور مضبوطی کچھ بڑھ گئی۔ وہ جملہ مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ’’میں نے تمہیں پہلے دن سے کہا تھا عمران! میں اپنی ماں اور اپنے بڑوں کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ راضی ہو جاتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا مگر اب یہ نہیں ہو سکتا عمران۔ تمہیں میری اور اپنی عزت کے لئے خود کو سنبھالنا ہوگا...... سب کچھ بھولنا ہوگا...... اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے...... اگلے مہینے میری شادی ہو رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اب تم دوبارہ یہاں ہمارے پنڈ آؤ...... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا کہ کسی کھوہ میں چھال مار دوں۔ میں سچ کہتی ہوں...... میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا......‘‘ اس کی آواز بھرا گئی۔

دکھ کی شدت نے عمران کو بے بس کر دیا۔ وہ پردہ ہٹا کر شبو کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ ”خدا کے لئے شبو! ایسی باتیں مت کرو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں سب کچھ ختم کر دوں گا۔ تمہیں کسی اور کی نہیں بننے دوں گا...... شبو...... خدا کے لئے شبو۔“

اس نے اسے جھنجوڑ دیا۔ فرطِ غم میں اس نے اسے اپنے گلے لگانے کی کوشش کی، اپنے اندر چھپانا چاہا۔ وہ ایک دم غیر ہو گئی۔ اس نے اسے پیچھے دھکیلا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ ”چھوڑ دو مجھے...... چلے جاؤ یہاں سے۔“ وہ کراہی۔

عمران نے اسے چھوڑ دیا...... وہ ایک گوشے میں سمٹ گئی...... وہ اپنے چہرے پر دنیا جہان کی التجا سمیٹ کر بولا۔ ”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا شبو! میرے ساتھ ایسا مت کرو...... میں نے......“

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ شبانہ کے رشتے دار آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے شبانہ کی احتجاجی آوازیں سن لی تھیں۔ شبانہ کے بڑے ماموں نے گھما کر پستول کا دستہ عمران کے سر پر مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ چھوٹا ماموں ان کے درمیان آ گیا۔ اس نے عمران پر حملہ آور ہونے والوں کو روکا اور گرجا۔ ”اس کو مار دو گے...... تو اپنی بدنامی کا اشتہار لگاؤ گے۔ اس کو ایک موقع دو دفع ہو جانے کے لئے۔ اگر یہ دوبارہ یہاں آیا تو میں تمہارے ساتھ مل کر اس کے ٹوٹے کروں گا......“

حملہ آور بہت بھرے ہوئے تھے لیکن شبانہ کے چھوٹے ماموں کی بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔

شبانہ کا چھوٹا ماموں عمران کو کھینچ گھسیٹ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اپنے ایک ساتھی سے کہہ کر اس نے عمران کے سر پر پٹی بندھوائی۔ پھر اسے سمجھایا کہ اس کے لئے اب یہاں سے چپ چاپ چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔ ورنہ یہ لوگ اسے ابھی کاٹ کر یہیں کھیتوں میں دبا دیں گے۔

عمران نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ”چاچا! مجھے ایسی باتوں سے مت ڈرا لیکن...... میں تیرے کہنے پر چلا جاتا ہوں۔ ہاں، یہ بات تُو بھی اچھی طرح سن لے اور دوسروں کو بھی سمجھا دے، میں اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔ تم لوگوں نے ہاں کی ہوئی ہے۔ اب اس ہاں کو نہ میں نہیں بدلنے دوں گا۔ تم لوگ شبانہ پر زبردستی کر سکتے ہو، مجھ پر نہیں۔ میں ہر حد تک جاؤں گا۔“

شبانہ کے ماموں نے بے رخی سے کہا۔ ”میں بھی تجھے بتا دوں۔ اگلی دفعہ میں کسی کا ہتھ نہیں روکوں گا۔ اگر تُو اس پنڈ کی جو میں داخل ہوا تو تیرے ٹوٹے ہو جائیں گے۔“

”جو کچھ تم میرے ساتھ کر رہے ہو، اس کے مقابلے میں مجھے ہزار دفعہ مرنا بھی قبول ہے۔“ عمران نے بھی آتشیں لہجے میں کہا۔

پھر وہ گھونکی گاؤں سے چلا آیا۔

صورتِ حال بڑی عجیب ہو گئی تھی۔ جہاں جاہلیت اور ناخواندگی کا اندھیرا ہو، وہاں توہم پرستی کا آسیب بڑی تیزی سے پھیلتا ہے۔ گھونکی گاؤں میں رہنے والی برادری کے لوگوں کو بھی پورا یقین ہو گیا کہ آسمانی بجلی کی نحوست والی بات درست ہے اور اگر اس نوجوان کی شادی برادری میں ہو گئی تو یہ نحوست برادری میں آ جائے گی۔ برادری میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ویسے بھی برادری کے باہر شادی کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

ایک روز جان محمد صاحب نے عمران کو بتایا۔ ”مجھے پتا لگا ہے کہ شبانہ کے ماموؤں نے کسی نام نہاد مولوی سے فتویٰ بھی لیا ہے۔ اس نے بھی یہی کہا ہے کہ آسمانی بجلی والی نحوست پہلوٹی کے بعض بچوں میں ہوتی ہے اور یہ نحوست ایک بچے سے دوسرے بچے اور ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں جا سکتی ہے...... یہ لوگ تمہارے گاؤں والے واقعے کو بھی بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قاری سلیم کے گھر پر صرف اس لئے بجلی کی آفت آئی کہ تم وہاں رکے تھے اور تم نے کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد بجلی گاؤں کے پاس بیلے کے درختوں پر کوندتی رہی...... جیسے تمہیں ڈھونڈ رہی ہو۔“

”آپ کو ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہے یا رونا آتا ہے؟“ عمران نے جان صاحب سے پوچھا۔

”دونوں...... لیکن بات وہی جاہلیت کے قصوں کی ہے...... اور واہموں کی ہے۔ تم نے ناگ اور ناگن والی بات تو سنی ہوگی۔ لوگوں کو یقین ہے کہ اگر کوئی ناگ کو مار دے تو ناگن اس کا بدلہ لیتی ہے اور ہر سال ایک خاص وقت میں مارنے والے کو ڈسنے کے لئے آتی ہے...... اور ایسی بے شمار باتیں ہیں یار۔“

عمران نے گہری سانس لی۔ ان جاہلوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اگر بجلی کو مجھ سے ایسی ہی دشمنی ہے تو پھر پچھلے تین چار سال سے میں زندہ کیسے بچا ہوا ہوں؟“

”جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔“ جان صاحب نے کہا۔ ”ان لوگوں کا خیال ہے کہ تم ایک رُوپوش شخص ہو۔ جب آسمان پر بادل ہوتے ہیں تو

تم چھت کے نیچے سے نہیں نکلتے۔ خاص طور سے بارش کے موسم میں۔ کسی دن جب بھی کسی کھلی جگہ پر تمہارا اور بارش کا آمنا سامنا ہوگا، تمہاری موت ہو جائے گی۔''

اگلے دو تین ہفتے میں عمران نے جان صاحب کے ساتھ مل کر بہت کوشش کی مگر اچھے طریقے سے اس معاملے کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ شبانہ کے گھر والے کسی بھی طرح کی بات چیت کا دروازہ بند کر چکے تھے۔ پھر عمران کو پتا چلا کہ شبانہ کی شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس کی شادی اس کے اسی ماموں زاد سے ہو رہی تھی جسے اس نے گھوٹکی گاؤں سے باہر کنوئیں پر دیکھا تھا۔ قدرے چھوٹے سر اور بڑے منہ والا وہ اکھڑ سا لڑکا جو کندھے سے رائفل لٹکائے پھرتا تھا۔

سینے میں بھڑکنے والی آگ اس کے پورے بدن میں پھیلنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے شبانہ کے چھوٹے ماموں اشرف کو ایک خط بھی لکھا۔ اس خط میں اس نے لکھا کہ وہ باقیوں کے مقابلے میں سمجھ دار ہے۔ آخر وہ بھی ایسی بیکار کی باتوں پر یقین کیوں کر رہا ہے۔ یہ سب جعلی پیروں فقیروں اور تعویذ گنڈے والوں کی بیان بازیاں ہوتی ہیں۔ زندگی موت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور اگر کوئی اس بات پر بہت پکا یقین رکھتا ہے کہ مجھ پر آسمانی بجلی کی نحوست ہے اور میں گھر میں چھپا رہتا ہوں تو میں اس کو غلط ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر کوئی میرا امتحان لینا چاہتا ہے تو لے لے۔ مجھے بارش میں کھڑا کر دو۔ ایک دن نہیں، دو دن نہیں، جتنے دن مرضی یہ آزمائش کر لو۔ اگر مجھ پر بجلی گر گئی تو آپ سب لوگوں کی جان مجھ سے چھوٹ جائے گی اور اگر یہ بات بکواس ثابت ہوتی ہے تو پھر آپ لوگوں کو اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔

یہ طویل خط اس نے جان صاحب کے ملازم حسن دین کے ذریعے گجرات میں شبانہ کے چھوٹے ماموں تک پہنچایا...... کئی دن کے انتظار کے باوجود اس کا ذرا سا ردِعمل بھی ظاہر نہیں ہوا۔ شاید جان صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا...... جو لوگ اندھے عقیدے بنا لیتے ہیں، ان کے پاس اپنے عقیدوں کے حوالے سے ہر سوال کا جواب موجود ہوتا ہے۔

ایک دن جب جان گسل بے قراری عروج پر تھی، عمران شاد پورہ پہنچا اور آموں کے باغ میں اپنے پرانے یار راجا سے ملا۔ راجا ابھی تک یہیں باغبان کبیر کے گھر رہائش پذیر تھا۔ اس کے باقی شغل بھی اسی طرح جاری تھے۔ افیم کی نقل و حرکت، گھوڑوں اور کتوں کی سدھائی، شراب نوشی اور طوائف بازی بھی۔ اپنے میزبان کبیر احمد سے راجا کے تعلقات میں وہ پہلے والی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ عمران کو اندازہ ہوا کہ شاید راجا جلد ہی واپس گجرات

جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

راجا، عمران سے تپاک سے ملا۔ عمران نے اس سے کہا۔ ''بھا راجا! مجھے تمہاری ضرورت آن پڑی ہے۔''

وہ خوش ہو گیا۔ عمران کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر مخصوص انداز میں بولا۔

''یار! اب اگر کوئی ضرورت بتانے لگے ہو تو ''ٹیٹ'' سی بتانا۔ کوئی کنڈم بات نہ کرنا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کوئی زوردار کام ہو۔ راجے کی شان اور تیری شان کے مطابق۔''

''کام تو کچھ ایسا ہی ہے۔'' عمران نے کہا۔ پھر ذرا وقفے سے بولا۔ ''شبو کی شادی ہو رہی ہے۔''

''اوئے مبارکاں۔ یعنی تیری اور شبو کی شادی۔''

''نہیں راجا! اس کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے۔'' عمران نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کنڈم خبر دے رہا ہے۔'' راجا ششدر رہ گیا۔

عمران نے اگلے پندرہ بیس منٹ میں اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس پر بیتا تھا۔

○......❖......○

شبانہ کی شادی ہو رہی تھی۔ آج اس کی مہندی کی رات تھی۔ گھوٹکی گاؤں کے اس گھر میں سرسوں کے بہت سے دیے جل رہے تھے اور کئی لالٹینیں روشن تھیں۔ گاؤں کی الھڑ مٹیاریں شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی اور کبھی کبھی کوئی لڑکی رقص بھی کرنے لگتی تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ آلو گوشت کی دیگ ابھی ابھی خالی ہوئی تھی اور چھوٹی لڑکیاں اور بڑی عمر کی عورتیں برتن وغیرہ سمیٹ رہی تھیں۔ اس گھر کے پچھواڑے مکئی کے اونچے کھیتوں میں عمران موجود تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ اس کے رگ و پے میں خون کی جگہ سیال آگ دوڑ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی، اس کے ساتھ اٹھائیس گولیوں والا میگزین اٹیچ تھا۔ یہ رائفل اسے راجا نے فراہم کی تھی۔ راجا بھی اس کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے پاس بھی پمپ ایکشن گن تھی۔ ان کا لوڈر تھوڑے ہی فاصلے پر درختوں میں کھڑا تھا۔

''یہ بڑا ٹھیک وقت ہے۔'' راجا نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔ ''میرے اندازے کے مطابق گھر میں تین چار سے زیادہ مرد نہیں ہیں۔''

عمران نے جیسے سن کر بھی نہیں سنا۔ اس کا چہرہ خون کے بے پناہ دباؤ سے سرخ تھا۔ اس

نے رائفل کو بے حد مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ رائفل کا لوہا اس کی ہتھیلیوں میں پیوست سا ہو گیا تھا۔

اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ شبانہ کی معصوم صورت اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''عمران! کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہو گا کہ میں کھوہ (کنوئیں) میں چھال ماردوں۔ میں سچ کہتی ہوں، میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہو گا۔''

اسے اپنے گھر والوں کی عزت اپنی جان سے پیاری تھی۔ وہ اس کے لئے جان دے سکتی تھی۔ تو کیا وہ اسے جان دینے پر مجبور کر دے گا؟ کیا اس کا یہ اقدام اسے موت کے اندھیروں میں لے جائے گا؟ وہ اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ وہ اس کی بربادی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ایک بار پھر ہاتھ جوڑے، آنکھوں میں آنسو لئے اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اسے کہہ رہی ہے...... اپنے قدم روک لو عمران! کچھ باقی نہیں بچے گا اور تمہارے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا۔ میں جان دے دوں گی۔ ہمارا پیار قربانی مانگ رہا ہے۔ ہمیں یہ قربانی دینی ہو گی۔ خدا کے لئے عمران......

رائفل کے دستے پر عمران کی گرفت بہت مضبوط رہی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے رہے لیکن اس کے اندر کی کیفیت بدلنے لگی۔ اس کے غیظ وغضب کو بے بسی کی ایک بلند و بالا دیوار نے گھیر لیا۔ اس کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکے۔ ڈھولک کی مدھم آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ لڑکیاں گا رہی تھیں۔ اساں چڑیاں دا چنبہ ہو...... بابل اساں اڈ جاناں۔

راجا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''عمران! یہ بڑا چنگا ویلا ہے۔ مجھے پتا ہے، دو منٹ لگیں گے اور شبو ہماری گڈی میں ہو گی۔''

عمران خاموش رہا۔

''اوئے تُو سوچ کیا رہا ہے؟ کہیں تیرا ارادہ تو ڈانواں ڈول نہیں ہو رہا...... اوئے کھوتے، ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔'' راجا نے عمران کا کندھا جھنجوڑا۔

دونوں کے درمیان ایک نہایت بوجھل خاموشی طاری رہی۔ پھر عمران نے نہایت عجیب لہجے میں کہا۔ ''نہیں راجے...... میں...... نہیں کر سکتا۔''

''کیا مطلب؟''

عمران جواب دینے کے بجائے اُٹھ کھڑا ہوا اور لوڈر کی طرف چل دیا۔ راجا کچھ دیر ٹھٹکا رہا پھر وہ بھی اس کے پیچھے لوڈر میں آ گیا۔ اس نے عمران کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''راجا! چلو یہاں سے۔''

اس کے ان چار لفظوں میں کچھ ایسا درد تھا...... اور کچھ ایسی فیصلہ کن کیفیت تھی کہ راجا کچھ بول نہیں پایا۔ اسے لوڈر اسٹارٹ کرنا پڑا۔ اس نے عمران کو کبھی ایسی گھمبیر کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔

گھونکی گاؤں سے قریباً دو میل دور آنے کے بعد عمران نے راجا کو لوڈر روکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے لوڈر روک دیا۔ ''مجھے شراب دو۔'' عمران نے کہا۔

راجا نے انڈین شراب کی بوتل اسے تھما دی۔ اس نے بوتل منہ سے لگائی اور عجب دیوانگی کے عالم میں اس سیال آگ کو سینے میں اُتارتا چلا گیا۔ دو تین سانسوں میں وہ آدھی سے زیادہ بوتل چڑھا گیا۔ اس نے اپنا سر ڈیش بورڈ پر پھینک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ راجا کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کہنا سننا فضول ہے۔ عمران وہی کرے گا جو وہ چاہتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکھڑاتا ہوا سا نیچے اُتر آیا۔ الکحل اس پر اثر انداز ہو چکی تھی...... اس نے رائفل لوڈر میں پھینک دی اور اپنے لڑکھڑاتے قدم واپس گھونکی گاؤں کی طرف بڑھائے۔

''کہاں جا رہے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟'' راجا چلایا۔

وہ ٹوٹی آواز میں بولا۔ ''کچھ نہیں کر رہا۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں اس کو برباد نہیں کر سکتا۔ میں تو...... میں تو ایک بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کل جب وہ دوہٹی بنے گی...... لال جوڑا پہنے گی، اس کے ماتھے پر جھومر لگے گا، تو وہ کتنی پیاری لگے گی۔ میں بس ایک بار...... ایک بار اسے دور سے دیکھوں گا اور پھر واپس خوشاب آ جاؤں گا۔ بس ایک بار۔''

''کیسی جھلوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔'' راجا نے اسے ڈانٹا۔ ''اس طرح جائے گا تو وہ تیرا قیمہ کر کے کتوں کو ڈال دیں گے۔''

''تو ڈال دیں۔ میں پہلے کون سا زندہ ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے ہاتھ لہرائے۔

راجا نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ ''چل...... چل گڈی کے اندر بیٹھ۔''

"یار! ایسے کیوں کرتے ہو۔ میں کچھ مانگ تو نہیں رہا۔ کچھ چھین تو نہیں رہا۔ میں ایک بار اسے لال کپڑوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یار! اب میرا اتنا حق بھی نہیں ہے؟ تم مجھے اتنا بھی نہیں کرنے دیتے۔ یار تم کیسے یار ہو؟" وہ سسک اُٹھا۔

راجا نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور خود بھی اشک بار ہو گیا۔ وہ اسے کھینچ کھینچ کر لوڈر تک لایا۔

عمران لوڈر میں بیٹھ گیا لیکن جب راجا نے لوڈر اسٹارٹ کیا تو وہ دروازہ کھول کر پھر باہر نکل آیا۔

"اب کیا ہے؟" راجا نے پوچھا۔

"یار! مجھے ایک بار جانے دو۔ بس ایک بار...... میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا...... کسی کے سامنے نہیں آؤں گا۔ اپنا منہ چھپا کر رکھوں گا۔ بس دور سے اس کو دیکھوں گا۔"

راجا پھر اس پر جھپٹا۔ "تجھے چڑھ گئی ہے۔ چل بیٹھ گڈی میں اور اگر نہیں تو پھر آ میرے ساتھ...... آ میرے ساتھ...... اُٹھا لیتے ہیں اس کو۔ لے جاتے ہیں کہیں دور۔ دیکھتے ہیں ان میں سے کون مائی کا لال روکتا ہے ہمیں۔" اس نے رائفل پھر عمران کے ہاتھ میں تھما دی۔

عمران نے رائفل تھام لی۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت رائفل پر بے ساختہ سخت ہوتی چلی گئی۔ چہرہ، انگارہ نظر آنے لگا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ اس کی نگاہ دور گھونکی کی مدھم روشنیوں پر تھی۔ وہ روشنیاں جہاں ایک گھر کے اندر مہندی کے گیت گائے جا رہے تھے، ایک ماں اپنی بیٹی کی بلائیں لے رہی تھی۔ عمران کی آنکھوں میں آتشیں آنسو جھلملانے لگے۔ تب عجیب ہیجانی انداز میں اس نے رائفل کا رخ کئی...... کلومیٹر دور نظر آنے والی ان روشنیوں کی طرف کیا اور ٹریگر دباتا چلا گیا۔ بیرل سے شعلے نکلے اور دھماکوں سے فضا گونج اُٹھی۔ تاریک سناٹا لرز گیا۔ گولیاں لامتناہی اندھیرے میں کہیں گم ہو گئیں۔ تب اس نے وحشت بھرے انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ سرخ ڈبیا نکالی جو اسے جان صاحب نے دی تھی۔ اس میں خوبصورت انگوٹھی تھی۔ اس نے ڈبیا زمین پر پھینکی اور ایک پورے برسٹ سے اسے اُڑا کر رکھ دیا۔ تب اس نے رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر اندھا دھند ایک درخت کے تنے پر مارا۔ وہ شاید اسے مزید مارتا اور برباد کر کے رکھ دیتا مگر راجا نے اسے سنبھال لیا۔ رائفل اس سے چھینی اور اسے کھینچتا ہوا لوڈر تک لے آیا۔ عمران کی آنکھوں سے آتشیں آنسو اب تواتر کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنا سر لوڈر کے ڈیش بورڈ پر پٹخ دیا۔ راجا نے لوڈر کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

...... صبح ہونے تک وہ لوگ واپس خوشاب پہنچ گئے لیکن عمران جیسے واپس آ کر بھی واپس نہیں آیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا صرف بت باقی ہے، روح وہیں گھونکی گاؤں کے آس پاس کہیں رہ گئی ہے۔ ڈھولک کی تھاپ میں گم ہو گئی ہے، یا لڑکیوں کے گیتوں میں، یا مہندی کی خوشبو میں۔

وہ جینا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی بوجھ بن گئی تھی اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ یہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ماں تو بہت پہلے ہی اس سے بچھڑ گئی تھی، اب وہ ہستی بھی بچھڑ گئی تھی جس نے اس میں پھر سے زندہ رہنے کی امنگ جگائی تھی۔ اب کیا کرنا تھا جی کر...... وہ ہر وقت یہی سوچ رہا تھا۔ راجا کی تسلیاں، جان صاحب کی محبت اور خالہ صدیقہ کی شفقت کچھ بھی اس کے دکھ کا مداوا نہیں تھا۔ ہاں، اب وہ اور جینا نہیں چاہتا تھا۔

اسے اب سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ شبانہ کو اس شادی کے لئے اس طرح مجبور کیا گیا تھا کہ بالآخر اس کے پاس اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ خاندان، برادری کا زور چل گیا تھا۔ اس کی والدہ نے ایک روز خود پر مٹی کا بہت سا تیل چھڑک کر ماچس ہاتھ میں پکڑ لی تھی اور قسم کھائی تھی کہ اگر شبانہ نے شادی کے لئے ہاں نہیں کی تو وہ ابھی اسی وقت خود کو جلا کر کوئلہ کر لے گی۔ شبانہ نے اس سے ماچس لے لی تھی اور اس کے قدموں میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

بہر حال اب یہ سب کچھ ماضی بن چکا تھا۔ حال یہ تھا کہ عمران زندگی اور موت کے درمیان لٹک گیا تھا۔ سانس ایک تیز زہریلی کٹار تھی جو ہر پل اس کے سینے کو چیر رہی تھی۔ پھر بھی شاید بہت دور، دل کی اتھاہ گہرائی میں کہیں آس کا دیا ٹمٹماتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب تک سانس تب تک آس، کرب کے بے رحم پنجوں میں تڑپتے ہوئے وہ کبھی کبھی سوچتا تھا...... کیا کوئی انہونی ہو سکتی ہے؟ کیا کسی وقت شبو اس کی طرف پلٹ سکتی ہے؟ انہونیوں کی خواہش پالنا شاید انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

شبانہ کی شادی کو تین چار ہفتے گزر گئے تھے جب ایک اور اندوہناک سانحہ ہوا اور ہر امید ختم ہو گئی۔ اس سانحے نے عمران کی زندگی یکسر اندھیر کر دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب زندگی کا زہر مزید پینے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا۔ ایک دن صبح سویرے جان انکل کے ملازم حسن دین نے عمران کو روتے ہوئے یہ خبر سنائی کہ شبانہ اور اس کا شوہر حادثے کا شکار ہو گئے ہیں اور اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

عمران کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کی زندگی کے لئے تو اس

نے اتنا بڑا جہنم اپنے سینے میں اُتارا تھا۔ وہ کیسے چلی گئی؟ وہ کیسے مرگئی؟ شروع میں پتا چلا کہ رائفل صاف کرتے ہوئے رائفل کا برسٹ چلا اور دونوں میاں بیوی موقع پر ہی دم توڑ گئے لیکن پھر رات کے وقت اصل تفصیل سامنے آئی۔ معلوم ہوا کہ شبانہ کے سخت گیر شوہر نے اس سے جھگڑا کیا تھا۔ اس نے بے قصور شبانہ پر بدچلنی کا الزام لگایا اور پھر اسے بُری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں شبانہ کا چھوٹا ماموں اشرف وہاں پہنچ گیا۔ اس نے شعلہ مزاج بھتیجے کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی۔ اسی بات پر چچا بھتیجا میں شدید جھگڑا ہو گیا۔ شبانہ کے شوہر سجاد نے پستول نکال لیا۔ اپنی جان خطرے میں دیکھ کر اشرف نے دیوار سے آٹھ ایم ایم رائفل اُتار لی۔ روتی بلکتی شبانہ، شوہر اور ماموں کے بیچ آ گئی۔ سخت کھینچا تانی کے دوران میں آٹھ ایم ایم رائفل چل گئی۔ اس کی ایک ہی گولی شبانہ اور سجاد دونوں کے جسم سے پار ہو گئی۔ شبانہ نے تو وہیں اپنے کمرے میں دم توڑ دیا...... سجاد گجرات کے سرکاری اسپتال میں پہنچ کر ختم ہو گیا۔ عمران دو تین دن تک اپنے ہوش میں ہی نہیں رہا۔ وہ نشے میں غرق تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس نے یہ دو تین دن کہاں اور کس حال میں گزارے ہیں۔ آہ...... یہ کیا انجام تھا اس کی محبت بھری داستان کا۔ وہ داستان جو دریائے چناب کے کنارے کی ہواؤں میں پور پور بڑھ کر جوان ہوئی تھی اور اپنے شباب کو پہنچی تھی۔ سب کچھ کس طرح اور کتنی جلدی ختم ہو گیا تھا۔ عمران نے وہ فیصلہ کر لیا جو کئی ہفتے سے اس کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اپنی شبانہ کے پاس پہنچ جائے گا۔ وہ اس دنیا میں نہیں مل سکے شاید اُس دنیا میں قدرت کو ان پر رحم آ جائے۔

O......❖......O

یہ وہ دن تھے جب وہ بے حد سنجیدگی کے ساتھ اپنی جان لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اپنے حوالے سے ایک عجیب سی بے حسی اس پر طاری ہو چکی تھی۔ لباس کے علاوہ کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ اپنے جانوروں کی طرف سے بھی وہ بالکل غافل ہو چکا تھا۔ اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی کسی کام میں۔ وہ ہر چیز کو اوپری اور الوداعی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ان کا سرکس سرگودھا میں تھا۔ ایک روز وہ اپنے شامیانے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا کہ سرکس میں کام کرنے والی نئی لڑکی شاہین اس کے پاس آئی۔ وہ چند ہفتے پہلے جمناسٹک کے شعبے میں بھرتی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”عمران! تمہیں کچھ پتا بھی ہے کہ دفتر میں کیا ہوا ہے؟“

عمران اپنی سوچی سوچی آنکھوں اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بولی۔

”گولڈن سرکس کے لوگوں نے جان صاحب سے جھگڑا کیا ہے۔ گالی گلوچ تک نوبت آئی ہے۔ وہ دھمکیاں دے کر گئے ہیں۔“

”کیا کہتے ہیں؟“

”وہی پرانی بات۔ ان علاقوں میں ہمیں کام نہیں کرنے دیں گے۔ اگر ہم کریں گے تو پچھتائیں گے۔“

”جان انکل ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتے ہیں۔“ عمران نے آنکھیں بند کر کے گہرا کش لیا اور لاتعلق سا نظر آنے لگا۔

......مگر دو دن بعد وہ لاتعلق نہیں رہ سکا۔ شام کا وقت تھا۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ اتوار کی وجہ سے کافی رش بھی تھا۔ عمران کے کانوں میں یہ اُڑتی اُڑتی سی خبر پہنچی کہ گولڈن سرکس والوں نے اپنے کچھ لوگ تماشائیوں کے روپ میں اس شو میں بھیج دیئے ہیں اور وہ ہنگامہ کریں گے۔ بہرحال ابھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والا ہر دلعزیز فن کار ”بادشاہ“ موجود نہیں ہے۔ اسے ہر جگہ تلاش کیا گیا ہے لیکن وہ نہیں ملا۔ موت کے کنوئیں پر موجود سیکڑوں تماشائی ہلڑ بازی کے موڈ میں ہیں۔ اس بات کا پتا اگلے روز چلا کہ بادشاہ کو گراں معاوضہ دے کر گولڈن سرکس والوں نے بھرتی کر لیا تھا اور یہ کام اس طرح کیا گیا تھا کہ جان صاحب کے اسٹار سرکس میں زوردار ہنگامہ کا ماحول بن سکے۔

جان صاحب مصیبت میں تھے اور ان کے عمران پر بہت سے احسان تھے۔ عمران کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ وہ کبھی کبھی بادشاہ کی بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کنوئیں کے اندر نیچے ہی نیچے ایک دو چکر لگانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ آج وہ بادشاہ کی جگہ لے اور کنوئیں کے اندر موٹر سائیکل چلائے۔ یہ بڑا سنسنی خیز خیال تھا۔ شاید ایک دو ماہ پہلے تک وہ ایسی خطرناک حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اب اس کی ذہنی کیفیت کچھ اور تھی۔ وہ خود کو زندگی سے دور اور موت کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ وہ مرنا چاہ رہا تھا اور جب مرنا تھا تو پھر زندگی جانے کا خوف کیا......؟

اس نے ڈریسنگ روم میں جا کر کاسٹیوم پہنا اور کنوئیں میں آ گیا۔ تب تک ہلچل واضح نظر آنے لگی تھی۔ تماشائی شور مچا رہے تھے۔ کنوئیں کے اندر سگریٹوں کے خالی پیکٹ، پھلوں کے چھلکے اور جوس کے ڈبے وغیرہ پھینکے جا رہے تھے۔ جان صاحب وہاں موجود نہیں تھے۔ اسسٹنٹ منیجر عباس نے بتایا کہ وہ بادشاہ کے نوآموز شاگرد انور کو ہلکے پھلکے تماشے کے لئے

آمادہ کر رہے ہیں مگر وہ سخت خوف زدہ ہے۔

عمران نے عجیب ہیجانی انداز میں کہا۔ ''عباس بھائی! یہ کام میں کروں گا۔''

عباس حیرت سے عمران کا چہرہ تکنے لگا۔ عمران نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تو عباس سامنے آ گیا۔ ''نہیں عمران! میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا۔ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو پھر جان صاحب کو آ جانے دو۔''

عمران نے اس بات کا جواب یوں دیا کہ ریس گھما کر ایک جھٹکے سے موٹر سائیکل کا کلچ چھوڑا اور اسے لہراتا ہوا، عباس کے پہلو سے نکال لے گیا۔ اس کے ذہن پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اردگرد کی ہر شے اسے بے معنی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی موت بھی اور یہ خیال بھی کہ وہ شدید زخمی ہو جائے گا۔ اسے اس کھیل کی بنیادی تکنیک کا پتا تھا۔ جتنی زیادہ رفتار، اتنی زیادہ بلندی اور اتنی ہی زیادہ کنوئیں کی دیواروں پر پہیوں کی ''گرپ''۔ وہ بے خوف ہو کر رفتار بڑھاتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا چلا گیا۔ وہ ایک عجیب تجربہ تھا، وہ ایک دیوانی کوشش تھی اس نے سنا تھا کہ ڈر سے آگے کامیابی ہوتی ہے۔ آج یہ کہاوت عملی شکل میں اس کے سامنے تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے اپنی پوزیشن کو دیکھا تو خود ہی حیران رہ گیا۔ اس کی برق رفتار موٹر سائیکل کنوئیں کے بالائی کنارے سے بس چار پانچ فٹ ہی نیچے رہ گئی تھی۔ موٹر سائیکل کے زبردست ''مومنٹیم'' سے چوبی کنوئیں کی دیواریں ہل رہی تھیں۔ تماشائی دم بخود تھے۔ عمران اندھا دھند رفتار بڑھاتا ہوا موٹر سائیکل کو آخری حد تک لے گیا۔ اب وہ بالائی کنارے کے بالکل ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ تماشائی تالیاں پیٹنے لگے۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے گرا تو سیدھا کنوئیں کی تہ میں گرے گا اور پھر شاید اُٹھ نہ سکے لیکن یہ متوقع سانحہ بھی اسے خوف زدہ کرنے میں ناکام تھا۔ اس نے ''ریس'' کے گھماؤ کو ایک جگہ ایڈجسٹ کرنے کے بعد ''بادشاہ'' کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اطراف میں پھیلا دیئے۔ موٹر سائیکل اسی طرح آندھی کی رفتار سے دوڑتی رہی...... عمران اس ایکشن کو بہت مشکل سمجھا کرتا تھا مگر یہ اتنا مشکل نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا...... یا شاید عمران کی بے خوفی نے اسے آسان بنا دیا تھا۔ بادشاہ اس اسٹیج پر کچھ اور پوز بھی بناتا تھا لیکن وہ عمران کے بس میں نہیں تھے۔ عمران جو کچھ کر چکا تھا، وہ تماشائیوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ رفتار کم کی اور پھر موٹر سائیکل کو تہ میں لے آیا۔

جان محمد صاحب، عباس اور دیگر لوگ ہکا بکا تھے۔ جان صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا تاہم اس غصے کی تہ میں محبت بھی شامل تھی۔ ان کا سگریٹ مسلسل ان کے ہونٹوں میں دبا

ہوا تھا۔

تماشائیوں کی ساری توقعات تو پوری نہیں ہوئی تھیں۔ بہرحال وہ منتشر ہونے لگے۔ یقیناً یہ ساری صورتِ حال ان لوگوں کے مفاد میں نہیں تھی جو تماشائیوں کو توڑ پھوڑ پر اکسانا چاہتے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ سنبھل گیا ہے تو انہوں نے اپنے طور پر گڑبڑ کر دی۔ سرکس کا ایک سینئر فنکار ''سینڈو'' بھاگتا ہوا آیا اور اس نے جان صاحب کو بتایا۔ ''سر! ایک بندے نے پنڈال کے پیچھے خیمے میں آگ لگا دی ہے۔ چوکیداروں نے اسے پکڑ لیا ہے۔ کچھ لوگ اسے چھڑانے کے لئے جھگڑا کر رہے ہیں۔''

یہی وقت تھا جب اوپر تلے پستول کے دو فائر ہوئے۔ ''یہ وہی لوگ ہیں جی۔'' سینڈو نے اُڑی اُڑی رنگت کے ساتھ کہا۔

جان صاحب اور دیگر لوگ موقع کی طرف لپکے۔ عمران بھی ان کے ساتھ تھا۔ پنڈال کے عقب میں آگ بھڑک رہی تھی اور کئی لوگ آپس میں گتھم گتھا تھے۔ ان میں گولڈن سرکس والوں کے غنڈے صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس دن عمران پر عجیب سی وحشت طاری ہو گئی۔ وہ کم ہمت تو پہلے بھی نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی کرنا اور خم ٹھونک کر میدان میں آنا جانتا تھا...... لیکن اس روز وہ اس انداز سے لڑا کہ سب دنگ رہ گئے۔ وہ دیوانہ وار گولڈن سرکس کے غنڈوں میں گھس گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط ہاکی تھی۔ اس ہاکی سے کئی افراد کے سر پھٹے اور دو تین کی ہڈیاں بھی ٹوٹیں۔ پھر ہاکی ٹوٹ گئی اور عمران کے ہاتھ میں ایک چاقو آ گیا۔ یہ چاقو بھی ہاکی ہی کی طرح مخالفین کے لئے مہلک رہا۔ عمران کے بازو پر ایک گہرا زخم آیا۔ اس زخم کے بدلے اس نے کم از کم تین افراد کو زخمی کیا۔ اسی دوران میں پولیس کود پڑی۔ پولیس اہلکاروں نے اندھا دھند ہوائی فائرنگ کر کے متحارب گروہوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔

بعدازاں عمران کو بھی دیگر زخمیوں کی طرح مرہم پٹی کے لئے اسپتال لے جایا گیا۔ وہاں سے پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ جان صاحب نے اسے دو دن سے زیادہ تھانے میں نہیں رہنے دیا اور پرچے سے اس کا نام خارج کرا کے واپس لے آئے۔

دو دن بعد عمران نے ایک اور حیران کن کام کیا۔ وہ کسی کو بھی بتائے بغیر خاموشی سے گولڈن سرکس والوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی شلوار کے نیفے میں بھرا ہوا بریٹا پسٹل تھا اور کمر سے گولیوں کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دندناتا ہوا گولڈن سرکس کے مالک کے دفتر میں جا گھسا۔ وہ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا اور جب بندہ ایسا چاہتا ہے تو پھر دیواریں گرتی ہیں۔ بند

گلیوں سے رستے نکلتے ہیں اور لوہا ہاتھوں میں موم ہوتا ہے۔ عمران کی اس آمد نے گولڈن سرکس والوں کو ہکا بکا کر دیا۔ عمران نے سرکس کے مالک ''چودھری جی'' سے کہا۔ ''بادشاہ نے جان محمد صاحب سے ستر ہزار روپیا ایڈوانس لیا ہوا ہے اور اپریل تک کا معاہدہ کیا ہوا ہے۔ اگر آپ اس کو اپنے پاس رکھو گے تو پھر کام بگڑ جائے گا۔''

جو کام شاید بہت سی گفتگو اور میٹنگز وغیرہ کے بعد بھی نہیں ہو سکتا تھا، وہ صرف دس منٹ میں ہو گیا۔ عمران، جان صاحب کے پرانے ملازم بادشاہ کو اپنے سرکس واپس لے آیا۔

عمران کی اس جرأت اور دلیری نے جان صاحب اور حاجی اشفاق کو ششدر کر دیا......

جان صاحب کے نزدیک پہلے بھی عمران کی بہت اہمیت تھی، اب یہ اہمیت اور بڑھ گئی۔ وہ اسے مزید ذمے داریاں سونپنا چاہتے تھے لیکن عمران جانتا تھا کہ وہ تو پہلی ذمے داریاں سنبھالنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ جانوروں سے اس کی رغبت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اپنے اردگرد کے لوگوں سے وہ بالکل لاتعلق ہو چکا تھا۔ وہ تو مرنے کی جگہ ڈھونڈتا پھرتا تھا......

اگلے چند دن میں اس نے کئی ایسے کام کئے جن میں مرنے کا خطرہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ سرگودھا کے ایک پوش علاقے میں بگڑے تگڑے امیرزادے، موٹر سائیکلوں کی ایک خوفناک ''ریس'' لگاتے تھے۔ عمران نے اس ریس میں حصہ لیا اور حیران کن طور پر نہ صرف محفوظ رہا بلکہ دوسرا انعام بھی جیت گیا۔

پھر اس نے جان صاحب کے ایک اور پرانے حریف استاد چھیمے تھیٹر والے کو للکارا اور اس کے دو غنڈوں کو بُری طرح مار پیٹ کر اسپتال پہنچا دیا۔ اس پھڈے کا نتیجہ بھی فوری اور مفید نکلا۔ استاد چھیمے کی طرف ڈوبا ہوا جان صاحب کا ایک لاکھ روپیا نکلنے کی قوی امید پیدا ہو گئی......اور اس رقم کی پہلی قسط تقریباً تیس ہزار روپے جان صاحب کے ہاتھوں میں بھی پہنچ گئے۔

......اس کے بعد ایک روز عمران نے راجا کو ساتھ لیا اور دندناتا ہوا شیخوپورہ میں اپنے گاؤں جھنڈووال پہنچ گیا۔ اس کی قمیص کے نیچے بریٹا پستول لگا ہوا تھا اور تیز دھار چاقو تھا جبکہ راجا کی گرم چادر کے نیچے چھوٹی نال کی رائفل چھپی ہوئی تھی۔ نومبر کی وہ سرد ابر آلود رات گاؤں کے چودھری سجاول پر بہت بھاری گزری۔ عمران اور راجا حویلی کی پچھلی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ کچھ دیر تک پرالی کے ڈھیر میں دبکے رہے پھر ایک پہرے دار کے سر پر بندوق کا وزنی دستہ مار کر اسے نیم جان کیا اور اس کی مشکیں کسنے کے بعد سیدھے اس کمرے میں جا پہنچ جہاں چودھری سجاول اپنی فربہ اندام بیوی کے ساتھ سو رہا تھا۔ یہی شخص تھا جس

نے اسے اس کی ماں سے جدا کیا اور پھر اس کی ماں کو بھی سب کچھ چھوڑ کر دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اپنے لاڈلے بیٹے کو ایک بے حقیقت نحوست سے بچانے کے لئے ان میاں بیوی نے عمران کی ہنستی بستی زندگی کو زہرناک حقیقتوں کے حوالے کیا تھا اور آج وہ خود عمران کے حوالے تھا۔

راجا نے وسیع کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور عمران نے پستول کی نال چودھری سجاول کی پیشانی سے لگا دی۔ شوگر کے مرض نے ہٹے کٹے چودھری سجاول کو خزاں رسیدہ پتے جیسا کر رکھا تھا۔ وہ لرزنے لگا۔ اس کی فربہ اندام بیوی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولی۔ ''یہاں سے جو کچھ لے کر جانا ہے لے جاؤ، پر ہمیں کچھ نہ کہو۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اپنے طلائی کڑے اُتارنے لگی۔

عمران نے چہرے سے مفلر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پہچان چودھرائن! میں یہاں کچھ لوٹنے نہیں آیا۔ اس کا حساب لینے آیا ہوں جو تم لوگوں نے لوٹا ہے۔ بتاؤ کیا کیا تھا تم لوگوں نے میری مسکین ماں کے ساتھ؟ بتاؤ کس طرح انگوٹھے لگوائے تھے اس سے زمین کے کاغذوں پر......اور مجھے بتاؤ کہاں پھینکا تھا اسے؟''

چودھرائن ہکی بکی عمران کو دیکھ رہی تھی۔ چودھری نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالنے کی کوشش کی مگر عمران کے ایک ہی زوردار جھانپڑ نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے۔ وہ پختہ دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ عمران کے قدموں میں گر کر کراہنے لگا۔ عمران نے اسے سیدھا کر کے بٹھایا اور اپنے سوال دہرائے۔ یہ گفتگو قریباً پندرہ منٹ جاری رہی...... اس دوران میں حویلی کے اندر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ چودھری کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ چودھری سجاول اور اس کی بیو نے رو رو کر عمران کو یقین دلایا کہ انہیں اس کی والدہ کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ہاں...... چودھری سجاول نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اپنے ایک ملازم کے ذریعے اس نے شریفاں بی بی کی زمین خود ہی خریدی تھی۔ وہ اسی وقت زمین کی رجسٹری ایک آہنی الماری میں سے نکال کر لایا اور عمران کے حوالے کر دی۔ عمران اپنے ساتھ کچھ اسٹامپ پیپر لے کر آیا تھا۔ اس نے اسی وقت ان اسٹامپ پیپرز پر چودھری سجاول کے سائن انگوٹھے کروا لئے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد چودھری کو امید پیدا ہونے لگی کہ اس کی جان بخشی ہو جائے گی مگر عمران کے دل و دماغ میں چودھری کے لئے زہر کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ آج اس کی دو چار ہڈیاں توڑے بغیر یہاں سے جانے والا نہیں تھا۔

چودھری نے گھگیائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں بیمار ہوں۔ مجھے دل کا دورہ پڑ جائے

گا...... یہ سب کچھ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔''

عمران نے کہا۔''جو کچھ پچھلے ایک گھنٹے سے تم پر بیت رہی ہے، وہ مجھ پر کئی سال سے بیت رہی ہے۔ مجھے بھی ہر گھڑی یہی لگتا رہا ہے کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔ میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔''

چودھری بولا۔''میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ ہم نے اپنے بچے کی محبت میں تمہیں تمہاری ماں سے وکھرا کر دیا۔ شاید اسی کی سزا مجھے اس ظالم بیماری کی شکل میں ملی ہے۔ میری ہڈیاں کھر کھر کر میرے پیشاب کے ساتھ نکلتی جاتی ہیں۔ میں نے اب زیادہ وقت نہیں جینا۔ تم میرا خون اپنے سر نہ لو۔''

عمران بولا۔''ابھی تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ تمہارے جیسے شیطان کی ٹانگیں قبر میں چلی جائیں تو بھی وہ اپنی آخری شیطانیوں سے باز نہیں آتا...... گجرات سے کچھ لوگ میرے بارے میں سن گن لینے کے لئے یہاں آئے تھے۔ وہ مجھے اپنی دھی کا رشتہ دینا چاہتے تھے۔ تم نے اور تمہاری اس ''بھینس بیوی'' نے بڑی اچھی طرح ان کو اطمینان دلایا...... میری تعریفوں کے پل باندھے اور میرے رستے کے سارے کانٹے اپنے ہاتھوں سے چن لئے۔ یہی کیا نا تم دونوں نے؟'' اس کے لہجے میں طنز کی تیز کاٹ تھی۔

چودھری کا رنگ جو تھوڑی دیر کے لئے نارمل ہوا تھا پھر ہلدی ہو گیا۔ اس کی بیوی چاپلوسی کے انداز میں عمران کو ''عمو پتر'' کہنے لگی اور منت ترلے میں مصروف ہو گئی۔

تب اچانک وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ چودھری کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آئے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا۔ پھر وہ یکا یک ایک طرف کو جھکتا چلا گیا۔

''ہائے میں مری۔'' اس کی بیوی پکاری اور دوڑ کر الماری کی طرف گئی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چودھری کی زبان کے نیچے گولی رکھی۔ تب تک چودھری تقریباً بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ کراہی۔''اسے دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ خدا کے لئے کچھ کرو۔ اسے اسپتال لے جاؤ۔''

عمران نے پستول چودھرائن کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔''ہم اسے ماریں گے نہیں تو بچائیں گے بھی نہیں۔ اپنے پتر کو بلاؤ، وہی اس کا کچھ کرے گا اور ایک اور بات پورے دھیان سے سن لو، اگر یہاں ہمارے بارے میں کسی کو پتا چلا تو تیری اور تیرے پتر کی خیر نہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو، ہم تمہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے۔''

''نہیں...... میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' چودھرائن نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''تو ٹھیک ہے، بلاؤ جس کو بلانا ہے۔'' راجا نے کہا۔ عمران اور راجا دونوں نے اپنے

ہتھیار چھپا لئے۔ عمران نے پہلے کی طرح مفلر میں اپنا منہ سر لپیٹ لیا۔ چودھرائن نے اپنے پتر کا نام لے کر دہائی دی۔''نیازے...... نیازے جلدی آؤ۔ تمہارے پیو کو کچھ ہو گیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے کا دروازہ بھی چوپٹ کھول دیا تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ نیازے کا کمرا کہیں پاس ہی ہے۔ چودھرائن کی دوسری آواز پر ہی نیازا ہکا بکا وہاں پہنچ گیا۔ وہ عمران ہی کا ہم عمر تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ یقیناً بستر سے نکلا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی جواں سال بیوی بھی تھی۔ وہ بھی سر پاؤں سے ننگی تھی۔ جب اس نے کمرے میں دو غیر مردوں کو دیکھا تو جلدی سے اپنا سر ڈھانپنے کی کوشش کی۔

چودھری کو بے ہوشی کے عالم میں پڑے دیکھ کر ہی نیازے اور اس کی بیوی کو اندازہ ہو گیا کہ ابا جی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ ایک دم کھلبلی سی مچ گئی۔ ملازموں کو آوازیں دی گئیں اور بھاگتے دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ اس افراتفری میں کسی کو عمران اور راجا کی طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ جب بے ہوش چودھری سجاول کو ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی، عمران اور راجا وہاں سے کھسک آئے...... اور پھر اگلے چند گھنٹوں میں واپس خوشاب پہنچ گئے۔

چوتھے دن راجا ہی کی زبانی عمران کو یہ اطلاع ملی کہ چودھری سجاول دل کے اس شدید دورے سے جانبر نہیں ہو سکا...... اور انجام کو پہنچ گیا ہے۔

ان دنوں عمران کے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کبھی اس کا دل خودکشی کرنے کو چاہتا تھا۔ کبھی دل چاہتا تھا کہ اپنی زندگی تو ختم کر لے لیکن اس طریقے سے کہ کوئی اسے حرام موت قرار نہ دے۔ یہی پراگندہ خیالات تھے جن کے زیر اثر وہ اپنی صحت و سلامتی کی طرف سے بالکل بے پروا ہو گیا تھا اور خطرناک ترین کام بھی کر گزرتا تھا۔ ایک روز وہ موت کے کنوئیں میں اندھا دھند موٹر سائیکل چلاتے ہوئے گر کر سخت زخمی بھی ہوا اور اسے دس بارہ روز اسپتال میں گزارنا پڑے لیکن اس کے طرزِ زندگی پر کوئی اثر پڑا...... اور نہ اس کی سوچوں میں کوئی فرق آیا۔ اسپتال میں قیام کے دوران میں کئی بار اس کے ذہن میں آیا کہ شاید چودھرائن اور اس کے پتر نیازے کی طرف سے کسی طرح کا کوئی ردِعمل ظاہر ہو لیکن حیران کن طور پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یوں لگا کہ وہاں چودھری سجاول کی حویلی میں کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔ غالباً چودھرائن نے بھانپ لیا تھا کہ عمران نے جو کچھ کہا ہے، وہ کر دکھائے گا۔ وہ خاوند سے تو محروم ہو ہی چکی تھی، اب بیٹے سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے دم سادھ لیا

تھا۔

عمران کو اسپتال سے آئے ہوئے پانچ چھ روز ہوئے تھے، جب ایک انگریز پروفیسر صاحب، جان محمد صاحب کے ہاں آئے۔ وہ پچاس پچپن برس کے صحت مند شخص تھے...... فرنچ کٹ داڑھی اور عینک ان کے چہرے کا حصہ تھی۔ ان کا پورا نام تو کچھ اور تھا مگر جان صاحب انہیں مسٹر رچی یا رچی صاحب کہتے تھے۔ رچی صاحب اپنے ساتھ ایک خوفناک سینٹ برنارڈ کتا بھی لائے تھے۔ اس کا وزن سو کلو کے لگ بھگ ہوگا۔ اس کے پورے جسم پر بال اور آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی۔

جان صاحب نے عمران کو حیران کرتے ہوئے بتایا۔ ''رچی صاحب تمہارے لئے ہی یہاں آئے ہیں۔''

''میرے لئے؟''

''ہاں...... یہ تمہارے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے جب تم ٹائیگر کو ''ٹرینڈ'' کر رہے تھے، عباس نے تمہاری ویڈیو فلم بنائی تھی...... یہ فلم کسی طرح اسلام آباد...... میں مسٹر رچی تک پہنچی۔ اس کے بعد اور بھی کچھ لوگوں نے یہ فلم دیکھی۔ پچھلے مہینے مسٹر رچی نے اسلام آباد سے عباس سے رابطہ کیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کام کے سلسلے میں عباس راولپنڈی تو جا ہی رہا تھا، اس نے رچی صاحب سے ملاقات کا پروگرام بھی بنا لیا۔ وہاں رچی صاحب اور ان کے دو دوستوں نے عباس سے تمہارے بارے میں بہت سی معلومات لیں۔ یہ لوگ جانوروں کے ساتھ تمہارے رویے اور تمہارے ساتھ جانوروں کے رویے سے بھی زیادہ حیران ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب رچی صاحب خود یہاں موجود ہیں۔''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''بس تم سے ملنا اور تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''میں کوئی عجوبہ ہوں؟'' عمران کا لہجہ روکھا تھا۔

''نہیں...... لیکن جو کچھ تمہارے اندر ہے، وہ ضرور عجوبہ ہے۔ جس طرح یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے، اسی طرح رچی صاحب اور ان کے دوستوں کی سمجھ سے بھی باہر ہے۔''

رات کو ایک پُرتکلف کھانے پر رچی صاحب سے عمران کی ملاقات ہوئی۔ عمران اس صورتِ حال سے بیزار تھا مگر جان صاحب کے کہنے پر اس نے رچی صاحب کو تفصیلی انٹرویو دیا۔ رچی صاحب کافی عرصے سے پاکستان میں مقیم تھے اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر لیتے

تھے...... ان کے کچھ سوالوں کے جواب عمران نے تفصیل سے دیئے، کچھ کو وہ گول کر گیا۔

رچی صاحب نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ ''عمران! تمہیں اپنے ساتھ جانوروں کے خاص رویے کا پتا پہلی بار کب چلا؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں جی۔ میں نے آپ سے ماجھاں نامی عورت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا سرکش گھوڑا ''ہیرا'' تھا۔ کوئی اسے سنبھال نہیں پاتا تھا مگر میں نے تھوڑی سی کوشش سے اسے سنبھال لیا۔ اس وقت مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہوا۔''

''کیا تمہیں اپنے بچپن کی کوئی ایسی بات یاد ہے جب کسی جانور نے تمہارے ساتھ خاص رویے کا مظاہرہ کیا ہو؟''

عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ رچی صاحب نے اس طرز کے اور کئی سوال عمران سے پوچھے۔ پھر ٹی وی اسکرین پر وہ ویڈیو دیکھی گئی جس میں عمران، ٹائیگر اور چند دوسرے جانوروں کو تربیت دیتے ہوئے نظر آتا تھا۔ اس ویڈیو کو دیکھنے کے دوران میں رچی صاحب نے کئی بار ''ونڈرفل اور امیزنگ'' کے الفاظ استعمال کئے۔

اگلے روز عمران کا عملی امتحان تھا۔ پنجرے میں بند خوفناک سینٹ برنارڈ کتے کو ٹریننگ والے احاطے میں چھوڑا گیا۔ اب عمران کو اس احاطے میں داخل ہونا تھا۔ عمران کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور صورتِ حال میں کیا تبدیلیاں رُونما ہو چکی ہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا لیکن اس کا ہلکا سا احساس عمران کی چھٹی حس کو ضرور ہو رہا تھا...... وہ مختصر احاطے میں داخل ہوا۔ اس کے چاروں طرف دیوار تھی جس کے اوپر خاردار تار لگائے گئے تھے۔

سینٹ برنارڈ کا انداز خطرناک تھا۔ وہ اپنی دُم کو تیزی سے گردش دے رہا تھا اور اس کے چوڑے جبڑے میں سے نکیلے دانتوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ عمران نے اسے پچکارا اور اس کے قریب چلا گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کتا چند قدم آگے بڑھا عمران نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کو حرکت دی اور اسے شانت رہنے کا اشارہ دیا۔

وہ ذرا سا جھجکا لیکن اگلے ہی لمحے بھیانک انداز میں عمران پر جھپٹا۔ عمران کو اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک لحظے کی دیر ہوتی تو اس کا نرخرہ ادھڑ چکا ہوتا۔ جانور کے بالوں کا لمس اُس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا اور اس کی حیوانی بُو اس کے نتھنوں میں گھسی۔ اگلے آٹھ دس سیکنڈ بڑے تہلکہ خیز تھے۔ بپھرا ہوا کتا عمران کو ذرا خاطر میں نہیں لایا۔ یہ صرف عمران کی غیر معمولی پھرتی تھی جس نے اسے کتے کے تند و تیز حملوں سے بچایا...... جان صاحب کے گارڈز نے

رائفلیں تان لی تھیں۔ جان صاحب چلا رہے تھے۔ ''باہر آ جاؤ...... جلدی کرو۔''

رچی صاحب بھی کچھ اسی طرح کا واویلا کر رہے تھے۔ عمران نے ہنگامی راستہ استعمال کیا اور ٹریننگ والے احاطے سے باہر آ گیا۔ عمران حیران تھا اور اس سے بھی زیادہ دیگر لوگ حیران تھے۔ اسی احاطے میں انہوں نے ٹائیگر جیسے خطرناک جانوروں کو عمران کے اشارے پر چلتے اور اس کی گود میں سر رکھتے دیکھا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں عمران پر یہ انوکھا انکشاف ہوا کہ اس کے اور جانوروں کے درمیان جو ایک غیر معمولی و خصوصی تعلق تھا، وہ ختم ہو چکا ہے یا بہت ماند پڑ چکا ہے۔ وہ ٹائیگر کے پاس گیا، سفید ریچھ کے پاس گیا، اسٹار سرکس کی معروف ہتھنی نازو کے پاس گیا، ہر جگہ اس کا یہ احساس قوی تر ہوا کہ صورتِ حال بدل چکی ہے۔

دوسرے روز رچی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے عمران سے تفصیلی بات چیت کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہارے بارے میں جو اندازے لگائے تھے، وہ درست ثابت ہوئے ہیں۔ بے شک کل تم کسی بھی طرح کی کارکردگی دکھانے میں ناکام ہوئے ہو...... لیکن تمہاری یہ غیر متوقع ناکامی اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے اندر وہ خاص صلاحیت موجود ہے جس کے بارے میں، مَیں اور میرے ساتھی غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ اس صلاحیت کا کچھ عرصے کے لئے اوجھل ہو جانا ہی اس کی موجودگی کا ثبوت ہے۔''

''میں سمجھا نہیں جی۔'' عمران نے کہا۔

پروفیسر رچی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے غور سے عمران کو دیکھا اور بولے۔

''جانوروں کے ماہر اور نفسیات دان بڑے عرصے سے یہ بات مانتے ہیں کہ کچھ انسانوں اور جانوروں میں ایک خاص قسم کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی طرح جانوروں میں بھی ایک طرح کی مقناطیسیت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کی مقناطیسیت حیوانوں کی مقناطیسیت سے ایک جدا ''لنک'' بنا لیتی ہے۔ عام طور پر یہ صلاحیت قدرتی ہوتی ہے مگر اپنی کوشش اور محنت سے اسے بہت بہتر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اس صلاحیت کو Animal Mastery کہا جاتا ہے۔ مسمریزم سمجھتے ہو تم؟'' رچی صاحب نے آخر میں عمران سے پوچھا۔

''جی...... جسے ہپناٹزم کہتے ہیں؟''

''یہی سمجھ لو۔ عرصہ پہلے فرانز مسمر نام کا شخص ہوا کرتا تھا۔ اسی کے نام سے مسمریزم کا لفظ نکلا۔ فرانز مسمر نے بھی اسی خاص قسم کی کشش کی بات کی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کشش سے حیران کن نتیجے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے جدید دور میں بھی جانوروں کو ہپناٹائز کرنا

ایک ٹھوس حقیقت کی طرح جانا جاتا ہے۔'' اس کے بعد پروفیسر رچی نے اس حوالے سے چند ایک مثالیں دیں۔

پروفیسر رچی کی کہی ہوئی باتیں بہت اہم اور توجہ طلب تھیں لیکن عمران کو اس ساری گفتگو میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ اسے کسی چیز میں دلچسپی رہی ہی نہیں تھی۔ کسی صلاحیت کا حاصل ہو جانا...... کھو جانا...... اور پھر دوبارہ ملنے کی امید ہونا...... یہ سب اس کے لئے بے معنی باتیں تھیں۔ وہ تو کسی اور ہی آگ میں جل رہا تھا، کسی اور ہی اذیت سے گزر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ سچ مچ چلی گئی ہے...... ہمیشہ کے لئے ناتا توڑ گئی ہے۔ امید آس کی ہلکی سی کرن بھی نہیں چھوڑ گئی جس میں اسے اپنی زندگی کی شکل نظر آ سکے۔ اس نے بار ہا سوچا تھا کہ وہ کیسے گئی ہو گی۔ جب وہ اپنے ہی خون میں لت پت ہو کر گری ہو گی تو اس نے کیا سوچا ہو گا؟ کیا آخری بار اس نے اسے یاد کیا ہو گا؟ اس کے دل نے اسے آواز دی ہو گی؟ آہ...... برسوں کی پیار کہانی کتنی جلدی ختم ہوئی تھی۔ بس دو چار ماہ کے اندر ہی ان کی جدائی ہوئی۔ وہ دلہن بنی اور پھر قبر میں جا سوئی۔ اس کی معصوم مسکراہٹ عمران کی آنکھوں میں چمکتی رہتی۔ اس کے سادہ فقرے اس کے کانوں میں گونجتے رہتے اور اس کی دلکش ہنسی عمران کی روح کو چرکے لگاتی رہتی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھی، کتنے سہانے سپنے تھے اس کی آنکھوں میں...... اور ایک آٹھ ایم ایم کی گولی نے وہ سب کچھ ختم کر ڈالا تھا۔

عمران اسے بھولنا چاہتا تھا مگر بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ راتوں کو دیوانہ وار خوشاب شہر کی گلیوں میں پھرتا، شراب پیتا، جھگڑے کرتا اور پھر نڈھال ہو کر سو جاتا۔ اس کی دلیری اور بے خوفی کے چرچے ہونے لگے۔ یہ چرچے دو طرح کے تھے۔ ایک تو وہ پھڈے اور جھگڑے تھے جن میں وہ بے دریغ ''انوالو'' ہو جاتا تھا۔ دوسرے سرکس میں اس کی خطرناک پرفارمنس تھی...... جانوروں سے دور ہونے کے بعد اس نے دیگر شعبوں کی طرف خطرناک تیزی کے ساتھ غیر معمولی توجہ دی اور دیکھنے والوں کو حیران کر دیا۔ ''موٹر سائیکلسٹ بادشاہ'' کا سرکس سے معاہدہ ختم ہونے سے پہلے ہی عمران نے اس فن میں حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے بھی خاطر خواہ مدد کی۔ اب وہ موت کے کنوئیں میں شاندار پرفارمنس دینے کے قابل ہو گیا تھا...... بلکہ کچھ آئٹمز میں بادشاہ سے دو ہاتھ آگے نکل گیا تھا۔

اس کے لئے بدترین خطرات کے لئے ایک بھوک سی پیدا ہو چکی تھی۔ جان صاحب اور خالہ صدیقہ وغیرہ کے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے جھولوں پر بازی گری بھی شروع کر دی...... اس کی غیر معمولی دلیری و بے خوفی اسے ہر دلعزیز بنا رہی تھی۔ وہ جہاں کہیں کسی

ناتواں لاچار شخص پر زیادتی ہوتے دیکھتا، سینہ تان کر اس کے دفاع میں کھڑا ہو جاتا اور اس حوالے سے اپنی جان کی بھی پروا نہ کرتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ احسان مند شخص اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ اسے اپنے اردگرد سے محبتیں ملنے لگیں۔ لوگ اس سے اپنائیت محسوس کرنے لگے اور مشکل وقت میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کی طرف اٹھنے والی الفت بھری نظریں اس کے اندر دھیرے دھیرے ایک تبدیلی کو راہ دینے لگیں۔ اسے اپنی بیکار زندگی کا موہوم سا مقصد نظر آنے لگا۔ وہ اپنے اردگرد ایسے آنسو تلاش کرنے لگا جنہیں پونچھ سکے...... ایسے بے وسیلہ لوگ ڈھونڈنے لگا جن کا وسیلہ بن سکے۔ اس کی تباہ حال زندگی غیر محسوس طور پر ایک نیا رخ اختیار کرنے لگی۔ اب اس کے لباس میں ہر وقت بھرا ہوا ریوالور رہتا تھا لیکن یہ ریوالور زیر دستوں کے لئے نہیں، ان زبردستوں کے لئے تھا جو محبت کی زبان نہیں سمجھتے۔ عام لوگوں کے لئے تو وہ سراپا مہر تھا۔ وہ بڑی اپنائیت سے اسے عمران بھائی اور ہیرو بھائی جیسے القابات سے نوازتے تھے۔

جان صاحب کے اسٹار سرکس میں کئی خوبرو لڑکیاں تھیں۔ عمران کی مردانہ وجاہت اور اس کی غیر معمولی دلیری صنفِ مخالف کو بڑی شدت سے اپنی طرف کشش کرتی تھی۔ دو تین لڑکیاں ہر وقت عمران کی قربت کی خواہش مند رہتی تھیں...... مگر وہ تو یہ باب اپنے اوپر ہمیشہ کے لئے بند کر چکا تھا...... ان میں سے صرف ایک لڑکی تھی جسے وہ کسی حد تک قابلِ توجہ سمجھتا تھا لیکن وہ بھی ایک عورت کی حیثیت سے نہیں، صرف ایک ''مصیبت زدہ'' کی حیثیت سے۔
اس کا نام شاہین تھا۔ شاہین اور اس کے اہلِ خانہ ایک شاطر عامل کے چکروں میں پھنسے ہوئے تھے...... وہ شخص نہ صرف ان سفید پوش لوگوں سے ہزاروں روپے بٹور چکا تھا بلکہ اپنی عیاریوں کے ذریعے اس نے ان کا مکان بھی اپنے ایک چہیتے مرید کے پاس گروی رکھوا دیا تھا۔ شاہین، عمران کے ساتھی فنکاروں میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس لئے بھی شاہین کی مدد ضروری سمجھتا تھا کہ اسے ان نام نہاد عاملوں اور جعلی پیروں، فقیروں سے خدا واسطے کا بیر پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ آتشیں اسلحہ لے کر نکلتا اور جہاں کہیں اسے ایسی جاہلیت کا کوئی علم بردار نظر آتا، اسے بھون کر رکھ دیتا۔ جو کام شاہین اور اس کے سفید پوش گھر والے پچھلے تین برسوں سے نہیں کر سکے تھے، وہ عمران نے صرف دو روز میں کر دیا۔ عامل کے چیلے نے نہ صرف مکان کا قبضہ چھوڑا بلکہ عامل نے اس رقم کا کافی حصہ بھی واپس کیا جو اس نے عملیات کے نام پر سادہ لوح گھرانے سے ہتھیایا تھا۔
شاہین، عمران کو کسی اور نظر سے دیکھنے لگی تھی لیکن عمران نے اس پر بالکل واضح کر دیا کہ

اس کی زندگی میں اب عورت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہاں، اس کی دل جوئی کے لئے وہ اس سے ملتا بھی تھا اور ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیتا تھا۔ کسی وقت اسے ڈر بھی لگتا تھا کہ کہیں آگے جا کر ان کا تعلق کوئی اور رخ اختیار نہ کر لے لیکن پھر شبانہ کا غم بے پناہ شدت کے ساتھ اس کے سینے کو بھر دیتا اور اسے یقین ہونے لگتا کہ اس مختصر سی زندگی میں تو یہ غم اسے کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت نہیں دے گا۔ اسے شبانہ کے ساتھ اپنی ''وفا'' بالکل محفوظ نظر آنے لگتی اور یہی اس کی آخری خواہش تھی۔ وہ اس وفا کو آخری دم تک محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔
دھیرے دھیرے اس کی زندگی تبدیل ہونے لگی۔ اس نے خود کو دوسروں کی آسانیوں اور خوشیوں میں گم کر دیا۔ اپنے اردگرد کے نچلے طبقے سے اسے خاص طور پر وابستگی پیدا ہونے لگی۔ جاہلیت و توہم پرستی کے مسائل کا شکار لوگ اس کی خصوصی توجہ کے مستحق ٹھہرے۔
وہ اندر سے جھلس رہا تھا مگر اس کو اپنے ہونٹوں پر ہنسی سجانا آ گیا۔ اس کا کلیجا چھلنی تھا مگر اس نے خوش خلقی کو اپنے اشکوں کا پردہ بنا لیا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اور چہرے پر مسکان سجا کر ایک اور ڈھنگ سے جینے لگا۔ جان صاحب اور خالہ صدیقہ کے لئے وہ سگی اولاد کی طرح تھا۔ وہ اسے اپنے کاروبار میں کوئی انتظامی حیثیت دینا چاہتے تھے مگر عمران اپنے ڈھب سے جینے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ اب جان صاحب کے سرکس کا سب سے مقبول فن کار تھا...... خطروں سے کھیلنا اس کی فطرتِ ثانیہ ہو گیا تھا۔ وہ ہیرو کہلاتا تھا اور شاید ایسا کہلانے کا حق دار بھی تھا۔ اپنی ماں کی یاد اور اپنی شبانہ کی تصویر کو سینے سے لگائے وہ اپنے ڈھنگ سے جیتا رہا...... اور جیتا رہا۔

○......❖......○

...... اب میں اسی جگہ واپس آتا ہوں جہاں سے عمران کی طویل کہانی شروع ہوئی تھی...... ہاں، یہ زرگاں کی وہی پُرفسوں رات تھی۔ ساتویں کے جشن کا آغاز ہو چکا تھا۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہو گیا تھا مگر آسمان پر ابھی تک گاہے بگاہے آتش بازی کے رنگ بکھرتے تھے اور قرب و جوار کو منور کر جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ زرگاں آج سونے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ موسیقی کی لہریں، نعروں کا شور، ہاتھیوں کی آوازیں، آتش بازی کی تڑتڑاہٹ یہ سب کچھ ایک دل نواز ارتعاش پیدا کرتا تھا اور ہر جان دار و بے جان شے ایک سرمستی میں ڈوب جاتی تھی۔
ہمارے سامنے چائے کے کئی خالی مگ رکھے تھے۔ عمران کے اردگرد سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ اس کی کہانی نے میرے دل میں عجیب سا گداز بھر دیا تھا۔ میں نے اس کے خوبرو چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک یادوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''ماں کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا؟''

''نہیں۔'' اس نے نیا سگریٹ سلگا کر مختصر جواب دیا۔

''تم نے تلاش ختم کر دی؟''

''نہیں جگر! وہ زندگی کی آخری سانس تک ختم نہیں ہو سکتی لیکن پتا نہیں، اب کبھی کبھی آس ٹوٹ جاتی ہے۔''

''تمہارا شیخوپورہ والا آبائی گھر تمہارے پاس ہے؟''

''ہاں، کئی بار سوچا کہ اسے بیچ ڈالوں لیکن نہیں بیچا۔ پتا نہیں کیوں دل کہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی اس گھر میں، میں اور ماں اکٹھے ہوں گے۔ اس کے صحن میں بیری کے نیچے بیٹھیں گے۔ اس کے کمروں میں ہماری آوازیں گونجیں گی۔ بڑی یادیں ہیں اس گھر کے ساتھ۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اسے کبھی بیچ سکوں گا۔''

''اور چودھری سجاول وغیرہ؟ چودھری کے وارثوں نے کبھی تم سے بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی؟''

عمران نے کہا۔ ''چودھرائن ڈیڑھ دو سال تو خاموش رہی۔ پھر اس نے پتا نہیں کس موڈ میں اپنے پتر نیاز اور داماد شیر افگن کے سامنے سب کچھ بک دیا۔ ان لوگوں نے مجھ پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی......''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر کیا ہونا تھا۔'' وہ مخصوص انداز میں مسکرایا۔ ''تیرا یار اب تر نوالہ نہیں، لوہے کا چنا بن چکا ہے۔ تیری دعا سے نیازے اور افگن جیسے لوگ اب یہاں اس جیب میں رہتے ہیں۔'' اس نے اپنی جیب تھپتھپائی جیسے واقعی وہاں نیاز اور افگن موجود ہوں اور وہ انہیں تھپک رہا ہو۔

''اور...... وہ تمہارا یار راجا؟''

عمران نے گہرا کش لیا۔ ''راجا، اپنی طرز کا کھرا کریکٹر تھا۔ میں نے بہت روکا لیکن وہ اپنے شغلوں سے باز نہیں آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن لاہور کی ہیرا منڈی کے قریب ایلیٹ فورس کے ہتھے چڑھ گیا۔ منشیات اور فراڈ کے تین سنگین کیسوں میں اسے سات سال قید کی سزا ہوئی۔ اب وہ پنجاب ہی کی کسی جیل میں ہے۔ کافی عرصے سے اس کی کچھ خبر نہیں......''

''اور شاہین؟''

عمران کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک زخمی مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ بولا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں اور اقبال قریباً ایک سال پہلے پاکستان سے تمہارے کھوج میں روانہ ہوئے

تھے۔ اس وقت تک وہ بقید حیات تھی۔ میں اس پر زور دے کر آیا تھا کہ وہ منگنی شنگنی کرا لے بلکہ میری واپسی تک اس کی شادی اور ایک آدھ بچہ بھی ہو جانا چاہئے۔ وہ خوب ہنسی تھی۔''

''کیوں؟''

''میں نے کہا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ تین چار مہینوں میں واپس آ جاؤں گا۔ اسے یقین تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں وہ بچہ پیدا نہیں کر سکتی لیکن اب تو سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میری فرمائش پوری کر دے۔''

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی تم...... میرا مطلب ہے تمہیں اس سے کوئی لگاؤ نہیں؟''

''نہیں تابی!'' وہ پورے یقین سے بولا۔ ''میں اسے صاف بتا چکا ہوں کہ مجھ پر یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ میری دوستی ہے، ہنسی مذاق بھی ہے اور ایسا دیگر لڑکیوں کے ساتھ بھی ہے لیکن...... میرے دل میں جو کچھ مر چکا ہے، وہ پھر زندہ نہیں ہو سکت۔ شاید میں چاہوں بھی تو نہیں ہو سکتا۔ اِٹ از آل اوور۔ اور اب ان باتوں کو چھوڑو یار۔ تم ماضی میں بہت غوطے دے چکے ہو مجھے۔ اب میرا سانس ٹوٹنے لگا ہے۔ اب مجھے باہر نکالو ورنہ ساتویں کا جشن دیکھنے سے پہلے ہی میرا اپنا ساتواں اور دسواں ہو جائے گا۔'' وہ دھیرے دھیرے پھر اپنی مخصوص خوش گفتاری کی طرف پلٹ رہا تھا لیکن میرا دل اس کے لئے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہی لگ رہا تھا کہ معصوم صورت شبانہ کی ناگہانی موت میرے سامنے واقع ہوئی ہے اور میں اس سارے درد و کرب کا چشم دید گواہ ہوں جو چناب کے کنارے پیار کرنے والے دو دلوں کے حصے میں آیا اور جسے انہوں نے آنسوؤں کے دریا میں تیر کر جھیلا۔

میرا یہ قیافہ سو فیصد درست نکلا تھا کہ عمران بھی کسی ایسی ہی دقیانوسیت کا ڈسا ہوا ہے جو یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں کسی عفریت کی طرح پنجے گاڑے ہوئے ہے۔

سادہ لوحی اور توہم پرستی کی کوکھ سے جنم لینے والی یہ دقیانوسیت عمران کی ہنستی بستی زندگی کو چاٹ گئی تھی اور ایسی نہ جانے کتنی زندگیاں قرنوں سے اس کی بھینٹ چڑھ رہی تھیں۔ میں گہری نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ''جب تم ایسے دیکھتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ ہپناٹزم سیکھ رہے ہو اور اس کا پہلا پہلا تجربہ مجھ پر کرنا چاہتے ہو۔ دیکھو جگر! اناڑی جادوگر بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ بندے کو غائب کر دیتا ہے اور پھر واپس نہیں لا سکتا...... بعد ازاں ایسے جادوگر متاثرین کے ڈر سے قبائلی علاقے

میں فرار ہو جاتے ہیں۔"

میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ "عمران! ایک بات کہوں؟ تمہیں عجیب تو لگے گی لیکن ہے حقیقت۔"

"ہاں ہاں کہو۔ عجیب باتیں سننے کے لئے میں ہی تو رہ گیا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ابن صفی مرحوم کا ایک کردار ہوا کرتا تھا علی عمران...... کالج کے دور تک ہم نے اسے خوب پڑھا ہے۔ بڑی دلچسپ جاسوسی کہانیاں ہوتی تھیں اور کہانیوں سے زیادہ دلچسپی ہمیں اس اوٹ پٹانگ کردار میں ہوا کرتی تھی۔ اتفاق سے تمہارا نام بھی عمران ہے صرف اس میں دانش کا اضافہ ہے۔ مجھے تمہارے اندر اس کردار کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کہیں تم اس کردار کا دوسرا جنم تو نہیں ہو؟"

"دیکھو، اب تم نے ہندوؤں میں رہ کر ہندوؤں جیسی باتیں شروع کر دی ہیں۔ کل تم یہ بھی کہو گے کہ سلطانہ تمہاری بیوی نہیں بلکہ دھرم پتنی ہے اور تم اسے پیار نہیں کرتے بلکہ پریم کرتے ہو اور تمہارا بچہ دراصل "پونشل" کے بغیر ہنومان کا چالیسواں جنم ہے۔"

"ہاں ہاں، وہ بھی ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔" میں نے کہا۔ "فرق صرف یہ ہے کہ ابن صفی کے مطابق وہ تم سے ذرا کم خوبصورت اور تم سے ذرا زیادہ عقلمند تھا اور اس کی کرچین محبوبہ ابھی زندہ تھی اور وہ در پردہ ایک بڑا سرکاری عہدیدار تھا...... سیکرٹ سروس کا چیف وغیرہ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ادیبوں اور دیگر فن کاروں کا ذہن تخلیق کرتا ہے، وہ سراسر فرضی نہیں ہوتا۔ چاہے اس میں کتنی بھی فینٹسی ہو، اس جیسی یا اس سے ملتی جلتی چیزیں اس دنیا میں فی الواقع موجود ہوتی ہیں۔ شاید تم بھی ایک ایسی ہی ملتی جلتی چیز ہو۔"

اچانک ایک دھماکا ہوا اور ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے۔ یہ دھماکا عمارت کی بیرونی دیوار کے اندر ہوا تھا۔ یہ زیادہ زوردار نہیں تھا۔ کسی کریکر یا آتش بازی والے بم کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی ملی جلی آوازیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ عمارت سے باہر بہت سے لوگ جمع ہیں اور نعرہ زنی کر رہے ہیں۔

رات کے اس پہر یہ صورت حال تعجب خیز تھی مگر آج تو شاید رات ہوئی ہی نہیں تھی۔ زرگاں کی بیشتر آبادی ناچ گانے اور عیش عشرت میں مصروف تھی۔

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

"لگتا ہے کہ کچھ لوگ شاید تم پر اپنا غصہ اُتار رہے ہیں۔ آوازیں غور سے سنو۔"

مدھم آوازیں اب ہمارے کمرے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ انہیں زیادہ وضاحت سے

سننے کے لئے عمران نے ایک کھڑکی وا کر دی۔

"قاتل ہے...... پھانسی دو...... زندہ جلاؤ۔" اس طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر کسی نے نعرہ مارا۔ "سامبر مقابلہ۔"

جواب میں بیسیوں آوازیں بلند ہوئیں۔ "نامنظور۔"

یہ نعرہ کئی مرتبہ دہرایا گیا اور مظاہرین میں ہلچل نظر آنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ عمارت کے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہوائی فائرنگ شروع ہو گئی۔ یقیناً یہ فائرنگ اسپیشل گارڈز کر رہے تھے جو ہماری حفاظت پر یہاں مامور تھے۔

کچھ ہی دیر بعد یہ ہنگامہ سرد ہو گیا اور مظاہرین جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی، منتشر ہو گئے۔ یہ صورتِ حال ہمارے لئے نئی نہیں تھی، ہمیں معلوم تھا کہ زرگاں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو جارج گورا جیسے "مہان شخص" سے میرے دوبدو مقابلے کا مخالف ہے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ میں ایک معمولی شخص ہونے کے ساتھ ساتھ اسٹیٹ کا مجرم بھی ہوں۔ جارج کے ساتھ دوبدو مقابلے کے پروگرام نے مجھے جارج کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ہم دونوں کے حقوق برابر ہو گئے ہیں اور یہ کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

علی الصباح میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا۔ "وہ مٹھی بھر لوگ تھے۔ گارڈز کی ہوائی فائرنگ سے منتشر ہو گئے۔" پھر وہ دھیمی آواز میں رازداری کے لہجے میں بولی۔

"میرے خیال میں یہ بھی تم پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کا ایک طریقہ ہے۔ مقابلے سے پہلے یہ لوگ تمہیں زیادہ سے زیادہ پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انتظامیہ چاہتی تو یہ مٹھی بھر لوگ یہاں پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ انہیں کہیں دور ہی روک لیا جاتا جیسے دوسرے لوگوں کو روکا گیا۔"

"دوسرے لوگ کون؟" میں نے پوچھا۔

"کل رات تمہارے حق میں بھی بہت سے لوگ نکلے ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار کا جلوس تو ہو گا۔ یہ لوگ تمہاری جیت کے لئے نعرے لگا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں غصہ بھی تھا۔ کسی طرح یہ خبر نکل ہی گئی ہے کہ کل تم پر پھر حملہ ہوا ہے۔ غسل خانے کے نلکے میں کرنٹ چھوڑ کر تمہاری جان لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ لوگ احتجاج کرتے ہوئے یہاں تک آنا چاہتے تھے اور شاید اس سے آگے راج بھون بھی جانا چاہتے ہوں لیکن گارڈز نے انہیں روک لیا اور مار پیٹ کر منتشر کر دیا۔"

وہ جشن کا دن تھا۔ اس روز میں نے اور عمران نے زرگاں میں حیرت انگیز نظارے دیکھے۔ یوں لگتا تھا کہ زرگاں کے بیشتر باشندے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں اور انہوں

نے خود کو مستیوں میں غرق کر لیا ہے۔ جشن کا ایک اہم نظارہ ہاتھیوں کا جلوس تھا۔ یہ جلوس دوپہر کے فوراً بعد راج بھون سے روانہ ہوا۔ اسے شہر کے اہم راستوں سے گزر کر شام کے بعد واپس راج بھون پہنچنا تھا۔ ہماری قیام گاہ کے سامنے سے یہ شان دار جلوس سہ پہر کے وقت گزرا۔ یہ درجنوں سجے سجائے ہاتھی تھے۔ ان پر خوبصورت ہودے تھے اور ہودوں میں زرگاں کے معزز مرد و زن تھے۔ جلوس کے راستے کی دونوں جانب سیکڑوں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ کھڑکیوں، چوباروں اور چھتوں پر بھی اہلِ زرگاں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ جلوس میں سب سے آگے جو دیوہیکل ہاتھی تھا، وہ سب پر بازی لے گیا تھا۔ اس کی سجاوٹ بھی دیدنی تھی۔ اس کے ہودے میں حکم جی اپنی چھوٹی پتنی رتنا دیوی کے ساتھ موجود تھا۔ رتنا کو بچہ تولد ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے پھر بھی وہ تمام مصروفیات میں حصہ لے رہی تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ وہ پیچھے رہی تو کوئی دوسری رانی اس کی جگہ لے لے گی۔

دو رویہ کھڑے لوگ جلوس پر گل پاشی کر رہے تھے۔ جواباً شاہی ہاتھیوں پر سے عوام الناس پر سکوں کی بارش کی جا رہی تھی۔ ہم یہ سب کچھ لال بھون کی چھت کے اوپر سے دیکھ رہے تھے۔ نعروں اور باجے گاجے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

''کاش میں بھی ایک ہاتھی ہوتا۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''کیوں، ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ دیکھو۔'' عمران نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا، ایک ہاتھی کی سونڈ میں ایک خوبرو نیم برہنہ لڑکی بیٹھی تھی اور تماشائیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تو یہ ہتھنی ہے۔ کیا تم ایک لڑکی کو اپنی سونڈ پر بٹھانے کے لئے ہتھنی بننا پسند کرو گے؟''

''یہ ہتھنی ہو ہی نہیں سکتی۔'' عمران نے وثوق سے کہا۔ ''تم دیکھ نہیں رہے ہو، وہ کتنا خوش ہے۔ کتنی طاقت آ گئی ہے اس کی سونڈ میں۔ یہ محاورہ بالکل درست ہے کہ ہاتھی اور مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔''

''یہ محاورہ گھوڑے اور مرد کے بارے میں کہا گیا ہے۔'' میرے اور عمران کے عین پیچھے کھڑی گیتا مکھی نے کہا۔

ہم نے مڑ کر اسے دیکھا۔ رقاصہ لڑکیوں کی یہ بے باک استاد ہمیشہ کی طرح ہوشربا لباس میں تھی۔ اپنی عادت کے مطابق وہ گفتگو کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''لگتا ہے گیتا دیوی تمہیں ایسے ''محاوروں'' میں خاصی دلچسپی ہے۔''

''تمہیں ناہیں ہے؟'' وہ نیم باز آنکھوں سے بولی۔

''ہوتی تو غلط محاورہ نہ بولتا۔'' عمران نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ویسا گیتا دیوی، تمہیں آج کے دن تو کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تم نے اپنے کپڑوں پر بالکل بھی پیسے خرچ نہیں کئے۔ اتنا تھوڑا سا لباس۔ یہ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔''

وہ بے باکی سے مسکرائی۔ ''اور تم اسے کنجوسی کہہ رہے ہو؟ یہ تو فراخ دلی ہے...... زرگاں کی بیشتر عورتیں آج کے دن ایسی ہی فراخ دل ہو جاتی ہیں۔''

''کیا تم بھی ''بیشتر'' عورتوں میں شامل ہو؟''

''ہاں...... لیکن ہر کسی کے لئے ناہیں۔'' وہ عمران کو خاص نظروں سے دیکھ کر بولی اور تھوڑا سا اس کی طرف کھسک آئی۔

عمران نے جلدی سے موضوع بدلا اور گیتا سے پوچھا کہ یہ جلوس یہاں سے گزر کر کس طرف جائے گا۔ گیتا نے بتایا کہ یہاں پاس ہی ایک اسٹیڈیم نما جگہ ہے جہاں بہت سے کھیل تماشے ہو رہے ہیں۔ جلوس کے شرکاء کچھ دیر تک وہاں رکیں گے پھر راج بھون روانہ ہو جائیں گے۔ راج بھون میں آج جشن کی رات ہے۔ کل چونکہ زرگاں میں عام چھٹی ہے، اس لئے یہ جشن رات گئے تک جاری رہے گا۔ سات پریوں کا انتخاب اور اس کے علاوہ بھی بہت سی تقریبات ہوں گی۔

زرگاں کی وہ رات قابلِ دید تھی۔ گھروں پر چراغاں کیا گیا۔ دیسی گھی کے دیے روشن ہوئے۔ انواع و اقسام کے پکوان بنائے گئے اور لوگوں نے زرق برق لباس پہنے۔ مجھے اور عمران کو علم نہیں تھا کہ ہم بھی راج بھون جا سکیں گے یا نہیں؟ تاہم شام سے تھوڑی دیر پہلے میڈم صفورا نے مجھ سے کہا۔ ''حکم جی نے تمہیں راج بھون آنے کی اجازت دی ہے لیکن یہ اجازت مشروط ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ظاہر ہے کہ جارج صاحب بھی وہیں موجود ہوں گے۔ وہ تمہیں دیکھ کر طیش میں آ سکتے ہیں یا تمہاری طرف سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس لئے تم عام حاضرین میں نہیں بیٹھو گے بلکہ ایک گیلری تک محدود رہو گے اور وہیں سے جو کچھ دیکھ سکو، دیکھو گے۔ ہاں، عمران میرے گارڈز میں شامل ہو کر میرے ساتھ رہے گا اور ہر جگہ جا سکے گا۔''

شام سے کچھ دیر پہلے ہی مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار کیا گیا۔ میڈم صفورا اور منیجر

مدن وغیرہ بھی میرے ساتھ موجود تھے۔ نہایت سخت حفاظتی انتظامات میں ہم راج بھون کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم نے جشن کے پُرجوش مناظر دیکھے۔ جگہ جگہ آتش بازی ہو رہی تھی۔ نوجوان رقص کر رہے تھے۔ راستوں پر شراب کی خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ ہیجڑے بھی رنگین کپڑوں میں ملبوس، اس گہما گہمی کا حصہ تھے۔ وہ نہر جو راج بھون کی عظیم الشان سیڑھیوں کے پاس سے گزرتی تھی، کشتیوں اور رنگ برنگے تفریحی بجروں سے بھری ہوئی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی کرنوں میں بادبان چمک رہے تھے اور موسیقی کی لہریں پھیل رہی تھیں۔

ہم راج بھون کے سامنے پہنچے تو روشنیاں جگمگا اُٹھی تھیں۔ سارا بھون دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ خوب صورت فواروں سے ہفت رنگ پانی کی پھواریں پھوٹ رہی تھیں...... رنگین آنچل لہراتے تھے اور قہقہے بکھرتے تھے۔ گارڈز کے کڑے نرغے میں مجھے راج بھون کے اندر پہنچایا گیا اور مختلف راہداریوں سے گزار کر ایک گیلری میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی جنریٹرز کی برقی روشنی موجود تھی اور نشستیں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک بہت بڑا مخملی پردہ کھچا تھا۔ اس پردے کی دوسری جانب سے خوشبوؤں کی لپٹیں آتی تھیں اور سریلے قہقہے سنائی دیتے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پردے کی دوسری جانب بہت سے لوگ موجود ہیں۔

میڈم صفورا اور منیجر مدن کے علاوہ چند دیگر لوگ بھی اس گیلری میں موجود تھے۔ یہ بھی زرگاں کے معزز باشندوں میں سے تھے۔ ان سب کی نظروں میں میرے لئے بے پناہ دلچسپی موجود تھی۔ میری طرف دیکھ کر وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے اور پھر چور نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ میں ان کے لئے بے حد توجہ کی چیز تھا۔ صرف دو دن بعد راج بھون کے سامنے جارج گورا سے میرا دو بدو مقابلہ ہونے والا تھا...... فائٹ ٹل ڈیتھ۔ میں نے ایک ایسے شخص کو للکارا تھا جس کے مقابلے میں میری کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ غالباً یہ لوگ مجھے ایک چلتی پھرتی لاش کے طور پر دیکھ رہے تھے اور کچھ یہی حال ان گارڈز کا بھی تھا جو اس بالکونی نما گیلری میں میری حفاظت پر مامور تھے۔ وہ کنکھیوں سے مجھے تاکتے تھے جیسے نگاہوں نگاہوں میں مجھے تولتے ہوں اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوں کہ میں جارج گورا جیسے فائٹر کے سامنے کتنی دیر تک کھڑا رہ سکوں گا۔

میری تیاریوں اور رہن سہن کے حوالے سے بھی بہت سی سچی جھوٹی باتیں پھیل چکی تھیں۔ ان باتوں کا علم ہمیں زیادہ تر گیتا مکھی اور میڈم صفورا سے ہی ہوتا تھا۔ مثلاً یہ بات پتا نہیں کیسے پھیل گئی تھی کہ میں گھنٹوں برف کی سل پر لیٹا رہتا ہوں اور اپنے جسم کو زہریلے

کیڑوں سے ڈسواتا ہوں جس سے میرے جسم کی کھال بالکل بے حس ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے، یہ بے بنیاد بات تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد نیم تاریک گیلری کا مخملی پردہ ہٹایا گیا۔ سامنے کا منظر ہوش ربا تھا۔ یہ وہی وسیع و عریض بغیر ستون کا ہال کا تھا جو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ آج یہ ہال پہلے سے زیادہ مرصع و مزین نظر آتا تھا۔ ہال کی گنبد نما چھت پر مصنوعی ستاروں کی برات تھی اور چاند دلہا کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ تین آبشاروں کا پانی وسیع تالاب میں گرتا تھا۔ اس تالاب میں چھوٹی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ راجواڑے کے امراء خوش پوش نازنینوں کے ساتھ مصروفِ سیر تھے۔ تالاب کے کنارے ناچنے والیوں نے مختصر ترین لباس پہن رکھے تھے۔ سخت سردی میں وہ یہ مظاہرہ کرنے میں اس لئے کامیاب ہوئی تھیں کہ اس سارے چیمبر کو مصنوعی طریقے سے گرم کر دیا گیا تھا۔

میڈم صفورا نے ٹھیک کہا تھا۔ اس وسیع ہال کے بیچوں بیچ نصب فوارے میں سے آج پانی کی جگہ شراب پھوٹ رہی تھی اور فوارے کے گرد بنے ہوئے بلوری حوض میں جمع ہو رہی تھی۔ اس حوض سے جام بھر بھر کر پیئے جا رہے تھے اور ''پینے والے'' اپنی ساتھی حسیناؤں کے ساتھ بے تکلف ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آج کی شب کے لئے سارے قانونی و اخلاقی قاعدے ضابطے معطل ہو چکے ہیں...... اور یہاں کی جلوت...... خلوت بن گئی ہے۔

ایک طرف ڈانسنگ فلور بنا ہوا تھا۔ یہاں موسیقی کی دھنا دھن پر جوڑے محوِ رقص تھے۔ انہی جوڑوں میں ایک بلند قامت شخص نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ میرا مدِمقابل جارج گورا تھا۔ ایک مقامی حسینہ کو اپنے ساتھ پیوست کئے وہ محوِ رقص تھا۔ پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میری نگاہ حکم جی پر پڑی۔ وہ ایک بلند مرمریں چبوترے پر اپنی تینوں رانیوں کے ساتھ تشریف فرما تھا۔ اس کے گرد بھی جام گردش کر رہے تھے اور خوش بدن شاہی خادمائیں چکرا رہی تھیں۔ کئی دیگر مصاحبین بھی اس چبوترے پر حکم کے عقب میں موجود تھے۔

کچھ دیر بعد اس وسیع ہال میں جیسے رنگ و نور کا سیلاب سا آ گیا۔ روشنیوں کے زاویے بدل گئے۔ موسیقی کی پُرجوش تانوں نے ماحول کو گرمایا۔ وہ چالیس حسینائیں جگمگاتے اسٹیج پر ایک ساتھ نمودار ہوئیں جو پچھلے کئی ماہ سے اس تیاری میں تھیں کہ دیکھنے والوں پر بجلیاں گرائیں اور ان کے دل و دماغ کو اپنے سحر میں جکڑ لیں۔ یہ زرگاں کے گلشنِ حسن کے منتخب پھول تھے اور ان میں سے آج سات بہترین پھول منتخب کئے جانے تھے۔ اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹا

حشر خیز تھا۔لڑکیوں نے مشترکہ رقص کیا اور اپنے حسن و شباب کے جلووں سے دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیا۔حاضرین بار بار تالیاں پیٹتے رہے اور آہیں بھرتے رہے۔

میڈم صفورا نے کہا۔"لڑکیوں کا کمال تو ہے لیکن اس میں گیتا مکھی کی ٹریننگ کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔یہ لڑکیوں کی کایا پلٹنے میں ماہر ہے۔"

"کیا اب سات لڑکیوں کا سلیکشن ہو جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی کہاں۔" وہ بولی۔"ابھی ان کا ایڑی چوٹی کا زور لگے گا۔اپنے بہت سارے کپڑوں سے بھی محروم ہو جائیں گی۔"

اس کے بعد اگلا دور شروع ہوا۔لڑکیوں نے لباس تبدیل کئے اور کیٹ واک کے انداز میں ایک ایک کر کے اسٹیج پر آنا شروع کیا۔ان کی چال، مسکراہٹ، اُٹھنے بیٹھنے کا انداز، خوش لباسی، سب کچھ نوٹ کیا جا رہا تھا۔منصف خواتین و حضرات کی تعداد دس کے قریب تھی۔وہ بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔حاضرین خاموش رہ کر یا تالیاں بجا کر ان کی مدد کر رہے تھے۔

اس کے بعد آخری مرحلے کا آغاز ہوا۔یہ بھی بڑا سنسنی خیز تھا۔دوشیزائیں مختصر لباس میں اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔وہ پانچ پانچ کی ٹولیوں میں آئیں۔انہوں نے رقص کے مختلف انداز اپنائے اور داد وصول کی۔بعد ازاں چالیس کی چالیس لڑکیاں اکٹھی نمودار ہوئیں۔انہوں نے اپنے اپنے انداز سے رقص کیا۔پھر وہ اسٹیج سے اُتر کر وسیع ہال میں چلی گئیں۔انہوں نے حاضرین کے درمیان پرفارمنس دی۔آخر یہ طویل کارروائی ختم ہوئی۔کچھ ہی دیر بعد ان لڑکیوں میں سے سات رنگوں کی سات پریاں چن لی گئیں۔یہ سات لڑکیاں تالیوں کی گونج اور پھولوں کی بارش میں چبوترے پر آئیں۔انہوں نے باری باری حکم اور اس کی تینوں بیویوں کے چرن چھوئے۔تب وہ حکم، جارج، اسٹیل اور دیگر حکام کے قدموں میں فرش پر بیٹھیں اور تصویریں بنوائیں۔

اس اہم مرحلے کے بعد شراب نوشی کا دور شروع ہوا۔ساتوں پریاں حکم اور اس کے مصاحبین و بیگمات کے لئے ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔پھر کھانے کا دور شروع ہوا۔اس پُرشکوہ و شان دار شاہی ضیافت کے بعد حاضرین ہاتھوں میں قہوہ کی پیالیاں اور جام وغیرہ لئے پھر سے اپنی نشستوں پر آ بیٹھے۔ایک عجیب سی سرمستی نے ہر ذی نفس کو گھیرا ہوا تھا۔اب زیادہ تر بیگمات یہاں سے جا چکی تھیں۔مرد حضرات رہ گئے تھے یا وہ حسینائیں جو آج کے دن اپنے حسن و شباب کا سارا سرمایہ اپنے پرستاروں پر لٹانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

ان میں سے کچھ خود بھی "شیری" طرز کا مشروب پی رہی تھیں اور اپنے ساتھی مردوں کی بے باکی کو خوش دلی سے قبول کر رہی تھیں۔ان میں مجھے جارج گورا اور اسٹیل وغیرہ بھی نظر آئے۔جارج گورا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ایک مقامی حسینہ کو اپنی بغل میں لئے وہ اس نہایت مضبوط بلوری شوکیس کے پاس بیٹھا تھا، جس میں پگھلا ہوا سونا ہلکورے لیتا تھا اور لڑکی کی برہنہ مورتی اس میں ڈوبتی اُبھرتی تھی۔پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ پرسوں کا انتظار نہ کروں۔آج ہی سارے بندھن توڑ کر اس گورے عیاش پر جا پڑوں اور اسے اس پگھلے ہوئے سونے میں ایک مکمل غوطہ دے دوں۔

لیکن میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ میں صرف سوچ سکتا ہوں۔عمران بھی اسی نیم تاریک گیلری میں میڈم صفورا کے سکیورٹی گارڈ کی حیثیت سے موجود تھا۔میری اور اس کی نظر گاہے بگاہے ملتی تھی۔اچانک عمران مجھے چونکا ہوا نظر آیا۔میں نے دیکھا، وسیع و عریض حال میں ایک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ایک شخص نے رم کی ایک خالی بوتل کے اوپر لکڑی کا ایک مستطیل ٹکڑا رکھا اور اس پر کھڑا ہو گیا۔پھر اس نے لکڑی کے ٹکڑے پر ایک اور خالی بوتل رکھی اور اس پر لکڑی کا ٹکڑا رکھنے کے بعد اس پر بھی اپنا توازن برقرار کیا۔حاضرین نے تالیاں بجا کر اسے داد دی۔اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا مگر چوتھی بوتل پر کھڑا ہونے کی کوشش میں وہ گر گیا اور بوتلیں لڑھک گئیں۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے میڈم سے پوچھا۔

"یہاں کا بہت پرانا کھیل۔رم کی خالی بوتلوں کو اوپر نیچے رکھ کر ان پر کھڑا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔یہ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے، ایک جشن کے موقع پر رتنا دیوی نے ترنگ میں آ کر یہ آفر کر دی تھی کہ جو شخص اس طرح آٹھ بوتلوں کے اوپر کھڑا ہو جائے گا، وہ اسے شاہی اصطبل کے بہترین آٹھ گھوڑے انعام میں دے گی۔اس کے علاوہ وہ طلائی زیورات کا بھی حق دار ہوگا۔"

"کون سے زیورات؟" میں نے پوچھا۔

"رتنا دیوی کی جیولری۔یعنی وہ جیولری جو ان کی ملکیت ہے۔حکم جی کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیوی ہونے کی حیثیت سے رتنا دیوی کے پاس سب سے زیادہ جیولری ہے۔قریباً تین باکس بھرے ہوئے ہیں جن کے کل وزن کا شاید رتنا دیوی کو بھی نہیں پتا۔دیوی نے کہا ہوا ہے کہ جو اس شرط کو پورا کرے گا، وہ جیولری باکس میں سے دو مٹھی بھر کر زیورات لے سکتا ہے۔اب اس کی قسمت کہ اس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے۔دو مٹھیوں میں کچھ نہیں تو لاکھوں کے

زیورات تو آ ہی سکتے ہیں۔ یہ جڑاؤ زیورات معمولی قیمت کے تو نہیں ہوں گے۔"

"عجیب بات ہے۔" میں نے کہا۔

"ان راجوں مہاراجوں کی تفریحات اسی طرح کی ہوتی ہیں۔ دینے پر آئیں تو بے وجہ لاکھوں کروڑوں لٹا دیں، نہ دیں تو پھوٹی کوڑی کے بدلے جان لے لیں۔ اب پچھلے تین چار سال سے شغل بنا ہوا ہے کہ کھانے کے بعد جب لوگ گپ شپ کے لئے بیٹھتے ہیں تو یہ کھیل شروع کر دیتے ہیں۔ اچھا، وہ دیکھو...... آج وہ بھی قسمت آزمانے آئی ہے۔"

"کون؟"

"او وہی مس انڈیا...... وہ دیکھو ننگی ٹانگیں چلاتی آ رہی ہے۔" میڈم صفورا نے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہاں، یہ وہی سولہ سترہ سالہ تیز طرار لڑکی تھی جس نے لال بھون میں ریہرسل کے دوران میں جمناسٹک کا شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ بعدازاں اس نے عمران سے بحث بحثی شروع کر دی تھی۔ اس تکرار کا انجام یہ ہوا تھا کہ عمران نے اس لعل مس انڈیا سے مقابلہ کیا تھا اور بعدازاں جان بوجھ کر ہار گیا تھا۔ اس ہار کے اندر جو جیت چھپی ہوئی تھی، اس کا پتا ہمیں بعد میں چلا تھا۔

آج یہ لعل مس انڈیا پھر میدان میں تھی۔ کھیل تماشوں میں حصہ لینے والے دو اور نوجوانوں نے آٹھ بوتلوں والی شرط پوری کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک نوجوان باقاعدہ "جگلر" تھا۔ وہ بھی پانچویں بوتل کے بعد توازن برقرار نہ رکھ سکا اور قہقہوں کے درمیان قالین پر گر گیا۔ گرنے والوں کو ہلکی پھلکی خراشیں بھی آ رہی تھیں۔ تاہم موج مستی کے اس ماحول میں چھوٹی موٹی چوٹوں کی پروا نہیں کی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لعل مس انڈیا کی باری آ گئی۔ وہ زیادہ بااعتماد نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سب کچھ اس کی ٹریننگ کا حصہ نہیں تھا۔ بہرحال انعام کے لالچ میں وہ قسمت آزمائی کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط اور بڑے دھیان سے کھیل کا آغاز کیا۔

وہ رم کی بوتل رکھتی پھر اس پر لکڑی کا مستطیل ٹکڑا رکھتی اور کھڑی ہو جاتی۔ بہتر توازن حاصل کرنے کے بعد وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی۔ معاون لڑکی رم کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھماتی۔ لعل مس انڈیا بوتل کو بڑے دھیان سے لکڑی کے ٹکڑے میں جماتی۔ جس مستطیل ٹکڑے پر وہ کھڑی ہوتی تھی، وہ شمالاً جنوباً ہوتا تو وہ اوپر والا ٹکڑا شرقاً غرباً رکھتی تا کہ نچلے والے ٹکڑے پر پاؤں جمے رہیں۔

اسی طریقے سے وہ ساتویں بوتل تک پہنچ گئی۔ حاضرین نے سانسیں روک لیں۔ میڈم نے کہا۔ "یہ ہائیسٹ اسکور ہے بھئی...... اگر......"

ابھی میڈم کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ بوتلوں کا مینار ٹوٹا اور وہ دھڑام سے نیچے گری۔ کچھ قہقہے اُبھرے لیکن زیادہ تر لوگوں نے تالیاں بجا کر لڑکی کی ہمت کو داد دی۔ حکم جی کے پہلو میں بیٹھی رتنا دیوی نے لڑکی کو اپنے پاس بلایا اور اس کی اشک شوئی کے لئے اسے کوئی تحفہ دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ اور ادب سے جھک کر قبول کیا۔

میں نے کہا۔ "میڈم! یہ کھلا مقابلہ ہے نا؟ میرا مطلب ہے ہر کوئی حصہ لے سکتا ہے؟"

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ "میڈم! ایک مزے کی بات بتاؤں آپ کو۔ آپ عمران کو کہیں کہ وہ یہ کھیل کھیلے۔"

میڈم چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ وہ میری بات کو وزن دے رہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ عمران ایک پروفیشنل فن کار ہے...... بلکہ شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ لاہور میں اسٹار سرکس کے شوز کے دوران میں کبھی کبھی خاص شوز بھی ہوتے تھے جن کو خاص لوگ دیکھتے تھے اور نڈر فن کار اس میں نہایت خطرناک "پرفامنسز" دیتے تھے۔ تو جو شخص پنڈال کی خطرناک بلندی پر بغیر کسی حفاظتی انتظام کے شاندار مہارتوں کا مظاہرہ کرتا تھا، وہ یہ رم کی خالی بوتلوں والا کھیل بھی کھیل سکتا تھا۔

میں نے عمران کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ میڈم صفورا اس سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ عمران کے چہرے پر ہلکا پھلکا تاثر تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ وہ یہ کام کر لے گا۔

چند منٹ بعد میڈم صفورا گیلری سے نکل کر نیچے ہال میں پہنچی۔ منیجر مدن بھی اس کے ساتھ تھا۔ منیجر مدن نے ادب سے جھک کر رتنا دیوی سے کچھ کہا۔ رتنا دیوی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا...... پھر میڈم صفورا کی طرف دیکھ کر بھی سر کو اثباتی حرکت دی۔

کچھ ہی دیر بعد عمران وسیع و عریض ہال میں حاضرین کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس کے جسم پر سیکیورٹی گارڈز والا مخصوص لباس تھا...... تاہم بہتر کارکردگی کے لئے اس نے اپنے جوتے اور موزے اُتار لئے تھے۔ اب یہاں کافی لوگ عمران کو پہچاننے لگے تھے۔ عمران کی پہچان دراصل صرف ڈیڑھ دن پہلے راج بھون کے بھرے پُرے دربار میں ہوئی تھی جب عمران نے حکم کے سوالوں کے مدلل جواب دیئے تھے اور ثابت کیا تھا کہ انتہا پسندی اور کٹر پن کا الزام صرف مسلمانوں پر لگانا کسی طور درست نہیں۔ اس کی باتوں نے جہاں کھوسٹ بڑھیا کی بولتی بند کی تھی، وہاں حکم کے مصاحبین کو بھی کچھ دیر کے لئے سانپ سونگھ گیا تھا۔

آج عمران ان معززین کے سامنے ایک دوسری طرح کے چیلنج کے لئے موجود تھا۔ چار بوتلوں تک تو عمران بہ آسانی پہنچ گیا۔ پانچویں اور چھٹی بوتل پر اسے دقت ہوئی۔ ساتویں بوتل کی باری آئی تو وسیع ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ اس سنسنی خیز خاموشی میں بس فواروں اور آبشاروں کی حرکت کرتے پانی کی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ سازندوں نے بھی اپنے ہاتھ روک لئے تھے اور ان کی نگاہیں تماشے پر جمی تھیں۔ ''کیا وہ کر لے گا؟'' میڈم نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''مجھے یقین ہے۔'' میں نے کہا۔

ہاں، مجھے یقین تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ اور اس کی شخصیت میں کرامات ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ اس نے ساتویں بوتل پر لکڑی کا مستطیل ٹکڑا رکھنے کے بعد اس پر اپنے پاؤں جمائے اور مکمل توازن حاصل کیا تو سازندوں نے سازوں کو زور سے چھیڑا اور وسیع وعریض ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اب عمران کو آخری بوتل پر چڑھنا تھا۔ وہ زمین سے تقریباً آٹھ فٹ بلند ہو چکا تھا۔

آخری مرحلہ شروع اور ختم ہونے میں قریباً پانچ منٹ لگے۔ دھڑکنیں تھم گئی تھیں اور نگاہیں جامد ہو گئی تھیں۔ خواتین نے ہاتھ سینوں پر رکھے ہوئے تھے۔ عمران نے وہ کر دکھایا جس کی میں اس سے توقع کر رہا تھا۔ جب وہ آٹھویں بوتل پر کھڑا ہوا اور اس نے فاتحانہ انداز میں اپنے دونوں بازو دونوں طرف پھیلائے تو لعل مسل انڈیا اور اس کے ساتھیوں کے چہرے دیکھنے کے قابل تھے۔ چند روز پہلے کی جھوٹی فتح کا خمار، زبردست کھسیانے پن میں بدل چکا تھا۔ ان لوگوں نے خود ہی اسے لعل مس انڈیا اور مسٹر پاکستان کے مقابلے کا نام دیا تھا۔ اب یہ ''نام'' اس کے لئے اضافی ہزیمت کا باعث تھا۔

عمران نے اس پر بس نہیں کیا۔ اس نے اپنی جیت کو مزید واضح اور مستحکم کرنے کے لئے ایک اور بوتل طلب کی۔ ہال تالیوں سے گونجا۔ مختصر لباس والی معاون لڑکی نے ایک اسٹول پر کھڑی ہو کر بوتل اور لکڑی کا ٹکڑا عمران کو تھمایا...... عمران نے بے پناہ داد کے شور میں یہ آخری step بھی کر دکھایا......

O......❖......O

یہ نئے دن کی صبح تھی۔ گیارہ بج چکے تھے...... لیکن راج بھون میں بیشتر لوگ سوئے پڑے تھے۔ ساتویں کا جشن کل رات آخری پہر تک جاری رہا تھا۔ اس کے اختتام پر شراب پانی کی طرح استعمال ہوئی۔ رقص وموسیقی نے ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کیا اور آخر بدمست

جوڑے خلوت گاہوں میں جا گھسے۔ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر لگتا یہی تھا کہ وہ تمام تینتیس لڑکیاں بھی ان خلوت گاہوں کا حصہ بنی ہیں جنہوں نے پریوں کے انتخاب میں حصہ تو لیا تھا مگر چنی نہیں جا سکی تھیں۔ ان لڑکیوں نے کل رات راج بھون کے اعلیٰ ترین افراد کی تنہائیوں کو رنگین کیا تھا۔ انہیں چند دن یہیں رہنا تھا۔ پھر تحائف سے لد پھند کر گھروں کو لوٹ جانا تھا۔ یہ سب کچھ یہاں معمول کے مطابق تھا۔ گیتا مکھی نے بتایا تھا کہ ایسی لڑکیوں کی بعد ازاں باقاعدہ شادیاں ہوتی ہیں اور وہ نارمل زندگی گزارتی ہیں۔ راج بھون میں گزری ہوئی دو چار راتوں کے لئے انہیں کبھی مطعون نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے تو ذمے دار شخص حکم کے عتاب کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ پریوں کو یہاں ایک خاص الخاص درجہ حاصل ہو جاتا تھا۔ وہ مستقل طور پر راج بھون کے ساتھ منسلک ہو جاتی تھیں۔ شروع شروع میں یہ سات پریاں پاکیزگی اور تقدس کا نشان ہوتی تھیں مگر گزرتے زمانے کے ساتھ ساتھ روایتیں تبدیل ہوئی تھیں اور اب یہ پریاں چند ماہ، بلکہ ہفتوں کے اندر ہی اعلیٰ سطح پر ''رکھیلوں'' کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ حرص وہوس نے اپنی بقا کے راستے ڈھونڈ لئے تھے۔ غالباً دھرم کے ٹھیکیداروں نے ہی آقاؤں کی خوشنودی کے لئے اس رسم میں کچھ ایسی شقیں ڈھونڈ نکالی تھیں جن کی رُو سے حکم اور اس کے نہایت قریبی ساتھی ان پریوں سے جسمانی ربط قائم کر سکتے تھے۔ اس کی ایک مثال باروندا جیکی کی محبوبہ شکنتلا تھی جسے پتنی بنانے میں ناکام ہو جانے پر حکم نے اسے پری کا درجہ دیا اور اپنے حرم میں شامل کیا۔

میں اور عمران ابھی تک راج بھون میں ہی تھے۔ دوپہر کے بعد خمار زدہ لوگوں نے جاگنا اور چلنا پھرنا شروع کیا۔ سہ پہر کے وقت میڈم صفورا کے ذریعے عمران کو رتنا دیوی کا بلاوا آیا۔ یقیناً یہ بلاوا اسے وعدے کے مطابق انعام سے نوازنے کے لئے تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے میں بھی میڈم صفورا، منیجر مدن اور عمران وغیرہ کے ساتھ شاہی اصطبل میں چلا گیا۔ میری وجہ سے درجن بھر مسلح گارڈز کو بھی میرے ساتھ حرکت کرنا پڑی۔ ہم شاندار اصطبل میں پہنچے۔ یہاں بیش قیمت گھوڑے گھوڑیوں اور ان کے بچوں کی طویل قطاریں موجود تھیں۔ طویل اصطبل کے ایک حصے میں پارٹیشن کر کے اسے گیراج کی حیثیت دی گئی تھی اور یہاں شاہی استعمال کی چند گاڑیاں موجود تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد رتنا دیوی اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں آن موجود ہوئی۔ اس نے عمران کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اپنے گارڈ سے کہو کہ یہ بلا جھجک اپنی پسند کے آٹھ بہترین گھوڑے یہاں سے چن لے۔ ہم اس سے بہت خوش

ہیں۔ بے شک ہمیں یہ جانکاری بھی ہوئی ہے کہ یہ شخص شوقیہ کھلاڑی ناہیں تھا۔ یہ کسی سرکس میں کام کرتا رہا ہے اور جسمانی کمالات دکھاتا رہا ہے لیکن ہمیں پتا ہے کہ پچھلے تین چار سالوں میں اس شرط کو پورا کرنے کے لئے کھلاڑی لوگن بھی آتے رہے ہیں۔ جیسے کل رات وہ مس انڈیا نام کی لڑکی آئی تھی مگر اس کے سوا کوئی بھی سپل (کامیاب) ناہیں ہوا ہے۔ ہم اس کو انعام دیتے ہوئے من سے خوش ہیں۔ یہ گھوڑے چن سکتا ہے اور یہ رہا اس کا دوسرا انعام۔'' رتنا دیوی نے ایک خادمہ کو اشارہ کیا اور اس نے ایک مخملی پوٹلی عمران کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا ہے رانی؟'' عمران نے ادب سے پوچھا۔

''طلائی زیور...... تمہاری دو مٹھیاں کتنی بھی بڑی ہوتیں یہ ان سے زیادہ ہی ہے۔'' رتنا نے جواب دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ یہ زیادہ زیور تھا۔

عمران نے پوٹلی لے تو لی مگر اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اسے لینا نہیں چاہتا۔ عمران کی اکثر باتیں سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی تھیں۔ رتنا دیوی نے ایک بار پھر عمران سے کہا کہ وہ اپنی مرضی کے آٹھ گھوڑے شاہی اصطبل میں سے چن لے۔

عمران نے میڈم صفورا کی طرف دیکھا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''رانی صاحبہ میں آپ کی ان نوازشوں کے قابل نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ بہت مہنگے گھوڑے ہیں...... لیکن میں انہیں کہاں رکھوں گا اور سچ یہ ہے کہ مجھے گھڑسواری کا شوق بھی نہیں ہے۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں چاہوں گا کہ گھوڑے شاہی اصطبل میں ہی رہیں اور ان لوگوں کے استعمال میں آئیں جو ان کو برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔''

رتنا دیوی سمیت کئی افراد نے عمران کو حیرت کی نظروں سے دیکھا۔ وہ عجب سیر چشمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ رتنا دیوی نے کہا۔ ''ایسا ناہیں ہو سکت۔ ہم نے جو وچن دے رکھا ہے اسے پورا کریں گے۔ اگر تم گھوڑے لینا ناہیں چاہت ہو تو اس کی قیمت لے لو۔ یہاں کوئی بھی گھوڑا، ایک لاکھ سے کم قیمت کا نہیں ہے۔ یہ کافی بڑی رقم بن جاوے گی۔''

''لیکن رانی صاحبہ! میں یہ رقم لینا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ نہیں چاہئے۔ میرے لئے آپ کی توجہ اور مہربانی ہی بڑا انعام ہے۔ میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے مجھے کسی قابل جانا اور میری ستائش کی میں بصد احترام اور خوشی یہ زیورات بھی واپس کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس قابل نہیں ہوں جی کہ ان کا بوجھ اُٹھا سکوں۔ آپ کے قدموں میں جگہ مل جائے، میرے لئے یہی بڑی بات ہے۔'' عمران کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

وہ زبردست اداکار تھا۔ بظاہر سادہ مگر اندر سے پیچیدہ۔

رتنا دیوی کا تنا ہوا چہرہ قدرے نرم پڑ گیا۔ وہ میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولی۔

''صفورا! تمہارا یہ سیکیورٹی گارڈ خاصے کی چیز ہے۔ جو کچھ اسے مل رہا ہے، اس سے اس کے اگلے دس بیس سال بڑے آرام سے گزر سکت ہیں لیکن یہ لینے سے انکار کرت ہے۔''

''جی رتنا دیوی! یہ ایسا ہی ہے۔ بس اپنے آپ میں خوش اور مست رہنے والا۔''

رتنا دیوی نے بھرپور نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ بے ساختہ مسکرانے لگی۔ مسکراتے ہوئے اس کے جبڑے کا تھوڑا سا ٹیڑھا پن ظاہر ہوتا تھا۔ یہ دراصل اس پرانے حادثے کی نشانی تھا جب سلطانہ اور رتنا کا جھگڑا ہوا تھا۔ شاہی پن گھٹ کی سیڑھیوں پر رتنا شاید اپنے ہی زور میں گری تھی اور اس کا جبڑا ہل گیا تھا۔ اس معمولی سے نقص کے سوا رتنا دیوی ایک نہایت پُرکشش عورت تھی۔

اس نے عمران کا نام پوچھا اور پھر اسے نام سے مخاطب کر کے بولی۔ ''تمہیں کچھ نہ کچھ تو لینا پڑے گا۔ ورنہ ہمیں نراشا ہوگی۔''

عمران نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ''محترمہ رانی صاحبہ! یہاں کوئی بھی ایسی چیز نہیں کہ میں خود کو جس کے قابل سمجھ سکوں۔''

''تم نراش کر رہے ہو۔'' رتنا دیوی کے ماتھے پر ہلکی سی سلوٹ نظر آئی۔

عمران نے گیراج کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''پاکستان میں کچھ عرصہ میں نے گاڑیوں کا کام کیا ہے جی۔ مجھے اچھی گاڑیوں کا شوق ہے اور ڈرائیونگ بھی اچھی کر لیتا ہوں...... اگر آپ کا اصرار ہے تو مجھے ان گاڑیوں میں سے کوئی عنایت کر دیجئے۔''

رتنا دیوی بولی۔ ''تو پھر تم خود چن لو...... وہ تمہارے سامنے کھڑی ہیں۔''

عمران گاڑیوں کے پاس گیا۔ کچھ دیر گھوم پھر کر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک فور وہیل ڈرائیو، چھوٹی جیپ کا انتخاب کیا۔ یہ اسپیشل ماڈل کی شاندار جرمن گاڑی تھی۔ حالت بھی اچھی تھی۔ رتنا دیوی کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے تردد نظر آیا۔ شاید یہ اس کی پسندیدہ گاڑی تھی۔ ویسے بھی اس بھانڈیل اسٹیٹ میں گنتی کی گاڑیاں ہی تھیں اور ان میں سے اکثر فاضل پرزوں کی عدم دستیابی کے سبب کھڑی رہتی تھیں۔ ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد رتنا دیوی کے چہرے سے تردد کے آثار اوجھل ہو گئے۔ یقیناً اس نے حساب کتاب لگایا تھا۔ جو کچھ عمران اپنی منشا سے چھوڑ رہا تھا، وہ اس جیپ کی قیمت سے، کچھ نہیں تو بیس پچیس گنا زیادہ تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بس یا کچھ اور؟''

"بس رانی صاحبہ۔"

"ٹھیک ہے، یہ تمہاری ہوئی۔" رتنا دیوی نے کہا۔

میں نے عمران کی دلکش آنکھوں میں دیکھا۔ ان میں ایک چمک سی تھی۔

O.....❖.....O

سنسنی خیز گھڑیاں قریب پہنچ رہی تھیں۔ پورے زرگاں میں اس مقابلے کی دھوم تھی جو کل میرے اور جارج گورا کے درمیان ہونا تھا۔ وہ کشتی دیوتا تھا۔ وہ شکست کھانا نہیں جانتا تھا اور میں اسے شکست دینے کا دعویٰ کر چکا تھا۔

اس شام ہم لال بھون میں واپس آ گئے۔ ہم "جم" میں پہنچے اور قریباً تین گھنٹے تک اندھا دھند پریکٹس کی۔ یہ درد اور برداشت کا مقابلہ تھا۔ عمران بیٹھ گیا مگر میں لگا رہا۔ آخر میں بھی تھک کر چور ہوا اور گدے پر گر گیا۔ عمران نے مجھے پانی پلایا اور پھر کیلوں کا ایک گچھا لے آیا۔ اس نے ایک کیلا چھیل کر بڑی محبت سے میری طرف بڑھایا۔ "لو، منہ میٹھا کر لو اور اس میں توانائی بھی بہت ہوتی ہے۔"

"منہ میٹھا کس خوشی میں؟" میں نے پوچھا۔

"میری ترقی کی خوشی میں۔ سہ پہر کو رتنا دیوی کی ہدایت پر میڈم صفورا نے مجھے سیکیورٹی گارڈ سے پروموشن دے کر اسسٹنٹ انچارج بنا ڈالا ہے۔"

"بھئی واہ۔ رتنا، میڈم نادیہ اور گیتا مکھی جیسی عورتوں کو شیشے میں اُتارنا تمہیں خوب آتا ہے۔"

"تم بھی تو کچھ کم نہیں ہو۔ تم نے بھی تو یہاں آ کر سلطانہ جیسی منہ زور لڑکی کو شیشے میں اُتارا ہے۔"

سلطانہ کے ذکر نے ایک دم مجھے اداس کر دیا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "عمران! کل کچھ بھی ہو سکتا ہے...... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو تم کیا کرو گے؟"

"میں گانا گاؤں گا۔ ساتھی رے...... تیرے بنا بھی کیا جینا...... جب دودھ میں بس پانی رہ گیا تو دودھ کا کیا پینا...... اس کے بعد میں گیتا مکھی کی آخری خواہش پوری کر کے آتما ہتھیا کر لوں گا۔ ویسے خودکشی کے مقابلے میں آتما ہتھیا قدرے بہتر چیز ہے۔ اس میں دوسرے جنم کی امید تو رہتی ہے نا۔"

"گیتا مکھی کی آخری خواہش؟ کیا مطلب؟"

"یار، وہ سونا چاہتی ہے میرے ساتھ اور تمہیں پتا ہے کہ وہ سوئے گی ہرگز نہیں۔"

"میں بہت سنجیدہ ہوں عمران۔"

"تو پہلے بتانا تھا۔ میں نے سمجھا شاید کوئی لطیفہ سنا رہے ہو۔ دیکھو جگر! ہم وصیتوں وغیرہ کی باتیں تو تب کریں جب ہمیں ہارنا ہو۔ ہمیں ہارنا ہے ہی نہیں۔ بس جیتنا ہے۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ مڑ کر دیکھنے والے پتھر ہو جاتے ہیں اور ویسے بھی پیچھے کچھ نہیں۔ کل تم کشتیاں جلا کر میدان میں اُترو گے اور جیت کر باہر نکلو گے۔"

"لیکن عمران! غیب کا علم تو قدرت کے سوا کسی کو نہیں اور جب ہم غیب نہیں جانتے تو پھر ہمیں صرف ایک ہی رخ پر تو نہیں سوچنا چاہئے۔ کچھ پلاننگ تو ہونی چاہئے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اگر کل مجھے کچھ ہو گیا تو تم تین کام ضرور کرو گے۔ پہلا یہ کہ سلطانہ اور بالو کو سنبھالنا اور انہیں اسٹیٹ کے اندر یا باہر کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا...... دوسرا پاکستان جا کر فرح اور عاطف کا خیال رکھنا اور تیسرا......"

میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ آواز بیٹھ سی گئی۔

"ہاں...... ہاں۔ اب بولنا شروع کیا ہے تو بول دو۔"

"ہو سکے تو ثروت کا کھوج لگانا اور اگر کبھی اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہنا، میں نے اس سے بہت پیار کیا ہے...... اور آخری سانس تک کیا ہے۔"

"یہ سب باتیں تم اس سے خود ہی کہو گے...... اگر سلطانہ نے کہنے کی اجازت دی تو۔ باقی جگر! دلیپ کمار وغیرہ تو خواہ مخواہ مشہور ہو گئے ہیں، اگر تم فلموں میں روندو ہیرو کے روپ میں آ جاؤ تو سب کی چھٹی کرا دو۔"

وہ ایسے ہی باتوں کو ہوا میں اُڑاتا تھا اور نہایت گھمبیر و کشیدہ ماحول کو بھی کسی دوسرے رخ پر دھکیل دیتا تھا۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ امکانات پر غور کرتے رہے اور آمدہ گھڑیوں کی حشر خیز چاپ سنتے رہے۔

میں نے کہا۔ "تمہاری کہانی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ لگتا ہے کہ میں سارے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔ ویسے مجھے ایک بات بتاؤ...... مجھے ذرّہ بھر بھی شک نہیں کہ جانوروں سے اپنے حیران کن تعلق کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے یہ حرف بہ حرف سچ ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ خصوصی تعلق ایک دم ختم کیسے ہو گیا؟ کیا اس میں تمہاری کوئی کوتاہی تھی یا اسے ہونا ہی تھا اور پھر پروفیسر رچی صاحب کی پیشین گوئی کہ یہ خاص صلاحیت پھر سے تمہارے اندر آ سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ شدت سے آئے۔ کیا یہ سب

درست ہے؟"

عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسے سچ سمجھوں۔ ہوسکتا ہے کہ جیسے اچانک ہی یہ سب کچھ میرے پاس سے چلا گیا، ایسے ہی واپس آ جائے اور ہوسکتا ہے نہ بھی آئے۔"

"کیا اب بھی تم جانوروں سے اسی طرح لگاؤ محسوس کرتے ہو؟"

"سچی بات یہ ہے جگر کہ زیادہ لگاؤ تو میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا۔ جو کچھ تھا، دوسری طرف سے ہی تھا جواب نہیں ہے۔ ابھی دو تین دن پہلے ہی میں غلطی سے شیڈ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں بندھے ہوئے، منیجر مدن کے کتے نے مجھ پر جھپٹا مارا اور ٹانگ زخمی ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

"اچھا اور ایک بات مجھے اُلجھن میں ڈال رہی ہے۔ تم اندر کی بات نہیں بتا رہے ہو۔ آج تم نے رتنا دیوی کی اتنی بڑی آفر ٹھکرا کر وہ جیپ کیوں چنی ہے۔ کیا اس سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہے ہو؟"

"یار! اب تم میرے سیدھے سادے کاموں میں بھی "پلاننگ" ڈھونڈنے لگتے ہو۔ بس وہ گاڑی مجھے اچھی لگی اور میں نے لے لی۔ دوسری طرف میں نے رتنا کی آفر کو ٹھکرا کر اس کی انا کو ٹھیس بھی پہنچائی۔ وہ آج جتنی بھی میٹھی بنی ہوئی تھی مگر ہے تو تمہاری اور سلطانہ کی دشمن نا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا، کل بھی تم پر کیسی قہر بھری نظر ڈالتی تھی خانہ خراب۔"

"اس گاڑی کا کیا کرو گے؟"

"کل تمہاری جیت کے بعد تمہیں اس میں بٹھاؤں گا اور فاتحانہ پورے زرگاں کا چکر لگاؤں گا......"

"اور اگر معاملہ الٹ ہوا تو؟"

"اب آگے بولو گے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔" اس نے گل دان اُٹھالیا۔

میں خاموش ہو گیا تو اس نے ایک کتاب اُٹھا کر میری طرف بڑھائی۔ "اس میں ٹائم لگاؤ، فائدہ ہوگا۔"

یہ وہی مخطوطہ یعنی ہاتھ سے لکھی ہوئی باتصویر کتاب تھی جو چند روز پہلے میڈم صفورا نے ہمیں دکھائی تھی۔ اس کا عنوان "سویمر اور سامبر" تھا۔ آج میں نے میڈم سے فرمائش کی کہ یہ کتاب منگوائی تھی اور کافی دیر تک اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے کئی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ میں باقی ماندہ کتاب پر نگاہ دوڑانے لگا۔ ساتھ ساتھ ہم دونوں باتیں بھی کرتے جا

رہے تھے۔ ہم قریباً نصف شب تک اپنی آخری تیاریوں میں مصروف رہے...... پھر فرش کے بستر پر پہلو بہ پہلو لیٹے اور سو گئے۔ کتنا حوصلہ بخش ساتھ تھا عمران کا۔

O......❖......O

راج بھون کے عظیم الشان محرابی دروازے کے سامنے، جہاں تک نظر جاتی تھی لوگوں کے سر دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایک اسٹیڈیم نما جگہ تھی۔ بیٹھنے کے لئے پختہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی مقابلے ہو چکے تھے لیکن آج کے مقابلے نے بے نظیر شہرت پائی تھی۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں ایسے پوسٹرز اور بینرز نظر آ رہے تھے جن پر جارج گورا کی تصویر تھی اور اسے شکتی دیوتا کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگی پگڑیاں لہرا رہے تھے۔ میدان کے بیچوں بیچ لڑائی کا اکھاڑا تھا۔ اس کی چاروں طرف آہنی جنگلا تھا جس میں بس ایک داخلی دروازہ تھا۔ وسیع گول اکھاڑا قریباً بیس میٹر قطر کا ہوگا۔ اس اکھاڑے کے درمیانی حصے کو لکڑی کے ایک گول سائبان کے ذریعے ڈھانپا گیا تھا۔ سائبان کم بیش بارہ فٹ اونچا تھا۔ اکھاڑے سے باہر حکم اور شاہی خاندان کے افراد کے بیٹھنے کے لئے ایک شان دار گیلری تھی۔ یہاں نہایت شان دار نشستیں تھیں اور سردی سے بچانے کے لئے انگیٹھیاں وغیرہ دہکائی گئی تھیں۔ بالکونی نما گیلری کی دائیں جانب وہ منحوس سُولی کھڑی تھی جس کا نظارہ میں نے اور عمران نے چند دن قبل کیا تھا۔ میرے دیرینہ ساتھی اسحاق کو یہاں بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔ اس کی آخری دردناک آوازیں ابھی تک میرے کانوں میں زہر گھولتی تھیں۔ دائیں جانب ایک چھوٹا سا احاطہ اور بھی تھا۔ اسے بھی آہنی جنگلے اور خاردار تاروں سے محفوظ کیا گیا تھا۔ یہ جگہ بھی خاص لوگوں کے بیٹھنے کے لئے تھی۔ یہاں شامیانے وغیرہ تنے ہوئے تھے۔

"بڑے خونی مقابلے" سے پہلے یہاں تین چار چھوٹے مقابلے بھی ہونے تھے۔ ان سامبر مقابلوں میں حصہ لینے والے افراد ایک چھوٹے سے احاطے میں موجود تھے اور خود کو وارم اَپ کر رہے تھے۔ شاہی مہمانوں کی گیلری کے ساتھ ہی میں ایک پختہ کمرے میں موجود تھا۔ میرے اردگرد گارڈز کا سخت پہرا تھا۔ سخت سردی کے باوجود میرے جسم پر فقط ایک کاٹرائے پتلون تھی۔ بے شمار لوگ میری جھلک دیکھنے کے خواہش مند تھے تاہم سخت سیکیورٹی کے سبب وہ نزدیک نہیں آ سکتے تھے۔ جارج کہاں تھا، مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ عمران میرے ساتھ ہی تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ میڈم صفورا کا پاکستانی گارڈ (عمران)

ٹریننگ میں میری معاونت کرتا رہا ہے۔لہٰذا میرے ساتھ اس کی موجودگی پر کسی کو تعجب نہیں تھا۔عمران کی موجودگی مجھے بے پناہ حوصلہ دے رہی تھی۔اس کے علاوہ بھی مجھے دو تین تجربہ کار معاون فراہم کئے گئے تھے۔ان میں سے ایک درمیانی عمر کا پارسی تھا۔اس نے اکھاڑے کے اندر لڑائی کے دوران میں میری دیکھ بھال کرنا تھی۔

اب تک ہم نے جارج گورا کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق لڑائی میں جارج کا اہم ترین ہتھیار اس کی ''بدزبانی'' تھی۔وہ اپنے حریف کو تاؤ دلاتا تھا اور غلطی کرنے پر مجبور کرتا تھا۔جوڈو کی ایک تکنیک ''نیک لاک'' اس کا پسندیدہ ترین داؤ تھا۔اپنے بیشتر حریفوں کو اس نے اسی طرح پچھاڑا تھا کہ ان کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی تھی اور انہیں بے بس کر دیا تھا۔ایسی صورت میں جارج کے حریف کے پاس دو ہی راستے ہوتے تھے کہ وہ اپنی گردن تڑوا لے یا پھر ہار مان لے۔

عمران نے مجھ سے کہا تھا۔''جگر! جس طرح اپنے حریف کے خطرناک ہتھیار کا پتا ہونا چاہئے، اسی طرح اپنے بہترین ہتھیار کا بھی علم ہونا چاہئے۔تمہیں پتا ہے تمہارا بہترین ہتھیار کیا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔''تمہاری برداشت، تمہاری درد سہنے کی گنجائش۔تم نے مہینوں تک اپنی جان کو جس طرح رولا ہے، اس نے تمہارے اندر درد سہنے کی زبردست صلاحیت پیدا کر دی ہے۔تمہاری یہ صلاحیت تمہارے مدِمقابل کو کسی بھی وقت دھوکا دے سکتی ہے۔وہ جس وقت تمہیں تکلیف کے شکنجے میں سمجھ رہا ہوگا اور یہ سمجھ رہا ہوگا کہ تم مزید وار نہیں کر سکتے، تم وار کرنے کی پوزیشن میں ہوگے، اگر تم کسی ایسے موقع سے فائدہ اُٹھا سکو تو...... تمہارے لئے بہت اچھا رہے گا۔''

بات کرتے کرتے اس نے تیزی سے مکا چلایا۔میں نے بے ساختہ ایک طرف جھک کر اس کا وار بچایا اور جوابی مکا مارا۔یہ مکا عمران نے اپنی ہتھیلی پر روکا۔''ہاں، میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔'' وہ بولا۔''تمہارے دائیں کِکے کی طاقت سے مجھے بڑی امیدیں ہیں، چند روز پہلے تم نے فصیل پر جس طرح پہرے دار کی کھوپڑی توڑی تھی...... ایسے ہی ایک بدبودار ناریل ادھر بھی توڑ ڈالو تو مزہ آ جائے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی چھوٹے مقابلے شروع ہو چکے تھے۔ایک مقابلہ زرہ بکتر جیسا لباس پہن کر کیا گیا اور اس میں چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں استعمال ہوئیں۔ایک

شخص کے زوردار وار سے اس کے حریف کا آہنی خود پچک گیا۔منصف نے مقابلہ وہیں روک دیا اور زوردار وار کرنے والے کو فاتح قرار دیا۔

دوسرا مقابلہ خاصا یک طرفہ تھا۔صرف تین چار منٹ میں ختم ہوگیا۔جیتنے والے نے سر کی ایک زوردار ٹکر سے اپنے کمزور مدِمقابل کو لمبا لٹا دیا۔وہ نیم بے ہوش ہوگیا تھا۔اسے اُٹھا کر باہر لے جانا پڑا۔اس کے فوراً بعد تیسرے مقابلے کی شروعات ہوگئی۔

آخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کا انتظار بے پناہ شدت سے کیا جا رہا تھا۔جس کے لئے لوگوں کا چین سکون حرام ہوا تھا۔وہ مقابلہ جس پر بیش بہا شرطیں لگ چکی تھیں اور جس کے نتیجے کے بارے میں ہزارہا قیاس آرائیاں فضاؤں میں تیر رہی تھیں۔رنجیت پانڈے جیسے ''جن'' کو چند منٹ میں پسپا کر دینے والا شخص...... شکتی دیوتا کے مدِمقابل تھا۔

عمران جیسا ''لکی'' شخص میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔وہ بدترین رسک لیتا تھا اور کامیاب ہوتا تھا۔خطرات اس سے آنکھیں چرا کر گزرتے تھے...... اور ''بازیاں'' اس کے حق میں پلٹنے کو تیار رہتی تھیں۔اکھاڑے میں داخل ہوتے وقت ایک بار پھر میرے ذہن میں آیا...... کہیں عمران کے ہوتے ہوئے میں جارج کے مقابل جانے میں غلطی تو نہیں کر رہا لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو رد کر دیا۔عمران کی ساری آشیرباد میرے ساتھ تھی۔وہ اپنی بہترین تمناؤں کے ساتھ مجھے اکھاڑے میں داخل کر رہا تھا۔میں اس سے بغل گیر ہوا۔میں نے اس کا شانہ چوما، اس نے میرا اور پھر میں اکھاڑے میں آ گیا۔

ہوا یخ تھی۔میں اور جارج گورا آمنے سامنے تھے۔اس نے پتلون اور بغیر آستین کی بنیاد پہن رکھی تھی۔اس کا فولادی جسم ڈھلتے سورج کی کرنوں میں دمک رہا تھا۔میں پاؤں سے ننگا تھا جبکہ جارج نے جوگرز پہن رکھے تھے۔ہماری بائیں جانب لوہے کی ایک مستطیل میز تھی۔اس پر تین تیز دھار آلے رکھے تھے۔چھوٹے دستے کی دو کلہاڑیاں، دو رام پوری چاقو اور دو چھوٹی تلواریں یعنی کٹاریاں۔ہم ان میں سے کوئی سے بھی ایک جیسے دو ہتھیار چن سکتے تھے۔

دو فربہ اندام شخص میدان میں آئے۔ان میں سے ایک نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس میں چند کاغذ تھے۔لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج بھی عقب میں موجود تھا۔

''ان کاغذوں پر تمہارے دستخط ہوں گے۔'' عینک والے نے فائل میرے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

میں نے سرسری نظر ڈالی۔ اردو میں وہی تحریر لکھی گئی تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ یعنی یہ سارا مقابلہ میری مرضی و رضامندی سے ہو رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لڑائی ہم دونوں حریفوں میں سے کسی ایک کی موت تک جاری رہے گی...... میری موت کی صورت میں میرے وارثوں کو کسی طرح کا کوئی دعویٰ نہیں ہوگا...... اور یہ کہ میں اپنی تحریری یا زبانی وصیت کر چکا ہوں اور مجھے اس حوالے سے مزید کچھ نہیں کہنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بلاتردد ان کاغذوں پر دستخط کر دیئے۔ جارج گورا نے فقرہ کسا۔ ''اس پر یہ نوٹ بھی لکھ دو کہ میرے بعد میری بیوی کو اجازت ہے کہ وہ شادی کے بغیر جارج کے ساتھ رہ سکے۔''

میرے بدن میں انگارے دہک گئے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ تو شروعات ہے۔ مجھے آخر تک اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنا ہے۔

میرے بعد جارج گورا نے کاغذات پر دستخط کئے۔ اب بے پناہ شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ لوگوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ یہ امر میری حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ اس ٹھاٹھیں مارتے ہجوم میں میرے حمایتی بھی کم نہیں ہیں۔ جارج نے اپنی زہریلی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اب ان ہتھیاروں کی طرف آؤ اور دیکھو کہ تم کس ہتھیار سے مرنا پسند کرو گے۔''

سرجن اسٹیل نے مجھے بتا رکھا تھا کہ جارج مجھے ہتھیار چننے کی پیشکش کرے گا۔ یہ ایک طرح سے زبردست نفسیاتی حربہ بھی تھا۔ غالباً اس طرح وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ لڑائی کے ہر طریقے پر عبور رکھتا ہے۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے رام پوری چاقو اُٹھا لیا۔ یہ مضبوط دستے کا وزنی چاقو تھا۔ اس کی دھار اور لوہا دونوں شاندار تھے۔ درمیان میں خم سا تھا۔

''گڈ چوائس۔'' جارج نے کہا۔ پھر انگلش میں ہی بولا۔ ''لگتا ہے، یہ لڑائی زیادہ دیر نہیں چلے گی۔'' اس کے بعد اس نے بھی چاقو اُٹھا لیا۔

ایک ہٹا کٹا معاون آگے بڑھا اور آہنی میز اوزاروں سمیت اُٹھا کر میدان سے باہر لے گیا۔ منصف کے فرائض انجام دینے والے سفید فام شخص نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر ہم دونوں کا لباس چیک کیا اور آخری ہدایات دینے کے بعد ہمارے درمیان سے ہٹ گیا۔ یہ آخری رکاوٹ بھی دور ہوگئی۔ اب میں اور جارج گورا آمنے سامنے تھے۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ہزاروں تماشائیوں کے ساتھ ساتھ جیسے نیلگوں آسمان بھی تماشائی تھا۔ یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لئے ہوا بھی ساکن ہوگئی ہے اور ڈھلتا ہوا سورج بھی اپنی حرکت بھول کر اس منظر میں

کھو گیا ہے۔

ہم ایک دوسرے پر گہری نظر رکھے نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرتے رہے۔ جارج نے زہرافشانی کی۔ ''تمہارا باپ ضرور ہوں لیکن اس وقت مجھے اپنی والدہ کا شوہر نہ سمجھو...... بس حریف سمجھو، حملہ کرو۔''

ایک بار پھر تن بدن میں آگ بھڑکی لیکن میں نے خود کو ٹھنڈا رکھا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے ایک مناسب موقع نظر آیا۔ جارج گورے کا ایک پاؤں ہوا میں تھا۔ دوسرے پر ابھی پورا وزن نہیں پڑا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وار کیا۔ جارج نے خود کو بچانے کی بڑی کوشش کی۔ میرا چاقو اس کے پیٹ میں لگا۔ چاقو کی نوک نے اس کے جسم پر ایک سرخ لکیر سی کھینچ دی لیکن یہ معمولی نقصان تھا۔ لکیر گہری نہیں تھی۔ اس حملے کے جواب میں جارج گورا مغلظات بکتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے چاقو کے کم از کم چھ وار کئے۔ ان میں سے ایک وار نے میرے کندھے پر کھرونچ ڈالی۔ باقی وار میں نے کامیابی سے بچائے۔ اسی دوران میں میرا داؤ چل گیا۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے ایک بھرپور لات گورا کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ مجھے اُٹھنے کا موقع ملا اور میں پھر بازو کھول کر اس کے سامنے آ گیا۔

میرے دوبارہ کھڑے ہو جانے پر میرے خیرخواہوں نے شور بلند کیا اور جوش کے عالم میں پگڑیاں ہوا میں لہرائیں۔ جارج آگے کو جھکا ہوا تھا۔ ماہر چاقو زنوں کے انداز میں وہ چاقو کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر رہا تھا۔ اچانک وہ ہوا جس کی توقع گورا کو ہرگز ہرگز نہیں تھی۔ شاید مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں یہ وار اتنی کامیابی سے کر سکوں گا۔ اس وار کے لئے بے حد پھرتی اور ٹائمنگ درکار تھی جو میرے اندر کی آگ نے مجھے فراہم کی۔ میں نے اپنی ٹانگ چلائی۔ جارج گورا کا چاقو اس وقت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جا رہا تھا۔ وہ کسی ہاتھ میں بھی نہیں تھا۔ میرے پاؤں کی ضرب نے اسے ہوا میں اچھالا اور وہ اُڑتا ہوا سا اکھاڑے کے آخری کنارے تک چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ جارج سنبھلتا، میں نے زوردار حملہ کیا۔ رام پوری چاقو کی نوک گورا کے عین دل کے مقام پر لگتی مگر اس نے بروقت پینترا بدلا اور چاقو اس کے بازو میں پیوست ہوا۔ میں نے چاقو کھینچ کر دوسرا وار کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی گورا نے اس میدان نما اکھاڑے کے کنارے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ اپنے چاقو تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ نصف راستے میں تھا کہ میں نے جست لگا کر اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ تاہم اس کوشش میں چاقو میرے ہاتھ سے بھی نکل گیا۔

ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ لڑھکنیاں کھاتے ہوئے ہم پھر میدان کے وسط میں پہنچ گئے۔ دونوں چاقو ہماری پہنچ سے دور رہ گئے۔ میں جارج گورا کے منحوس بوجھ تلے دب گیا۔ جارج نے پھر زہر افشانی کی۔ ''اپنی پتنی سے بس تھوڑا ہی زیادہ زور ہے تمہارے اندر۔''

میں نے اس کا جواب ایک بھرپور مکے سے دیا۔ یہ مکا جارج کے چوڑے تھوبڑے پر لگا۔ چندلمحوں کے لئے وہ تیورا گیا۔ میں اس کے اوپر آ گیا اور یہیں پر مجھ سے وہ غلطی ہوئی جو نہیں ہونی چاہئے تھی...... اور جس کے حوالے سے میں الرٹ بھی تھا۔ پتا نہیں یہ کیسے ہوا؟ اچانک میں نے اپنی گردن کو ایک آہنی شکنجے میں محسوس کیا۔ میں نے تڑپ کر نکلنا چاہا مگر دیر ہو چکی تھی۔ جارج مجھے اپنے بدنامِ زمانہ داؤ میں لے چکا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ میں اب یہاں سے زندہ نہیں نکلوں گا۔ میں نے دوبارہ بھرپور کوشش کی مگر گردن پر اس کے فولادی بازو کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ کوشش ناکام ہوئی۔ بے پناہ شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یقیناً یہ جارج گورا اور حکم کے حمایتی ہی تھے۔ میری نگاہ شاہی بالکونی میں گئی۔ وہاں بھی تماشائی جوش کے عالم میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں جارج کی بہن ماریا اور بہنوئی سرجن اسٹیل پیش پیش تھے۔ ان کے سرخ چہرے تمتما رہے تھے۔

اگلے قریباً بیس منٹ کا وقت میری زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ میں موت و حیات کے درمیان لٹک گیا تھا...... میں گردن چھڑانے کے لئے بس ایک خاص حد تک زور لگاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھتا تھا تو لگتا تھا کہ گردن ٹوٹ جائے گی اور ذہن تاریکیوں میں ڈوب جائے گا۔ میں نے ایک ہاتھ کی مٹھی میں جارج گورا کے سر کے بال جکڑ رکھے تھے اور دوسرا ہاتھ اس کے آہنی شکنجے میں اس طرح گھسا دیا تھا کہ وہ میری گردن پر ایک حد سے زیادہ دباؤ نہ ڈال سکے۔ یہ ایک طرح کا ڈیڈ لاک بن گیا تھا۔ جارج اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ زور لگا کر میری گردن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکے۔ دوسری طرف میں بھی اس کے بازو کا شکنجہ کھولنے میں ناکام تھا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ اگر میں اندھا زور لگا کر گردن چھڑانے کی کوشش کرتا تو جارج کو اپنے بازو کے لئے اضافی توانائی مل جاتی اور وہ اس خونی ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے میں کامیاب ہو جاتا...... یا پھر مجھے بے ہوش ہی کر دیتا۔

وہ ناقابلِ فراموش گھڑیاں تھیں۔ میری سانس رک رہی تھی، آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا رہی تھی۔ لگتا تھا پھیپھڑے پھٹ جائیں گے...... یہ درد سہنے کی خو ہی تھی جو مجھے ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑا رکھے ہوئے تھی اور یہ جاں گسل اذیتوں سے میرا ناتا ہی تھا جو مجھے مزاحمت کا حوصلہ دے رہا تھا۔ وہ مجھے میدان میں اِدھر اُدھر گھما رہا تھا اور جنونی لہجے میں بک

رہا تھا۔ ''تمہاری پتنی کا جسم بڑا کومل ہے۔ کیا ایسے جسم والی تمہاری کوئی اور قریبی رشتے دار بھی ہے؟''

اسی قسم کے زہریلے فقرے تھے جو وہ بار بار میرے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔

میں اسے دھکیلتا ہوا کئی قدم پیچھے لے جاتا تھا پھر آگے لاتا تھا، پھر اپنے دائیں ہاتھ کو اس کے بالوں سے ہٹا کر اس کی جانگ تک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ بڑا عیار تھا۔ اس نے معقول انتظام کر رکھا تھا کہ میں اپنا ہاتھ اس کی ناف تک نہ پہنچا سکوں۔ جونہی میں اپنا ہاتھ نیچے لاتا، وہ اپنا آزاد ہاتھ میری بغل میں حائل کر دیتا اور یوں میری حرکت کر جاتی۔

میرے حمایتیوں کو چپ لگ چکی تھی۔ کان پھاڑ دینے والا شور جارج کے پرستاروں کا تھا۔ میری سانس ٹوٹنے لگی۔ جارج کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ مجھے یہ آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ ''...... تم حاملہ بکری ہو۔ تمہاری گردن نر شیر کے پنجوں میں ہے۔ اگر تم اپنی گردن نکال لو تو میں ابھی سب لوگوں کے سامنے اپنے ہاتھ سے اپنی شہ رگ کاٹ لوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں کاٹ لوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے کسی قصاب کی طرح نیچے کو زور لگایا۔ میری پیشانی زمین سے جا لگی۔ وہ حیوانی قوت سے میرا چہرہ زمین سے رگڑنے لگا۔ میرا باقی جسم آزاد تھا لیکن وہ عضوِ معطل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ سلطانہ کا چہرہ میرے ڈوبتے ذہن میں چمکا...... اس کے بعد باروندا جیکی کی شبیہہ نمودار ہوئی...... پھر اسحاق کی زندگی کے آخری دردناک مناظر نگاہوں میں گھومے۔ میں نے اپنے جسم کی رہی سہی قوت جمع کی، ایک حتمی اور آخری کوشش کی۔ بے پناہ زور لگایا اور اپنا بایاں ہاتھ جارج کے مڑے ہوئے بازو میں گھسا کر اس کی بندش توڑنا چاہی۔ میری جنونی مزاحمت نے چندلمحوں کے لئے جارج کو ہلا دیا۔ یوں لگا کہ اس مرتبہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میرے حمایتیوں میں جان پیدا ہوئی...... مگر پھر اچانک ہی جارج نے ایک چنگھاڑ بلند کی اور اپنی اس وحشیانہ طاقت کا مظاہرہ کیا جس کے لئے وہ مشہور تھا۔ میں نیچے جھکتا چلا گیا اور میرا چہرہ ایک بار پھر بے بسی کی مٹی میں لتھڑ گیا۔ میرے پھیپھڑوں میں آکسیجن کا دخل اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سُن ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ اگلے دو تین منٹ میں، مَیں ختم ہونے والا ہوں۔ تو یہ تھا انجام...... اس خونی مقابلے کا؟

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور زندگی کی ڈور کو تھامنے کی کمزور کوشش کرنے لگا۔

دفعتاً مجھے لگا کہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی رُونما ہوئی ہے۔ کچھ ایسا ہو رہا تھا جو انہونا

تھا۔ ہماری لڑائی میں کسی کو بھی مداخلت نہیں کرنا تھی لیکن کوئی کر رہا تھا۔ کوئی جارج کو میری جان لینے سے روک رہا تھا۔ کون تھا؟ کون ہوسکتا تھا؟ میں اوپر دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میری دھندلائی نگاہوں کو صرف پاؤں نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج تھا۔ ''چھوڑ دیجئے سرکار...... چھوڑ دیجئے اسے...... سے ختم ہوگیا ہے......''

پنڈت مہاراج کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے اُبھر کر میرے کانوں تک پہنچی۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ پنڈت مہاراج اور اس کے دو تین چیلے مجھے جارج کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ''وقت'' کا ذکر کر رہے تھے اور جارج کو بتا رہے تھے کہ مقابلے کے قاعدے کے مطابق ''وقت'' ختم ہوگیا ہے۔ سورج ڈوب گیا ہے۔

جارج نہیں سن رہا تھا۔ وہ ایک آخری جھٹکا دے کر ڈراپ سین کرنا چاہتا تھا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ میری مزاحمت کم ہوتے ہوتے ختم ہو رہی ہے۔

اچانک میری نگاہ کچھ دور عمران پر پڑی۔ وہ جست لگاتا ہوا میدان میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ برق رفتاری سے ہماری طرف آیا اور ان تین چار افراد میں شامل ہوگیا جو مجھے جارج گورا کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عمران کی آمد نے یکا یک صورتِ حال بدل دی۔ اس کی ''پکڑ'' معمولی نہیں تھی۔ جارج کے فولادی بازو پر عمران کی پکڑ قائم ہوتے ہی مجھے اپنے سانس کی آمدورفت بحال ہوتی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد میں اچانک جیسے موت سے زندگی کی طرف آیا۔ میری گردن جارج کے شکنجے سے نکل گئی۔ میں نے دیکھا، جارج غضب ناک انداز میں عمران پر جھپٹ رہا تھا۔ وہ چلا رہا تھ۔ ''یو باسٹرڈ...... یو باسٹرڈ منکی۔''

اس نے عمران پر کئی مکے چلائے جنہیں عمران نے کمال صفائی سے بچایا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دفاعی انداز میں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ یکا یک بہت سے گارڈز جارج اور عمران کے درمیان کود پڑے۔ کچھ گارڈز نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ میرے لئے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ گارڈز مجھے سہارا دیتے ہوئے اس خونی میدان سے باہر لے آئے۔

O......❖......O

اور یہ رات کا وقت تھا۔ میں راج بھون کے اندر ہی ایک مہمان خانے میں تھا۔ عمران اور میرے تین چار معاون بھی میرے ساتھ تھے۔ ان میں پارسی معاون بھی تھا۔ وہ ایک اچھے کمپاؤنڈر کے فرائض بھی انجام دے سکتا تھا۔ وہ میرے زخموں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ میری گردن کا پرانا زخم مسلسل خون اگل رہا تھا۔ اس کے علاوہ پسلیوں پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ کسی وقت مجھے سانس لینا بھی دشوار محسوس ہونے لگا تھا۔ اگر میں زندہ تھا تو اس میں میری

خوش قسمتی کو بھی دخل تھا۔ جیسا کہ چند دن پہلے ہی مجھے بتا دیا گیا تھا کہ شبھ گھڑی کے مطابق یہ مقابلہ سورج غروب ہونے سے قریباً ایک گھنٹا پہلے شروع ہوگا اور غروب آفتاب تک جاری رہے گا۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ یہ مقابلہ اتنی دیر چلے گا۔ ایسی خونی لڑائیاں عموماً بیس پچیس منٹ کے اندر ہی اختتام پذیر ہو جاتی تھیں اور بعض اوقات تو پہلے دو تین منٹ کے اندر ہی فیصلہ ہو جاتا تھا مگر اس لڑائی نے غیر متوقع طول پکڑا تھا۔ یہاں تک کہ پنڈتوں کی رائے کے مطابق سورج غروب ہوگیا تھا۔ اب بھی اگر مقابلہ جاری رہتا تو یہ سراسر ''پاپ'' ہوتا...... لہٰذا اسے روک دیا گیا۔ اب کل سورج نکلنے کے بعد یہ مقابلہ پھر شروع ہونا تھا...... اور پہلے پہر کی تیسری گھڑی تک جاری رہنا تھا۔

آج کی لڑائی ایک نہایت مایوس کن موڑ پر ختم ہوئی تھی۔ عمران خاموش تھا۔ میرے معاونین کے چہرے بھی اُترے ہوئے تھے۔ پارسی گول نے کہا۔ ''تابش صاحب! آپ کی قسمت نے آپ کا ساتھ دیا ہے۔ ورنہ جارج صاحب کے اس داؤ میں آ کر کوئی نکلتا ناہیں۔ کل پھر وہ شروع میں ہی آپ کو اس داؤ میں پکڑنے کی کوشش کریں گے...... اور آپ گھائل بھی ہیں۔''

''کیا تم صرف نراشا کی باتیں کرنے کے لئے یہاں بیٹھے ہو؟'' دوسرے معاون نور محمد نے تڑخ کر کہا۔

''میں وہ کہہ رہا ہوں جو نظر آوت ہے۔ تم ان کی گردن کا زخم ناہیں دیکھ رہے ہو۔ یہ کھل گیا ہے۔ میں نے بڑے جتن سے پٹیاں باندھ کر خون روکا ہے اور یہ پسلیوں والی چوٹ بھی معمولی ناہیں ہے۔''

''لیکن کچھ بھی ہے، تمہیں حوصلہ بڑھانے والی بات کرنی چاہئے...... اگر ہم......'' ایک دم معاون نور محمد کو خاموش ہونا پڑا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

عمران نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دو گارڈز کے پیچھے آٹھ دس افراد اندر آ گئے۔ ''نمستے نمستے'' کی کئی آوازیں گونجیں۔ اندر آنے والے اپنے حلیئے سے نچلی ذات کے ہندو لگتے تھے۔ ان کے لباس بھی معمولی تھے۔ پگڑیاں سر سے چپکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر مسکین لہجے میں کہا۔ ''سرکار! ہم آپ سے بات کرنا چاہت تھے۔ بڑی مشکل سے اجاجت ملی ہے جی۔ کئی جگہ تلاشیاں دے کر یہاں تلک آئے ہیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے جی کہ اس سامبر مقابلے میں ہم جیسے بہت سے لوگن کی ہمدریاں

آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ کی جیت چاہت تھے اور...... اب بھی چاہت ہیں لیکن سرکار......مم......میرا مطلب ہے کہ......سرکار......'' وہ بُری طرح ہکلا گیا۔

عمران بولا۔''جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے لجاجت سے کہا۔''سرکار! آپ ہماری بات کا برا نہیں مانیے گا لیکن یہ بات بالکل درست ہے کہ آپ کی دھرم پتنی سلطانہ بی بی سے ایک اپرادھ ہوا ہے۔ ان سے ایک برہمن موہن کمار جی کی ہتھیا ہوئی ہے۔ پتی ہونے کے کارن اس کا کچھ نہ کچھ بوجھ تو آپ پر بھی پڑتا ہے۔ ہم نے اپنے طور پر آپ کے اور آپ کی پتنی جی کے زائچے بنوائے ہیں اور فالیں بھی نکلوائی ہیں۔ آنے والے سمے کا ٹھیک ٹھیک پتا تو بھگوان کو ہی ہے لیکن جو رنجر یہی آوت ہے کہ...... آپ...... یہ لڑائی جیت ناہیں سکیں گے۔ ہم آپ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ ہم ہاتھ جوڑ کر آپ سے بنتی کرت ہیں کہ آپ اس لڑائی سے پیچھے ہٹ جاویں۔''

اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی گدلی آنکھوں میں واقعی سچی خیرخواہی نظر آتی تھی۔ میں نے اپنی گردن کی ٹیسوں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔''اگر میں پیچھے ہٹ جاؤں تو کیا ہوگا؟ یہ برہمن زادے مجھے چھوڑ دیں گے...... اور وہ سفید شیطان میری جان بخشی کر دے گا؟''

''میں نے پنڈت مہاراج سے بھی بات کی تھی جی...... وہ کہوت ہیں کہ ایشور کی طرف سے آپ کو ایک موقع تو ملا ہے۔ یہ لڑائی سورج ڈوبنے کے کارن رک گئی ہے۔ اگر آپ لڑائی سے پیچھے ہٹ جائیں اور کچھ شرطیں مان لیں تو ہوسکت ہے کہ آپ کی موت کی سجا کسی اور سجا میں بدل جاوے۔''

عمران بولا۔''اور ان شرطوں میں سب سے پہلی شرط یہی ہوگی کہ تابش اپنی بیوی کا پتا بتائے اور اسے ان بے رحم قاتلوں کے حوالے کرے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''اس بات کا تو ٹھیک سے پتا ناہیں جی۔ پر شاستروں سے نکالی گئی فالیں جھوٹ نہیں بتا سکتیں۔ جی ساری فالوں کا یہی کہنا ہے کہ یہ لڑائی......'' اس نے ڈرے ڈرے انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تم نے کچھ اور کہنا ہے یا بس؟'' میں نے پوچھا۔

''بس سرکار! یہ ہم سب کے من کی آواز تھی جو ہم آپ تلک پہنچانا جروری سمجھتے تھے۔ آخری فیصلہ تو آپ نے کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تمہاری ہمدردی اور تمہارے مشورے کا شکریہ۔'' میں نے کہا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لوگ اب چلے جائیں۔ مجھے اور عمران کو حیرانی ہوئی جب باہر جانے سے پہلے ان سب مسکین صورت لوگوں نے باری باری میرے پاؤں چھوئے۔

ان کے جانے کے بعد عمران نے ایک گہری سانس لی اور دھیمی آواز میں بولا۔''تو ہم پرستی کے اس بت کو تو ہم نے توڑنا ہے۔ اب ہمارا جیتنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے...... اور ہم جیتیں گے۔'' اس کی آواز میں وہی ولولہ تھا جو اسے کسی بھی دوسرے شخص سے ممتاز کرتا تھا۔

وہ درد اور تناؤ کی رات تھی۔ ہم آتش دان کے پاس بیٹھے تھے۔ عمران ہر پل میرے ساتھ تھا۔ کبھی میری مرہم پٹی کرتا ہوا، کبھی میرے بازو دباتا ہوا اور مجھے حوصلہ دیتا ہوا۔ کبھی مجھے تکنیکی مشوروں سے نوازتا ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اپنے زخموں کی وجہ سے میں کچھ کمزور پڑ رہا ہوں۔ ایسی صورت میں جارج مجھے اچانک غیر متوازن کر کے اپنے سر سے اوپر اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ مجھے سامبر مقابلے کے اس ''ناک آؤٹ داؤ'' سے ہوشیار رہنے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ آخر میں اس نے اپنا وہ پسندیدہ فقرہ بھی میرے سامنے دہرایا۔ میرے گلے میں اپنی باہیں ڈال کر اور دلکش انداز میں مسکرا کر بولا۔''تابی جگر! جب ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور جب مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا......''

اگلے روز سورج نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد میں اور جارج پھر آمنے سامنے تھے۔ مجھے پتا چلا تھا کہ بہت سے تماشائی سرد موسم کے باوجود ساری رات اس اسٹیڈیم نما جگہ پر موجود رہے ہیں۔ جو گھروں کو چلے گئے تھے، وہ بھی صبح سویرے اپنی جگہوں پر لوٹ آئے تھے۔ سخت سردی میں ہلکی ہلکی دھند پھیلی تھی۔ جوں جوں سورج اوپر آرہا تھا، یہ دھند اوجھل ہو رہی تھی۔ سنہری دھوپ درختوں پر سے اوس چن رہی تھی اور قرب و جوار کی ہر شے کو نکھارتی جا رہی تھی۔ شاہی بالکونی کل کی طرح پھر کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ نقارے بج رہے تھے اور نعروں کے شور سے زمین دہل رہی تھی۔

ہمارے لباس کل والے ہی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ گرانڈیل جارج کے کندھے پر ایک سفید پٹی نظر آرہی تھی۔ دوسری طرف میری گردن اور پسلیوں پر بھی پٹیاں موجود تھیں۔ کل والے رام پوری چاقو پھر سے ہمارے حوالے کر دیئے گئے۔ ہم وسیع اکھاڑے کے بیچوں بیچ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ آج جارج کل سے زیادہ بااعتماد نظر آتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بجلی سی کوندرہی تھی۔ وہ مجھ سے انگلش میں بات کرتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اشتعال انگیزی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔''یہ خیرات کی زندگی تمہیں پنڈتوں کی طرف سے ملی ہے۔ تم لوگ ہوتے ہی بے غیرت ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم رات کو ہی اپنے

گلے پر چھری پھیر لیتے لیکن کوئی بات نہیں۔ آج ''ہم'' یہ کام کریں گے اور زیادہ اچھے طریقے سے کریں گے۔''

میں کل کی طرح آج بھی یکسر خاموش رہا۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کو نظروں میں تولتے رہے پھر جارج نے ہی حملے کا آغاز کیا۔ اس نے اپنے چاقو سے میری گردن کو نشانہ بنانا چاہا۔ چاقو کی دھار میری گردن کی پٹی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کا دوسرا وار میں نے جھک کر بچایا۔ اس نے پھرتی سے گھٹنا چلایا۔ ضرب میری ٹھوڑی پر لگی۔ میں اچھل کر دور جا گرا۔ وہ مجھ پر جھپٹا۔ مجھے اس کے چاقو سے زیادہ اس کے خطرناک داؤ کا اندیشہ تھا۔ میں اپنی گردن بچانے کے لئے بائیں طرف جھکا اور اپنے دائیں بازو کو اس کے چاقو سے نہ بچا سکا۔ ایک انگارہ سا گوشت میں اُتر گیا۔ کندھا زخمی ہوا اور خون نکلنے لگا۔ میں کئی پلٹیاں کھا کر جارج کی زد سے نکلا۔ جارج کے ساتھیوں نے جارج کے کارگروار پر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ مقابلے کے شروع میں ہی یہ زخم لگ جانے سے جارج کا پلڑا اور بھاری ہو گیا۔ لگتا تھا کہ اسے فتح یقینی نظر آنے لگی ہے۔

مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میری شکست کی صورت میں کیا ہوگا۔ غالب امکان یہی تھا کہ جارج مجھے اکھاڑے میں مارنا نہیں چاہے گا بلکہ سُولی چڑھانے کے لئے زندہ رکھے گا۔

ایک دم میں چونکا۔ میں اپنی شکست کے بارے میں سوچ رہا تھا اور عمران نے یہی کہا تھا کہ شکست کے بارے میں نہیں سوچنا۔ کچھ اسی سے ملتی جلتی بات بارونداجیکی بھی کہہ گیا تھا۔ وہ کہتا تھا...... تکلیف اور توہین (شکست) کا ڈر ہی فائٹر کو کمزور کرتا ہے۔

یکا یک میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ جارج نے آج میرے ساتھ وہی کیا تھا جو کل میں نے مقابلے کے شروع میں اس کے ساتھ کیا تھا، ایک طرح سے اس نے میرے کل والے جادوئی وار کا جواب دیا تھا۔ میں زخمی کندھے کے سبب اپنے چاقو کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کر رہا تھا جب اس نے زبردست ٹائمنگ کے ساتھ ٹانگ چلائی اور چاقو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ ہوا میں اُڑ کر اوپر لکڑی کے سائبان میں پیوست ہو گیا۔ اب وہ میری پہنچ سے دور تھا اور میں خود کو نہتا دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر جارج کے حمایتیوں نے شورِ قیامت بلند کیا۔ ان میں سے بہت سے اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ جارج نے اپنے چاقو کو اس طرح پکڑا کہ اس کا رخ نیچے کو ہو گیا۔ اب جارج کا انگوٹھا چاقو کے دستے کے آخری سرے پر تھا۔ اس نے مجھے جھکائی دے کر پہلے بائیں طرف ہٹایا پھر اچانک تڑپ کر وار کیا۔ میری خوش قسمتی کہ اس کی چاقو والی کلائی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اپنے زخمی جسم کی

رہی سہی طاقت جمع کر کے اس کی کلائی مروڑی۔ میں چاقو اس کے ہاتھ سے چھڑانا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ گورے کا دوسرا ہاتھ آزاد ہے اور میری یہ چاقو چھڑانے والی دیوانہ وار کوشش میری گردن کو پھر سے گورے کے شکنجے میں لا سکتی ہے مگر اب رسک لینے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور چاقو چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ چاقو گرا تو میں نے اسے پاؤں کی ٹھوکر سے اکھاڑے کے آخری کنارے تک پہنچا دیا لیکن پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ میرے ذہن میں موجود تھا اور غالباً بہت سے تماشائی بھی جانتے تھے۔ جارج گورا گھوم کر میرے پیچھے آیا اور میری زخمی گردن ایک بار پھر اس کے منحوس شکنجے میں پھنس گئی۔ اس مرتبہ تماشائیوں کا شور فلک شگاف تھا۔ شکتی دیوتا والے کتبے ہوا میں لہرانے لگے اور سیکڑوں بینرز محوِ رقص ہو گئے۔

جارج پھنکارا۔ ''باسٹرڈ! میں نے کہا تھا نا، حاملہ بکری اور نر شیر کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔''

اگلے آٹھ دس منٹ پھر اسی اذیت ناک صورتِ حال میں گزرے جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں اور اگر کروں گا تو یہ خونی روداد طوالت کا شکار ہوگی۔ یہ بارونداجیکی کا انوکھا فلسفہ بھی تھا جو مجھے ان جاں گسل لمحوں میں درد سہنے کا حوصلہ دے رہا تھا...... میری سانس اکھڑتی جا رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری زخمی پسلی ٹوٹ چکی ہے۔ میری گردن اور کندھے سے خون کا اخراج بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ اخراج میری ناتوانیوں کو تیزی سے بڑھا رہا تھا۔ میں مسمار ہو رہا تھا...... مٹ رہا تھا۔ بعینہٖ کل والی صورتِ حال تھی۔ جارج کا لاک مکمل تھا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے لاک میں پھنسایا ہوا تھا تا کہ اپنی گردن پر اس کے بازو کا دباؤ کم رکھ سکوں۔ دوسرے ہاتھ سے میں اسے کوئی جسمانی تکلیف پہنچانے کی جوابی کوشش کرتا تھا تو وہ میرے آگے بڑھائے ہوئے ہاتھ کو ''بلاک'' کر دیتا تھا۔ میں نہتا تھا۔ میرا چاقو کہیں اوپر سائبان میں اٹک چکا تھا اور جارج والا چاقو میں خود پاؤں کی ٹھوکر سے اکھاڑے سے باہر پھینک چکا تھا۔

تو کیا سب کچھ ختم ہو گیا؟ میں نے خود سے پوچھا۔

کیا بارونداجیکی کی حسرت ناک موت کا بدلہ نہ لیا جا سکا؟ مرتے وقت اس نے جو آگ میرے ارادوں کو سونپی تھی، وہ رائیگاں گئی؟

کیا اپنے گھر کے بند دروازے کے پیچھے سلطانہ کے بانکپن اور آبرو کی دھجیاں اُڑانے والا جانور ایک بار پھر اپنی غلیظ زندگی کو طول دینے میں کامیاب رہا؟

کیا ہزاروں کے مجمعے میں سسک سسک کر تنہا جان دینے والے اسحاق کی موت بھی فی

الحال بیکار ہی رہی؟

میرے ڈوبتے ذہن میں یہ سارے سوال اُبھر رہے تھے اور میرے کلیجے کو شق کر رہے تھے۔

اسی دوران میں، مَیں نے محسوس کیا کہ جارج گورا ایک بار پھر اپنے آزاد ہاتھ کو میری دونوں ٹانگوں کے درمیان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں جانتا تھا، وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ وہ مجھے ہوا میں اُٹھانا چاہ رہا تھا۔ عمران کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ مجھے سامبر کے سارے اصول یاد تھے اور ان میں ایک اصول ''راندی'' کا بھی تھا۔ جو شخص اپنے حریف کو سر سے بلند کر کے زمین پر پٹخنے میں کامیاب ہوتا تھا، وہ اسے ذلیل وخوار کرنے کا حق دار بھی ٹھہرتا تھا۔ وہ اسے ننگا کر سکتا تھا۔ اس کی پشت پر تھوک کر اور اسے لات رسید کر کے اکھاڑے سے باہر پھینک سکتا تھا۔ ''مرو یا مارو'' کے مقابلے میں بھی اس داؤ کے چل جانے کے بعد مقابلہ وہیں ختم ہو جاتا تھا اور پٹخے جانے والے حریف کو ''ناک آؤٹ'' قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد فاتح، اس شخص کو جان سے مارنے کا حق دار ٹھہراتا تھا۔ کل اور آج کی لڑائی میں جارج نے متعدد بار ایسی کوشش کی لیکن میں اس طرف سے پوری طرح چوکس تھا۔ دوسری طرف میں نے بھی کل ایک دو موقعوں پر یہ ''ٹرائی'' کی تھی لیکن جارج جیسا شخص جو سامبر کا ایکسپرٹ تھا، مجھے اتنی آسانی سے یہ موقع کیسے دے سکتا تھا؟ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا کر خود کو حتی الامکان حد تک اکھاڑے کی مٹی کے قریب کر لیا اور یوں خود کو اوپر اُٹھائے جانے کی کوشش ناکام بنا دی۔

ایک بار پھر وہی جدوجہد شروع ہو گئی جو پچھلے دس منٹ سے جاری تھی۔ غالباً جارج گورا میری گردن کو اتنی دیر تک اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتا تھا کہ میری سانس رک جائے اور میں بے ہوش یا بے جان ہو کر زمین بوس ہو جاؤں۔ دوسری طرف میں سانسوں کی کمزور ڈور کو ٹوٹنے سے بچا رہا تھا اور کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھا جو مجھے جارج کا شکنجہ توڑنے میں کامیاب کرتا...... بہرحال، یہ موقع کل کی طرح آج بھی مجھ سے دور تھا بلکہ اب تو دور دور نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بجلی سی لپک گئی۔ دماغ کے تاریک ترین گوشے بھی ایک لمحے کے لئے منور ہو گئے۔ مجھے لگا میں جیت سکتا ہوں۔ میں اب بھی جیت سکتا ہوں۔ ہم سائبان کے نیچے تھے۔ یہی جگہ تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے جارج نے میری ٹانگوں میں ہاتھ دے کر مجھے سر سے اوپر اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی یہ کوشش...... اس کی شکست کا باعث بن سکتی تھی۔ مجھے ایک ایسی چیز نظر آ رہی تھی جو اس کو شکست فاش دے سکتی تھی۔ وہ

مجھے بدترین طریقے سے ہرانا چاہتا تھا اور اس کی اسی خواہش میں اس کی ''ہار'' کے قوی امکانات چھپے ہوئے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا، میں اسے موقع دوں گا۔ میں اسے خود کو اوپر اُٹھانے کا موقع دوں گا اور میں جانتا تھا، وہ میرے زخم زخم جسم کو اُٹھا لے گا...... وہ سامبر مقابلوں کا ماہر ترین کھلاڑی تھا...... سامبر کے ہر داؤ کا شناور تھا لیکن وہ ایک چیز نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس رام پوری چاقو کو نہیں دیکھ رہا تھا جو قریباً بارہ فٹ کی بلندی پر لکڑی کے سائبان میں پیوست تھا۔ شکتی دیوتا اپنی تمام تر جسمانی اور روحانی شکتی کے باوجود اس چاقو کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

...... مجھے لگا کہ بارونداجیکی کی بے بسی، سلطانہ کے لاچار آنسو اور اسحاق کے خونچکاں زخم سب ایک پلڑے میں آ گئے ہیں اور انہوں نے آناً فاناً جارج کی توانائیوں اور برتریوں سے لدا ہوا پلڑا ہواؤں میں اُٹھا دیا ہے......

مکافاتِ عمل جارج گورا کو آواز دے چکی تھی مگر ابھی میں نے یہ آواز سنی نہیں تھی۔ وہ اپنی امکانی فتح کے نشے میں چُور تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ٹوٹی ہوئی پسلی کی وجہ سے میرے لئے حرکت کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ گردن کے پچھلے حصے اور کندھے سے بہنے والے خون نے میرے تقریباً پورے جسم کو رنگین کر دیا تھا۔ میری گردن بدستور جارج کی آہنی گرفت میں تھی۔ یقیناً جارج کو بھی حیرت تھی کہ میں ابھی تک دم گھٹنے کے سبب ہوش وحواس سے بیگانہ کیوں نہیں ہوا۔ اس کا جواب بڑا مختصر تھا۔ میری غیر معمولی برداشت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ورنہ مجھ سے زیادہ تن وتوش اور طاقت رکھنے والا جارج کب کا فتح کا جھنڈا لہرا چکا ہوتا۔

میں نے وہی کیا جو میں نے سوچا تھا۔ میں نے جارج کو وہ موقع دیا جس کا وہ کافی دیر سے متلاشی تھا۔ اس نے جھک کر میری ٹانگوں تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کی تو میں نے اسے ایسا کرنے دیا۔ جارج اس سنہری موقع سے فائدہ کیوں نہ اُٹھاتا۔ وہ مجھے سر سے بلند کر کے اکھاڑے میں پٹخ دیتا تو اس کی یہ عظیم فتح اور بھی چمک دار ہو جاتی۔ جونہی میری ایک ران پر اس کی گرفت قائم ہوئی، اس نے میری گردن کے گرد لپیٹے گئے اپنے بازو کو پوزیشن تبدیل کی...... پھر ایک زوردار جھٹکے اور چنگھاڑ کے ساتھ اس نے میرے خونچکاں جسم کو ہوا میں اُٹھا لیا۔ تماشائی پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے۔ زبردست شور بلند ہوا...... میں نے اپنی دھندلائی نگاہوں کے ساتھ سائبان کی چھت کو دیکھا۔ رام پوری چاقو مجھ سے فقط دو تین فٹ کی دوری پر تھا۔ میں اپنے زخم زخم جسم کے ساتھ جس ہتھیار تک پہنچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہاں تک خود میرے حریف نے مجھے پہنچایا تھا۔

یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ اس سے پہلے کہ جارج دوسری مرتبہ چنگھاڑتا اور مجھے اکھاڑے میں پٹختا، اس سے پہلے کہ اس کی فتح کا ڈنکا بجتا اور شورِ قیامت بلند ہوتا، میں سائبان میں اٹکے ہوئے چاقو کو اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ اس کے لئے مجھے زیادہ زور نہیں لگانا پڑا تھا۔ بس ایک ہلکے سے جھٹکے نے مجھے چاقو کا قبضہ سونپ دیا۔ یہ سب کچھ ساعتوں میں ہوا۔

میں نے پہلا وار اوپر سے نیچے کی طرف جارج کی گردن کی جڑ میں کیا۔ وزنی چاقو دستے تک جارج کی چربی دار گردن میں گھسا۔ وہ جیسے ایک لمحے کے لئے سکتے میں رہ گیا۔ اس کی کرب ناک کراہ میرے کانوں سے ٹکرائی اور مجھے "سیراب" کر گئی۔ جارج اپنے قدموں پر لڑکھڑایا اور پیچھے کی طرف گرا۔ میں بھی اس کے ساتھ گرا۔ جارج کی نیلی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ ناقابلِ یقین نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھٹکے سے چاقو کھینچا اور دوسرا وار اس کے سینے پر کیا...... "یہ جیکی کے لئے جسے تم نے اپاہج کر کے مارا۔" میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

تکلیف کی شدت سے جارج کا منہ وا ہو گیا۔

میں نے چاقو کھینچ کر دوسرا وار اس کے عین دل کے مقام پر کیا۔ "...... اور یہ سلطانہ کی عزت کے بدلے میں......" میں نے جارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

نو انچ لمبا پھل ایک بار پھر دستے تک اس کے سینے میں گھس چکا تھا۔ اس مرتبہ وہ بے پناہ تکلیف کے سبب بلند آواز میں ڈکرایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں اکڑاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ہزاروں تماشائی یکسر خاموش تھے۔ وہ بھی جیسے اس اچانک تبدیلی کے سبب سکتے کی سی کیفیت میں چلے گئے تھے۔

اس مرتبہ مجھے چاقو جارج کے جسم سے نکالنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے زور لگانا پڑا۔ اس کے زخموں سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ آخری وار میں نے اس کے پیٹ پر کیا...... اور وار کرنے کے بعد چاقو کو نیچے کی طرف کھینچا...... جارج کا پیٹ ناف تک کھل گیا اور انتڑیاں نکل آئیں۔ "...... اور یہ اسحاق کو تڑپا تڑپا کر مارنے کے لئے۔" میں نے دم توڑتے جارج کے سامنے سرسراتی ہوئی وضاحت کی۔

اس نے سنا لیکن وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اپنی آخری منزل کی طرف اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس کی نظر پتھراتی چلی جا رہی تھی۔ شاہی بالکونی کی طرف سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں ماریا کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ اپنے بھائی کا یہ اچانک انجام دیکھ کر یقیناً اسے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ حیرت کے پہلے شدید

جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب تماشائی بھی اپنا ردِعمل ظاہر کرنے لگے۔ یہ دو طرح کا ردِعمل تھا۔ کچھ لوگ تو شاک کی کیفیت میں تھے اور کچھ غیظ و غضب دکھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ملا جلا شور بھی تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے۔ ان میں سے ایک ہاتھ کے اندر خون آلود چاقو بھی تھا۔ میں جیت چکا تھا...... اس ہجوم میں میرے سیکڑوں حمایتی بھی تھے لیکن انہوں نے میری فتح کی خوشی میں اچھل کود کی اور نہ نعرہ ہائے تحسین بلند کئے۔ وہ سب سہمے ہوئے تھے۔ جو ہوا تھا، وہ بالکل غیر متوقع تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے ہر کسی کو چپ لگا دی تھی۔ شاہی ردِعمل کیا ہو گا؟ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔

سائبان کے نیچے جارج گورا کی تازہ لاش پڑی تھی اور شاہی بالکونی کی طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تب میں نے دیکھا کہ بالکونی کے نیچے سے تماشائیوں کا ایک ریلا سا اکھاڑے کی طرف بڑھا۔ بے شک یہ جارج کے مشتعل حمایتی ہی تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ میدان میں داخل ہو کر میری تکا بوٹی کر دینا چاہتے ہوں۔ انہیں روکنے کے لئے کئی درجن گارڈز سامنے آ گئے اور انہوں نے اکھاڑے میں کھلنے والا راستہ بلاک کر دیا۔ اسی دوران میں ایک اور اچھی پیش رفت ہوئی۔ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج اپنے کئی ساتھیوں کے ہمراہ اکھاڑے میں آ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے حفاظتی گھیرے میں لے لیا۔ میں نے ایک نظر شاہی بالکونی پر ڈالی...... ماریا نوحہ کناں تھی۔ کچھ لوگ اسے سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ حکم جی، رتنا دیوی اور سرجن اسٹیل وغیرہ کے چہرے بھی دھواں دھواں نظر آ رہے تھے۔ شکتی دیوتا، خاک اور خون میں لتھڑا ہوا میرے پاؤں میں پڑا تھا۔ مجھے لگا کہ بارونداجیکی کہیں، میرے آس پاس ہے اور مسکرا رہا ہے......

اگلے چوبیس گھنٹے بڑے غیر یقینی اور پُر خطر تھے۔ میں زرگاں کے سرکاری اسپتال میں تھا۔ میری گردن کے ٹوٹے ہوئے ٹانکے دوبارہ لگے تھے اور میری مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ سب سے پریشان کن صورت حال میرے دائیں پہلو کی تھی۔ نیچے سے چوتھی پسلی ٹوٹ گئی تھی...... یہاں جارج کی ایک تباہ کن ٹھوکر لگی تھی۔ اس نے وزنی جوگرز پہن رکھے تھے۔ پسلی میں ایک بڑا فریکچر ہوا تھا۔ تاہم خوش قسمتی سے اندھا دھند لڑائی کے باوجود پسلی ''ڈس لوکیٹ'' نہیں ہوئی تھی یا شاید ''ڈس لوکیٹ'' ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنے مقام پر آ گئی تھی۔ ڈاکٹر سے مشورے کے بعد عمران نے مجھے بتایا۔ ''تمہیں کم از کم تین ہفتے آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی تم یہاں سے جانے کے قابل ہو سکو گے۔''

''اور ان تین ہفتوں میں یقیناً جارج کے حمایتی اپنا کام کر گزریں گے۔ کسی رات وہ اسپتال میں گھسیں گے اور میری باقی پسلیاں توڑ کر مجھے انا للہ کر دیں گے۔''

عمران میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرایا۔ ''اب یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جگر! تم نے جارج گورے کو شکست دی ہے، کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو نہیں پچھاڑا۔ شکتی دیوتا کو ہرانے کے بعد اب تم شکتی دیوتا ہو۔ لوگ نہ بھی مانیں، پھر بھی ان کا دل دماغ تو یہی کہتا ہو گا کہ اب تم ''شکتی دیوتا صاحب'' کی جگہ پر ہو اور شکتی دیوتا صاحب کی چاہے ایک پسلی ٹوٹی ہوئی ہو، اس پر شب خون مارنا آسان نہیں ہوتا......''

''مجھے بانس پر چڑھا رہے ہو؟'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''نہیں جگر!'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ''تم نے وہ کر دکھایا ہے جو یہاں کے لوگ مدتوں یاد رکھیں گے...... اور کچھ تو آخری دم تک بھول نہیں سکیں گے۔ بے شک تمہاری فتح پر کسی نے جشن نہیں منایا، کہیں ڈنکے بجے ہیں اور نہ چراغاں ہوا ہے لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا

ہوں کہ زرگاں کے بے شمار لوگوں کے دلوں کے اندر ضرور جشن کا سماں ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں اور نچلی مسلی ذاتوں والے ہندو بھی اور وہ سب لوگ بھی جن کو کسی نہ کسی طور جارج کی من مانیوں اور خر مستیوں سے واسطہ پڑا ہے۔ تمہیں پتا ہے کل رات جارج کی جیل میں کیا ہوا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔

وہ دائیں بائیں نظر دوڑا کر سرگوشی میں بولا۔ ''کسی نے راتوں رات جیل کی دیواروں پر چاکنگ کر دی ہے۔ قیدیوں کو جارج گورے کی موت کی مبارک باد دی گئی ہے اور اس کے بارے میں اور بھی کئی سخت باتیں لکھی گئی ہیں۔ اس حرکت کے شبہے میں دو تین قیدی گرفتار ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں آج دوپہر جارج کی آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد جیل میں اور گرفتاریاں بھی ہوں گی۔ پانڈے اس سلسلے میں بڑا سرگرم ہے۔''

''لیکن پانڈے تو کل رات تک یہیں اسپتال کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔''

''وہ ان گارڈز کا انچارج تھا جو یہاں اسپتال میں تمہاری حفاظت پر مامور ہیں۔ رات گئے میں نے اور میڈم صفورا نے مشورہ کیا۔ اس مشورے کے بعد میڈم صفورا نے پنڈت مہاراج سے رابطہ کیا اور ان سے کہا کہ رنجیت پانڈے جیسے افسر کو تمہاری سیکیورٹی کا ذمے دار بنانا ٹھیک نہیں۔ پنڈت مہاراج نے انتظامیہ سے بات کی اور پانڈے کو اس کے ماتحتوں سمیت یہاں سے ہٹوا دیا۔ اب میڈم صفورا والا سیکیورٹی اسٹاف ہی یہاں ڈیوٹی دے رہا ہے اور میں خیر سے اس اسٹاف میں اسسٹنٹ انچارج ہوں۔'' عمران نے اپنے یونیفارم کے بازو پر لگے سرخ نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو اچھی خبر ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ جھٹ بولا۔ ''نیوز چینل کا چڑیلا...... میرا مطلب ہے نمائندہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہمیشہ بری خبر ہی دوں گا۔ ابھی پچھلے سے پچھلے مہینے میں نے ''بہ زبانِ خود'' قوم کو بڑی اچھی خبر سنائی تھی۔''

''وہ کیا؟'' میں نے درد سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے کہا۔

''میں نے کہا تھا، ناظرین آج کوئی خبر نہیں ہے۔''

''تو یہ اچھی خبر تھی؟''

''بالکل، اس دور میں تو ایسی خبروں کو بھی اچھا ہی سمجھنا چاہئے۔ اتنی تیزی سے خبریں آ رہی ہیں اور اتنی بری کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ پچھلے ہفتے ہمارے ایک ساتھی کی سالی لاپتا ہو گئی۔

ہمارے ساتھی کو اس ''گمشدگی'' سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ کہیں کوئی دوسرا چینل یہ خبر پہلے نشر نہ کر دے۔ لہٰذا اس نے پہلے سالی کے اغوا کی خبر چلائی۔ پھر تصدیق کرنے کے لئے گھر ٹیلی فون کیا تو سالی صاحبہ، کہیں سے ایزی لوڈ کرا کے واپس بھی آ چکی تھیں...... اس کے بعد موصوف کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ واقعی ''بریکنگ نیوز'' کے زمرے میں آتا تھا...... بیوی سے مار کھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے، اب یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا سا بریک...... یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا بریک لیکن بیوی نے بھی اس وقت تک بریک نہیں لیا جب تک موصوف کی ہنسلی کی ہڈی بریک نہیں ہوگئی اور...... اور زبان میں فریکچر نہیں ہوگیا۔''

''زبان میں فریکچر؟ تمہارا مطلب ہے زبان کی ہڈی ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تو تم کیا سمجھتے ہو، ہم ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے یوں ہی بول لیتے ہیں؟''

''تم میڈیا پر طنز کرتے ہو مگر میڈیا کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ مجھے اس وقت درد ہو رہا ہے ورنہ میں اس موضوع پر لمبی بحث کر سکتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ تمہارے اچھے ہونے کا انتظار کر لیتے ہیں۔'' اس نے فراخ دلی سے کہا۔ کل صبح والے خونی مقابلے اور اس کے انجام کے بعد سے زرگاں میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہر کے سارے جذبات یعنی غصہ، خوف، حیرت، خوشی...... سب کچھ اس خاموشی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ جارج کے حمایتیوں میں زیادہ تر اعلیٰ طبقہ اور کھاتے پیتے لوگ شامل تھے...... انہیں جارج کی شکست اور موت بڑی مشکل سے برداشت ہوئی تھی۔ ایک طرح سے یہ ایک نہایت کڑوی گولی تھی جو انہیں کسی نہ کسی طور نگلنا پڑی تھی۔ دھرم کے حوالے سے یہاں انصاف کا ترازو پنڈت مہاراج کے ہاتھ میں تھا اور اسے وہی کچھ کرنا تھا جو کتابوں میں درج تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت، موقع دیکھ کر عمران پھر میرے پاس چلا آیا۔ اس نے گلاب کی ایک کلی میرے سرہانے رکھ دی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! تمہارا کیا خیال ہے...... جارج کی شکست اور موت کی خبر سلطانہ اور اقبال وغیرہ تک پہنچ گئی ہوگی؟''

''ہاں، میں بھی کل سے یہی سوچ رہا ہوں۔ ویسے جگر! یہ اتنی بڑی خبر ہے کہ پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں اس کی گونج سنائی دی ہوگی۔ مجھے نہیں لگتا کہ فتح پور والے بے خبر ہوں گے۔''

''لیکن سلطانہ وغیرہ تو مندر کے تہ خانوں میں ہیں اور تم نے آفتاب خاں کو تہ خانوں میں جانے سے منع کر دیا تھا۔''

''مگر اشد ضرورت کے وقت وہ جا بھی سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنی بڑی خوش خبری سنانے کے لئے اس نے مندر کا ایک چکر لگا ہی لیا ہو۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک زخمی چڑیا کی طرح ہر وقت پھڑ پھڑاتی رہتی تھی۔ جارج کی شکست اور میری کامیابی کی خبر اس کے زخموں پر مرہم کا کام دے سکتی ہے...... بلکہ ضرور دے گی۔''

شاید میں مزید بھی کچھ کہتا مگر اسی دوران میں دروازے پر گارڈز نمودار ہوئے۔ ان کے عقب میں میڈم صفورا، منیجر مدن اور پنڈت مہاراج کی صورتیں نظر آئیں۔ پنڈت مہاراج کی تعظیم کے لئے میں نے تکیے سے سر اٹھایا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پنڈت مہاراج کے ساتھ ایک جواں سال، قبول صورت لڑکی بھی تھی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ باقی جسم گرم شال سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں حزن و ملال کی عجیب سی کیفیت تھی۔

میڈم صفورا نے ہولے سے کہا۔ ''یہ تمہارے دوست اسحاق کی بھاوج حمیدہ ہے۔ وعدے کے مطابق پنڈت مہاراج اسے تمہارے سپرد کرنے کے لئے آئے ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر چونک کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے مجھے سلام کیا اور خاموش ہوگئی لیکن اس کی خاموشی بات کر رہی تھی۔ یہ خاموشی مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ''میرے محسن! میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میں ایک درندے کی تحویل میں تھی۔ اس نے میرے دیور کو موت کے جال میں جکڑنے کے لئے مجھے چارا بنا رکھا تھا اور وہ کامیاب ہوا۔ اس نے میرے بھائی جیسے دیور کو سُولی پر لٹکایا اور اس کے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا اور اب میری باری آنے والی تھی۔ میں اس کے ''بستر ہوس'' پر پامال ہونے والی تھی۔ میرا روگ اذیت ناک موت کا دوسرا نام تھا۔ تم مسیحا بن کے آئے...... تم نے میرے زہر کو تریاق دیا اور میری زنجیروں کو پگھلا کر مجھے پھر سے زندہ کیا۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟''

پنڈت مہاراج نے اپنے مخصوص اسٹائل سے اپنے لمبے بالوں کو کندھوں کے پیچھے پھینکا اور ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''اب تمہارا حال کیسا ہے؟''

''مجھے پہلے سے بہتر لگ رہا ہے مہاراج۔''

''بھگوان نے چاہا تو تم جلد ہی بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔ یہاں تمہیں ہر طرح کی سہولت ملے گی...... اور پوری رکھشا بھی کی جاوے گی۔''

"مجھے آپ کے انصاف پر پورا بھروسا ہے۔" میں نے کہا۔

پنڈت مہاراج نے حمیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب یہ تمہاری امانت ہے۔ تم جیسے ہی ٹھیک ہوگے، اسے یہاں سے لے جا سکو گے۔ حکم جی نے اس سلسلے میں جروری ہدایتیں دے دی ہیں۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر پنڈت مہاراج اور حکم جی کا شکریہ ادا کیا۔

پنڈت مہاراج نے مجھے بتایا کہ میرے صحت یاب ہونے تک حمیدہ لال بھون میں میڈم صفورا کے پاس رہے گی اور وہاں اس کی حفاظت کا پورا انتظام ہوگا۔

کچھ دیر بعد پنڈت مہاراج اپنے ساتھیوں اور گارڈز وغیرہ کے ساتھ واپس چلا گیا۔ میڈم صفورا بھی اسحاق کی بھاوج حمیدہ کو لے کر لال بھون چلی گئی۔ میں ایک بار پھر اپنے سفید بستر پر اکیلا رہ گیا۔

سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا۔ شہر کی فضا بھی پُرسکون تھی۔ اس کے باوجود محسوس ہوتا تھا کہ سینوں کے اندر ہلچل موجود ہے۔ شہر کے باسی اپنے اپنے طور پر اس بہت بڑے واقعے کے اثرات سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ اسپتال سرجن اسٹیل کی زیرنگرانی چلتا تھا۔ یہاں تین سفید فام ڈاکٹروں کے علاوہ دو تین مقامی ڈاکٹر بھی موجود رہا کرتے تھے۔ یہ مقامی ڈاکٹر وہ تھے جنھوں نے ڈاکٹر چوہان ہی کی طرح انڈین حکومت سے بھاگ کر اس دشوار گزار علاقے میں پناہ لی ہوئی تھی۔ بے شک یہاں میرا علاج ہو رہا تھا لیکن یہ اندیشے اپنی جگہ موجود تھے کہ علاج ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ میں اپنے حفاظتی انتظامات پر بھی پورا بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس حوالے سے عمران یہاں موجود نہ ہوتا تو شاید میں مسلسل تناؤ کا شکار ہو جاتا۔

سہ پہر کے وقت بتدریج اندھیرا چھا گیا اور پھر تیز بارش شروع ہوگئی۔ سردی میں اضافہ ہوگیا۔ ایک چھوٹی انگیٹھی میرے قریب دہکا دی گئی۔ کچھ دیر بعد عمران بھی مجھے کمپنی دینے کے لئے میرے پاس آ بیٹھا۔ گارڈز کی ہلکی نیلی یونیفارم اس کے جسم پر سجتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس پر ہر لباس ہی جچتا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ "عمران! سچ پوچھو تو تمہاری کہانی ایک گہرے دکھ کی طرح میرے دل کی تہ میں بیٹھ گئی ہے۔ میں نے شبانہ کو دیکھا نہیں، پر اس کی غم زدہ صورت نگاہوں میں گھومتی رہتی ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں نے ضرورت سے زیادہ خوداعتمادی کا مظاہرہ کیا۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں تھا۔ تم دونوں لمبے عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ

رہے۔ تمہارے رستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ راجا اور کبیر صاحب وغیرہ بار بار تم سے کہتے رہے کہ شادی کر لو...... اور تم نے نہیں کی۔"

"اسی کو تقدیر کہتے ہیں جگر! کبھی بہت آسان کام بھی نہیں ہو پاتے اور کبھی ناممکن، عین ممکن ہو جاتا ہے۔ باقی جہاں تک شادی نہ ہونے کی بات ہے تو اس میں مجھ سے زیادہ شبانہ ہی کا قصور تھا۔ وہ اپنے فیصلے میں اپنے گھر والوں کو شامل کرنا چاہتی تھی۔ اس بے چاری کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا اور حالات اس طرح پلٹا کھا جائیں گے۔"

"یار! وہ تو لڑکی تھی۔ اس کی سمجھ محدود تھی مگر تم نے تو کافی سرد گرم دیکھا ہوا تھا۔ تمہیں تو پتا ہونا چاہئے تھا کہ ایسے معاملے کسی بھی وقت الٹ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم اصرار کرتے اور زور دیتے تو وہ شاد پورہ میں تم سے شادی پر رضامند ہو جاتی۔"

عمران نے گہری سانس لی۔ "سانپ کی لکیر پیٹنے سے کبھی کوئی فائدہ ہوا ہے جو ہمیں ہو گا؟ ایسی باتیں دُہرانے سے بس دکھ ہی بڑھتا ہے۔ جو بگڑ گیا سو بگڑ گیا...... جو ابھی نہیں بگڑا اسے بچانا چاہئے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ حال کے بارے میں سوچنا چاہئے اور حال میں...... سلطانہ بھی شامل ہے...... اس نے تمہیں بہت چاہا ہے یار! تمہارے لئے پورے زرگاں سے ٹکر لی ہے۔ جب تم اپنے حواس میں نہیں تھے، وہ تمہارے بچاؤ کے لئے ایک دیوار بن کر کھڑی رہی ہے۔ ایسی ہمت والی، بےجگر عورتیں کم کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ بہت انوکھی ہے...... اور تمہارے لئے اس کا پیار بھی اتنا ہی انوکھا ہے۔ لوگ شادی سے پہلے رومانس کرتے ہیں لیکن اس نے تم سے شادی کے بعد رومانس کیا اور ایسا کیا کہ حق ادا کر دیا۔ اب اسے تمہاری محبت اور سہارے کی ضرورت ہے تابی۔"

میری نگاہوں میں سلطانہ کا چہرہ گھوم گیا۔ رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، انار جیسا رنگ، پتلی کمر لیکن مضبوط جسم جس سے جنگلی پھولوں کی باس آتی تھی...... وہ میرے لئے سراپا محبت اور اطاعت تھی۔ شاید میں اسے پہاڑ سے کودنے کے لئے کہتا تو وہ بس ایک بار میری خواہش کی تصدیق کرتی اور پھر کود جاتی۔ میرا دل اس کے لئے محبت سے بھر گیا۔ جی چاہا کہ اُڑ کر اس تک پہنچ جاؤں...... مگر پھر اچانک دل میں یہ وسوسہ جاگا، کہیں میرے اور سلطانہ کے درمیان بھی تو کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو جائے گی؟ آنکھوں کے سامنے ہاشو کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ایک انتہا پسند شخص ثابت ہوا تھا۔ اس کے پاس سے نیلگوں زہریلے پاؤڈر کے جو پیکٹ ملے،

اسی جیسا زہر سلطانہ کے پاس بھی موجود تھا۔ یہ زہر ایک پڑیا میں تھا اور یہ پڑیا اب میرے پاس تھی۔ سلطانہ کے پاس یہ زہر کیوں تھا؟ کہیں کسی طور اس کا تعلق بھی تو ہاشو وغیرہ سے نہیں تھا؟ یہ سنگین سوال بار بار میرے ذہن میں اُبھرتا اور مجھے جھنجوڑ دیتا۔ سلطانہ بھی ایک باغی تھی۔ اپنی دلیر والدہ کی طرح وہ بھی خطروں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ مرنا اور مارنا جانتی تھی...... زرگاں کے بااثر ہندوؤں سے اس کا ٹکراؤ، دیرینہ تھا۔ کہیں وہ بھی تو زرگاں میں موجود ''خطرناک شدت پسندی'' کا حصہ تو نہیں تھی؟

''کیا سوچ رہے ہو؟'' عمران نے میرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''بالکل غلط۔ سائیکالوجسٹ نادرا اکبر گوندل صاحب نے کہا ہے کہ انسان کا دماغ کچھ سوچے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ ہم ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں۔''

''یہ نادرا اکبر گوندل تو شاید کسی پولیس افسر کا نام تھا؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، پولیس افسر سائیکالوجسٹ نہیں ہوتے؟ گدھے! ان سے بڑا نفسیات داں اور کون ہوگا۔ عشق کا بھوت سب سے تگڑا ہوتا ہے۔ یہ اسے بھی دو چار گھنٹے میں اُتار دیتے ہیں اور ''مریض'' اپنی محبوبہ کو باجی کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ یہ لوگ ''چھترول'' کے ذریعے تحلیل نفسی کرتے ہیں اور ماضی کے ان سارے حادثوں کا پتا چلا لیتے ہیں جو کبھی وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے ہوتے۔ دیگر امراض کے علاوہ ''کنجوسی'' بھی دراصل ایک نفسیاتی روگ ہے۔ ان معالجوں کے علاج سے یہ بھی جڑ سے ختم ہو جاتا ہے۔ مریض اپنی ساری جمع پونجی بلکہ قرض اُٹھائی ہوئی رقوم بھی بے دریغ خرچ کرنا اور لٹانا شروع کر دیتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی اس ''فیاضی'' کا پچانوے فیصد فائدہ بھی اس کے معالجوں کو ہی ہوتا ہے......''

اچانک زور سے بجلی چمکی۔ میں اور عمران کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔ بارش زور پکڑ رہی تھی۔ دن میں ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ بعد بادل زور سے گرجے اور در و دیوار دہل گئے۔ عمران سگریٹ کا کش لے کر زخمی انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''دیکھا تم نے۔ آسمانی بجلی مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ میں باہر برآمدے میں نکلا نہیں اور جل کر کوئلہ ہوا نہیں۔''

اس کے لہجے نے مجھے آزردہ کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''یار! یہ وہم پرستیاں ہمارے دماغوں سے کس طرح نکل سکتی ہیں...... کس طرح ہم ان پھپھوندی زدہ عقیدوں کے جال کو توڑ سکتے ہیں؟''

''اس کا کوئی فوری حل نہیں۔ اس کے لئے کوشش کرنا ہوگی، طویل انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے لئے انسان کے اندر کی مضبوطی درکار ہے اور اندر کی مضبوطی میں سب سے اہم کردار علم کی روشنی کا ہے ''دی نالج اِز پاور''...... اور سیانے کہتے ہیں جہاں ''پاور'' بڑھتی ہے وہاں ''ہارر'' کم ہوتا جاتا ہے۔''

''مگر یار! عقلِ سلیم بھی تو کوئی شے ہے۔ بڑی بڑی ہستیاں اس دنیا میں ایسی آئی ہیں جو ان پڑھ تھیں مگر انہوں نے خداداد عقل سے سچ اور جھوٹ میں پہچان کی ہے۔ بیکار عقیدوں پر لعنت بھیج کر انہیں کچرے کے ڈھیر پر پھینکا ہے۔''

عمران مسکرایا اور مقامی زبان کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک کہوت ہو بھیا لیکن میں عام لوگن کی بات کرت ہوں۔ یہ جو عام لوگن ہووت ہیں نا، یہ بڑے کٹر ہووت ہیں۔ جہاں اڑ گئے بس اڑ گئے۔ پہاڑ میں سے زندہ اونٹنی نکلنے والا معجزہ دیکھ لیں پھر بھی نہ ماننے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں...... اگر تمہاری بیکار سمجھ میں ناہیں آیا تو میں تمہیں ایک اور مثال دیوت ہوں......''

وہ ایک بار شروع ہوا تو پھر بولتا چلا گیا...... اس کے پاس ہر موضوع پر باتوں کا ذخیرہ رہتا تھا۔ اچانک دروازے سے باہر شور سنائی دیا۔ یوں لگا جیسے گارڈز کسی شخص کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر یکایک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور سانولے رنگ کا ایک شخص طوفانی رفتار سے میری طرف بڑھا۔ اس کے لباس سے پتا چلتا تھا کہ وہ اسپتال کے عملے کا ہی آدمی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار آلہ چمک رہا تھا۔ وہ چلاتا ہوا، خطرناک انداز میں مجھ پر جھپٹا لیکن وہ مجھے نقصان کیسے پہنچا سکتا تھا؟ میرے اور اس کے درمیان عمران تھا۔ وہ شخص جو میری طرف بڑھنے والے ہر خطرے کے لئے ایک فلک بوس آہنی دیوار تھا۔ حملہ آور دوگنا پھرتی کا مظاہرہ بھی کرتا تو عمران کو جُل نہ دے سکتا۔

عمران نے مجھ سے دس بارہ فٹ دور ہی اسے روک لیا۔ ''مار دوں گا'' حملہ آور گرجا اور اس نے اندھا دھند عمران پر وار کیا۔ عمران نے نیچے جھک کر تیز دھار آلے کا وار بچایا اور اسے اس طرح بازوؤں میں جکڑا کہ اس کا آلے والا ہاتھ بھی بازوؤں کے گھیرے میں آ گیا۔ عمران اسے دھکیلتا ہوا دیوار کی طرف گیا۔ یہ کافی تیز رفتار عمل تھا۔ حملہ آور کا سر شدت سے پختہ دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ وہ ڈکرانے والے انداز میں چلایا۔ تیز دھار آلے پر اس کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی۔ عمران نے پاؤں کی ٹھوکر سے یہ آلہ اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ دو تین گارڈز بھاگتے ہوئے آئے اور حملہ آور سے لپٹ گئے۔ فرش پر گرنے والا ایک خطرناک

کٹر ہندو تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ شخص سرجن اسٹیل کے ماتحت عملے میں سے تھا اور اس کا تعلق اسی برادری سے تھا جس کے دو افراد نے چندن دن پہلے لال بھون میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ دونوں افراد لال بھون کے گارڈز میں شامل تھے۔

سر پر لگنے والی سخت چوٹ کے سبب حملہ آور نڈھال ہو گیا، اس کے باوجود اس کا واویلا جاری تھا۔ ''تم مکار ہو۔ تم نے دھوکا کیا ہے۔ سرجارج نے تم کو بازوؤں پر اُٹھا لیا تھا۔ تم ہار چکے تھے۔ تم نے ہارنے کے بعد ان پر وار کیا۔ تم نے فتح ناہیں پائی، تم نے...... ہتھیا کی ہے۔ تم ہتھیارے ہو۔ تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ اس جنم میں بھی اور بعد کے ہر جنم میں بھی......''

وہ دہاڑتا رہا۔ گارڈز اسے کھینچ کر باہر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اور اچھل اچھل کر بول رہا تھا۔ ''تم نے ایک مہان شخص کی ہتھیا کی ہے۔ ایک ایسے بندے کو مارا ہے جس کی وجہ سے سیکڑوں گھروں کے چولہے جلتے تھے۔ ہزاروں کنیاؤں کی ڈولیاں اُٹھتی تھیں۔ بھگوان تمہیں کبھی شما ناہیں کرے گا...... اور نہ ہم کریں گے۔''

وہ اتنے زور سے بول رہا تھا کہ اس کی آواز بیٹھ گئی اور الفاظ گڈمڈ ہو گئے......

گارڈز اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ تیز دھار آلہ عمران کے ہاتھ میں تھا۔ عمران نے مزید احتیاط کے طور پر میرے کمرے کی طرف آنے والے تمام دروازے بند کرا دیئے اور نگرانی پر مامور گارڈز کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔

''ایک بار پھر جان بچانے کا شکریہ۔'' میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ تم صرف میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے ایسی مقتولانہ حرکتیں کرتے ہو۔''

''تم دیکھ ہی رہے ہو، میں نے کچھ نہیں کیا بلکہ ابھی تو میں کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔''

''ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا پھر میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھا، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسی بارے میں بات کر رہے تھے۔ تو ہم پرستی کا روگ آسانی سے جان نہیں چھوڑتا۔ ایسے روگیوں کے پاس ہر بڑی سے بڑی دلیل کا جواب موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنے پھپھوندی زدہ عقیدوں کو اپنے سامنے پاش پاش ہوتے دیکھتے ہیں لیکن انہیں پھر سے جوڑ لیتے ہیں۔ اب دیکھو...... یہ وہی لوگ ہیں جو کہہ رہے تھے کہ تمہاری پتنی کے پاپ کی وجہ سے تمہاری شکست لازم ہے۔ اب وہ اس لڑائی کے نتیجے کو ہی تسلیم نہیں کر رہے لیکن ایسا کرنے والے بہت کم لوگ ہی ہوں گے۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ ساری دنیا نے دیکھا ہے۔ اس

کے علاوہ جن لوگوں کے پاس فیصلہ کرنے کی اتھارٹی تھی، انہوں نے بھی متفقہ طور پر تمہیں فاتح قرار دیا ہے۔''

''یہ بندہ کیا نکتہ اُٹھا رہا تھا؟''

''یہ بڑا کمزور نکتہ تھا۔ کہہ رہا تھا کہ جارج تمہیں بازوؤں پر اُٹھا کر سر سے بلند کر چکا تھا...... اور لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ یہ بات کوئی نہیں مانے گا۔ سامبر کے اصولوں کے مطابق لڑائی تب ختم ہوتی جب وہ تمہیں اکھاڑے میں پٹخ دیتا۔ خیر چھوڑو، یہ لاحاصل بحث ہے۔ اب نئی صورتِ حال پر غور کرو۔ تم پر پھر قاتلانہ حملے کی کوشش ہوئی ہے...... یہ خبر بھی دو تین گھنٹے کے اندر پورے زرگاں میں پھیل جائے گی۔ لوگوں میں پھر ہلچل پیدا ہو گی۔ شہر کی آبادی پہلے ہی دو دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔''

''یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے تو یہی لگتا ہے عمران کہ جتنی جلدی ہو ہم یہاں سے نکل جائیں۔''

''تمہارے زخموں کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم کوشش کرتے۔''

''اب بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی ذمے داری پر جانا چاہیں تو انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

''اعتراض کی بات تو ہے یار! ابھی تم ہلنے جلنے کے قابل بھی نہیں ہو۔ دشوار راستوں کا طویل سفر تو دور کی بات ہے۔''

O......❖......O

میرے اگلے چار پانچ روز کافی تکلیف میں گزرے لیکن پھر بتدریج طبیعت بہتر ہونے لگی۔ میری سیکیورٹی پہلے سے زیادہ سخت کر دی گئی تھی۔ عمران بھی زیادہ وقت میرے آس پاس ہی گزارتا تھا۔ تاہم کسی وقت وہ اوجھل بھی ہو جاتا...... ساتویں کے جشن کے روز جو گاڑی اس نے انعام میں جیتی تھی، وہ اسے مل گئی تھی۔ وہ کسی وقت اس پر سیر کے لئے بھی نکل جاتا۔ ایک دو بار وہ اپنے ساتھ گیتا مکھی کو بھی لے گیا۔ اس کی یہ مصروفیت میرے لئے پریشان کن تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ تو یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ میرا قریبی ساتھی ہے اور مجھے بھانڈیل اسٹیٹ سے نکالنے کے لئے یہاں آیا ہوا ہے مگر یہ تو سب جانتے تھے کہ وہ بھی پاکستانی ہے اور میری ٹریننگ وغیرہ میں میرا ساتھ دیتا رہا ہے۔

میں نے ایک دو بار اسے آزادانہ گھومنے سے منع بھی کیا لیکن وہ سنتا کب تھا۔ دوستیاں

بتانا اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور وہ مشکل ترین لوگوں میں بھی اپنے پرستار پیدا کر لیتا تھا۔ یہاں بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر پھر ایک روز ایسا واقعہ ہوا جس کی ہم دونوں میں سے شاید کسی کو توقع نہیں تھی۔

منیجر مدن میرے پاس آیا اور بولا۔ ''تمہیں پتا چلا ہے، عمران کو چوٹیں لگی ہیں۔''

''کیسے؟'' میں بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مجھے پوری جانکاری تو ناہیں...... لیکن معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اس سے اس کی گاڑی چھینی ہے۔''

میں نے ماتھا پکڑ لیا۔ مدن نے کہا۔ ''یہیں پر ایمرجنسی والے کمرے میں اس کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ ویسے وہ بالکل خیریت سے ہے۔''

یہ پریشان کن خبر تھی۔ کچھ ہی دیر بعد عمران سر اور ہاتھ پر پٹی باندھے مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ ''شاباش! یہ کام دکھایا ہے تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ضرورت مند ڈاکو تھے۔ مجھے ان پر ترس آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بھائی صاحب! یہ ہماری پہلی پہلی واردات ہے۔ اگر کوئی غلطی شلطی ہو گئی تو معاف کر دیں۔ میں سمجھ گیا کہ انہوں نے کیا غلطی کرنی ہے۔ انہوں نے ڈر کر خواہ مخواہ ہی گولی چلا دینی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ مفت میں گولی کھانے کے بجائے، ان کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی کر دی جائے۔ کیریئر کے شروع میں نوجوانوں کو واقعی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔''

میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے اندر جھانکنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ کبھی کبھی حیران کن فیاضی کا مظاہرہ بھی کر جاتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''کہیں سچ مچ کسی کو تحفے میں تو نہیں دے آئے گاڑی؟''

''تابش صاحب! اگر دے بھی آیا ہوں تو کسی دوسرے کی دُم پر تو پاؤں نہیں آنا چاہئے۔ میری اپنی گاڑی تھی۔''

شاید وہ پھر اپنی ہانکنا شروع کر دیتا مگر مجھے سنجیدہ دیکھ کر اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔ ویسے بھی منیجر کی موجودگی میں وہ میرے ساتھ زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ وہ زرگاں کی نہر کے ساتھ کچھ آگے تک چلا گیا۔ واپسی پر جیپ کا پہیا پنکچر ہو گیا۔ وہ پہیا بدل کر اٹھ ہی رہا تھا کہ چار بندوں نے اس پر اسلحہ تان لیا۔ اس کے پاس میڈم صفورا کا فراہم کردہ پستول تو موجود تھا مگر وہ جیپ کے ڈیش بورڈ میں رکھا تھا۔ ایک

شخص نے اچانک اس پر پیچھے سے رائفل کے دستے کا وار کیا، وہ گر گیا۔ انہوں نے اس پر دو رائفلیں تانے رکھیں اور جیپ لے کر نکل گئے۔

عمران جیسے بندے سے یوں گاڑی چھین کر لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ کئی دفعہ جب بندہ خطرے کی طرف سے بالکل غافل ہوتا ہے تو بے دست و پا ہو بھی سکتا ہے۔ پھر عمران کو جو چوٹیں لگی تھیں، ان سے بھی تصدیق ہوتی تھی کہ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔

عمران نے میری تفتیشی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے تابش صاحب، ابھی تمہاری پوری تسلی نہیں ہوئی...... پر حقیقت وہی ہے جو میں نے بتا دی ہے۔ میں لڑائی بھڑائی کر سکتا تھا لیکن اس میں کافی ''رسک'' تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو دن میں ہی حکم جی کے ہرکارے کہیں نہ کہیں سے گاڑی برآمد کر لیں گے۔ یہاں کوئی ایسا قبائلی علاقہ تو ہے نہیں جہاں لے جا کر گاڑی کا مدعا غائب کر دیا جائے۔''

منیجر مدن لال بولا۔ ''خیر، اس لحاظ سے تو تم نے واقعی عقل مندی کی ہے کہ گاڑی کے لئے کوئی بڑا خطرہ مول ناہیں لیا۔ وہاں اس علاقے میں اس طرح کی کچھ وارداتیں پہلے بھی ہوئی ہیں۔ راہزنوں کی دو تین ٹولیاں ہیں جو ایسے کام کرتی رہتی ہیں لیکن عام طور پر ان کی واردات پکڑی جاتی ہے۔''

اسی دوران میں شاہی محافظوں کا ایک لمبا تڑنگا انچارج اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے عمران کی خیر خیریت دریافت کی پھر اس سے واقعے کی تفصیل جاننے میں مصروف ہو گیا۔

اسی روز شام کو اطلاع ملی کہ زرگاں کی جیل میں زبردست بلوا ہوا ہے۔ قیدیوں نے جیل توڑنے کی کوشش کی ہے۔ جیل کی انتظامیہ نے پہلے ہوائی اور پھر سیدھی فائرنگ کی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں کم و بیش آٹھ قیدی ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے ہیں۔ طاقت کے بے رحمانہ استعمال کے بعد انتظامیہ قیدیوں کو واپس بیرکوں میں بند کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے مگر کشیدگی برقرار ہے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد عمران اس سلسلے میں پوری تفصیل لے کر آ گیا۔ اس نے بتایا۔ ''اس واقعے کی وجہ وہی وال چاکنگ بنی ہے جس میں قیدیوں کو جارج کی شکست اور موت کی مبارک باد دی گئی تھی۔ جیل حکام نے اس سلسلے میں پانچ چھ افراد کو گرفتار کیا تھا۔ پتا چلا ہے کہ بعد میں ان میں سے چار قیدیوں کو ٹیکا لگا کر مار دیا گیا ہے۔''

''کیسا ٹیکا؟'' میں حیران رہ گیا۔

"وہی جو ایک دفعہ ہماری میڈم صفورا ہمیں لگانے لگی تھی۔ اس نے ساری تفصیل بتائی تھی تمہیں۔ وہ درد کا ٹیکا ہے لیکن درد روکنے والا نہیں، درد شروع کرنے والا۔"

مجھے ساری تفصیل یاد آ گئی۔ وہ سبزی مائل مہلک دوا جس کے بارے میں میڈم نے بتایا تھا کہ یہ بندے کو مچھلی کی طرح تڑپاتی ہے اور اس کی دوسری ڈوز اسے زندگی کی سرحد پار کرا دیتی ہے۔ میڈم کے مطابق زرگاں میں سُولی کی سزا کے بعد یہ دوسری بڑی سزا تھی اور یہ سزا چار افراد کو صرف اس بنا پر دی گئی تھی کہ انہوں نے اپنے بے رحم صیاد کی موت پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

عمران نے بتایا۔ "ٹیکے کی سزا والی خبر پھیلی تو قیدی مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے گارڈز کی وردیاں پھاڑیں، انہیں مارا پیٹا...... اور کوٹھریوں میں بند کر دیا۔ وہ شاید جیل توڑنے میں ہی کامیاب ہو جاتے مگر زبردست فائرنگ نے انہیں بے بس کر دیا۔ اب جیل حکام نے سو کے قریب قیدیوں کو پکڑ لیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ان میں سے تیس چالیس قیدیوں کو مثالی سزا دی جائے گی تا کہ باقیوں کو عبرت ہو۔"

"مثالی سزا سے کیا مطلب؟"

"اسحاق والی سزا۔ سرِ عام سُولی پر ٹانگ کر ہڈیوں کا چُورا اور پھر موت۔" عمران نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کوئی قانون بھی لاگو ہوتا ہے یہاں؟ یا جو کچھ حکم جی کے دماغ میں آئے وہی قانون ہے۔" میں نے کہا۔

"حکم جی کا تو نام ہی حکم ہے، وہ حکم صادر نہیں کرے گا تو کیا گنگو تیلی کرے گا...... لیکن یہ بات صحیح ہے کہ اس طرح کی حاکمیت بغاوت کو جنم دیتی ہے اور یہی کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ پکڑے جانے والے زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک آدھ دن میں نل پانی سے بھی کوئی گرما گرم خبر آ جائے گی۔ اس سے پہلے بھی زرگاں اور نل پانی میں اسی وجہ سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جارج گورا کی جیل میں انور خاں کا ساتھ دینے والے کئی قیدیوں کو سرِ عام سُولی چڑھایا گیا تھا۔"

"لگتا ہے کہ حالات پھر کشیدہ ہو رہے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم کسی گڑبڑ سے پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں۔" میں نے پوچھا۔

عمران بولا۔ "کل میڈیم صفورا تمہارے ڈاکٹر سے بات کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں کم از کم دس دن اور بیڈ ریسٹ کرنا ہو گا لیکن...... میرا خیال ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو

بہتر بتاؤ...... اور ذرا چل پھر کر دکھاؤ تو ہو سکتا ہے کہ چار پانچ روز میں ہی چھٹی مل جائے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ میں اب سفر کر سکتا ہوں۔" میں نے بستر سے اُٹھ کر چند قدم کمرے کے اندر ہی چہل قدمی کی۔

"تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ تمہیں درد ہو رہا ہے۔"

"درد تو اب اپنا "عشق" ہے یار! اس کی کوئی پریشانی نہیں ہے مگر کچھ اور باتیں ضرور فکر مند کرتی ہیں۔"

"مثلاً؟" عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے دائیں بائیں دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ حکم جی اور اس کے ہزاروں بے رحم ہرکارے ہمیں حمیدہ سمیت یہاں سے نکل جانے دیں گے؟"

"یہ بات واقعی سوچنے کی ہے۔" عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ پنڈت مہاراج نے یہاں انصاف کا جھنڈا تھاما ہوا ہے۔ وہ یہاں وہی کچھ کر رہا ہے جو دھرم کی کتابوں اور پوتھیوں شاستروں وغیرہ میں لکھا ہوا ہے لیکن اندر سے اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ وہ بھی اسی حد تک جا سکتا ہے جس حد تک اسے اپنی خیریت نظر آئے گی۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو...... کیا ہمیں یہاں سے روانہ کرنے کی باتیں بس ڈھکوسلا ہیں؟"

"خیر، ایسا تو نہیں ہے۔ زرگاں کے مسلمانوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لئے حکم اور اس کے ساتھیوں کو کچھ تو کرنا ہو گا۔ وہ زبان دے چکے ہیں، اگر صاف مکریں گے تو ان کی ساکھ کا بیڑا غرق ہو گا۔ ہاں، ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ عین موقع پر تمہاری اور حمیدہ کی روانگی روکنے کے لیے کوئی زبردست عذر تراش لیں یا پھر ایک خاص فاصلے تک تمہیں محفوظ راستہ دینے کے بعد دوبارہ پکڑ لیں۔ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"کیسا بھی ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چلو چھوڑو یار ان باتوں کو۔ لوگ تو پہلے ہی کہتے ہیں کہ یہ نیوز چینلز والے تصویر کا سب سے برا رخ دکھاتے ہیں اور بعض اوقات صرف رخ ہی رخ ہوتا ہے، تصویر ہوتی ہی نہیں۔" وہ ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔

"اور لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ یہ چکنے گھڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ صرف وہی بات بتاتے ہیں جو بتانا چاہتے ہیں۔"

"خدا کا خوف کرو۔ تم مجھے چکنا گھڑا کہہ رہے ہو جبکہ میرے سر پر بال ہی بال ہیں اور یہ بال یونہی میرے سر پر نہیں ہیں۔ اس کے لئے بڑی محنت ہوئی ہے۔ اپنے دماغ کو بہت بچا کر رکھتے ہیں ہم لوگ۔ برے سے برے حالات میں بھی اس پر زور نہیں پڑنے دیتے۔ یہ دانش کا دور نہیں، فیس ویلیو کا دور ہے۔ اسکرین پر اپنی آب و تاب برقرار رکھنا پڑتی ہے۔ باقی دانش کا کیا ہے؟ یہ تو انٹرنیٹ سے آ ہی جاتی ہے۔ بیس منٹ انٹرنیٹ کے سامنے بیٹھو، کسی بھی موضوع پر علامہ کا درجہ پا جاؤ گے......"

وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا اور اصل موضوع وہیں دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بہرحال، یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ہماری روانگی کے حوالے سے عمران کے ذہن میں بھی بہت سے خدشات موجود ہیں۔ آنے والا وقت ایک گہری دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اس دھند میں داخل ہونے سے پہلے یہ جاننا مشکل تھا کہ اندر کیا ہے۔

ایک ہفتے بعد مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور میں لال بھون میں میڈم صفورا کے پاس آ گیا۔ لال بھون میں آج کل سناٹا تھا۔ ساتویں کا جشن گزرے ابھی پندرہ بیس دن ہی ہوئے تھے۔ پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی دوشیزاؤں کی تربیت کی گہما گہمی اب یہاں نہیں تھی۔ وہ گھنگروؤں کی جھنکار، وہ سریلے قہقہے...... اور رنگ برنگے آنچل۔ وہ سب کچھ کہیں اور تھا۔ غالباً وہ سب کچھ ابھی تک راج بھون کی خلوت گاہوں کو چمکا رہا تھا۔ رنگ برنگے آنچلوں میں ڈوبتے اُبھرتے ہوئے دودھیا ہاتھ مے نوشوں کے لئے جام بنا رہے تھے...... اور لال بھون میں سناٹا تھا۔

گیتا مکھی بھی بس آرام ہی فرما رہی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ بنی سنوری نظر آتی تھی اور شاید اس کی ایک وجہ عمران بھی تھا۔ وہ اس کی ہلکی پھلکی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ حوصلہ افزائی صرف باتوں تک محدود ہے۔ دونوں گفتگو کے دھنی تھے۔ گیتا مکھی سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے بولتی تھی اور عمران کے پاس اس رفتار کا توڑ موجود تھا۔

حمیدہ بھی لال بھون میں ہی موجود تھی۔ وہ سوگوار حسن کی مثال نظر آتی تھی۔ اس کا شوہر صرف ایک سال پہلے اسے دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یقیناً وہ ابھی اس کی موت کا غم بھول نہیں سکی تھی۔ اب اس کا دیور بھی اسے ایک نہ بھولنے والا دکھ دے گیا تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں یہ خوف جما ہوا تھا کہ ابھی وہ خطرے میں ہے۔ غالباً ہماری طرح اسے بھی یقین نہیں تھا کہ وہ زرگاں سے بحفاظت نکل سکے گی۔ اس کی عجیب سی کیفیت

تھی۔ ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی۔ کوئی آواز دیتا تو بدک اُٹھتی۔ کہتے ہیں کہ درندے کی دہشت، درندے کے جانے کے بعد بھی تادیر اس کے شکار پر طاری رہتی ہے۔ حمیدہ بھی جارج کا شکار تھی۔ وہ اس کے قبضے میں رہی تھی۔ اب وہ عدم آباد روانہ ہو چکا تھا۔ حمیدہ آزاد تھی مگر گزرے دنوں کا ہراس جیسے اس کی روح میں جذب ہو گیا تھا۔

مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ میں نے تادیر اس سے گفتگو کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد میرے ساتھ آزاد فضاؤں میں پہنچنے والی ہے۔ وہ بس 'ہوں ہاں' میں جواب دیتی رہی۔ آخر میں اس نے لرزتی آواز میں بس اتنا کہا۔ "میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ جھیلا۔ اتنے سارے زخم کھائے۔ میں جتنی دیر زندہ رہی، آپ کی یہ مہربانی بھول نا ہیں سکوں گی۔"

"تم سے کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے گردن جھکائی اور نفی میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد ہولے سے بولی۔ "لیکن جب میرے دیور اسحاق نے میرے لئے لڑائی کی اور ہارا تو جارج صاحب نے بہت شراب پی تھی۔ لڑکیوں کا ناچ دیکھا تھا اور مجھے بھی ناچنے کے لئے کہا تھا۔ میں نا ہیں ناچ سکی تو انہوں نے مجھے سخت برا بھلا کہا اور بولے...... تم اب بہت جلد میری جورو بننے والی ہو۔ میرے طریقے کے مطابق چلنا سیکھو۔"

"اب پریشانی کی کوئی بات نہیں حمیدہ۔" میں نے کہا۔ "اب وہ ذلیل "اپنے طریقے" کے مطابق چلتا ہوا قبر میں اُتر چکا ہے اور ہم اپنے طریقے پر چل کر ان شاء اللہ نل پانی پہنچیں گے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر ہولے سے بولی۔ "آپ نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نا ہیں بتایا۔"

میں نے کہا۔ "میرے خیال میں تمہارے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہم دونوں اسحاق کے دوست ہیں۔ تم اس کی بھابی تھیں تو ہماری بھی بھابی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ اپنی سفید اوڑھنی سے آنکھوں کے کنارے پونچھ کر بولی۔ "آپ کو میرے بارے میں اسحاق نے بتایا تھا؟"

"نہیں، یہ کوئی اور تھا۔" میں نے کہا۔ "اسی نے ہمیں تمہاری ساری کہانی سنائی اور بتایا کہ تم کس حال میں ہو۔"

"کون تھا وہ؟" وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔

”تمہاری ایک خیر خواہ......لیکن اس کے بارے میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

اسی دوران میں میڈم صفورا کی آواز آنے لگی۔ وہ راج بھون سے واپس آئی تھی اور ملازموں کو ضروری ہدایات دے رہی تھی۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ عمارت کی ڈیوڑھی سے اندر آنے کے لئے میڈم کو یقیناً چھتری کی ضرورت تھی۔ عمران نے مجھے آنکھ ماری اور پھر ایک چھتری لے کر بڑے ”خادمانہ“ انداز میں جلدی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں عمران نے میڈم کے ساتھ اپنے تعلقات کافی سے زیادہ بہتر کر لئے تھے۔ اسے دلوں میں گھر کرنے کا فن آتا تھا۔ وہ اپنے مخالفین پر زبردست خوش اخلاقی اور اپنائیت سے حملہ آور ہوتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی نفرت کے دانت کھٹے کر دیتا تھا۔ میڈم کی ”دشمنی“ پر اس نے پہلا شدید حملہ تب کیا جب بند کمرے میں زہریلے سانپ نے میڈم کو ڈسا تھا۔ عمران نے بے دریغ اپنے ہونٹ میڈم کے زہریلے زخم پر رکھ دیئے تھے اور دراصل یہیں سے ان کے تعلق نے ایک نیا موڑ لینا شروع کر دیا تھا۔ میڈم کے لئے اپنی چھوٹی بہن کے قاتل کو معاف کرنا آسان نہیں تھا......مگر دھیرے دھیرے ایسا ہو رہا تھا...... اور اب تو کسی وقت لگتا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔

تھوڑی دیر بعد میڈم اور عمران باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عمران خود بھیگ گیا تھا مگر میڈم کے اوپر چھتری موجود رہی تھی۔ میڈم کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ راج بھون سے کامیاب لوٹی ہے۔ دراصل میں نے میڈم صفورا سے کہہ رکھا تھا کہ وہ حکم سے اس بات کی اجازت لے کہ میں عمران کو اپنے ساتھ نل پانی لے جا سکوں۔ وہ اسی سلسلے میں راج بھون گئی ہوئی تھی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ میڈم نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ حکم جی نے میری یہ استدعا قبول کر لی ہے۔ میں اپنے ہم وطن کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔

عمران نے کہا۔ ”کیا بات ہے میڈم! ہماری ہر استدعا مانی جا رہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہو تو کہیں کچھ غلط بھی ہوتا ہے۔“

میڈم فوری جواب دینے کے بجائے سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر بعد بولی۔ ”اس موقع پر یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندیشے غلط ہوں۔ پنڈت مہاراج نے واقعی راج بھون والوں کو قائل کر لیا ہو کہ ”کمٹ منٹ“ کے مطابق تابش کو چھوڑ دینا چاہئے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کل رات بھی پنڈت مہاراج اور حکم جی کی طویل میٹنگ

ہوئی ہے۔ اس میٹنگ میں رنجیت پانڈے شریک نہیں تھا حالانکہ ایسے موقعوں پر وہ شریک ہوتا ہے۔ تمہاری بحفاظت روانگی اور سیکیورٹی کی ذمے داری ایک مسلمان فوجی افسر بشارت علی خاں کو سونپی گئی ہے۔ وہی تمہیں زرگاں کی آخری حد تک لے جائے گا۔ بہرحال ابھی اس بارے میں حتمی فیصلہ ہونا ہے......“ وہ آگے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر خاموش ہو گئی۔

عمران نے کریدا۔ ”آپ کچھ بتانے لگی تھیں؟“

اس نے طویل سانس لی اور بولی۔ ”کچھ باتیں شک رفع کرنے والی ہیں تو کچھ شک ڈالنے والی بھی ہیں۔ تمہیں وہ بڑھیا تو یاد ہے نا جس نے حکم جی کے دربار میں ہنگامہ مچایا تھا؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میڈم بولی۔ ”گیتا مکھی کو ارد گرد کی بڑی خبر رہتی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ پرسوں صبح بڑھیا نے پھر بڑا غدر مچایا ہے۔ اس نے چار پانچ دن سے کھانا پینا بند کر رکھا تھا۔ پرسوں صبح وہ محافظوں کے روکنے کے باوجود بھرے دربار میں چلی آئی۔ اس نے اس بات پر سخت احتجاج کیا کہ سامبر کی آڑ میں تم جیسے بڑے اپرادھی کو چھوڑا جا رہا ہے۔ اس نے واویلا کیا کہ دھرم کے پالن کے لئے اس نے اپنی پوری فیملی قربان کی ہے۔ اب وہ خود کو بھی قربان کر دے گی۔ اس نے خود کو باقاعدہ آگ لگانے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے اسے سنبھالا گیا۔ بعدازاں حکم جی اور رتنا دیوی وغیرہ نے اسے علیحدگی میں سمجھایا بجھایا۔ یہ بڑھیا اب بالکل مطمئن نظر آتی ہے۔ گیتا مکھی بتا رہی تھی کہ وہ اب کھا پی بھی رہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ اس میں یہ تبدیلی کیوں آئی ہے......“

کچھ دیر تک اس بارے میں بات ہوئی پھر عمران نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”میڈم! تو پھر آپ نے اپنے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کب پہنچ رہی ہیں نل پانی؟“

”تمہیں اتنی فکر کیوں ہے میری؟“

”آپ کی فکر کیوں نہیں ہو گی۔ یقین کریں ان چند ہفتوں میں آپ کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ آپ کی کمی بے طرح محسوس ہو گی......اور ویسے بھی ہمارا ساتھ کوئی آج کا تو نہیں ہے میڈم۔ برسوں کی بات ہے۔“

”اُلو مت بناؤ۔ میں جانتی ہوں تم یہاں اسٹیٹ میں صرف تابش کے لئے آئے۔ میرے یا ابرار صدیقی کے بارے میں تم نے بھول کر بھی نہیں سوچا ہو گا۔“

”ایسا مت کہیں میڈم! آپ نہیں جانتیں کہ آپ ہمارے لئے کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ یقین کریں، میں تو چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ آپ ہمارے ساتھ ہی یہاں

سے روانہ ہوں۔"

"اور تم جانتے ہو، ایسا ممکن نہیں ہے۔" میڈم مسکرائی۔ پھر سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "ہاں، مستقبل قریب میں امید رکھی جا سکتی ہے۔ میں کوئی ایسا موقع تلاش کروں گی کہ یہاں سے نکل کر نل پانی پہنچ سکوں۔"

"لیکن آپ کوئی بڑا خطرہ مول مت لیں۔" میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ "اگر بڑا خطرہ مول لینا پڑے تو پھر آپ انتظار کریں۔ ہمارا وعدہ ہے میڈم! ہم آپ کو اور ابرار صدیقی کو لئے بغیر اسٹیٹ سے نہیں جائیں گے۔"

"میں نے بہت پہلے وعدوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بہرحال، اچھے کی امید تم بھی رکھو میں بھی رکھتی ہوں۔" میڈم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ پھر ذرا توقف کر کے کہنے لگی۔ "تابش! تم اپنا بہت خیال رکھو۔ تم نے جارج جیسے شخص کو ہرا کر جہاں ایک بے مثال وکٹری حاصل کی ہے، وہاں اپنے بہت سے دشمن بھی بنا لئے ہیں۔ یہ دشمن صرف یہاں ہی نہیں، نل پانی میں بھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

میں نے میڈم صفورا کو یقین دلایا کہ میں اس کی ہدایات پر عمل کروں گا۔

...... اور پھر ہماری روانگی کی تیاری مکمل ہو گئی۔ ہم عجیب گومگو کی کیفیت میں تھے۔ کبھی لگتا تھا کہ ہمیں نیک نیتی کے ساتھ یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے۔ کبھی دال میں کچھ کالا لگتا تھا۔ ایک دن پہلے پنڈت مہاراج نے لال بھون آ کر مجھے آشیرباد دی اور کہا کہ نہایت نامساعد حالات کے باوجود حکم جی اپنا وعدہ پورا کر رہے ہیں اور مجھے حمیدہ بی بی کے ساتھ زرگاں سے روانہ کیا جا رہا ہے۔

میں نے پنڈت مہاراج کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میری سلامتی اور بخیریت واپسی میں ان کا کردار ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

پنڈت مہاراج ان لوگوں میں سے تھا جو میانہ رو ہوتے ہیں۔ انہیں برا کہا جا سکتا ہے نہ اچھا، نہ سیاہ نہ سفید۔ ان میں انسانی خوبیاں اور خامیاں ایک عجیب امتزاج کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔

روانگی سے ایک رات پہلے میں نے لال بھون کے ایک کمرے میں عجیب منظر دیکھا۔ عمران اور میں ساتھ ساتھ ہی فرش پر سوتے تھے۔ رات کے وقت میری آنکھ کھلی تو عمران موجود نہیں تھا...... میں نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دروازے کے ہینڈل کو گھمایا۔ وہ لاک نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عمران باہر نکلا ہے۔ میں نے باہر نکل کر راہداری میں جھانکا۔

آخری سرے پر جہاں لڑکیوں کی ٹرینر گیتا مکھی کا کمرا تھا، روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں دروازے تک پہنچا۔ کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر نائٹ بلب کی روشنی تھی۔ شروع میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر کمرے کے اندر حرکت ہوئی اور خوش قسمتی سے میں عمران اور گیتا مکھی کو دیکھنے میں کامیاب رہا۔ گیتا مکھی کی جوانی ڈھل رہی تھی اور ساتھ ہی اس کا لوچ دار جسم بھی۔ وہ زیادہ خوش شکل بھی نہیں تھی۔ بس اس کا فن اور رقص میں اس کی مہارت تھی جس کی وجہ سے اس کی قدر تھی۔ لڑکیوں کی استاد کی حیثیت سے وہ اچھی خاصی تنخواہ پاتی تھی۔ زرگاں کے خواص سے اس کے تعلقات تھے۔ عمران اس سے دل لگی کرتا رہتا تھا لیکن یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں عمران جیسے وجیہہ اسمارٹ شخص کو گیتا جیسی تھکی ہوئی عورت کے اتنا قریب پاؤں گا۔ میں نے اسے عمران کے بالکل پاس کھڑے ہو کر باتیں کرتے دیکھا۔ پھر وہ عجیب جذباتی انداز میں عمران کے گلے لگ گئی اور عمران کے رخسار کا بوسہ لیا۔ یہ کافی طویل بوسہ ثابت ہوا۔ اسی دوران میں اس نے عمران کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ عمران نے بھی اپنی بانہیں اس کے گرد حمائل کر دیں۔ عمران کے رخسار کے بعد اس کے ہونٹوں کی باری آئی...... وہ اس کے ساتھ پیوست سی ہو گئی۔ وہ قریباً نصف منٹ تک اسی طرح کھڑے رہے پھر وہ لال بھبوکا چہرے کے ساتھ عمران سے علیحدہ ہو گئی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران باہر آنا چاہ رہا ہے۔ میں جلدی سے ہٹ گیا اور واپس کمرے میں پہنچ کر فرشی بستر پر دراز ہو گیا۔ ایک دو منٹ بعد عمران بھی واپس آ گیا۔ اس نے کھوجی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں جاگ تو نہیں رہا۔ پتا نہیں کہ اس کا شک رفع ہوا یا نہیں، بہرحال وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ میں نے بھی خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا بندہ تھا۔ اس کی کسی بھی بات کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔

اگلے روز علی الصباح ہم لال بھون سے روانہ ہو گئے۔ سردی کا زور کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ زرگاں کے مندروں اور گرجوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ راج بھون کی عظیم الشان عمارت کی بلندیاں بھی لشکارے مار رہی تھیں۔ اس عظیم الشان عمارت میں چند ہفتے پہلے ہم دونوں نے "نزول" کیا تھا اور مار دھاڑ کے موسم کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں پر بھرے دربار میں حکم جی اور عمران کے درمیان یادگار مکالمہ ہوا تھا جس میں عمران نے فتح پائی تھی۔ یہیں پر ساتویں کا جشن برپا ہوا تھا اور رنگ و بو کا سیلاب آیا تھا۔ یہیں پر میرے اور جارج گورا کے درمیان یادگار مقابلہ ہوا اور جارج گورا ایک سنگین غلطی کے سبب رام پوری چاقو کا شکار ہوا۔

زرگاں حدِ نگاہ تک ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا اور اس کی ساری خوبیوں اور خامیوں سمیت ہم اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اس کی ساری خوب صورتیاں اور بدصورتیاں، ساری محبتیں اور نفرتیں ہم سے جدا ہو رہی تھیں لیکن کیا ہم واقعی جا رہے تھے؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں، حمیدہ اور عمران ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار تھے۔ میجر مدن بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس گھوڑا گاڑی کو چاروں طرف سے مسلح گارڈز نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک اور گھوڑا گاڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ میجر مدن نے بتایا کہ اس میں پنڈت مہاراج کا ایک نمائندہ ہے اور دربار کے ایک دو عہدے دار ہیں۔

میڈم صفورا نے بتایا تھا کہ ہماری روانگی کو راز رکھا جا رہا ہے، اس کے باوجود ہمیں اندازہ ہوا کہ مسلح گارڈز کے حصار سے آگے بہت سے عام لوگ بھی موجود ہیں...... ان میں ہمارے حمایتی تھے اور مخالف بھی۔ بہرحال حمایتیوں کی تعداد زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ ان کے نعرے ہم تک پہنچ رہے تھے۔ دوسری طرف مخالفانہ نعروں کی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔ مخالفانہ نعروں کا مفہوم یہ تھا کہ میں اپرادھی ہوں، میری جگہ نل پانی نہیں، زرگاں کی جیل ہے وغیرہ وغیرہ۔

میری حمایت کے نعرے کچھ سہمے سہمے تھے مگر نعرہ زن افراد کی تعداد زیادہ تھی...... میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ ان نعرہ زن افراد میں وہ لڑکی بھی شامل ہو جس نے شروع شروع میں ہمیں زرگاں میں پناہ دی تھی۔ اس کا نام وجنتی تھا۔ ہم اتفاقاً اس کے گھر میں گھسے تھے۔ وہ حمیدہ کی سہیلی نکلی تھی اور اسی نے ہمیں حمیدہ کی مصیبت سے سب سے پہلے آگاہ کیا تھا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ ریٹائرڈ فوجی اہلکار کی وہ خوش باطن لڑکی بھی ہمیں الوداع کہنے والوں میں شامل ہے اور اپنی سہیلی کی رہائی کی خوشی اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر چمک رہی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”وجنتی! اگر تُو ہمیں دیکھ رہی ہے تو جان لے کہ ہم نے یہاں تک اپنا وعدہ پورا کیا۔ اسحاق کے بے رحم قاتل کو جہنم واصل کیا اور تیری سہیلی کو رہائی دلائی۔ اب آگے کیا ہونا ہے، یہ ہم نہیں جانتے۔ انسان کا کام کوشش ہے اور وہ ہم کر رہے ہیں۔“

ہمارے سیکیورٹی گارڈز کا انچارج وہی بشارت علی خاں نامی افسر تھا۔ وہ اپنے چتکبرے گھوڑے پر سوار ہماری گھوڑا گاڑی کے بالکل ساتھ جڑا کھڑا تھا۔ اس کی شخصیت متاثر کن تھی۔ مسلح گارڈز کے عقب میں میری نگاہ ایک اور شخص پر پڑی۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ ہمارے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔ شاید وہ ہماری روانگی کا نظارہ

کرنے کے لئے یہاں موجود تھا۔ اس کا سانولا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نفرت کی سرخی تھی۔ جارج کی شکست نے جہاں ہمارے اور بہت سے بدخواہوں کو گہری مایوسی میں دھکیلا تھا، وہاں رنجیت پانڈے کے غیظ و غضب کی کمر بھی توڑ کر رکھ دی تھی۔ سامبر مقابلے کے بعد سے رنجیت پانڈے ایک بار بھی میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ اب بھی وہ گھوڑا گاڑی سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا۔

ہمیں ”الوداع“ کرنے والوں میں گیتا مکھی بھی شامل تھی۔ وہ میڈم صفورا کے عقب میں کھڑی تھی۔ میں جب سے یہاں آیا تھا، گیتا مکھی کو باتیں کرتے ہی دیکھا تھا۔ آج وہ پہلی بار گم صم نظر آئی۔ گھوڑا گاڑی حرکت میں آئی تو اس نے بھی الوداعی انداز میں ہماری طرف ہاتھ ہلایا مگر مجھے لگا کہ اس نے یہ ہاتھ صرف عمران کے لئے ہلایا ہے۔

نل پانی کی طرف ہمارا سفر شروع ہوا۔ میجر مدن نے ہمیں بتایا۔ ”یہاں سے قریباً ساٹھ کلومیٹر کی دوری پر وہ جگہ ہے جسے ”جوڑا ٹیلے“ کہا جاوت ہے۔ یہ دراصل دو ٹیلے ہیں جہاں پر زرگاں کی حد ختم ہو جاوت ہے۔ ان ٹیلوں کے پاس سے گزرنے والے ایک برساتی نالے کو ہم زرگاں کی سرحد بھی کہہ سکت ہیں۔ آپ لوگن کے ساتھ جو گارڈز جا رہے ہیں، وہ آپ کو اس سرحد تک پہنچانے کے ذمے دار ہیں۔ اس سے آگے آپ خود سفر کریں گے۔“

”اسی گھوڑا گاڑی پر؟“ میں نے پوچھا۔

”ناہیں جی۔ آگے کچھ دشوار راستے بھی ہیں جہاں گھوڑا گاڑی کے لئے چلنا مشکل ہووے گا۔ آپ کو گھوڑے دیئے جاویں گے۔ دو دن کا راشن دیا جاوے گا۔ اپنی رکھشا کے لئے آپ کو دو رائفلیں بھی مہیا کی جاویں گی۔“

”اس کے بعد ہم جانیں اور ہمارا کام؟“ عمران نے لقمہ دیا۔

”ہاں، پنڈت مہاراج کے فیصلے کے مطابق اس کے بعد آپ کو خود ہی سفر کرنا ہووے گا۔“

سنہری دھوپ حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی کے اندر بھی خوش گوار حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ سفر میں لگنے والے دھچکوں کی وجہ سے میری متاثرہ پسلی میں بار بار درد کی لہر اُٹھتی تھی مگر یہ قابلِ برداشت درد تھا۔ حمیدہ بدستور سہمی بیٹھی تھی۔ کسی ایسی چڑیا کی طرح جس پر خونخوار عقاب کی دہشت نے سکتہ طاری کر رکھا ہو۔ شاید اسے ابھی تک بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ اسے جارج گورا جیسے شخص سے چھڑا لیا گیا ہے اور اب وہ آزاد فضاؤں میں پہنچنے والی ہے۔

ایک جگہ درختوں کے درمیان ایک قدرتی چشمے کے قریب رک کر ہم نے دوپہر کا کھانا

کھایا اور ہمارا سفر پھر سے شروع ہوا۔ عمران اپنی پُر مزاح باتوں سے اس تناؤ کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا جو سفر کے آغاز سے ہمارے اندر موجود تھا۔

سہ پہر کے وقت ہم اس خاص مقام تک پہنچ گئے جسے ''جوڑا ٹیلے'' کہا جاتا تھا۔ چند ہفتے پہلے جب میں اور عمران سبزیوں سے لدی ہوئی گھوڑا گاڑی کے ساتھ دیہاتیوں کے روپ میں زرگاں پہنچے تھے تو تب بھی یہ جڑواں ٹیلے ہماری نگاہوں سے گزرے تھے۔ تاہم اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے زرگاں کی حد شروع ہوتی ہے۔

جس برساتی نالے کا مدن نے ذکر کیا تھا، وہ بالکل خشک تھا۔ اس کی گہرائی بھی معمولی سی تھی۔ اس کے کنارے ہمیں جنگلی جانوروں کے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ جھاڑیوں کی حالت اور درختوں کی شکست و ریخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ پالتو ہاتھی بھی یہاں سے گزرتے رہتے ہیں۔ ایک مقام پر ہمارا قافلہ رک گیا۔ پنڈت مہاراج کی نمائندگی ایک چھوٹے قد کا سیاہی مائل پنڈت کر رہا تھا۔ اس کے سر پر لمبی بودی اور گلے میں نصف درجن مالائیں تھیں۔

ہم گھوڑا گاڑی سے اُترے۔ پنڈت نے ہمیں آشیر باد دی۔ سیکیورٹی کے انچارج فوجی افسر بشارت علی خاں نے ہمیں بتایا کہ یہاں پر ان کی ذمے داری ختم ہو جاتی ہے۔ اب آگے ہم کو خود ہی سفر کرنا ہوگا۔

اس نے دو رائفلیں اور ایمونیشن کے دو چھوٹے بیگ ہمارے حوالے کر دیئے۔ چھ صحت مند گھوڑے ہمارے لئے تیار کھڑے تھے۔ یہ تازہ دم گھوڑے پہلے سے یہاں موجود تھے۔

بشارت نے نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تین گھوڑے آپ تینوں کی سواری کے لئے ہیں۔ اس سفید گھوڑے پر آپ لوگن کا سامان اور راشن وغیرہ ہے۔ باقی دو گھوڑے فالتو ہیں۔ راستے میں آپ کو ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

پنڈت نے کہا۔ ''بھگوان سے ہماری پرارتھنا ہے کہ تم لوگن کا باقی کا سفر بھی خیریت سے گزرے۔ ہمارے لائق کوئی اور سیوا ہو تو ہمیں بتا دو۔''

''ایک گرم گرم دودھ پتی مل جاتی تو کیا بات تھی۔'' عمران نے سرگوشی کی جو بس میں ہی سن سکا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' پنڈت نے عمران سے پوچھا۔

''کچھ نہیں جی۔ آپ لوگوں کا پریم دیکھ کر آپ سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہ رہا...... کتنا اچھا ہوتا اگر آپ کچھ دیر اور ہمارے ساتھ رہتے۔''

''کوئی بات ناہیں۔ ہماری پرارتھنا تو آپ کے ساتھ ہے۔''

عمران نے دائیں بائیں دیکھا۔ ''کدھر ہے جی؟''

''کون؟''

''پرارتھنا۔'' عمران نے کہا۔

''پرارتھنا کا مطلب ہے کہ ان کی دعا ہمارے ساتھ ہے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اوہ، میں سمجھا پنڈت جی اپنی سندر بیٹی کی بات کر رہے ہیں۔ اس سے مندر کی سیڑھیوں پر ملاقات ہوئی تھی۔ میں سمجھا شاید اس کا نام پرارتھنا ہے۔'' عمران نے بتیسی نکال کر کہا۔

پنڈت کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے ناگواری سے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے سمجھ نہیں پایا کہ اس کی اس اوٹ پٹانگ بات کا کیا جواب دے۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ بے ہودگی برداشت کی اور اشلوک پڑھ کر ہمیں جانے کی اجازت دی۔

عمران نے حمیدہ کو سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا۔ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے۔ باقی تینوں گھوڑے بھی ایک ہی رسّی سے بندھے ہوئے ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے زرگاں کی خیالی سرحد پار کی اور مشرق کی سمت بڑھنے لگے۔ یہ ویران راستہ تھا۔ یہ کہیں کہیں جھاڑیاں یا اونچی جنگلی گھاس تھی۔ زمین نیم پختہ تھی۔ گھوڑے دلکی چال چلتے ''جوڑا ٹیلے'' سے دور ہونے لگے۔

ہم تقریباً نصف کلومیٹر دور آ گئے تو عمران نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ہمیں رخصت کرنے والے اب ایک سیاہ لکیر کی طرح نظر آ رہے تھے۔ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتا ہے تابی...... یہ لوگ ہمیں بڑی گرم دودھ پتی پلانے والے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''یار دودھ پتی کا مطلب دودھ پتی ہوتا ہے اور یہ اتنی زیادہ گرم ہوگی کہ اگر ہم نے پینے کی بے احتیاطی کی تو ہمارے تالو جل جائیں گیا اور روزِ حشر تک یہ سڑن کم نہیں ہوگی۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ میں نے کہا۔

''یار! سیدھی بات کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''ان لوگوں نے ہمیں آزاد نہیں کیا...... بس چھوڑا ہے...... وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے۔''

''ہاں، میرا خیال ہے۔ ان سامنے والے درختوں تک پہنچتے پہنچتے سب کچھ سامنے آ

جائے گا لیکن ابھی تم مڑ کر نہ دیکھنا......بس اسی طرح چلتے رہو۔'' عمران نے سنسناتی آواز میں کہا۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ ہم نے یہ گفتگو دھیمے لہجے میں کی تھی پھر بھی ہمارے آگے جاتی ہوئی حمیدہ کچھ چونک سی گئی۔ اس نے مری مری آواز میں پوچھا۔ ''کیا کوئی خطرہ ہے بھائی؟''

''نہیں......ابھی تو نہیں ہے لیکن تمہیں چوکس رہنا ہے۔'' میرے بجائے عمران نے جواب دیا۔

''ایک رائفل مجھے دے دو۔'' میں نے عمران سے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ یہ کام نہیں کریں گی۔'' عمران نے پورے یقین سے کہا۔

میری بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ جونہی ہم ٹنڈ منڈ درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پہنچے، عمران نے مڑ کر دیکھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دور ہمارے عقب میں ''جوڑا ٹیلے'' کے پاس سیاہ لکیر حرکت میں آ چکی تھی۔ یہ دراصل وہ درجنوں مسلح گھڑسوار تھے جو ہمارے محافظ بن کر ہمیں یہاں تک چھوڑنے آئے تھے۔ اب وہ آندھی کی رفتار سے پھر ہماری طرف آ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارا بدترین اندیشہ حقیقت کا روپ دھار گیا ہے۔ یہ لوگ پھر سے ہمیں پکڑنے کے لئے آ رہے تھے۔ یہ منافقت اور ریاکاری کی انتہا تھی۔ یہ ان پنڈتوں، پجاریوں کی بے مثال دھوکا دہی تھی۔ پہلے ہمیں چھوڑ کر اپنے دھرم اور عقیدوں کا منہ بند کیا گیا پھر ہمیں دوبارہ پکڑنے کا جواز ڈھونڈ لیا گیا۔

عمران نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے حمیدہ والے گھوڑے کی لگام بھی تھام لی اور چلایا......''بھاگو تابش۔''

ہم نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور انہیں بھگا دیا۔ ہمارے عقب میں رسد والا گھوڑا اور اس کے عقب میں دونوں اضافی گھوڑے بھی بھاگ اُٹھے۔ یہ کافی رفتار تھی پھر بھی اس رفتار کے مقابلے میں بہت کم تھی جو ہمارے پیچھے آنے والوں نے پکڑ رکھی تھی۔ صاف اندازہ ہوا کہ وہ تیزی سے ہمارے قریب آ رہے ہیں۔ سامنے چٹیل میدان تھا اس میں بس کہیں کہیں جھاڑیاں اور خودرو درختوں کے جھنڈ تھے۔ کہیں کوئی قابلِ ذکر جائے پناہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''تیز دوڑاؤ تابی!'' عمران نے پھر پکار کر کہا۔

میں نے گھوڑے کی رفتار کو حتی الامکان حد تک بڑھایا۔ پسلیوں میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ عمران کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ ہم زیادہ دور تک اس طرح نہیں جا سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہم دو تین کلومیٹر تک اس طرح جاتے اور پھر دھر لئے جاتے۔ غالباً ہم نہتے بھی تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے عمران نے خود کہا تھا کہ ہمیں دی گئی رائفلیں کام نہیں کریں گی اور لگتا تھا کہ اس نے درست کہا ہے......

''عمران! وہ پاس آ رہے ہیں۔'' میں نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔

''آنے دو۔ تم بس آگے دھیان رکھو۔'' اس نے حمیدہ والے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے عقب میں دھول تھی اور اس دھول کے عقب میں کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر زرگاں کے ہرکارے طوفانی رفتار سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اب ایک قوس کی سی شکل بنالی تھی۔ یہ قوس لحہ بہ لحہ ہم سے اپنا فاصلہ کم کرتی جا رہی تھی۔ اچانک عمران نے اپنے مشکی گھوڑے کا رخ ترچھا کیا۔ ہم ناگ پھنی اور تھوہر کے درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچے۔ یہاں درختوں کے درمیان گھنی شاخوں کا سایہ تھا اور بارشی پانی کا ایک چھوٹا سا جوہڑ نظر آ رہا تھا۔ اس جوہڑ کے کنارے درختوں میں وہی جرمن جیپ کھڑی تھی جو عمران کے مطابق چند دن پہلے اس سے چھین لی گئی تھی۔

عمران نے بڑی تیزی سے راشن کا سامان گھوڑے سے اُتارا اور اسے جیپ میں پھینک دیا۔ اس دوران میں، مَیں اس کے کہنے پر حمیدہ کو سہارا دے کر گھوڑے پر سے اُتار چکا تھا۔

''چلو جلدی کرو......جیپ میں بیٹھو۔'' عمران چلایا۔

ہم دو تین سیکنڈ کے اندر جیپ میں تھے۔ جیپ ایسے رخ سے کھڑی کی گئی تھی کہ اسے بس اسٹارٹ کرنے کی دیر تھی، وہ سیدھی آگے نکل سکتی تھی۔ عمران نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اگنیشن میں چابی لگائی۔ میں عمران کے پہلو میں تھا۔ حمیدہ ہکا بکا سی پچھلی نشست پر تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ جیپ پہلے ''سیلف'' پر اسٹارٹ ہوئی۔ عمران نے ایک جھٹکے سے اسے آگے بڑھا دیا۔ ہم درختوں کے اس جھنڈ سے یوں نکلے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ ہم نے اپنے عقب میں زرگاں کے تیز رفتار ہرکاروں کو دیکھا......ان سے اب ہمارا فاصلہ مزید کم ہو چکا تھا۔ ان کی مدھم آوازیں بھی اب ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ غیظ و غضب سے لتھڑی ہوئی یہ آوازیں لحہ بہ لحہ واضح ہوتی جا رہی تھیں......لیکن اب ہمیں فکر نہیں تھی۔ ہمارے نیچے ہانپتے ہوئے گھوڑے نہیں، اسپیشل ماڈل کی شاندار جرمن گاڑی تھی۔ عمران اس کی رفتار بڑھاتا چلا

گیا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ایک انگلش ساخت کی طاقتور ''گن'' رکھی تھی۔ اس پر ٹیلی اسکوپ بھی چڑھی ہوئی تھی۔

میں نے گن اُٹھا کر عقب میں دیکھا۔ ٹیلی اسکوپ میں موت کے ہرکاروں کی شکلیں نظر آئیں۔ ان کی آنکھوں میں چنگاریاں تھیں مگر ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ شاید ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا اور کہ درختوں کے جھنڈ سے یوں اچانک جرمن جیپ نکلے گی اور ان کی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کر دے گی۔ پھر یکا یک مجھے تعاقب کرنے والے گھڑسواروں میں ایک چہرہ نظر آیا اور میرا خون کھول اُٹھا۔ یہ زرگاں کا خطرناک ترین کمانڈو اور سفاک پولیس افسر رنجیت پانڈے تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے چند قدم آگ گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ وہ گھوڑے کی پشت سے چپکا ہوا تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے بار بار گھوڑے کو کوئی چابک وغیرہ رسید کرتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ چلانے والے انداز میں اپنے ساتھیوں کو احکامات وغیرہ بھی جاری کر رہا تھا۔

میرے سینے میں ایک لہر سی اُٹھی۔ وقت کا پھیر زرگاں کے اس خطرناک ترین شخص کو میرے نشانے پر لے آیا تھا لیکن میرا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا۔ ہاں، میں کوشش کر سکتا تھا۔

میں نے گن کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور عمران سے پوچھا۔ ''لوڈ ہے نا؟''

''لوڈ ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمیں پکڑ نہیں سکیں گے۔''

''ضرورت ہے عمران!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ کتا میرے نشانے پر آ رہا ہے۔''

''کون؟''

''رنجیت پانڈے۔''

یہ اطلاع عمران کے لئے بھی دلچسپ تھی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر بولا۔ ''لیکن تم چلتی جیپ میں اتنی دور سے نشانہ نہیں لے سکو گے۔''

''کوشش تو کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگا دی۔

ناہموار راستے پر جیپ ہچکولے کھا رہی تھی۔ دوسری طرف ٹارگٹ بھی متحرک تھا۔ پھر بھی میں نے پوری یکسوئی کے ساتھ ٹیلی اسکوپ میں دیکھتے ہوئے پہلی گولی چلائی۔ زوردار دھماکا ہوا۔ رنجیت پانڈے کے پہلو میں گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک گارڈ الٹ کر گرا اور گھوڑے اسے روندتے ہوئے گزر گئے۔

طاقتور گن کی دوسری گولی رنجیت پانڈے سے آٹھ دس فٹ دائیں جانب ایک

دوسرے گھڑسوار کو لگی۔ یہ شخص دوڑتے گھوڑے پر سے رائفل کا فائر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یقیناً اس کا نشانہ ہماری جیپ ہی تھی۔ گولی کھا کر یہ شخص بھی اپنی رائفل سمیت گھوڑے کی پشت پر سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے کل چار گولیاں چلائیں۔ ان میں سے تین نے حکم کے گارڈز کو ہٹ کیا اور وہ اس دوڑ میں سے خارج ہو کر زمین بوس ہوئے۔ رنجیت پانڈے گن کے ہلاکت خیز بوسے سے بچا رہا۔ شاید میری یہ ''شوٹنگ'' ان تین افراد کی موت کا بہانہ تھی جنہیں میں مارنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ قدرت اسی طرح انسانی ارادوں کو خام کرتی ہے اور مستقبل کے وہ نقشے ترتیب دیتی ہے جو تقدیر کہلاتے ہیں۔ رنجیت کو ابھی زندہ رہنا تھا اور مرنے سے پہلے ایک سنگین واقعے کا سبب بننا تھا۔

...... جرمن جیپ اپنی فور وہیل پاور سے اُڑی جا رہی تھی۔ ہمارا تعاقب کرنے والے دیکھتے ہی دیکھتے بہت پیچھے رہ گئے۔ یقیناً انہوں نے ہمت ہار دی تھی۔ وہ جیپ کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ رہی سہی کسر گن کی مہلک فائرنگ نے پوری کر دی تھی۔

عمران بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب سکون کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھا اور گہری سانس لے کر کہا۔ ''تو یہ تھا سارا گیم؟''

''گیم...... کون سا گیم؟''

''تم بڑی کھوچل شے ہو عمران! مجھے شروع سے شک تھا کہ تم نے بیش قیمت انعام چھوڑ کر یہ جیپ لی ہے تو اس کی کوئی وجہ ہے۔''

''نہیں نہیں...... تم خواہ مخواہ شک کر رہے ہو، اس وقت میرے دماغ میں کوئی بات نہیں تھی۔''

''اور میرا خیال ہے کہ اپنے پیدا ہونے سے پہلے بھی تمہارے دماغ میں باتیں موجود تھیں اور تم پوری پلاننگ کے ساتھ ہی پیدا ہوئے ہو گے۔''

''دیکھو تم مجھ پر جوکنگ کا الزام لگاتے ہو اور اب خود جگتیں لگا رہے ہو۔''

''پتا نہیں کیوں، مجھے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ واقعی تم سے کوئی جیپ چھین کر لے گیا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس میں کوئی ہیر پھیر ہے......''

''دیکھو، اب تم مجھ پر ہیرا پھیری کا الزام بھی لگا رہے ہو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم گھوڑوں پر ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے اور برساتی نالے کے آس پاس کہیں فوت

ہو جاتے۔ کم از کم مجھے ایسی خوب صورت خاتون کے سامنے یوں ذلیل تو نہ ہونا پڑتا۔"

سنگین صورتِ حال کے باوجود میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کہا۔ "گویا تم یہ بات مان رہے ہو کہ یہ ساری تمہاری پلاننگ تھی؟"

"میں کہاں مان رہا ہوں...... میں تو برساتی نالے کے کنارے فوت ہونے کی بات کر رہا ہوں...... ویسے...... یار تابش! برساتی نالے کے کنارے فوت ہونے کا اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے۔ تمہیں تو سب یاد ہی ہوگا، اس سے پہلے ایک دفعہ میں لاہور جی ٹی روڈ کے قریب ایسی وفات کا مزہ چکھ چکا ہوں۔ واہ واہ...... کیسا دل بہار سین تھا جب اکٹھی چار گولیاں میرے سینے پر لگی تھیں۔ جان یوں جسم میں سے نکلی تھی جیسے مکھن سے بال نکلتا ہے۔"

"اور اتنا کچھ ہونے کے باوجود تم زندہ ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ جینا بھی کوئی جینا ہے یار! چڑیلے کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ زندوں میں نہ مُردوں میں اور پھر اگر اس چڑیلے کو نیوز چینل کا پیٹ بھی بھرنا ہو تو اور بڑا عذاب ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ قیامت تک میری روح یونہی بھٹکتی رہے گی۔"

"ان شاء اللہ۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"لیکن اتنا خوش ہونے کی ضرورت بھی نہیں تمہیں...... میرے لئے "یوں قیامت تک بھٹکنے" میں ایک پہلو اطمینان کا بھی ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے چینل پر قیامت کی خبر دے سکوں گا۔ ذرا سوچو، کتنا مزہ آئے گا جب میں ٹی وی اسکرین پر نمودار ہو کر اپنا دو فٹ لمبا غمگین پریشان چہرہ ناظرین کو دکھاؤں گا اور کہوں گا...... خواتین و حضرات! قیامت آ گئی ہے۔ بالآخر ہم قیامت لانے میں کامیاب رہے ہیں...... اب کہیں جائیے گا مت۔ ہم اس حوالے سے طویل دورانیے کی خصوصی ٹرانسمیشن شروع کر رہے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے لقمہ اجل بننے تک یہ ٹرانسمیشن جاری رہے گی......"

حمیدہ ہم دونوں کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی تھی۔ پیچھے اب دور دور تک تعاقب کرنے والوں کا نشان نہیں تھا مگر وہ پھر بھی خوف زدہ تھی۔ جیپ تیز رفتاری سے اونچے نیچے راستوں کو نگلتی چلی جا رہی تھی۔

ہم نے بغیر رکے اپنا سفر جاری رکھا۔ جیپ کے اندر وافر مقدار میں فیول تھا۔ اس کے علاوہ فیول سے بھرا ہوا ایک فالتو ٹینک بھی تھا۔ گن کے اضافی راؤنڈز، ٹارچ، شکاری چاقو اور اس طرح کی کئی اشیاء پہلے سے جیپ میں موجود تھیں۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ عمران نے پوری تیاری کے ساتھ جیپ کو وہاں چھپایا تھا۔ گھوڑے سے اُترنے والا راشن بھی جیپ کے اندر

موجود تھا اور یہ ہم تینوں کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ عمران نے بالکل درست کہا تھا۔ وقتِ رخصت بشارت علی خاں وغیرہ کی طرف سے جو دو رائفلیں ہمیں دی گئی تھیں، وہ بیکار تھیں۔ ان میں گڑبڑ کی گئی تھی۔ انہیں بس لاٹھی کے طور پر ہی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ہم نے کھانا بھی چلتی جیپ میں کھایا۔ ہمارے اصرار کے باوجود حمیدہ نے ایک دو لقموں سے زیادہ نہیں لئے۔ رات کے وقت ہم اسی پُرخطر علاقے سے گزرے جس کے بارے میں عمران نے کہا تھا کہ یہ "سانپوں کا علاقہ" کہلاتا ہے۔ اس وقت کے سارے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ تب میں اور عمران گھوڑا گاڑی پر سوار تھے۔ ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ زرگاں کی طرف سفر کر رہے تھے اور ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے زندہ پلٹ سکیں گے یا نہیں...... اور پھر ہماری گھوڑا گاڑی میں ایک زہریلا سانپ رینگ آیا تھا۔ بعدازاں لال بھون میں اس سانپ نے میڈم اور عمران کو ایک دوجے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس گھنے جنگل میں یہ سفر ہمارے لئے دشوار ثابت ہوا۔ ہم جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی آن نہیں کر رہے تھے۔ بس پارکنگ لائٹس کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ کئی جگہ عمران کو یا مجھے نیچے اُتر کر جیپ کے لئے راستہ بنانا پڑا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں ہمارے لئے اضافی تناؤ کا باعث تھیں۔ خاص طور سے حمیدہ کا برا حال تھا۔ وہ مسلسل منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ وہ ہم دونوں کو بھائی جی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ گاہے بگاہے کہتی۔ "بھائی جی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

عمران کہتا۔ "اس کا ایک ہی حل ہے بھابی جی...... بس ڈرتی رہو۔ عشق کی طرح ڈر پر بھی کسی کا زور نہیں ہوتا۔ یہ وہ آگ ہے جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔"

ایک بار پھر جب حمیدہ نے کہا۔ "بھائی جی، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" تو عمران بولا۔

"دیکھو بھابی جی! تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو تم ڈر کو لگ جاؤ۔ ڈر کو لگنے کا طریقہ یہ ہے کہ اچھی اچھی باتیں یاد کرو۔ جیسے میں اور تابش کر رہے ہیں۔ تابش اس وقت اپنی طرح دار بیوی کو یاد کر رہا ہے اور رضائی کے اندر گھس کر...... اس کے ہاتھ کے گرم گرم پکوڑے کھانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر فقرے میں "لمبا وقفہ" دیا تھا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اسی طرح میں اس کھوسٹ بڑھیا کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس نے اپنی ضد سے اپنا پورا پریوار تباہ کر دیا اور اب شاید خود بھی تباہ ہونے والی ہے۔"

"کون بڑھیا جی؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"وہی جس نے حکم کے دربار میں میرے ساتھ "ٹاک شو" کیا تھا۔ ذرا تصور کرو تابی! اس وقت کیا حالت ہوگی اس کی۔ اس نے تو پانچ چھ دن پہلے ہی خود کو آگ لگا کر بدروح بن جانا تھا۔ غالباً پنڈت مہاراج وغیرہ نے اسے تسلی دی ہو گی کہ ہمیں آزاد نہیں کیا جا رہا۔ چھوڑنے کے بعد ہمیں پھر پکڑ لیا جاوے گا...... لیکن اب، جب اس "ہائی اسپیڈ" بڑھیا کو پتا چلا ہوگا کہ ہم نکل گئے تو اس نے یقیناً قیامت مچا دی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اب تک وہ اپنے تئیں "شہید" بھی ہو چکی ہو۔"

اڑیل بڑھیا کے ذکر نے مجھے بھی محظوظ کیا لیکن میں نے عمران کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا۔ "یار! ایسے لوگ خود شہید نہیں ہوتے، دوسروں کو شہید کرانا زیادہ باعثِ ثواب سمجھتے ہیں۔ خاص طور سے نوجوانوں کو۔ یہ بڑھیا اپنے خاندان کو برباد کر چکی ہے لیکن اب بھی اس کے پاس اپنے حق میں بڑی ٹھوس دلیلیں موجود ہوں گی۔"

عمران نے میری بات سے اتفاق کیا۔

ہم نے اگلے روز بھی وقفے وقفے سے سفر جاری رکھا۔ ہم بتدریج سرسبز علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ اس علاقے میں کسی سے بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔ ایک طرح سے یہ سارا علاقہ زرگاں اور نل پانی کے درمیان "نو مین لینڈ" تھا۔ ہوشیار سنگھ اور آفتاب خاں وغیرہ نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں زرگاں اور نل پانی دونوں کے گارڈز اور جاسوس حرکت کرتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ قیام کر لیا جائے۔ اگر ہم چلتے رہتے تو ہمیں بغیر روشنی کے سفر کرنا پڑتا اور یہ بہت دشوار تھا۔ اس کے علاوہ پچھلے قریباً چھتیس گھنٹے میں تھکاوٹ بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ خاص طور سے حمیدہ کا تو برا حال تھا۔

ہم نے ایک نسبتاً اونچی جگہ پر درختوں کے درمیان جیپ روک دی۔ سردی کافی تھی مگر ہم جیپ کا ہیٹر آن نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ فیول اب گزارے مافق ہی رہ گیا تھا......

تھوڑا سا کھانا کھا کر حمیدہ پچھلی نشست پر لیٹ گئی۔ میں نے عمران سے کہا۔ "تم بھی اپنی سیٹ اسٹریچ کر کے تھوڑی دیر آرام کرلو۔"

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، حمیدہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "بھائی جی! آپ نے بتایا ناہیں کہ زرگاں میں میری مصیبت کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا تھا؟ آپ کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی عورت تھی؟"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "عورت نہیں لڑکی۔ تمہاری سہیلی وجنتی...... ہم اتفاقاً اس کے گھر میں جا گھسے تھے۔ اسی سے ہمیں ساری باتیں پتا چلیں۔"

"وجنتی؟" حمیدہ ششدر رہ گئی۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں سب کچھ بتایا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ بولی۔ "جب جارج صاحب کے سپاہی مجھے پکڑنے کے لئے میرے گھر آئے تو وجنتی بھی وہیں تھی...... اس نے انہیں روکنے کی بڑی کوشش کی۔ وہ ان سے لڑ پڑی تھی۔ سپاہیوں نے اسے گالیاں اور دھکے دیئے تھے۔ میں اس کے بارے میں بڑی فکرمند تھی۔ آپ نے یہ بتا کر میری تسلی کی ہے کہ وہ خیریت سے ہے لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"...... جب میں نے آپ سے زرگاں میں اس بارے میں پوچھا تھا تو آپ نے تب کیوں ناہیں بتایا؟"

"اس کا جواب سیدھا سادہ ہے حمیدہ۔" میرے بجائے عمران نے جواب دیا۔ "تب تک ہم دشمنوں میں تھے، خطرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ تمہیں وجنتی کے بارے میں بتانا کوئی مسئلہ پیدا کرسکتا تھا۔"

بات حمیدہ کی سمجھ میں آ گئی اور وہ اثبات میں سر ہلانے لگی مگر وہ پھر بھی نشست پر لیٹی نہیں۔ ہچکچاہٹ کے عالم میں بیٹھی رہی۔ عمران اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی کہ وہ ہماری موجودگی میں بے آرامی محسوس کر رہی ہے...... عمران اور میں جیپ سے باہر نکل آئے۔ طاقتور گن عمران کے ہاتھ میں تھی۔ "آ...... آپ کہاں جا رہے ہیں؟" وہ بوکھلائی۔

"کہیں نہیں۔ ہم ذرا سگریٹ وغیرہ پئیں گے۔ یہیں جیپ کے پاس بیٹھ رہے ہیں۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔" عمران نے کہا۔

جیپ کے پاس ہی صاف ستھری پتھریلی جگہ تھی۔ ہم نے وہاں ایک چٹائی بچائی اور تناور درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے ہم اپنے اردگرد زیادہ اچھی طرح نگاہ رکھ سکتے تھے۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ مدھم روشنی درختوں سے چھن چھن کر خشک پتوں سے اٹی زمین پر پڑ رہی تھی۔ ہلکی سرد ہوا اور درختوں کے درمیان سے یوں گزرتی تھی جیسے کوئی دوشیزہ لمبا آنچل لہراتی بے شمار ستونوں والے محل سرا میں بھاگ رہی ہو...... اس کی پائل مدھر آواز پیدا کرتی ہو اور اس کی خوشبو قرب وجوار کو مہکاتی ہو...... یوں لگتا تھا کہ اس سنسان جنگل میں میلوں تک ہم تینوں کے سوا اور کوئی ذی نفس نہیں۔ یہاں جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔

عمران نے سگریٹ سلگا کر اسے اپنے ہاتھ کی قوس سے ڈھانپ لیا اور اپنا دوسرا ہاتھ میری زخمی پسلی پر چلاتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ درد تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تمہیں درد کے حوالے سے نہیں کہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ کچھ بھی ہو جائے تم ''نہیں'' ہی کہو گے۔''

''کیا یہ بری عادت ہے؟''

''بالکل نہیں اور میرا خیال ہے کہ اسی ''نہیں'' کی وجہ سے تم جارج گورا جیسے شخص کو مات دینے میں کامیاب ہوئے ہو۔ وہ جس طرح تمہیں زخمی کر چکا تھا تمہاری گردن جکڑ چکا تھا، لگتا نہیں تھا کہ تم کھڑے رہ پاؤ گے۔ میرا خیال ہے کہ اس ''نہیں'' کے سلسلے میں تو تمہاری شاگردی اختیار کر لینی چاہئے۔''

''خیر، ایسی بھی بات نہیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے ہم دونوں ایک دوسرے کی شاگردی اختیار کر سکتے ہیں۔ کچھ باتیں تمہارے اندر ایسی ہیں جو مجھ میں نہیں۔''

''مثلاً؟''

میں ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مثلاً، بات کو چھپانے اور گول کرنے کا فن۔''

''میں نے کیا چھپایا ہے؟''

''تم نے بتایا کیا ہے، ہر معاملے میں گھپلا کیا ہے۔ تمہیں پتا تھا کہ حکم کی نیت میں فتور ہے، وہ ہمیں صرف دکھاوے کے لئے چھوڑ رہا ہے۔ اس کی پلاننگ کو ناکام بنانے کے لئے تم نے بھی لمبی چوڑی پلاننگ کی۔ رتنا دیوی والی جیپ حاصل کی پھر اس کے چھینے جانے کا ڈراما کیا پھر اسے پوری تیاری کے ساتھ مناسب جگہ پر چھپایا اور مجھے خبر تک نہیں ہونے دی۔''

اس نے کش لے کر تنے سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے کسی چیز کے بارے میں بھی یقین نہیں تھا۔ یہ سب اندازے تھے جو غلط بھی ہو سکتے تھے اور صحیح بھی۔ شکر ہے کہ یہ صحیح ہوئے۔ دوسری بات یہ کہ میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں بتا دوں کہ میں جیپ کے چھینے جانے والا ڈراما کرنے والا ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس کے بعد تمہیں مسلسل اداکاری کرنا پڑے گی اور ہو سکتا ہے کہ کہیں کہیں تمہاری اداکاری زیادہ اچھی نہ ہو اور حکم کے ہرکاروں کو شک گزرے۔''

''شک تو خیر مجھے شروع سے ہی تھا۔'' میں نے کہا۔ ''حکم اور پنڈت مہاراج وغیرہ جس طرح ہماری ہر بات مانتے چلے جا رہے تھے...... خاص طور سے جس طرح انہوں نے تمہیں بھی میرے ساتھ آنے کی اجازت فراخ دلی سے دے دی تھی، لگتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے لیکن کچھ باتیں اب بھی اُلجھن میں ڈالتی ہیں۔ مثلاً تمہارا جیپ کو بالکل صحیح جگہ پر چھپانا...... تمہیں اس بات کا پہلے سے علم ہونا کہ جو رائفلیں ہمیں دی گئی ہیں، وہ ناکارہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

وہ مسکرایا۔ ''ابھی تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ کچھ معاملوں میں تم بھی میری شاگردی اختیار کر سکتے ہو۔ درست اندازے لگانا بھی تو ایک فن ہے جگر...... اور اس حوالے سے میں تم سے تھوڑا سا آگے ہوں۔''

''تم بہت سے معاملوں میں آگے ہو۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''چھپے رستم ہو...... بہت پہنچی ہوئی شے ہو بلکہ مستی میں ضرورت سے زیادہ ہی ''پہنچ'' جاتے ہو۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ چاندنی اس کی ٹھوڑی کے دلکش گڑھے کو نمایاں کر رہی تھی۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کوئی بات نہیں کر رہا۔ وہی پرانی دُہرا رہا ہوں۔ اگر باتوں کو چھپانے اور گول کرنے کا کوئی عالمی مقابلہ ہو تو تم ضرور گولڈ میڈل لے جاؤ۔'' میں مسکرایا۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ اس کی تیز عقابی نگاہیں میری آنکھوں کے راستے جیسے میرے دماغ کے اندر گھسنے لگیں۔ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ''تم نے میری مستی کی بات کیوں کی ہے؟ کیا تم نے کچھ دیکھا ہے؟''

میں نے بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا، میں نے کہا۔ ''ہاں دیکھا ہے اور بہت حیران بھی ہوا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ گیتا مکھی ایسی زوردار لڑکی ہے۔''

اس نے نتھنوں سے دھوئیں کی طویل لکیریں خارج کیں اور قدرے پُرسکون نظر آنے لگا...... اب اس کے چہرے پر اُلجھن کے بجائے ایک طرح کی چمک سی آ گئی۔ چند لمحے بعد وہ مسکرایا اور بولا۔ ''انڈیا کا ایک مشہور فلمی گانا ہے، میرا تو جو بھی قدم ہے وہ تیری راہ میں ہے...... تُو کہیں بھی رہے میری نگاہ میں ہے۔ اسی طرح بھئی ہم بھی جو کچھ کرتے ہیں تمہارے لئے ہی کرتے ہیں۔ تمہارے سکون کے لئے...... تمہاری خوشی کے لئے۔''

''یعنی تم نے میرے سکون اور خوشی کے لئے گیتا سے زبردست قسم کے رومانی سین کئے۔ بھئی واہ...... زبردست...... کل تم کہو گے کہ میرا غم غلط کرنے کے لئے تم نے شراب کی

میری کھوجی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ میں نے پوچھا۔ ''کب ملے تمہیں یہ زیور؟''

''جن دنوں تم نے اپنی پسلی کی ''ویلڈنگ'' کرائی تھی اور اسپتال میں تھے۔'' وہ مسکرایا۔

مجھے یاد آیا کہ ان دنوں عمران کافی گھومتا پھرتا رہا تھا۔ جیپ کی ڈرائیونگ کا بہانہ کر کے وہ تین چار بار اسپتال سے نکلا تھا اور دیر تک باہر رہا تھا۔

ایک دم میں نے چونک کر پوچھا۔ ''لیکن...... ہم بات تو کچھ اور کر رہے تھے۔ میں نے تم سے تمہارے اور گیتا مکھی کے بارے میں پوچھا تھا۔''

''تو وہی تو بتا رہا ہوں یار۔ ان زیوروں کی دستیابی اور گیتا مکھی میں گہرا تعلق ہے۔ تمہیں کچھ عجیب تو لگے گا لیکن میں وہی بتا رہا ہوں جو سچ ہے۔ ایک دن میں اور گیتا مکھی بڑے اچھے موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ طوفانی رفتار سے بول رہی تھی اور اپنے ماضی کے قصے سنا رہی تھی۔ میں نے اس سے سلطانہ کے زیورات کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی اور بتایا کہ وہ زیور کیسے اور کن حالات میں زرگاں کے ایک تجربہ کار وید کے پاس چلے گئے تھے۔ میں نے گیتا مکھی سے کہا کہ وہ ایک چلتا پرزہ ہے۔ زرگاں کے چپے چپے کی خبر اسے رہتی ہے۔ کیا وہ کسی طرح اس وید کا اور زیوروں کا پتا نہیں چلا سکتی؟ وہ موڈ میں تھی۔ الائچی سپاری پان چبا کر بولی کہ وہ یہ کام کر دے گی لیکن اس کے بدلے مجھ سے ایک من پسند تحفہ لے گی۔ میں نے کہا کہ تحفہ تو دینے والے کی مرضی کا ہوتا ہے۔ وہ بولی لیکن میں اپنی مرضی کا لوں گی۔ میں ذرا چونک گیا۔ میں نے کہا، اگر کوئی ایسی چیز ہوئی جو میں نہ دے سکا تو؟ وہ بولی۔ میں تمہیں بڑی اچھی طرح جان گئی ہوں عمران صاحب! کوئی ایسی چیز نا ہیں مانگوں کی جو تم نہ دے سکو۔ بس اس طرح ہمارے درمیان ایک ''ڈیل ٹائپ'' کی چیز ہو گئی...... گیتا مکھی نے میری توقع سے زیادہ صلاحیت دکھائی۔ ایک دو جگہ میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ آٹھ دس دن کے اندر ہم اس وید صاحب تک اور ان زیوروں تک جا پہنچے۔ وید صاحب ان زیوروں کے منہ مانگے پیسے مانگ رہا تھا لیکن لالچی شخص اکثر ڈرپوک بھی ہوتا ہے۔ میں نے اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ معقول رقم پر زیور واپس کرنے پر رضامند ہو گیا...... وید کو قائل کرنے کے سلسلے میں گیتا مکھی نے بھی کردار ادا کیا۔''

''اور زیورات کے لئے رقم کہاں سے لی تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''جگر! تمہیں بتایا ہے نا کہ پیسوں کے سلسلے میں تمہارے یار کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔''

''پھر بھی پتا تو چلے؟''

''میڈیم صفورا سے ادھار لئے تھے۔ اگر اللہ نے اسے زندگی دی تو جلد ہی لوٹا دوں گا۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میڈم صفورا جیسی عورت تمہیں ادھار دے سکتی ہے۔''

''وہ بہت کچھ دے گی اور لے گی، اگر اس کی زندگی رہی تو۔ تم آگے آگے دیکھنا۔''

''اس کی زندگی کی بڑی فکر ہے تمہیں۔ خود تو جیسے آبِ حیات پی رکھا ہے تم نے۔''

''چڑ بلے کو موت نہیں آتی یار...... وہ مر کر ہی تو چڑیلا بنتا ہے۔''

چاندنی درختوں میں اپنا زاویہ بدل چکی تھی۔ ہلکی اوس گرنا شروع ہو گئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر کیچڑ میں لتھڑی ہوئی جرمن جیپ کے اندر حمیدہ شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔ کسی چکور کی آواز بلند ہوئی اور سناٹے میں دور تک پھیل گئی۔ میں نے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''تو پرسوں رات میں نے لال بھون کے کمرے میں جو کچھ دیکھا وہ گیتا مکھی کا من پسند تحفہ تھا؟''

''تم کہہ سکتے ہو۔ ان عورتوں کی خواہشیں بھی انہی کی طرح عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ وہ کہتی تھی، میں تمہیں اپنے ہونٹوں سے الوداع کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا کر لو بھئی۔ اس نے میرے ساتھ اس کمرے میں اپنی مرضی کے ایک دو منٹ گزارے اور اسی میں خوش ہو گئی۔ کوئی اس طرح خوش ہو جائے تو اسے کر دینا چاہئے یار۔ ہمارے حقوق کون سے بحق زوجہ محفوظ ہیں۔''

میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والا شخص تھا۔ پولیتھین میں لپٹے ہوئے زیورات چاندنی میں دمک رہے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''عورت کی زندگی میں گہنوں کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے اور عروسی گہنے تو اس کی روح کے اندر دمکتے ہیں۔ انہیں کھو کر وہ اندر سے تاریک ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کل یا پرسوں رات جب تم سلطانہ سے تنہائی میں ملو تو اپنے ہاتھ سے اسے یہ گہنے پہناؤ۔ مجھے یقین ہے، تمہارے ہاتھوں سے یہ سونا پہن کر وہ اندر سے روشن ہو جائے گی۔''

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔ ''لیکن ایک بات کا تمہیں مجھ سے ابھی اور اسی وقت وعدہ کرنا ہوگا اور اگر تم نے وہ وعدہ توڑا تو سمجھو ہمارے درمیان جنگِ عظیم ہو جائے گی۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ بہت نقصان ہوگا ہماری دوستی کا۔''

''سلطانہ بھابی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہئے کہ گہنے برآمد کرنے میں میرا عمل دخل ہے۔''

میں یہ کریڈٹ تمہارے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے میری یہ خواہش پوری نہ کی تو...... سچ کہتا ہوں، ہماری لڑائی ہو جائے گی۔'' وہ واقعی سنجیدہ تھا۔

میں نے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کہیں پاس کے درختوں میں ایک بار پھر چاندنی میں نہائی ہوئی...... چکور کی رومان انگیز آواز سنائی دی۔ عمران کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ''سلطانہ بڑی اسپیشل لڑکی ہے تابی۔ وہ باہر سے شاید بہت خوب صورت نظر نہ آتی ہو مگر اندر سے حسین وجمیل ہے۔ وہ تمہارے پیار کی اتنی زیادہ حق دار ہے جتنا سوچا جا سکتا ہے۔ تم نے اسے ٹوٹ کر بکھرنے سے بچایا ہے، اب اس کی زندگی کو زندگی بنانا بھی تمہارا ہی کام ہے......''

O......❖......O

یہ اگلی شب، دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ ہم ایک بار پھر اس مچھیرا بستی فتح پور کے نواح میں تھے۔ فتح پور کا قدیم مندر دو کلومیٹر دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ ہلکی چاندنی میں ہم دونوں اپنی کیچڑ زدہ جرمن جیپ کے پاس کھڑے تھے۔ جیپ کا انجن خاموش تھا۔ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔

حمیدہ کو اس کی شدید خواہش کے مطابق ہم نے شام کے وقت یہاں سے چالیس پچاس کلومیٹر دور ایک بستی ''شاہی پور'' میں اُتار دیا تھا۔ شاہی پور میں حمیدہ کے دو شادی شدہ تایا زاد بھائی رہتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ان کے ذریعے بحفاظت نل پانی میں اپنے دیگر رشتے داروں کے پاس پہنچ سکتی ہے۔ وقتِ رخصت وہ بے حد ممنون اور احسان مند نظر آتی تھی۔ خاص طور سے میری طرف دیکھ کر اس کی آنکھیں بار بار ڈبڈبا جاتی تھیں۔

اور اب ہم فتح پور میں داخل ہونے کے لئے تیار تھے۔ فتح پور میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں ایک نہایت ناپسندیدہ کام کرنا تھا اور وہ یہ کہ اپنی اسپیشل جرمن جیپ کو، جس نے کٹھن راستوں پر ہمارا بے مثال ساتھ دیا تھا...... پانی میں غرق کرنا تھا۔ اس کام کے لئے ہم ایک بڑا بارشی جوہڑ پہلے ہی منتخب کر چکے تھے۔ عمران چونکہ کئی ماہ سے یہاں فتح پور میں رہ رہا تھا، اس لئے وہ اور اقبال یہاں کے نشیب و فراز کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ جوہڑ کافی گہرا تھا۔ دوسرے جوہڑوں کی طرح اس میں بھی چھوٹے سائز کی مچھلیاں موجود ہوتی تھیں لیکن انہیں پکڑنے کے لئے کوئی اس جوہڑ کی طرف نہیں آتا تھا۔ یہاں بھی وہی توہم پرستی کارفرما تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں اوپر تلے تین لڑکے بالے اس جگہ ڈوب کر ہلاک ہو چکے تھے اور حسبِ رواج یہ جوہڑ آسیب زدہ قرار پا گیا تھا۔

ہم نے جیپ میں سے تمام ضروری اشیاء نکال لی تھیں...... جیپ بالکل جوہڑ کے کنارے پر کھڑی تھی۔ اس کے دروازے بند کرنے کے بعد ہم نے اسے آہستہ آہستہ دھکیلنا شروع کیا اور وہ جوہڑ کے مٹیالے پانیوں میں اُتری چلی گئی۔ ایک منٹ کے اندر اس کا نام و نشان مٹ گیا...... ہم نے جوہڑ کے قریب سے اس کے چوڑے ٹائروں کے نشان ختم کر دیئے۔ امید تھی کہ دو چار دن میں جب بارش ہو جائے گی تو باقی ماندہ نشانات بھی ختم ہو جائیں گے۔

اب مسئلہ آفتاب خاں کو ڈھونڈنے اور اسے بتانے کا تھا کہ ہم واپس پہنچ گئے ہیں۔ پروگرام کے مطابق اس کام کے لئے عمران کو آگے جانا تھا۔ ہمارے رسد کے سامان میں دو بڑے سائز کی گرم چادریں بھی موجود تھیں۔ عمران نے ایک چادر مقامی انداز میں اس طرح جسم کے گرد لپیٹی کہ اس میں منہ سر بھی چھپ گیا۔ ایک لاٹھی کے ساتھ اس نے کپڑوں والی گٹھڑی باندھ کر کندھے سے لٹکا لی۔ اس حلیے میں وہ ایک مقامی مسافر ہی نظر آنے لگا۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر اس نے دور مار رائفل بھی اپنی چادر کے نیچے ہی چھپا لی تھی۔ میرے پاس ہتھیار کے نام پر بس ایک چاقو تھا۔ یہ بڑا خاص چاقو تھا اور میرے لئے اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔

ہم پیدل ہی فتح پور کی طرف روانہ ہوئے۔ دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ مندر کے تہ خانوں میں صورتِ حال کیا ہو گی؟ وہ سب لوگ خیر خیریت سے ہوں گے جنہیں ہم یہاں چھوڑ کر گئے تھے؟

فتح پور کے بالکل پاس آ کر میں درختوں کے ایک جھنڈ میں ٹھہر گیا اور عمران آگے چلا گیا۔ میں ایک ایک پل گن گن کر گزارنے لگا۔ قریباً ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا، ہمارا اپنے ساتھیوں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ جہاں ان سے ملنے کی خوشی تھی، وہاں اَن گنت اندیشے بھی ذہن میں سر اُٹھا رہے تھے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا میں آج رات سلطانہ کو اپنے رُوبرو دیکھ سکوں گا؟

مجھے عمران پر پورا بھروسا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ فتح پور میں داخل ہو کر وہی کچھ کرے گا جو موجودہ صورتِ حال میں بہترین ہو گا۔

انتظار کے پل، برسوں کی طرح گزرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ آخر مجھے ایک شخص کا سایہ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ عمران تو ہرگز نہیں تھا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے چاقو پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ آنے والا دراز قد تھا۔ پھر

میں نے پہچان لیا۔ وہ آفتاب خاں تھا۔ میں درختوں کی اوٹ سے باہر نکلا، ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

آفتاب خاں نے جوش کے عالم میں میرا کندھا چوما اور بولا۔ ''مرحبا...... مرحبا تابش بھائی! آپ نے...... آپ نے ام سب کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔ آپ نے وہ کر دکھایا جس کا ام سب لوگ بس سپنا ہی دیکھ سکتا تھا۔ امارے بس میں ہوتا تو ام آپ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتا اور آپ کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر گاؤں میں لے جاتا۔''

اس نے ایک بار پھر جوش سے میرا کندھا چوما۔

میں نے کہا۔ ''سب خیریت سے ہیں نا آفتاب خاں...... میرا مطلب ہے، اقبال، تاؤ افضل، ہوشیار سنگھ اور سلطانہ؟''

''سب ایک دم خیریت سے ہے جی۔ بس ایک بندہ خیریت سے نہیں ہے، اس کے بارے میں ام آپ کو بعد میں بتا دے گا۔''

''سلطانہ اور اقبال تو خیریت سے ہیں نا؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''بالکل جی، ایک دم ٹھیک ٹھاک۔ ام لوگوں کو زرگاں میں ہونے والے زبردست دنگل کا خبر دس پندرہ دن پہلے ہی مل گیا تھا۔ ام کو یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ایک بہت بڑے مقابلے میں ایک جوان نے جارج گورا کو جان سے مار ڈالا ہے لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ مارنے والا کون ہے۔ کچھ لوگ اسے نل پانی کے انور خاں کا کارنامہ بتاتا تھا، کچھ چھوٹے سرکار کے ایک فوجی افسر کا نام لیتا تھا لیکن ام کو یقین تھا کہ یہ آپ دونوں میں سے ہی کوئی ہوگا۔ ایک دو روز بعد سارا تفصیل مالوم ہو گیا اور اس بات کا پکا پکا تصدیق ہو گیا کہ یہ کارنامہ آپ نے ہی کیا ہے۔'' آفتاب خاں اتنا پُرجوش تھا کہ اس کی آواز بار بار بھرا رہی تھی۔

''عمران کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ام انہیں مندر میں چھوڑ آیا ہے۔ وہ خود بھی میرے ساتھ یہاں آنا چاہتا تھا لیکن ام نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں۔''

آفتاب مجھے اپنے ساتھ لے کر مندر کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھٹھری ہوئی چاندنی میں فتح پور کے سنسان گلی کوچے سو رہے تھے۔ بس کہیں کہیں کسی بکری کی ممیاہٹ یا آوارہ کتے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ حسبِ معمول آفتاب خاں کے ہاتھ میں لاٹھی اور لالٹین تھی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی اور اس بکل میں یقیناً چھوٹا موٹا اسلحہ بھی موجود تھا...... مندر کا جلا ہوا مسمار شدہ حصہ دوبارہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ تعمیر کا سامان یہاں وہاں بکھرا ہوا تھا۔ اردگرد

احتیاط سے دیکھنے کے بعد آفتاب خاں مندر کی شکستہ سیڑھیاں چڑھ کر چوبی دروازے تک پہنچا اور اس کا قفل کھول دیا۔ تب اس نے اشارے سے مجھے بھی اوپر بلا لیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر کے نیم گرم ماحول میں چلے گئے۔ بالائی تہ خانے میں ہمارے سارے ساتھی موجود تھے۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہونے والا اقبال ہی تھا۔ اس نے جوش کے عالم میں مجھے اُٹھایا اور کئی چکر دیئے۔ اس کے بعد طلال، تاؤ افضل اور دیگر لوگوں نے میرا استقبال کیا۔ مجھے سلطانہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری نگاہ اس کی تلاش میں بھٹکنے لگی۔ وسوسے سر اٹھانے لگے۔ ''سلطانہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

عمران چہکا۔ ''ہم ڈھونڈتے ہیں ان کو جو مل کے نہیں ملتے...... روٹھے ہیں نہ جانے کیوں مہماں وہ مرے دل کے۔'' پھر اس نے نیچے والے تہ خانے کی طرف اشارہ کیا۔

تاؤ افضل بولا۔ ''چلو جاؤ۔ وہ وہاں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جب سے پتا چلا ہے کہ تم آ گئے ہو، مسلسل رو رہی ہے۔''

میں سیڑھیاں اُتر کر زیریں تہ خانے میں پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ دروازہ بند تھا...... میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ اُٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پہلے اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی پھر بے بس ہو گئی اور بلند آواز سے رونے لگی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ دل فگار انداز میں بولی۔ ''وہ مر گیا ہے نا...... وہ مر گیا ہے نا مہروج؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں سلطانہ! میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے میں نے نہیں تم نے مارا ہے۔ تمہاری دی ہوئی طاقت نے مارا ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔''

''سچ کہو مہروج...... سچ کہو۔''

''ہاں سلطانہ...... وہ تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔ اس کی انتڑیاں اس کے پیٹ سے باہر تھیں۔ وہ اپنے خون میں لت پت تھا۔''

''وہ رویا چلایا بھی تھا؟''

''ہاں سلطانہ! میں نے اسے کئی زخم لگائے۔ وہ ہر زخم پر ڈکرایا تھا اور اس کی آواز پورے میدان میں گونجتی تھی۔''

وہ اور جوش کے عالم میں مجھ سے لپٹ گئی اور شدت سے رونے لگی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ میری جیکٹ کو بھگوتی رہی۔ پھر میں نے اسے خود سے جدا کیا۔ میں

نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ رام پوری چاقو نکالا جس سے میں نے جارج گورا کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے خم دار پھل پر ابھی تک اس کے خون کا نشان موجود تھا۔

''یہ دیکھو سلطانہ! یہ ہے وہ ہتھیار جس سے میں نے اس شیطان کو ڈھیر کیا۔'' اس نے چاقو میرے ہاتھ سے لیا اور بے ساختہ اس کے دستے کو چوم لیا۔ پھر وہ میرے سینے سے لگ گئی اور ایک بار پھر تشکر کے آنسو بہانے لگی۔

مندر کے تہ خانوں میں وہ رات جشن جیسی تھی۔ سب میرے اور عمران کے گرد جمع تھے...... دو آتش دانوں میں کوئلے دہک رہے تھے۔ ہم نے منہ ہاتھ دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن لئے تھے۔ تاؤ افضل کی بیٹیوں نے نوری اور سلطانہ کے ساتھ مل کر بڑی تیزی سے گوشت بھونا تھا اور چاول پکائے تھے۔ سب نظر آ رہے تھے مگر گاڑی بان ہوشیار سنگھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ قتل ہو جانے والے گرو کی جواں سال پتنی رادھا بھی نظر نہیں آئی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ درمیانی تہ خانے میں سو رہی ہے۔

''ہوشیار سنگھ کہاں ہے؟'' میں نے آفتاب خاں سے پوچھا۔

وہ ذرا ٹھٹکا پھر اقبال کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ ''تابش بھائی! ابھی باہرام نے آپ کو بتایا تھا نا کہ امارے ساتھیوں میں سے بس ایک بندہ خیریت سے نہیں ہے...... وہ یہی خانہ خراب ہوشیار سنگھ ہے۔ وہ ہوشیاری دکھا کر یہاں سے نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ اپنے ساتھ گرو کی پتنی رادھا کو بھی لے گیا۔''

''اوہ گاڈ...... یہ کیسے ہوا؟'' میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ عمران بھی حیران پریشان نظر آنے لگا۔

اقبال نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔ ''رادھا ہر وقت اپنے گرو پتی کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ ایک دن میں نے اسے بتا دیا کہ وہ مر گیا ہے۔ اس خبر پر اس نے بڑا واویلا مچایا۔ رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ کلائیوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں سیندور مٹا دیا اور پتا نہیں کیا کچھ کیا۔ ہوسکتا ہے کہ اسے گرو کی موت کا غم بھی ہو مگر اس سے زیادہ خوف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے ''مہان'' شخص کی ہتھیا کی وجہ سے کوئی بڑی سخت مصیبت آئے گی۔ لال آندھی چلے گی، باڑ تباہی مچا دے گی یا بیماری پھوٹ پڑے گی۔ وہ رونے چلانے لگی اور اس نے کہا کہ وہ اپنے گرو پتی کے ساتھ ہی ستی ہونا چاہتی ہے۔ وہ خود کو آگ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے اسے روکا۔ دو تین دن یہی سلسلہ چلتا رہا۔ وہ ستی ہونے کی کوشش کرتی اور ہم اسے پکڑ وکڑ کر روکتے۔ پھر ایک دن میری

برداشت ختم ہوگئی۔ میں نے مٹی کے تیل کی بوتل لی، ماچس پکڑی اور یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ میں نے کہا، اگر تم نہیں رہ سکتیں تو پھر ہو جاؤ ستی۔ اگلے دن سے وہ بالکل ٹھیک ہوگئی۔ اس نے سفید کپڑے پہن لئے، زمین پر سونا شروع کیا اور رُوکھی سوکھی روٹی بس دو وقت کھانے لگی۔ اس نے کہا کہ وہ گرو کے غم میں بیوہ کی زندگی گزارے گی...... میں نے ہوشیار سنگھ کو رادھا کی دیکھ بھال پر لگایا ہوا تھا اور یہ میری غلطی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ اسے پتا تھا کہ اگر رادھا ستی ہونے کے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی تو ''بیوگی'' کے فیصلے پر بھی نہیں رہ سکے گی۔ وہ بھرپور جوان تھی اور ابھی ایک موٹے بوڑھے شوہر کے سوا اس نے دیکھا ہی کچھ نہیں تھا۔ ہوشیار سنگھ نے پتا نہیں کیا کرامات دکھائی کہ تھوڑے ہی دنوں میں جوان رادھا کو پوری طرح شیشے میں اُتار لیا۔ ہمیں ہوشیار سنگھ کے اس ''سنہری کارنامے'' کا پتا تب چلا جب نوری نے ہوشیار سنگھ اور رادھا کا پول کھولا۔ دراصل نوری کو ان دونوں پر شک ہو چکا تھا۔ ایک شام اس نے چالاکی دکھائی اور رادھا کے کمرے کی چٹخنی کو ہتھوڑی سے چوٹ لگا کر خراب کر دیا۔ رات کسی وقت ہوشیار سنگھ اپنی جگہ سے اُٹھا اور رادھا کے پاس چلا گیا۔ نوری نے ایک ٹارچ کا انتظام پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور ہم رادھا کے کمرے میں جا گھسے۔ ہم نے جو کچھ وہاں دیکھا، وہ ان خواتین کے سامنے دُہرانا مناسب نہیں...... مختصر یہ کہ وہ دونوں سخت نازیبا حالت میں تھے۔ ہم نے دونوں پر بہت لعن طعن کی۔ ہوشیار سنگھ دو تین دن اپنے کمرے میں ہی گھسا رہا۔ اس دن کے بعد سے نوری اور کلثوم نے رادھا کے کمرے میں سونا شروع کر دیا۔

''اگلے آٹھ دس روز میں معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا اور ہمیں لگنے لگا کہ دونوں سدھر گئے ہیں مگر ہوشیار سنگھ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ اسے اپنی بے عزتی کا رنج بھی تھا۔ دوسری طرف رادھا کی جوانی کا نشہ اسے لگ گیا تھا۔ اس نے چپکے سے ایک منصوبہ بنایا اور ایک رات رادھا کو لے کر مندر سے نکلنے کے لئے تیار ہوگیا۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ آفتاب خاں تالا کھول کر مندر میں آیا تو ہوشیار سنگھ اور رادھا دونوں سب سے اوپر والے کمرے میں کاٹھ کباڑ کے اندر موجود تھے۔ ہوشیار سنگھ نے آفتاب کو سیڑھیوں سے دھکا دے کر نیچے گرایا اور رادھا کے ساتھ نکل گیا۔ آفتاب جس بری طرح گرا تھا اس کی موت بھی ہوسکتی تھی مگر ایک خوش گوار اتفاق یہ ہوا کہ جہاں وہ گرا تھا وہاں دو تین لحاف پڑے تھے۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بس سر پر ایک زخم لگا۔ زوردار آوازیں سن کر میں بھی اوپر آ گیا۔ میں اور آفتاب مندر سے نکل کر ہوشیار سنگھ اور رادھا کے پیچھے لپکے۔ وہ شاید گاؤں کی طرف بھاگتے تو ان کے لئے اچھا ہوتا

لیکن رات کے بارہ بجے تھے اور شاید ہوشیار سنگھ کے بھی بجے ہوئے تھے، وہ جنگل کی طرف گیا۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے برساتی نالا پار کرنے کی کوشش کی۔ صرف ایک گھنٹا پہلے تک تیز بارش ہوتی رہی تھی۔ نالے میں بہاؤ بڑا تیز تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ ٹھیک اندازہ نہ لگا سکے۔ ہم نے ان کے چلانے کی آوازیں سنیں لیکن ہم بھی کچھ نہ کر سکے۔ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ پانی کے ساتھ بڑی تیزی سے آگے نکل گئے۔“

”یعنی ان کا کچھ پتا ہی نہیں چلا؟“ عمران نے پوچھا۔

”ہاں جی، دو تین دن تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔“ اقبال کی جگہ آفتاب خاں نے جواب دیا۔ ”ام سب سخت پریشان تھا۔ اگر وہ زندہ بچ گئے تھے تو پھر ام سب اس مندر میں بالکل بھی خیریت سے نہیں تھے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ تھا تو بھی خطرہ موجود تھا۔ کبھی کبھی کسی کی موت کا دعا بھی مانگنا پڑتا ہے۔ ام نے بھی مانگا اور یہ قبول ہوا۔ تیسرے دن ام کو پتا چلا کہ نیچے کی طرف کھوڑی نام کی جگہ پر نالے سے دو لاشیں ملا ہے۔ ایک کسی جوان سکھ کا اور دوسرا ہندو ناری کا ہے......“

یہ رُوداد میرے اور عمران کے لئے بڑی سنسنی خیز رہی۔ رادھا کے ساتھ جو کچھ ہوا، شاید یہ بھی انتہا پسندی کا ایک شاخسانہ تھا۔ وہ جوان خوب صورت لڑکی صرف دھرم کی خاطر ایک ادھیڑ عمر بدوضع پتی کی ”خواہشوں“ کا شکار رہی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس جال سے نکل نہیں سکتی تھی۔ اس کے آدرش کہتے تھے کہ وہ خود کو ستی کر لے یا پھر ایک ہندو بیوہ بن کر زندہ درگور ہو جائے لیکن اس کے اندر کی عورت ان غیر فطری سوچوں کے خلاف جنگ کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ ٹوٹی تو ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اقبال اور نوری نے اسے موقع پرست ہوشیار سنگھ کی آغوش میں دیکھا۔

اس رُوداد کے المناک پہلو نے ہمیں جہاں افسردہ کیا، وہاں اس بات کا احساس بھی دلایا کہ چند دنوں کے ساتھ میں کسی بھی شخص کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے ہوشیار سنگھ اور رادھا دونوں کے بارے میں جو علیحدہ علیحدہ اندازے لگائے تھے، وہ دونوں اس سے بہت مختلف نکلے تھے۔

O......❖......O

......اور یہ رات میرے اور سلطانہ کے ملن کی رات تھی۔ ہمیں تہ خانوں میں واپس آئے ہوئے اب تقریباً اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ سفر کی تھکان اور تکلیف ختم ہونے کے بعد میری جسمانی حالت اب کافی بہتر ہو چکی تھی۔ ہمارے کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔

میرے کہنے پر آفتاب خاں باہر سے سلطانہ کے پسندیدہ پھول لایا تھا۔ گیندے اور موتیے کے یہ پھول میں نے سلطانہ کے تکیے کے قریب رکھ دیئے۔ اس نے ہلکے گلابی پھولوں والا سفید جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کے نہایت گھنے بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے آج پھر میرے لئے اپنے ہاتھ سے حلوہ بنایا تھا۔ اب وہ اس حولے کی تعریف سننے کی منتظر تھی۔ میں نے حلوے کے بجائے حلوہ بنانے والی کی تعریف شروع کر دی تو اس کے چہرے پر حیا کا رنگ لہرانے لگا......

آج یہ وہ سلطانہ نہیں تھی جو میرے چھونے سے کپکپانے لگتی تھی اور جس کا چہرہ دھواں ہو جاتا تھا۔ میری تعریف کے جواب میں وہ سادگی سے بولی۔ ”میں جانتی ہوں، میں جیادہ خوب صورت ناہیں ہوں۔ یہ آپ اچ ہیں جنہیں میری تعریفوں کے پل باندھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔“

”کبھی خود کو میری آنکھوں سے دیکھو تو تمہیں اپنی اہمیت کا پتا چلے۔“ میں نے کہا۔

”میں تو آپ کے خدموں کی خاک بھی ناہیں ہوں مہروج! آپ نے میرے اندر پھر سے جندگی ڈالی ہے۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔“

”اپنوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا سلطانہ۔ اگر کیا جاتا ہوتا تو میں تمہارے سامنے شکریے کے انبار کھڑے کر دیتا۔“

”ناہیں مہروج۔“ اس کی جھیل آنکھوں میں پانی چمکنے لگا۔ ”میں جانتی ہوں آپ نے وہاں زرگاں میں میرے لئے بہت مصیبت اُٹھائی ہوئے گی، بہت جیادہ خطرے مول لئے ہوئیں گے۔ میرا بس چلے تو آپ کے ان جخموں کے لئے مرہم بن جاؤں۔“

”تم مرہم ہو سلطانہ! تم سے بڑا مرہم اور کیا ہو سکتا ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو...... تم نے ابھی تک مجھ سے بیویوں والی کوئی بات نہیں کی۔“

”کیا جی؟“ وہ چونک کر بولی۔

میں مسکرایا۔ ”شوہر جب سفر سے گھر واپس آتے ہیں تو بیویاں پوچھتی ہیں کہ وہ ان کے لئے کیا لائے ہیں۔“

”آپ خود آ گئے ہیں، میرے لئے اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہوئیں گا۔“ وہ بولی۔ وہ اب بڑے تواتر سے مجھے ”تم“ کے بجائے ”آپ“ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ یہ تبدیلی بھی ان تبدیلیوں میں سے ایک تھی جو اس میں رُونما ہوئی تھیں۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے علاوہ بھی تو کچھ پوچھا جا سکتا ہے۔“

"آپ جو بھی لائے ہوں گے، وہ میرے لئے سب سے اچھا ہوئیں گا۔"

"اچھا، مجھے ایک بات بتاؤ سلطانہ! آخر تم زیور کیوں نہیں پہنتی ہو؟ میں نے کسی غریب سے غریب مقامی عورت کو بھی چھوٹے موٹے زیور کے بغیر نہیں دیکھا؟"

"میں نے بتایا تھا نا مہروج! مجھے عادت اچ نا ہیں ہے۔"

"عادت ہی نہیں ہے یا پھر زیور ہی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب مہروج؟" وہ چونک سی گئی۔

میں نے کہا۔ "سلطانہ! بات وہی ہے جس کا تمہیں پتا ہے اور مجھے بھی۔ کچھ عرصہ پہلے تم اپنے سارے زیور اور جمع پونجی، میری زندگی بچانے پر خرچ کر چکی ہو۔ تمہاری شادی کے گہنے جن میں تمہاری ماں کے گہنے بھی شامل تھے، اب تمہارے پاس نہیں ہیں۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ میں نے اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈالا اور موی کاغذ میں لپٹے ہوئے سلطانہ کے گہنے اس کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی چلی گئی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے ان طلائی زیورات کو ٹٹولا اور اس کی حیرت بڑھتی گئی۔ "یہ...... یہ آپ کو کہاں سے ملے مہروج؟"

"ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی ملتا ہے، یہ تو پھر گہنے تھے سلطانہ۔ یہ ابھی تک زرگاں کے اسی وید کے پاس تھے جس نے میرا علاج کیا۔ بے شک وہ ایک بہت قابل اور بہت لالچی وید ہے۔ میں نے ان زیورات کے لئے اسے باقاعدہ قیمت دی ہے اور موجودہ بھاؤ کے مطابق دی ہے۔"

سلطانہ کے سادہ چہرے پر ایک عجیب معصوم سی چمک نمودار ہو گئی۔ اس چمک میں اندرونی خوشی کا عکس تھا۔ اس نے ایک بار پھر زیورات کو اپنی کپکپاتی انگلیوں سے ٹٹولا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ میرے گلے سے لگ گئی۔ میں نے اسے پیچھے ہٹا کر اس کے ماتھے پر جھومر سجایا، اس کے گلے میں گلوبند پہنایا، اس کے کانوں میں جھمکے آویزاں کئے اور اسے ایک بار پھر گلے سے لگا لیا۔ آج کی شب وہ اندر باہر سے جگمگا گئی تھی۔

"مہروج! میں سوچ بھی نا ہیں سکتی تھی کہ آپ میرے لئے اتنا کچھ کریں گے۔" وہ نیازمندی سے میرے گھٹنوں پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کا سر اٹھایا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام کر دیا...... ہاں، آج اس کا مرمریں جسم اس کپکپی سے محفوظ تھا جو میرے چھوتے ہی اس پر طاری ہو جاتی تھی۔

اس نے بڑی "عاجزانہ خودسپردگی" کے ساتھ خود کو میرے اندر جذب کر دیا۔ میں نے لالٹین بجھا دی۔ ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہو گئے۔ اس کے جسم میں پہاڑی بارشوں کا ترنم تھا...... جنگلی پھولوں کی مہک تھی اور خودرو درختوں کا بانکپن تھا۔ وہ بڑی محبت سے میرا نام پکارتی رہی۔ اس کی یہ حسین سرگوشی ریشمی اندھیرے میں جذب ہوتی رہی......

اگلے آٹھ دس روز بڑے حسین تھے۔ میری گردن کا زخم غیر متوقع تیزی سے ٹھیک ہوا تھا۔ پسلی کا درد بھی اب نہ ہونے کے برابر تھا۔ کلثوم، تاؤ افضل کی بیٹیوں اور نوری وغیرہ سے بہت گھل مل چکی تھی۔ یہ کلثوم وہی لڑکی تھی جسے میں نے فتح پور کے چودھری اور ستیش وغیرہ سے نجات دلائی تھی۔ کلثوم، نوری اور تاؤ افضل کی بیٹیاں ان تہ خانوں کو بہت صاف ستھرا رکھتی تھیں۔ وہ دیگر امور خانہ داری کے علاوہ مزے دار کھانے بھی پکا رہی تھیں۔ کئی ہفتوں کی جان توڑ مشقت اور خطرات کی یلغار کے بعد مجھے اور عمران کو راحت کی گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں۔ سلطانہ بھی بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کے کانوں میں اب جھمکے چمکتے تھے اور کلائیوں پر چوڑیاں گنگناتی تھیں۔ وہ سرِ شام صاف ستھرا لباس پہنتی، خود کو تھوڑا سا سنوارتی اور اس کی آنکھوں میں شرمگیں سائے لہراتے...... ان خوب صورت شب و روز میں اگر اس کے ذہن میں کوئی کسک تھی تو وہ بالو کے حوالے سے تھی۔ ہمارا بچہ ہم سے دور تھا۔ بے شک وہ محفوظ رہا تھا اور خیریت سے تھا لیکن دوری تو تھی۔

ایک شب کے ریشمی اندھیرے میں جب میں چت لیٹا تھا اور سلطانہ کا سر میرے سینے پر تھا، میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "ایک بات پوچھوں سلطانہ؟"

"جی۔" اس نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

"تمہیں پتا ہے کہ تمہارا پرانا ملازم ہاشو نل پانی میں نہیں ہے؟"

اس نے چونک کر میرے سینے سے سر اٹھایا اور بولی۔ "کہاں ہے وہ؟"

"زرگاں میں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اور وہ وہاں اچھی حالت میں بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب مہروج؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

میں نے لالٹین کی لو اونچی کی تو کمرے میں مدھم روشنی پھیل گئی۔ سلطانہ نے اپنے دودھیا شانوں کے گرد گرم شال لپیٹ لی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سلطانہ! مجھے ایک بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتانا۔ کیا تمہیں پتا تھا کہ ہاشو گونگا نہیں ہے؟"

اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ

کے لئے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر بولی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہروج! ہا...... ہاشو بول ناہیں سکتا۔ یہ سب جانتے ہیں......''

''لیکن...... وہ بول سکتا ہے سلطانہ! میں نے اسے خود بولتے سنا ہے۔''

''کب...... کہاں؟''

''حکم کے دربار میں...... جہاں اسے زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسے نل پانی سے پکڑا ہے جہاں وہ ایک بڑی سنگین واردات کرنے جارہا تھا۔''

سلطانہ کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ ناہیں آرہا مہروج! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کہیں...... کہیں وہ کوئی اور شخص تو ناہیں جسے آپ نے زرگاں میں دیکھا ہے؟''

''مجھے اتنا ہی یقین ہے کہ وہ ہاشو ہے، جتنا اس بات کا یقین ہے کہ تم سلطانہ ہو۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے...... کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

اس کے کہنے پر میں نے اسے تفصیل سے سارے واقعات بتائے۔ میرا اور عمران کا حکم کے بھرے دربار میں پہنچنا، وہاں سخت مزاج بڑھیا اور ہمارا مکالمہ، ہاشو کا پابہ زنجیر نمودار ہونا۔ پانڈے کے ہاشو کے بارے میں انکشافات...... زہر سے بھرے ہوئے پیکٹ کی رُونمائی...... میں نے سب کچھ سلطانہ کے گوش گزار کیا۔ آخر میں، میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہاشم عرف ہاشو نے کس طرح بہ بانگِ دہل خود پر لگائے جانے والے الزامات قبول کئے اور بچ جانے کی صورت میں اپنے اقدام کو دہرانے کا اعلان کیا۔

سلطانہ سخت حیرت کے عالم میں سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

''میں ایسا سوچ بھی ناہیں سکتی تھی۔'' وہ آخر میں لرزاں آواز میں بولی اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

میں اس سے زہر والی پڑیا کی بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کی کیفیت دیکھ کر خاموش رہا۔ وہ اگلے روز بھی بالکل گم صم رہی۔ تیسرے روز اس نے خود ہی اس پڑیا کی بات چھیڑ کر مجھے حیران کر دیا۔ نوری نے بڑا زبردست پلاؤ بنایا تھا۔ ہم رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک سلطانہ نے کہا۔ ''مہروج! میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔''

''کہو سلطانہ۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''جن دنوں میں بہت جیادہ دکھی تھی اور جارج کی جان لینے کے لئے طلال کے ساتھ زرگاں چلی گئی تھی، میں نے خود کو مارنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''کیا مطلب سلطانہ؟''

''میں نے فیصلہ کیا تھا مہروج کہ اگر میں زرگاں میں پکڑی گئی تو بے عجت ہونے کے بجائے موت کو گلے لگالوں گی۔ میں نے جہر کی ایک پڑیا اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ یہ جہر بس تھوڑے سے میں بندے کو مار سکتا ہے۔ یہ جہر مجھے ہاشو نے دیا تھا۔ پرسوں آپ نے جہر والے لفافے کی بات کی ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ جہر بھی اسی لفافے کا ہو۔''

''تم بڑے ڈرادینے والے انکشاف کر رہی ہو سلطانہ! مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اس حد تک جا چکی ہو۔ کیا ان دنوں تمہیں میرا اور بالو کا خیال بھی نہیں آتا تھا؟''

وہ کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔ ''اگر سچ پوچھتے ہیں...... مہروج...... تو ناہیں آتا تھا۔ میں اس وقت خود کو جندہ سمجھتی اچ ناہیں تھی، ہاں...... سمجھتی اچ ناہیں تھی۔ مرنا میرے لئے اتنا اِچ آسان تھا جتنا آنکھیں بند کرنا......'' وہ عجب لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''اب وہ پڑیا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب وہ کہیں ناہیں ہے۔ اگر ہوتی بھی تو سمجھیں کہ ناہیں تھی۔ اب میں ان باتوں کے بارے میں سوچنا اچ ناہیں چاہتی۔''

''کہیں پھینک دی ہے؟''

''ناہیں...... کھوگئی ہے۔''

''تمہاری بہت سی کھوئی ہوئی چیزیں میرے پاس سے ملتی ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نیلگوں پاؤڈر والی چھوٹی سی پڑیا سلطانہ کے سامنے کر دی۔ ایک بار پھر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ''یہ...... یہ آپ کو کہاں سے ملی؟''

''جہاں تم نے چھپائی تھی۔'' میں نے کہا...... اور پڑیا اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

اس نے لرزاں ہاتھوں سے اس پڑیا کو کھولا۔ کچھ دیر تک اشک بار آنکھوں سے اس نیلگوں پاؤڈر کو دیکھتی رہی جو کسی بھی شخص کو دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی سرحد پار کرا سکتا تھا۔ پھر اس نے اس پڑیا کو انگیٹھی کے دہکتے انگاروں پر الٹ دیا اور میرا بازو تھام کر میرے کندھے

سے سر ٹکا دیا۔

ہاشو کے بارے میں، مَیں نے جو انکشافات پرسوں سلطانہ کے سامنے کئے تھے، انہوں نے بظاہر سلطانہ کو بھی ورطۂ حیات میں ڈال دیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک شخص اتنا عرصہ ان کے گھر میں ان کے ساتھ گونگا بن کے رہا اور وہ اس کے بارے میں جان نہ سکے۔ اس کے علاوہ وہ صرف ہاشو نہیں تھا بلکہ ہاشم رازی تھا اور اس کی اہمیت اور حیثیت ان کی سوچوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ ''میں آپ کو اور عمران بھائی کو جھٹلا نہیں سکتی مہروج! اگر کوئی اور یہ بات کہتا تو میں کبھی بھی ناہیں مانتی۔''

اس رات بھی ہم دیر تک ہاشو اور اس کے جنونی رویے کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اس کے علاوہ زرگاں کے وہ حالات بھی ہماری گفتگو کا موضوع بنے جو مقامی حکمرانوں کی من مانیوں سے پیدا ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے فرقہ پرستی اور شدت پسندی کو ہوا مل رہی تھی......اور وہ عروج پر پہنچ رہی تھی۔

سلطانہ نے ہاشو کے حوالے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا تھا۔ پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ اس معاملے میں تھوڑا بہت پیچ ضرور ہے۔

○......❖......○